کلیاتِ
غلام عباس

ترتیب و مقدمہ

ندیم احمد

کلیاتِ غلام عباس

غلام عباس کے افسانے

ترتیب و مقدمہ

ندیم احمد



Rahrawan-e-Adab

کلیاتِ غلام عباس

(غلام عباس کے افسانے)

ترتیب و مقدمہ : ندیم احمد

فضیل جعفری اور افتخار حسین

کے نام

یہ سانحہ میرہم نے کہ قیامت خواب لائے
تری سرگذشت سن کر گئے اور خواب یاراں

کلیات غلام عباس

KULLIYAT - E - GHULAM ABBAS

GHULAM ABBAS KEY AFSANEY

(Short Stories By : Ghulam Abbas)

Edited By : Nadim Ahmad

ISBN 978 - 93 - 5265 - 604 - 2

پہلی اشاعت : ۲۰۱۶ء
تعداد : ۵۰۰
ترتیب : احمد اقبال صدیقی
طابع : [illegible]
قیمت : ۸۰۰ روپے (Rs.800/-)



Rahrawan-e-Adab

ترتیب

افسانے

آنندی (۱۹۴۸)

جاڑے کی چاندنی (۱۹۶۰)

Artist are complicated people. ...They dont have to be saints. You shouldnt idealize them or demonize them. Their work is what matters, not their lives.

Mario Vargas llosa

کلیات غلام عباس

کن رس (۱۹۶۹)

دیگر افسانے

* *

The last and greatest art, the art to blot.

Pope

تمہید

غلام عباس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "آنندی" مکتبہ جدید، لاہور سے پہلی بار اپریل ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اس مجموعے کی کسی اشاعت کا مجھے کوئی علم نہیں۔ ان کا دوسرا مجموعہ "جاڑے کی چاندنی" جولائی ۱۹۶۰ء میں پہلی دفعہ شائع ہوا۔ اور اس کے متعدد ایڈیشن ۱۹۸۰ء تک شائع ہوتے رہے۔ عباس صاحب کا تیسرا اور آخری مجموعہ "کن رس" دسمبر ۱۹۶۹ء میں پہلی دفعہ لاہور سے شائع ہوا اور اغلب ہے کہ یہ اس کا واحد ایڈیشن تھا۔ پاکستان میں وقتے وقتے سے ان کے افسانوں کے متعدد انتخابات بھی شائع ہوتے رہے لیکن ہندوستان میں غلام عباس کا ذکر بہت کم ہوا۔ کم سے کم مجھے تو اس بات کا کوئی علم نہیں کہ ہندوستان سے ان کے افسانوں کا کوئی مجموعہ یا انتخاب شائع ہوا ہو۔ ہندوستان میں "آنندی" کے سوا غلام عباس کا کوئی بھی افسانہ عام اردو والوں کی دسترس میں نہیں۔ ۶۰ کی نسل نے تو عباس صاحب کو پڑھا بھی تھا لیکن ۸۰ کے بعد اردو میں جو نسل سامنے آئی اسے "کہانی کی واپسی" نے ایسا پاگل کر رکھا تھا کہ عباس صاحب جیسا غیر معمولی قصہ گو بھی ان کی نظروں سے اوجھل رہا۔ "آنندی" کو تو ہماری درسگاہیں بچا لے گئیں ورنہ اس کا بھی وہی حال ہوتا جو عباس صاحب کے دوسرے افسانوں کا ہوا۔

ہندوستان میں افسانہ 'آنندی' دستیاب تو ہے لیکن اس کا متن نہایت ہی ناقص اور غیر تشفی بخش

ہے۔ اس معاملے میں پاکستان بھی ہم سے پیچھے نہیں۔ وہاں سے شائع ہونے والے انتخابات کا حال تو اتنا پتلا ہے کہ عباس صاحب کا افسانہ "غازی مرد" "نمازی مرد" بن گیا ہے۔

عباس صاحب جیسے بڑے افسانہ نگار کے متعلق اسی غیر محتاط رویے نے مجھے ان کے افسانوں کو جمع کرنے اور ان کا درست متن تیار کرنے پر مجبور کیا۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ غلام عباس کے افسانوں کی ایک نئی دنیا ہمارے سامنے آئے گی۔

افسانوں کے متن کو ہر طرح سے معتبر بنانے کے لئے ضروری تھا کہ غلام عباس صاحب کے تمام افسانوی مجموعوں کے ان اولین نسخوں کو حاصل کیا جائے جو خود غلام عباس صاحب کی نگرانی میں شائع ہوئے تھے۔ چنانچہ میں نے وہ تمام نسخے حاصل کئے اور ان کی روشنی میں متن تیار کیا۔ ہندوستان میں شاید میں واحد آدمی ہوں جس کی ذاتی لائبریری میں یہ تمام نسخے اپنی اصل حالت میں موجود ہیں۔

تحقیق کے جدید رویوں کے مطابق میں نے کلیات کو مجموعے کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے تاکہ کتاب حوالے کے طور پر استعمال کی جاسکے اور نودریافت افسانوں کو ایک الگ باب کے تحت رکھا ہے۔

شمس الرحمن فاروقی صاحب نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی مجھے اپنے مشوروں سے نوازا اور کتاب کے بیک سرورق کے لئے رائے لکھی۔ ان کی شفقتوں کو میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ کام کے دوران آصف فرخی، فضیل جعفری، شمیم حنفی، ابوالکلام قاسمی اور انیس اشفاق صاحب سے میری گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا اور ان لوگوں کا شکر گزار ہوں۔

استاد محترم پروفیسر شہبازی صاحب نے ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھایا۔ ان کے احسانات بے شمار ہیں مجھ پر۔ میرے دوست احمد اقبال صدیقی نے کتاب کا دیدہ زیب سرورق تیار کیا جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ عزیز شاگرد محمد شہنواز عالم نے کتاب کے بعض حصوں کے پروف پڑھے اور ڈاکٹر تسلیم عارف نے کتاب کے بعض حصے کی حرف کاری کی ان لوگوں کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔ کتاب کی تکمیل میں میری شریک حیات انجم آراء نے میری کافی معاونت کی اور میرے ہر کام کو اپنی توجہ سے آسان بنایا۔ لیکن وہاں کا معاملہ دو دل ہے۔

ندیم احمد

مقدمہ

غلام عباس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے سب کے لئے افسانے نہیں لکھے۔ یہ بیان نظریوں کو سینے سے لگائے اور قدم قدم پر گم شدہ قاری کی تلاش میں سرگرداں ناقدوں کے لئے خاصہ پریشان کن ہے۔ پابند ادبی سیاست کے زیر اثر Politically Correct بیانات دینے کے ہم ایسے عادی ہوچکے ہیں کہ فساد خلق کا خطرہ دیکھتے ہی آئیڈیالوجی کا سہارا ڈھونڈنے لگتے ہیں خواہ اس کے نتیجے میں لفظوں کے مرکبات اور ان میں موجود تجربوں کی شکل مسخ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ سب کے لئے افسانے لکھنا یا ایسے افسانے لکھنا جسے پڑھ کر ناتیار (Unprepared) قاری بھی رواں ہوجائے میرے خیال میں بڑا غبی فعل۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں متن کے باہر قاری کے وجود سے انکاری ہوں یا متن کی تفہیم کے لئے کسی عقلیت کوش بورژوازم کا حامی۔ بات صرف اتنی ہے کہ آرٹ کے بغیر قاری کا وجود ممکن نہیں۔ فن کار اس لئے نہیں لکھتا کہ اسے کیسے اور کتنے قاری میسر آئیں گے۔ تخلیق کا اندرونی عمل تو اسے یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔ منشائے مصنف اور متن کی پُراسراریت کے نتیجے میں معنی کی غیر قطعیت کے درمیان ایک پیکار کا عمل ہوتا ہے جو مسلسل جاری رہتا ہے۔ ان کی اس صورت میں فن کار کو یہ مہلت ہی نہیں ملتی کہ وہ فرضی چیزوں پر اپنی توجہ صرف کرے اور تخلیقی عمل کی Originality کو خود اپنے ہاتھوں سے تہس نہس کردے۔ متن بناتے وقت ادیب کو خارجی اشیا سے بھی

لڑنا پڑتا ہے اور اپنے آپ سے بھی۔ مشرقی شعریات نے مثالی متن The Ideal Text کے متعلق اس حقیقت کو بہت پہلے پا لیا تھا البتہ مغربی تنقید کو اس نکتہ تک پہنچنے کے لئے والیری کا انتظار کرنا پڑا۔ والیری کہتا تھا:

IL FANT TENTER DE VIVSE

والیری کی طرح ملارمے بھی تخلیقی عمل کو نتائج سے الگ رکھ کر دیکھتا تھا۔ ادیبوں کے ایک اجتماع کے موقع پر کہی گئی نظم 'سلام' Salutation میں وہ کہتا ہے:

NOTHING! THIS FORM AND VIRGIN VERSE
TO DESIGNATE NOUGHT BUT THE CUP
SUCH FAR OFF THERE PLUNGES A TROOPS
OF MANY SIRENS UPSIDE DOWN

WE ARE NAVIGATING MY DIVERSE FRIENDS

ALREADY ON THE POOP YOU THE SPLENDID
PROW WHICH CUTS THE MAIN OF THUNDERS
AND OF WINTERS

A FINE CLARITY CALLS ME WITHOUT FEAR OF
ITS ROLLING TO CARRY UPRIGHT THIS TOAST

SOLITUDE IT WAS THAT WAS WORTH
OUR SAIL'S WHITE SOLICITTED

عسکری صاحب کی مانیں تو ملارمے نے نظم کی پہلی سطر میں ہی کہہ دیا ہے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ یعنی یہ ساری نظم ایک کھیل ہے لیکن اس نظم کی طرح فنی تخلیق کا آغاز بھی اسی " کچھ بھی نہیں" اسی کھیل سے ہوتا ہے۔ آج کل کچھ نقاد ایسے بھی ہیں جو فن کے سلسلے میں کھیل کا نام سن کر بگڑ جاتے ہیں اور فوراً یہ سمجھانا شروع کر دیتے ہیں کہ کھیل کا نفسیاتی مطلب کیا ہے اور انسان کے لئے اس کی حیاتیاتی اہمیت کتنی ہے۔ لیکن فن کار یہ سوچ کر لکھنے نہیں بیٹھتا کہ اس وقت مجھے انسان کی ایک زبردست خدمات انجام دینی ہے۔ اس کی تخلیقی سرگرمی کے نتائج انسانیت کے لئے کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں تخلیقی لمحے

میں اسے نتائج سے سروکار نہیں ہوتا۔ عشق کرنے سے پہلے آدمی یہ نہیں سوچا کرتا کہ نسل انسانی کی افزائش میرا فرض ہے۔ فن کار بھی ایک تخلیقی شہوت کے پنجے میں گرفتار ہوتا ہے وہ اس کھیل کے لطف کی خاطر اپنے آپ کو اس تحریک کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس معاملے میں فن کار کی حیثیت کچھ عورت کی سی ہے۔ برسوں کے دکھ تخلیقی لمحے کی لذت میں تحلیل ہو کے رہ جاتے ہیں۔ اس کھیل کی مسرت میں فن کار کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ کون سی اذیت اپنے سر لے رہا ہے۔" غلام عباس نے بھی یہ اذیت اپنے سر لی ہے وہ جان بوجھ کر افسانہ لکھتے ہیں۔ ملارمے نے تخلیقی عمل کو باقاعدہ ریاضت بنا دیا تھا۔ غلام عباس کے بارے میں ایسی کوئی بات تو نہیں کہی جا سکتی لیکن انسانی ذہن کے کسی عمل کو رد کئے بغیر روزمرہ کے تجربات میں حقیقت کی تلاش ان کے افسانے کو عام انسانی سطح سے بہت بلند کر دیتی ہے۔ وہ تجربات سے نہیں کھینچتے اور نہ ہی خواب دیکھتے ہیں بلکہ انہی کے ذریعہ ان کا تخیل حرکت میں آتا ہے۔ فن میں جو حقیقت ہے اس کے مقابلے میں اور حقیقتیں صرف ایک سایہ ہیں، غلام عباس کو بھی اس کا احساس ہے۔ چنانچہ حقیقت میں ڈوب جانے کے لئے کبھی تو افسانے میں انہیں روزمرہ کی حقیقت سے تھوڑے وقفے کے لئے قطع تعلق کرنا پڑتا ہے اور کبھی ساری حقیقتیں متن کی سطح پر ایک ساتھ چلنے لگتی ہیں۔ جو لوگ افسانے میں حقیقت، موضوع، خیال یا جذبے کی وحدت کو فوراً پانا چاہتے ہیں انہیں غلام عباس کے افسانے پھیکے معلوم ہوں گے۔ دراصل وحدت ان کے یہاں جلدی سے نہیں ملتی یہی وجہ ہے کہ منٹو اور بیدی کی طرح اچھے افسانے لکھنے کے باوجود انہیں وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ عسکری صاحب نے ایک موقعہ پر یہ بات کہی تھی:

عام طور پر افسانے کے متعلق جو تنقیدی مضامین لکھے جاتے ہیں ان میں عباس کا ذکر بھولے بھٹکے ہی ہوتا ہے۔ مضمون نگار ذرا باخبر یا ستھرے ذوق کا ہوا تو اس نے ان کے متعلق کچھ لکھ دیا ورنہ غائب۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی درست ہے کہ انفرادی طور سے ان کے دو تین افسانے مقبول بھی ہوئے اور مشہور بھی ہوئے بلکہ آنندی کا شمار تو اردو کے مشہور ترین افسانوں میں ہوتا ہے۔ اگر آپ ادب سے سنجیدہ دلچسپی رکھنے والے کسی آدمی سے پوچھیں کہ تمہیں کون کون سے افسانے اب تک پسند آئے ہیں تو وہ آنندی کا نام ضرور لے گا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ غلام عباس مجموعی طور سے مقبول نہیں ہیں۔ مگر ان کے بعض افسانے بہت مقبول ہیں۔ اگر ہم اس تضاد کی وجہ معلوم

کرلیں تو ہم غلام عباس کے فن کی خصوصیت کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔

جدید ناقدوں میں فضیل جعفری نے بھی غلام عباس کے آرٹ کو ایک عرصے تک نظرانداز کئے جانے کی بات کہی ہے۔ اپنی کتاب 'آبشار اور آتش فشاں' میں انہوں نے عباس پر بڑا زبردست مضمون باندھا ہے۔ فضیل صاحب منٹو، کرشن چندر، بیدی اور عصمت کے ساتھ غلام عباس کا نام لینا پسند کرتے ہیں۔ انہیں عباس کی تکنیک اور کردار نگاری سے دلچسپی ہے۔ 'سیاہ و سفید'، 'بھنور'، 'سایہ'، 'غازی مرد' اور 'بردہ فروش' کے کرداروں کی خارجی زندگی اور داخلی پہلوؤں پر فضیل صاحب نے جو گفتگو کی ہے اس کی توقع صرف فضیل جعفری یا پھر فاروقی صاحب جیسے بڑے ناقدوں سے ہی کی جا سکتی ہے۔ تکنیک اور کردار نگاری غلام عباس کی طاقت ہیں مگر ان کے فن پر نظری گفتگو کرتے وقت کچھ اور باتیں بھی بڑی توجہ طلب ہیں۔ غلام عباس نے ۳۶ء کی تحریک سے تقریباً آٹھ دس سال پہلے لکھنا شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سیاسی، معاشی، سماجی اور نفسیاتی پیچیدگیاں پردے ہی پردے میں نشوونما پا رہی تھیں اور اب تک واضح نہ ہو پائی تھیں۔ نفرت اور محبت کے مرکز اب تک متعین نہیں تھے۔ ادیبوں کے یہاں بغاوت یا بیزاری کا یہ عالم نہ تھا کہ وہ اپنا اصل کام چھوڑ کر چند چیزوں کے خلاف اور دوسری چند چیزوں کے حق میں لکھنا شروع کر دیں یعنی نفرت اور محبت کے لئے چند چیزیں چن لیں اور پھر نظریے کی تھیلی میں بند کر کے ان چیزوں کو لوگوں تک پہنچاتے رہیں۔ الحمرا کے افسانے سے چل کر جزیرہ سخنوراں اور پھر آنندی تک آتے آتے غلام عباس نے نظریے کا جھنجھٹ ہی نہیں پالا۔ نظریے بازی نے ان کے یہاں وہ پیچیدگی پیدا نہیں کی جو ہمیں کرشن چندر کے یہاں ملتی ہے۔ غلام عباس نے دوسرے معاصرین کے علی الرغم آئیڈیالوجی اور اس کے زیر اثر جعلی موضوعات سے اپنے افسانے کو الگ تھلگ رکھا ہے۔ وہ ان ادیبوں میں سے نہیں ہیں جو لکھنے سے پہلے ایسے موضوع چنتے ہیں جن کے متعلق وہ پہلے ہی سے فرض کر لیتے ہیں کہ یہ ان کے مقاصد کے لئے مناسب اور موزوں ہیں۔ فارمولے کے تحت ایسے افسانے لکھنا جن سے ایک قسم کی جمالیاتی سنسنی پیدا ہو سکے، میرے خیال میں بڑا کمزور اور غیر دلچسپ کام ہے۔ ۳۶ء کی تحریک کے فوراً بعد قائم ہونے والے بہت سے جدید افسانہ نگاروں کے اسی رویے کے متعلق عسکری صاحب نے کہا تھا:

> جدید افسانہ نگاروں نے افسانے کا ایک فارمولا تیار کر لیا ہے۔ اسی کے مطابق وہ اپنے افسانے گڑھتے ہیں۔ اس فارمولا کا مقصد یہ ہے کہ ایک قسم کی جمالیاتی سنسنی پیدا ہو سکے۔ کہیں ایک گھنٹی سی بجتی ہے لیکن اتنی مدھم اور مبہم

> آواز سے کہ بس کان میں ایک جھنک سی سنائی دیتی ہے۔ یہ آواز اس سے زیادہ بلند نہیں ہونی چاہیے۔ فیشن کا تقاضا ہے کہ یہ آواز کچھ رموز کے پردوں میں لپٹی ہوئی ہو۔ بس ہلکی سی ٹن کی آواز آنی چاہیے۔ پڑھنے والوں کا رد عمل بھی اب بہت مخصوص اور محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ جدید افسانے پڑھتے ہوئے بس یہ دیکھ لینا کافی ہے کہ وہ وضعی اعتبار سے درست ہیں یا نہیں۔ یہ پوچھنا مشکل ہو گیا ہے کہ وہ واقعی لکھنے کے قابل بھی تھے یا نہیں۔ جدید افسانوں میں زندگی کے متعلق ایک بہت ہی مخصوص و محدود اور غیر اہم رویہ ملتا ہے۔ انہیں پڑھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بس زندگی کا سارا مقصد ہی کوئی ایسا واقعہ فراہم کرنا ہے جو ایک مختصر سے تخیل میں ٹھیک بیٹھ سکے اور اس تخیل کا مقصد افسانہ نگار کو کوئی چھوٹا سا چست خیال فراہم کرنا ہے، جسے وہ اخلاقی سبق کے طور پر افسانے کے آخر میں چپکا سکے۔

اخلاقیات سے پیچھا چھڑانا تو فن کار کے لئے ممکن نہیں لیکن اس لفظ کو چھوٹے سے چھوٹے اور تنگ سے تنگ معنوں میں استعمال کر کے ناتیار (Unprepared) قاری کے لئے سامان تفریح فراہم کرنا ایک نہایت ہی غیر ادبی کام ہے۔ اخلاقی رشتے حقیقت کا حصہ ہیں بلکہ سب سے بڑی حقیقت ہیں۔ غلام عباس کو بھی اس کا احساس ہے لیکن وہ ۳۶ء کی تحریک سے متاثر نوجوانوں کی طرح مابعد الطبعیاتی معاملات کو صحافت کی سطح پر نہیں کھینچتے۔ یہ رویہ مروجہ ادبی فیشن کے خلاف تھا اور غلام عباس کو اس کا نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ 'آنندی' جیسا افسانہ لکھنے کے باوجود وہ اس طرح مشہور نہ ہو پائے جس طرح کرشن چندر، منٹو، عصمت، بیدی، ممتاز مفتی اور اشک وغیرہ نے شہرت پائی۔ غلام عباس اور ان کے افسانوں سے نام نہاد قاری کی عدم دلچسپی اور اس کے نتیجے میں نقادوں کی بے توجہی کے اور بھی کئی وجوہ ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اپنے معاصرین کے برخلاف افسانے کو دلچسپ بنانے کے لئے وہ کسی خاص قسم کے موضوع کا انتخاب کبھی نہیں کرتے یعنی دلچسپ ہونا ان کے افسانے کی شرط نہیں۔ وہ کسی خاص موضوع، اسلوب یا جذباتی فضا کے چوکھٹے میں بند بیانیہ کے تفاعل سے افسانہ خلق نہیں کرتے بلکہ ایک صورت حال ہوتی ہے جو بیان اور کردار کے تفاعل کو ہمارے لئے قابل قبول بناتی ہے اور جس کی بنا پر ہم ان سے انسانی جذبات کے دائرے میں رہ کر معاملہ کرتے ہیں۔ بیان غلام عباس کے یہاں وسیلہ ہے جس سے کہانی وجود میں آتی ہے۔ 'آنندی' اس کی بہترین مثال ہے۔ اس

میں کردار کوئی نہیں، یہ بیانیہ اور صورت حال کے آپسی تعامل Interaction کا افسانہ ہے۔ کہانی کی بڑائی اس بات میں ہے کہ یہاں روایتی بیانیہ کا وہ عنصر موجود ہے، جہاں واقعہ یا صورت حال ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ یعنی صورت حال اور واقعہ کے آپسی تعامل میں کردار کا عمل دخل بہت کم ہو اور واقعہ اس قدر پیش منظر میں ہو کہ کردار ہمیں غیر اہم معلوم ہونے لگے۔ 'آنندی' میں بیانیہ کی پکڑ اتنی مضبوط ہے کہ کہانی پڑھتے وقت ہم فرضی چیز کی تلاش نہیں کرتے ہمیں اس کی فکر ہی نہیں رہتی کہ یہاں کردار کتنے ہیں اور کردار نگاری کتنی۔ ایک شہر ہے جسے غلام عباس نے طاقت ور بیانیہ کی مدد سے عدم سے وجود میں آتے، آباد ہوتے اور چلتے پھرتے دکھایا ہے۔ 'آنندی' میں جو چیز پیش از پیش حاوی ہے، وہ دراصل وہی صورت حال ہے جو کہانی پن کو خلق کرتی ہے۔

بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنان بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیوں کہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔ بلدیہ کے ایک بھاری بھر کم رکن جو ملک و قوم کے سچے خیر خواہ سمجھے جاتے تھے، نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے۔ ......اور پھر حضرات! آپ یہ بھی خیال فرمایئے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزر گاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے علاوہ ازیں شرفا کی پاک دامن بہو بیٹیاں اور بازار کے تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دل بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں اور اپنے دولتمند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے بادل ناخواستہ اس علاقے میں رہنے پر آمادہ ہو گئی تھیں، ورنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھدروں میں جا چھپیں

گی یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ دیں گی۔ یہ چودہ بیسوائیں اچھی خاصی مالدار تھیں۔ اس شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے، ان کے دام انھیں اچھے مل گئے تھے اور اس علاقے میں زمین کی قیمت برائے نام تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے عالیشان مکان بنوانے کی ٹھان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی منتخب کی گئی۔ زمین کے قطعے صاف کرائے اور چابکدست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ دن بھر اینٹ، مٹی، چونا، شہتیر، گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان لاریوں، چھکڑوں، خچروں، گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا اور منشی حساب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انھیں گنواتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ میر عمارت معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے، مزدور ادھر ادھر دوڑتے پھرتے۔ مزدورنیوں کو چلا چلا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کیلئے بلاتے۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی، اس بستی کی خبر سن کر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک خورد سال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ، بیڑی چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا اور کنوئیں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا، پیسے کے دو دو گھونٹ شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی، وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کے لے آیا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر: "لے لو خربوزے۔ شہد سے میٹھے خربوزے۔" کی صدا لگانے لگا۔ اس شخص نے کیا کیا گھر سے سری پائے پکا، دیگچی میں رکھ خوانچہ میں لگا تھوڑی سی روٹیاں مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے کر

آ موجود ہوا اور اس بستی کے کارکنوں کو جنگل میں ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے۔ کبھی کبھی دن دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آ جاتیں اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آ جاتیں اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور انھیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے اوباش بے کار مباش کچھ کیا کر کے مصداق شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سن گن لینے آ جاتے اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے ذرا ہٹ کر ان کے اردگرد چکر لگاتے رہتے۔

بستی میں ایک جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن بستی کے راج مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس سے دھواں اٹھ رہا ہے اور سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا، تڑنگا مست فقیر، لنگوٹ باندھے چار ابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے اردگرد پھر رہا اور کنکر پتھر اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک گھڑا لے کر کنوئیں پر آیا اور پانی بھر بھر کر مزار پر لے جانے لگا اور اسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنوئیں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے۔ وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا: "جانتے ہو یہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا۔ میرے باپ دادا ان کے مجاور تھے۔" اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کے پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کرامات بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔ شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائنتی چراغ روشن کر دیے۔ رات کو

پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے، اللہ ہو، کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔ چھ مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے۔

ایسے زمانے میں جب لوگ اپنی بات کہنے کے لیے تڑپ رہے تھے، پٹے پٹائے تیار شدہ موضوعات نئے لکھنے والوں کو اپنا ذریعۂ اظہار بنا کر دنیا کے سامنے آنا چاہتی تھیں۔ غلام عباس نے ایسے افسانے خلق کیے جو زبان و بیان کی سطح پر غیر معمولی طور پر صاف ستھرے اور فرضی الجھیڑوں سے پاک ہیں۔ مطالب کے اظہار پر قدرت غلام عباس کی قوت بیان کا بہترین مظہر ہے۔ عسکری صاحب نے درست کہا ہے:

> غلام عباس کی زبان آلائشوں اور الجھیڑوں سے پاک ہے۔ جن مطالب کو وہ بیان کرنا چاہتے ہیں ان کے اظہار پر قادر ہیں۔ اپنی صلاحیتوں سے واقف، اپنی حدوں کے اندر بالکل مطمئن اور ان سے تجاوز ہونے کے خیال سے گریزاں۔ یہ خوبیاں مجموعی اعتبار سے نئے افسانہ نگاروں میں کمیاب ہیں۔ عصمت چغتائی کی نثر کا تو ذکر کیا ہے، وہ تو جتنا کہنا چاہتی ہیں اس سے کہیں زیادہ کہہ جاتی ہیں مگر غلام عباس کا یہ وصف ہے کہ وہ جو کہنا چاہتے ہیں اسے کہہ ضرور دیتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ کہیں کوئی کسر رہ جائے اور پڑھنے والا تشنگی محسوس کرے۔ وہ اپنی بساط سے بڑھ کر بات کہنے کی کوشش بھی نہیں کرتے تھے ان کی زبان یا اسلوب سنبھل نہ سکے۔ اگر انھیں کسی پیچیدگی یا دقیق بیان منظور ہوتا ہے تو وہ پہلے غور کر کے اسے سمجھ لیتے ہیں، اور پھر جس حد تک وہ ان کی گرفت میں آتی ہے اسی حد تک کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے انداز میں بڑا توازن، اعتدال اور قرار پیدا ہو گیا ہے جو بے حسی یا جمود ہرگز نہیں ہے۔ غلام عباس کی قوت بیان کا بہترین مظہر ان کا افسانہ "آنندی" ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زبان و بیان ہی نے اسے افسانہ بنایا ہے ورنہ ایک چٹکلا تھا۔ مگر مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اظہار کے معاملے میں ان کی احتیاط اب حد سے زیادہ بڑھنے لگی ہے۔ سنبھال سنبھال کے قدم اٹھانا بڑی ضروری چیز ہے بلکہ نئے ادب کے ماحول میں تو قابل ستائش ہے۔ مگر اتنا سنبھلنا بھی اچھا نہیں کہ قدم ہی رکنے لگے۔ اس کشمکش میں پڑھنے والے کا

ذہنی جھٹکے کھانے شروع کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے قاری افسانے کی فضا میں
جذب ہوتے ہوتے پھر الگ ہو جاتا ہے۔ یہ چیز افسانے کی اثر انگیزی میں
ذرا سی مانع ہوتی ہیں۔☆۹

عسکری صاحب نے غلام عباس کی زبان اور اظہار کے معاملے میں ان کے مخصوص رویے سے متعلق بڑی بنیادی بات کہی ہے۔ 'آنندی' کی زبان میں جو اعتدال اور توازن ہے وہ غلام عباس کے کسب کا نتیجہ ہے۔ ایک ذاتی مشاہدے کو بیانیہ کی مدد سے پر جلال تخلیقی تجربے میں تبدیل کر دینا عباس کا ایسا کارنامہ ہے جو ان کے معاصرین میں صرف منٹو کے یہاں ملتا ہے۔ 'آنندی' کے متعلق خود غلام عباس کا بیان ہے:

میرا افسانہ 'آنندی' بھی اسی قسم کے مشاہدے پر مبنی ہے جو میں نے طوائفوں کے علاقے کی تعمیر نو کے سلسلے میں مشاہدہ کیا۔ یہ علاقہ میرے راستے میں تھا اور میں ہر روز دفتر آتے جاتے اسے بغور دیکھتا رہتا تھا۔ مشاہدے کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی خیال آفرینی افسانے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ واقعہ صرف اتنا تھا کہ طوائفوں کو چاوڑی سے نکال دیا گیا تھا اور اس طبقے کو شہر سے کوسوں دور ایک اجاڑ مقام پر لے جا پھینکا گیا تھا۔ جب بیس برس بعد ان آبرو باختہ عورتوں کے ارد گرد شہر آباد ہو گیا تو اس کی میونسپل کمیٹی نے بھی اپنے علاقے سے انھیں نکالنے کا مطالبہ کر دیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بعض وقت اس میں خیال آفرینی کرنی پڑتی ہے۔☆۱۰

غلام عباس نے 'آنندی' کی کہانی کو جس مشاہدے پر استوار کیا ہے مجموعی طور پر ان کی بعض دوسری کہانیاں بھی اسی مرکز کے قریب آ جاتی ہیں۔ عباس کو انسانوں اور ان کی نفسیات سے دلچسپی ہے۔ ان کی تحقیق و تفتیش کا مرکز انسانی جبلت کا وہ احساس ہے جو انسان کو فریب اور دھوکے کے سہارے جینے اور اسی دنیا میں مسلسل فریب کھاتے رہنے کا حوصلہ بخشتا ہے۔ کوشش سے کچھ ثابت نہ ہونے کے نتیجے میں پیدا ہونے والا طاقتور فریب غلام عباس کے یہاں زندگی کو سسٹم میں ہی کی، بحال رکھنے کا واحد ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔ دھوکا کھانے کی صلاحیت اور ایک ہمہ گیر ذاتی فریب کا تجربہ ان کے زیادہ تر کرداروں کے یہاں تقریباً ایمانی شدت اختیار کر گیا ہے۔

تلو پہلے ہی سے اس حملے کے لئے تیار تھا۔ پولیس کے چھاپہ مارنے سے لے

کہ اس وقت تک تو اس نے چپ سادھ رکھی تھی اور اس سارے قضیے میں اس کا رویہ ایک بے تعلق کا سا رہا تھا۔ مگر اب جبکہ سب طرف سے اس پر تیز نظروں کے حملے شروع ہوئے تو اس نے ایک جھرجھری لی اور اپنی مدافعت میں ایک لطیف مسکراہٹ جس میں خفیف سی خوشی بھی ملی ہوئی تھی اپنے ہونٹوں پر طاری کی۔ یہ مسکراہٹ چند لمحے قائم رہی۔ پھر اس نے نہایت اطمینان کے ساتھ سب پر ایک نظر ڈالی اور بڑی خود اعتمادی کے لہجہ میں کہا: ''آپ لوگ بالکل بھی فکر نہ کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ میں سے کسی کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ میرے ہاں پچھلے پانچ برس میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسے تو کیا کہنا چاہئے۔ مذاق سمجھو مذاق!''

جواری

رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اس کے ذہن میں آیا۔ خدا کے کارخانے عجیب ہیں۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ کیا عجب اس کے دن پھر جائیں۔ وہ کلرک درجہ دوم سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ بن جائے۔ اور اس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر چار سو ہو جائے......... یہ نہیں تو کم سے کم ہیڈ کلرک ہی سہی۔ پھر اسے سائے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے۔ بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے۔ اور اس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے۔

تجسس

اس کا جواب سننے کے لئے مولانا ہی نہیں بلکہ محسن عدیلی کے سارے ساتھی بھی ان ہی جیسا اشتیاق رکھتے تھے۔ چنانچہ جھنا گر جو اکیلا ہی فرش پر بازی لگا رہا تھا اس کے ہاتھ میں تاش کا پتہ پکڑا کا پکڑا رہ گیا۔ دیپ کمار سراغ رسانی کا ایک انگریزی ناول پڑھ رہا تھا۔ اس کی نظریں پڑھتے پڑھتے آخری لفظ پر جم کر رہ گئیں۔ اور اس کے کان محسن عدیلی کی آواز پر لگ گئے۔ قاسم اور شیخی پاس ہی پاس لیٹے نہ جانے کن تصورات میں غرق تھے۔ دونوں نے چونک کر

پر معنی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر نظریں عدیل کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"ابھی تم نہیں سمجھتے۔" آخر حسن عدیل نے کہا۔ اس کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے ایک سرگوشی سی بن گئی تھی۔ "بات یہ ہے۔ اس دن وہ آئی تھیں نا رات کو۔ اور پھر غسل کیا تھا ٹھنڈے پانی سے۔ آج سردی بہت زیادہ ہے۔ میں نے سوچا۔ بے کار بیٹھے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو ننگے ہاتھوں پانی ہی گرم کردیں۔"

یہ کہتے کہتے اس نے پہلو بدلا۔ اپنا سر گاؤ تکیے پر ڈال دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔

حمام میں

جوں جوں گھر قریب آتا گیا۔ اس کے قدم آپ سے آپ تیز سے تیز تر ہوتے چلے گئے۔ آخر جب وہ گھر کے سامنے پہنچا تو ایک استہزا آمیز تبسم اس کے ہونٹوں پر جھلکنے لگا۔ اس نے اپنے دل میں کہا:

"یہ سچ ہی کہ میری بیوی باعصمت نہیں۔ لیکن آخر وہ عورتیں بھی کون سی عفیفہ ہیں جن کے پیچھے میں قلاش ہوگیا۔ اور جن سے ملنے کے لئے میں آج بھی تڑپ رہا ہوں۔"

وہ اوپر کی منزل میں تن تنہا کھلے آسمان کے نیچے چھپر کھٹ پر خوشبوؤں میں بسی ہوئی کچھ سو رہی کچھ جاگ رہی تھی۔ کہ اچانک کھٹکا سن کر چونک اٹھی۔ کان آہٹ پر لگا دیئے۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی سیڑھیوں پر بچ بچ کر قدم دھرتا اس کے پاس آرہا ہو۔

سمجھوتہ

"اچھا ہی ہوا کہ ہم خود اس مکان میں نہ گئے۔ ایک تو اس کی عمارت بڑی ناقص ہے دوسرے اس میں رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ مگر اب مجھے مکان بنوانے کا بخوبی تجربہ ہو گیا ہے۔ اب کے میں انتہائی احتیاط سے کام لوں گا اور کرانے چاہا تو ایسا مکان بنواؤں گا جو بے عیب ہوگا۔ پھر خواہ کوئی

مجھے کتنا ہی روپیہ دے میں اسے کرائے پر نہیں اٹھاؤں گا۔ وہ مکان ہمارے اپنے رہنے کے لئے ہوگا۔ کیوں کہ لڑکیاں بڑی ہوگئی ہیں اور ہم سب کا ایک ہی گھر میں رہنا اخلاقی لحاظ سے اچھا نہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اخبار اٹھایا اور اس کا وہ کالم بڑے غور سے پڑھنے لگا جس میں خالی پلاٹوں کی خرید و فروخت کے اشتہار درج تھے۔

بحران

غلام عباس کی اس دلچسپی کے متعلق عسکری صاحب نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس پر ترقی پسند قطعی نہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ غلام عباس کی دلچسپی اور تخلیق و تفتیش کا مرکز یہ احساس ہے کہ انسان کے دماغ میں دھوکہ کھانے کی بڑی صلاحیت ہے بلکہ فریب خوردگی کے بغیر اس کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے اور وہ ہر قیمت پر کسی نہ کسی طرح کا ذہنی فریب برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے مجموعے میں دس افسانے ہیں جن میں سے پانچ کا موضوع وضاحتاً یہی ہے اور یہی پانچ افسانے غلام عباس کے بہترین افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں کردار یا تو کسی نئے فریب میں مبتلا ہوتے ہیں یا کسی فریب کا پردہ چاک ہوتا ہے۔ ہماری کا ہیرو اپنے ذہنی فریب کے نشے میں ایسا مست ہے کہ وہ دکھی ہونے کے بعد بھی نہیں چوکتا بلکہ اپنے آپ کو خوش رکھنے اور دوسروں کو بھی اسی نشے کی دوا ایک گھونٹ پلانے کی جان توڑ کوشش کرتا رہتا ہے۔ نتیجہ میں باپ کے خوابوں کی عمارت تو ڈھے جاتی ہے مگر بیٹا باپ کی تجویز کو جزو ضمیر کرکے اپنے لئے اہمیت کا ایک نیا فریب ایجاد کرتا ہے۔ 'حمام میں' کے کرداروں کے سارے ذہنی فریب خاک میں مل جاتے ہیں اور وہ صاف صاف اس کا اعلان کردینا چاہتے ہیں مگر پھر بھی ان فریبوں کے بغیر انہیں اپنی زندگی ہی ناممکن نظر آنے لگتی ہے۔ یہ تجربہ دو اس شکست و ریخت کے احساس ہی کو اپنے شعور سے مٹانے کی فکر شروع کر دیتے ہیں۔ انہیں زندگی کی چند تلخ حقیقتوں کو داخل رہنا پڑتا ہے اور وہ اپنے مطالبات میں ترمیم گوارا کر لیتے ہیں تاکہ زندہ رہ سکیں۔ سمجھوتہ کے ہیرو نے اخلاقیات کی دیوار کے پیچھے جھانک کے دیکھ لیا ہے مگر وہ راہ عمل قسم کا آدمی ہے۔ دل شکستہ نہیں ہوتا۔ اپنے نئے علم سے فائدہ اٹھاتا ہے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی عقلیت پسندی بھی ایک فریب نہیں ہے؟ وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اخلاقی اقدار سے سمجھوتہ کیا ہے مگر یہ سمجھوتہ دراصل اس نے اپنے آپ سے کیا ہے اور ایک نئی قید کو آزادی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ 'آنندی' میں ایک فرد کی بجائے جماعت نے اپنے آپ کو جان بوجھ کر دھوکے میں مبتلا کیا ہے۔ شہر آنندی کی تعمیر اور اس کی آبادی اور رونق میں دراصل

انسان انسانی حماقت کے قصر کی تعمیر ہے۔ 'آنندی' میں جو نئی اینٹ دوسری اینٹ پر رکھی جاتی ہے، وہ اس قصر کو بلند تر اور مستحکم تر بناتی ہے۔ 'آنندی' کیا بن رہا ہے ایک نیا فریب بن رہا ہے۔ اسی وجہ سے شہر کی تعمیر ایک خاص طرح معنویت اختیار کر لیتی ہے اور اس کے طویل طویل بیان ہی میں ساری افسانویت ہے۔ یوں دیکھنے میں تو شہر بننے کی کہانی بڑے مزے لے لے کر بیان کی گئی ہے مگر دراصل یہ چٹخارہ ہی ایک دبا دبا زہرخندہ ہے، جیسے انسانی حماقت کے نئے سے نئے ثبوت مہیا کرنے میں مصنف کو لطف آ رہا ہو۔"

انسانی سائیکی پر اتنی غیر معمولی دسترس رکھنے والے غلام عباس کا فن ایک عرصے تک اس لئے بھی مرکز نگاہ نہ بن سکا کہ اس وقت کی سب سے طاقتور تحریک سے انہوں نے خود کو جوڑنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے لکھا ہے:

> میری چیزیں ترقی پسندانہ رہیں لیکن میں نے لیبل لگانا پسند نہیں کیا۔ اس تحریک سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا میں سمجھتا تھا کہ ادب کو پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرنا غلط ہے۔ کسی سیاسی نقطۂ نظر کو ادب پارے کے ذریعہ پھیلایا جائے تو میں اسے ادب نہیں سمجھتا۔ ترقی پسند تحریک دراصل کمیونسٹ تحریک تھی اور اسی لئے پروفیسر احمد علی اور احمد ندیم قاسمی اس تحریک کو چھوڑ کر بھاگ گئے کیونکہ وہ کمیونسٹ نہ تھے۔

غلام عباس نے کافی کچھ پڑھ لکھ رکھا تھا۔ جو افسانے انہوں نے لکھے وہ کسی اعتبار سے پیچھے یا اس دور میں لکھے گئے نمائندہ افسانوں کے مقابلے میں کم رتبہ نہیں تھے باوجود اس کے انہیں وہ مقبولیت نہ مل سکی جو ان کے دوسرے معاصرین کے حصے میں آئی۔ غالباً پہلی بار محمد حسن عسکری نے اپنے مضمون میں غلام عباس اور ان کے فن کو نظر انداز کیے جانے کی بات کی تھی۔ عسکری صاحب کی طاقتور تحریر نے غلام عباس کو فائدہ تو پہنچایا اور اب لوگ منٹو، کرشن چندر، بیدی اور عصمت کی طرح غلام عباس کے افسانے بھی کسی نو دریافت شدہ متن کی طرح پڑھنے لگے۔ قاری، عباس کو میسر آ گیا تھا لیکن نقادوں کی بے توجہی کا سلسلہ تو آج تک جاری ہے۔ بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ 'آنندی' سے جس غلام عباس کی ادبی شہرت استوار ہوئی اس کی تصانیف کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ 'جزیرہ سخنوراں' (۱۹۴۱ء) سے چل کر 'آنندی' (۱۹۴۷ء)، 'الحمرا کے افسانے'، 'جاڑے کی چاندنی' (۱۹۶۰ء)، 'اور پھر کن رس' (۱۹۶۹ء)، 'دھنک' (۱۹۶۹ء)، 'گوندنی والا تکیہ' (۱۹۸۳ء)، 'چاند تارا' اور ان کے علاوہ اعلیٰ پائے کے تراجم کا

ایک تخلیقی سلسلہ ہے۔ کیا کچھ ہے اس میں۔ کتنے اعصاب شکن تجربے ہیں۔ بیانیہ کی تکنیک اور اس کے گرد تہ در تہ پیچ در پیچ کرداروں کا کتنا غیر معمولی مشاہدہ ہے اور ان سب سے بڑھ کر انسانی سائیکی کا کتنا غیر معمولی ادراک۔ ہنر کی بات کریں تو غلام عباس کا مقابلہ اردو کے صرف گنے چنے فکشن رائٹروں کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔

* *

اپنے بارے میں

غلام عباس

نومبر ۱۹۰۹ء کی سترھویں تاریخ کو امرتسر میں پیدا ہوا۔ تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی۔ گرچہ بہت کم عمری ہی میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ مگر صحیح معنوں میں ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۲۵ء میں ہوا جب کہ میری سب سے پہلی ادبی چیز اس وقت کے مشہور رسالہ 'ہزار داستان' میں شائع ہوئی۔ یہ ٹالسٹائی کے ایک افسانہ کا ترجمہ تھا۔

۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۸ء تک کا زمانہ زیادہ تر غیر ملکی ادب کے پڑھنے اور افسانوں کا ترجمہ کرنے میں گزرا۔ اسی زمانہ میں بچوں کے لئے چند کتابیں بھی لکھیں، جنہیں دارالاشاعت پنجاب لاہور نے شائع کیا۔

۱۹۲۸ء سے سید امتیاز علی صاحب تاج کے نائب کی حیثیت سے 'پھول' اور 'تہذیب نسواں' کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگا۔ جن کا سلسلہ ۱۹۳۷ء تک یعنی پورے نو سال رہا۔

۱۹۰۹ء میں حضرت تاج کی فرمائش پر واشنگٹن ارونگ کی 'الحمرا' کے افسانوں کا آزاد ترجمہ کیا۔ اس کی نثر میں، میں نے ایک خاص آہنگ (Rythm) پیدا کرنے کی کوشش کی۔

۳۷-۱۹۳۶ء میں مولانا چراغ حسن صاحب حسرت کے ہفتہ وار اخبار 'شیراز' کے لئے

'جزیرۂ سخنوراں' کے عنوان سے ایک طویل طنزآمیز افسانہ مشہور فرانسیسی ادیب آندرے موروا کے تتبع میں لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۴۱ء میں اس میں کئی مطالب بڑھا کر کتابی صورت میں شائع کیا۔

۱۹۳۸ء سے آل انڈیا ریڈیو کے اردو اور ہندی رسالے 'آواز' اور 'سارنگ' میری ادارت میں نکلتے ہیں۔

یوں تو میں نے اپنی زندگی میں بہت سے لوگوں سے کچھ نہ کچھ سیکھا۔ یا فیض صحبت حاصل کیا لیکن ان میں خاص طور پر قابل ذکر یہ ہیں — ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر جنہوں نے مطالعہ اور فکر میں میری رہنمائی کی۔ خان بہادر عبدالرحمن چغتائی جن کی تصویروں سے آرٹ کی رفعتوں کا احساس ہوا۔ اور مولانا چراغ حسن صاحب حسرت جنہوں نے اردو زبان کی نزاکتوں سے آگاہ کیا۔

میرے محبوب مصنف یہ ہیں: غالب، اقبال، رسوا، گورکی، موپاساں اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس۔

اب کچھ اس افسانہ کے متعلق جسے میں نے اس مجموعہ 'میرا بہترین افسانہ' مرتبہ محمد حسن عسکری کے لئے پسند کیا ہے — 'آنندی'۔ اس افسانہ کو پسند کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کی تکنیک عام افسانوں سے مختلف ہے۔ یعنی اس میں ایک دو یا چند کرداروں کی کردار نگاری نہیں کی بلکہ ایک شہر کو اپنی پوری دلچسپیوں اور ہماہمیوں کے ساتھ عدم سے وجود میں آتا اور بتدریج رستا بستا دکھایا گیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں طنز کے پیرایہ میں زندگی کا ایک فلسفہ پیش کیا گیا ہے۔

جنگ اور صلح، ظلم اور انصاف، گناہ اور ثواب کے خواص روز ازل سے ابن آدم کی سرشت میں داخل ہیں۔ اور دنیا کی بھلائی اور انسانی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ یہ خواص ابد تک اس میں موجود رہیں۔ اگر دو چار دس بیس مفکر مل کر یہ کوشش کریں کہ دنیا میں ہمیشہ کے لئے امن قائم ہو جائے یا صدہا پیغمبر اور ان کے حواری آ کر یہ چاہیں کہ انسان فرشتوں کی طرح معصوم ہو جائیں۔ تو یہ انہونی سی بات ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ فوری طور پر اصلاح ہو جائے۔ یا کچھ عرصہ کے لئے شر خیر کی شکل اختیار کر لے۔ مگر بدی کا خمیر اندر ہی اندر پکتا رہے گا اور ایک نہ ایک دن موقع پا کر جوالا مکھی کی طرح پھوٹ نکلے گا۔

'آنندی' میں ملک و قوم کے چند سچے خیر خواہ اور درد مند اپنے شہر سے بدی (زنانِ بازاری) کو نکال کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ مگر زیادہ عرصہ نہیں گزرنے پاتا کہ بدی ان کے بچوں ہی میں ایک نئے اور زیادہ دل آویز روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور شہر کے 'پاکبازوں' کو پہلے سے زیادہ دلفریب طریقے سے لبھاتی اور اپنی طرف کھینچتی ہے۔

غلام عباس

پریم ناتھ در

غلام عباس...... ذکر چھڑتے ہی مجھے پوربیوں کا ایک چھوٹا سا گیت یاد آتا ہے جسے اس طرف کے "بھیّن" ابھی بے تکلفی کے موقع پر اور دروازے بند کر کے ہی گاتے ہوں گے۔ میں اس گیت کو یہاں نہیں دہرا سکتا۔ لیکن پوربیوں کا وہ گیت میرے ذہن پر ترنم ہوتا ہوتا ابھرا اسی انداز میں بیٹھا ہوا ہے جیسے غلام عباس کے وہ ہونٹ جن سے اس نے گیت کے ایک ایک بول کو کھینچ کھینچ کر سنایا تھا۔۔۔ غلام عباس کے ہونٹوں سے بڑھ کر اس کی شگفتہ پیشانی ہے جس پر ہمہ وقت ایک ذہانت کھل رہتی ہے اور ملاقاتی آنکھیں اٹھاتے ہی صحبت کا مزا لینے لگتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کو آپ کے ساتھ بات کرنے کی فرصت نہیں ہے، یا فرض کیجیے کہ انسانی جذبے کے تحت وہ عدیم الفرصتی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو وہ آپ سے لاکھ لاکھ معافیاں مانگیں گے، تفصیل کے ساتھ وجوہات بتا دیں گے اور اس مسئلے کی اہمیت سمجھا دیں گے جو اس وقت درپیش ہے۔ مگر جب وہ اپنے مضمون کی طرف دھیان لگا کے کسی لکھی ہوئی سطر کو بنا آواز نکالے اپنے ہی ہونٹوں سے پڑھنے لگیں گے اور آپ رخصت ہونے کو کھڑے ہو جائیں گے تو وہ فوراً کاغذ کو ایک طرف سرکا کے آپ کو کندھوں سے پکڑ کر بٹھا دیں گے۔ موٹے موٹے ہاتھوں سے اپنی بڑی بڑی جیبیں ٹٹول کر سگریٹ کا ایک ڈبہ نکالیں

گے۔ ایک سگریٹ آپ کو پیش کر کے ایک اپنے ہونٹوں میں پھنسا کر، کرسی پر ٹیک لگا کے، ٹانگیں لمبی کر کے، ایک اچھے اونچے درجے کے ماہرِ فن کے انداز میں بیٹھیں گے۔ پہلے آپ کے کسی کارنامے کی تعریف کریں گے۔ آپ کو دور دراز صوبوں، ملکوں کی پرانی کہانیاں اور لطیفے سنائیں گے۔ اور شاید پوربیوں کا وہ گیت بھی سنا ڈالیں گے۔ پھر نہ ان کو اپنی مصروفیت کا خیال رہے گا نہ آپ کی ملاقات کے ابتدائی غرض کا۔

غلام عباس فوراً ہی بے تکلف نہیں ہو جاتے۔ گفتگو بڑھتی جاتی ہے، تکلف گھٹتا جاتا ہے۔ بات جو کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے اور غلام عباس جو صرف مسکرا رہے تھے ہنسنے لگتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ کھلکھلا کر کبھی نہیں ہنستے۔ زیادہ ہنسی آنے کی صورت میں بھی [illegible] لیکن وہ سر کو جھکا کے آواز کو دانتوں کے پیچھے روک روک کر ہی ہنستے رہیں گے جیسے ان کو یہ ڈر ہو کہ منہ کے زاویے بہت بگڑ جائیں گے۔ غلام عباس کو میں نے کسی غصے میں چلاتے نہیں سنا۔ کچھ بھی ہو گیا ہو، کنپٹیاں تک لال ہوتی ہوں غلام عباس آپ کی طرف ایسے دیکھیں گے جیسے انہیں غصہ نہیں تعجب ہو رہا ہے۔

ملاقات کتنی ہی لمبی ہو جائے آپ کبھی اکتائیں گے نہیں۔ بیچ بیچ میں پوچھتے رہو آپ کی بات بھی سنتے رہیں گے اور آپ پھر دل و جان سے ان کی ساری باتیں سن لیں گے۔ یوں بھی ان کی باتیں دلچسپ ہوتی ہیں۔ واقعات ایسے بیان کرتے جاتے ہیں جیسے اپنا ہی افسانہ سنا رہے ہوں۔

کئی بار وہ گھر ہی سے یہ تہیہ کر کے آتے ہیں کہ ان کے کلام سے ان کی بزرگی اور وقار ظاہر ہو۔ لیکن آپ اپنے دل میں ان کے لئے عزت سے زیادہ پیار کا جذبہ لے کر آئیں گے۔ کیونکہ ان کے چہرے کی بھاری، چوڑی اور موٹی بناوٹ کے پیچھے ان کے ٹوٹے ہوئے دانت کی جھریوں میں سے ان کی سادگی، معصومیت اور پیارا پیارا مسکراتا ہوا بچپن جھانک ہی لیتا ہے۔

میلہ ٹھیلہ ہو یا تہوار کا دن، عید کی بھیڑ بھاڑ ہو یا محرم کا جلوس، غلام عباس گھر سے باہر نہیں جائیں گے۔ مزاج میں سنجیدگی اور کم آمیزی اس حد تک ہے کہ کسی دوست کے گھر بھی کسی بہت ضروری وجہ کے بغیر نہیں جاتے۔ لیکن کسی ادب نواز افسر کے گھر اگر کھانے کے ساتھ ساتھ ایک بے تکلف مشاعرے کا پروگرام ہے تو غلام عباس اپنے ذمے نامہ بر کا کام بھی لے لیں گے۔ دن بھر ٹیلیفون کرتے رہیں گے اور جو لوگ ٹیلیفون پر نہیں ملیں گے انہیں گھر جا جا کے بلا آئیں گے۔

انہیں کھلانے کا بے حد شوق ہے۔ ان کے گھر روز ایک مخصوص لذت کا گوشت پکتا ہے جس میں کوئی نہ کوئی سبزی ضرور ہوتی ہے۔ چاہے سبزی کوئی بھی ہو، سالن کا مزا ہر روز ایک جیسا ہوتا ہے۔ اس

کے رنگ میں بھی فرق نہیں پڑتا۔ روز گھر سے بندھی ہوئی ایک مقدار دفتر آتی ہے۔ اگر ان کے پاس دو تین آدمی بھی بیٹھے ہوں تو غلام عباس یوں تو انھیں نہیں پوچھیں گے بلکہ سالن کی اسی مقدار کو ٹفن کیریر کے الگ الگ حصوں اور ڈھکنوں میں بانٹ کر سب کے آگے رکھ دیں گے۔ اگر کوئی ان کے گھر دعوت میں پہنچ جائے تو وہ اسے جی بھر کے کھلائیں گے۔ اتنا کہ عمر بھر یاد رہے۔ گوشت لذیذ ہوگا، اپنے دیسی رنگ ڈھنگ کا۔ اور غلام عباس اسے ایک انگریزی نام دے کر زیادہ دلچسپ بنائیں گے اور کھانے والا جتنی تعریف کرتا جائے گا اتنا اور گوشت اس کے سامنے آتا جائے گا۔

مذاق مذاق میں عباس صاحب نے ایک دن اپنے گھر ایک سالم بکرا کٹوایا اور چھ "بیٹھے پہلوانوں" کو سیر ہونے کی دعوت دی۔ پکا ہوا لذیذ گوشت تل تل کے برتنوں میں آتا گیا اور جس نے جس مقدار کا برتن مانگا اس کے سامنے وہی رکھ دیا گیا۔ ان میں ایک حکیم صاحب بھی تھے جنھوں نے دو سیر کھایا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کو چھ دن تک ہیضہ تمام بدہضمی لاحق رہی اور وہ بال بال بچے۔ غلام عباس نے دراصل ایک اور دوست کا دعویٰ غلط ثابت کرنے کے لئے اتنا گوشت پکوایا تھا۔ لیکن اس شخص نے پورے ڈھائی سیر کھا کر ہڈیوں تک کا صفایا کر کے رکھ دیا اور حکیم صاحب ہار گئے۔ اس دعوت میں ڈیڑھ سیر سے کم کسی نے نہیں کھایا تھا۔ لیکن غلام عباس نے حسب عادت وہی تین نرم نرم بوٹیاں لیں۔ ان کے پسندیدہ کھانوں کی فہرست بہت مختصر ہے۔ وہ چھوٹے بکرے کی اگلی ٹانگوں کا گوشت کھاتے ہیں، دوسری کسی قسم کا گوشت نہیں کھاتے۔ مرغا ہو یا مرغابی، مچھلی ہو یا شکار، کسی اور جانور کا گوشت وہ کبھی نہیں کھائیں گے۔ کھانے کے معاملے میں وہ حد درجے کے حساس واقع ہوئے ہیں اور کھانے کی ایک قائم شدہ عادت کی حدود سے باہر نہیں آ سکتے۔

انھیں ایک ادبی مجلس چاہئے اور ہو سکے تو ہلکی دھن میں ایک آدھ مشاعرہ بھی ہو جائے، ایسے شعروں کا جنھیں شاعر چھپوا سکیں۔ اور اگر اس قسم کی مجلس کوئی بڑا آدمی یا بڑا ادیب اپنے گھر بلا رہا ہے تو اس وقت بھی غلام عباس سب کو بلاتے اور اطلاع کرتے پھریں گے۔

سنجیدہ ادبی مجلسوں میں جانے سے پہلے غلام عباس یہ ضرور معلوم کریں گے کہ مجلس میں اور کون کون شریک ہوگا۔ خیر یہ بات تو انھیں کوئی امتیازی خصوصیت نہیں دیتی۔ ہر بڑا ادیب اس کا دھیان رکھتا ہے۔ لیکن جب بھی وہ کسی سوسائٹی یا مجلس میں دلچسپی لیں گے تو اس کی خاطر ہر تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار رہیں گے۔ حلقہ ارباب ذوق دہلی کی دلچسپ مجلسوں کے لئے جب کوئی جائے نشست نہ رہی تو غلام عباس نے اپنا گھر پیش کیا۔ کئی مہینوں تک انھی کے گھر حلقے کی مجلسیں ہوتی

رہیں۔ ان کے اشتیاق اور دلچسپی کی حد دیکھئے کہ ایک دن کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر صرف ایک ہی صاحب مجلس میں شریک ہونے کو آئے جنھیں اس دن اپنا افسانہ پڑھنا تھا۔ غلام عباس نے اس دن بھی نشست منعقد کی۔ بڑے عجیب و غریب طریقے پر خود مجلس کی صدارت سنبھالی، صاحب افسانہ کو پڑھنے کا حکم دیا اور سامعین کی جگہ اپنے کتے کو بٹھا دیا۔

غلام عباس کے بارے میں کئی لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ وہ مغرب پسند ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں انگریزیت کو اپنانا چاہتے ہیں۔ ایسا سمجھنے والے دراصل ان کی ٹائی کو دیکھتے ہیں، سطح کے نیچے گہرائی میں دیسی غلام عباس کو نہیں پہچانتے۔ مثال کے طور پر آپ ان کے ساتھ انگریزی میں بات کر کے دیکھئے۔ انگریزی میں صرف ان کے ہونٹ ہلتے رہیں گے لیکن الفاظ جب بھی نکلیں گے خالص اردو کے ہوں گے۔ آپ انگریزی بولتے جائیے "بالکل بالکل بالکل" کرتے ہوئے آپ کے جملوں کا ساتھ دیں گے یا زیادہ سے زیادہ "yes, yes" ، بالکل بالکل کہتے جائیں گے۔

ان کے پاس ہزاروں کتابیں ہیں جنھیں انھوں نے بڑی کاوش سے جمع کیا ہے۔ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کے پرانے خریدار ہیں۔ مشہور مصنفوں کی بڑی بڑی کتابیں نہ جانے کہاں کہاں سے نکال لاتے ہیں۔ سب کی سب کتابیں الماریوں میں قرینے سے رکھی رہتی ہیں۔ بیشتر کتابیں انگریزی کی ہیں لیکن ان ہی کے دوش بدوش اپنی دیسی کتابیں بھی کم تعداد میں نہیں۔ ان میں آخر انگریزی کتابیں ایسی ہیں جنھیں غلام عباس نے پڑھا ہی نہیں یا پڑھا ہے تو زیادہ سے زیادہ اس عبارت کو جو کتاب کے گرد پوش کے اندر مڑے ہوئے حصے پر ہوتی ہے۔ اسی حد تک وہ انگریزیت پسند ہیں۔ وہ بہت کم پڑھتے ہیں اور اگر کبھی پڑھیں گے بھی تو انگریزی افسانے، کیونکہ انگریزی میں دنیا بھر کے افسانے پڑھنے کو ملتے ہیں۔

میں غلام عباس کے لکھنے کے بارے میں یہاں کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ غلام عباس ایک ایک سطر کو لکھ لکھ کر پانچ پانچ چھ چھ بار بغیر آواز نکالے اپنے سوئے سوئے زمزمہ ہونٹوں سے ایسے پڑھتے ہیں جیسے کوئی عامل بھوت اتارنے کے لئے منتر پڑھ رہا ہو۔ آپ کو ان کے گھر میں ایک آدھ انگریزی ساز بھی رکھا ہوا ملے گا۔ لیکن پوچھئے تو ان کو اس پر آدھی دھن بھی بجانی نہیں آتی ویسے وہ اس فن میں ملک کے ایک بڑے استاد کے شاگرد ہیں اور اس بات پر بڑا فخر کرتے ہیں۔

غلام عباس کبھی کبھی اونچی ٹانگوں والی انگریزی لیگ ہارن (Leghorn) مرغیاں پالتے ہیں اس لئے کہ ان مرغیوں پر بھی کبھی انعام ملتا رہتا ہے۔

غلام عباس سے ملے ہوئے مجھے اب سات سال ہو گئے ہیں۔ اس اثناء میں وہ ولایت بھی رہ آئے ہیں اور سنا ہے وہاں انہوں نے ایک اور شادی بھی کر لی ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ بہت بدل گئے ہوں لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔ میں اب بھی اسی غلام عباس کو دیکھتا ہوں کہ گھر آئے، اپنا انگریزی قسم کا لمبا کوٹ اتار پھینکا، ہاتھ سے پائپ کو ایک طرف گرا دیا، تہمد باندھا، رضائی کھولی، اوڑھی اور سردی کا لطف لینے لگے اور وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے دیسی انداز سے توے کے بڑے بڑے پھلکے، ان کے بڑے بڑے نوالے جلد جلد کھائے اور سو گئے۔

* *

غلام عباس کے افسانے

محمد حسن عسکری

غلام عباس نے اتنے ہی اچھے افسانے لکھے ہیں جتنے اردو کے کسی اور افسانہ نگار نے۔ اگر ان کے اچھے افسانوں کا مقابلہ اردو کے دوسرے اچھے افسانوں سے کیا جائے تو غلام عباس کے افسانے کسی طرح بھی پیچھے نہیں رہیں گے۔ مگر پھر بھی انہیں وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ عام طور پر افسانے کے متعلق جو تنقیدی مضامین لکھے جاتے ہیں ان میں عباس کا ذکر بھولے بھٹکے ہی ہوتا ہے۔ مضمون نگار ذرا باخبر یا ستھرے ذوق کا ہوا تو اس نے ان کے متعلق کچھ لکھ دیا ورنہ غائب۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی درست ہے کہ انفرادی طور سے ان کے دو تین افسانے مقبول بھی ہوئے اور مشہور بھی ہوئے۔ بلکہ 'آنندی' کا شمار تو اردو کے مشہور ترین افسانوں میں ہے۔ اگر آپ ادب سے سنجیدہ دلچسپی رکھنے والے کسی آدمی سے پوچھیں کہ تمہیں کون کون سے افسانے اب تک پسند آئے ہیں تو وہ 'آنندی' کا نام ضرور لے گا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ غلام عباس مجموعی طور سے مقبول نہیں ہیں مگر ان کے بعض افسانے بہت مقبول ہیں۔ اگر ہم اس تضاد کی وجہ معلوم کر لیں تو ہم غلام عباس کے فن کی خصوصیات کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔

اردو میں جو افسانہ نگار بحیثیت مجموعی مقبول ہوئے ہیں، انہیں کسی نہ کسی چیز کا سودا ضرور ہے۔

یہ لفظ میں کسی برے معنی میں استعمال نہیں کر رہا ہوں کہ میرا مطلب یہ ہے کہ انہیں ایک خاص قسم کا موضوع پسند ہے۔ انہوں نے عکاسی کے لئے ایک خاص علاقہ یا ایک خاص طبقہ چھانٹ لیا ہے۔ کوئی منفرد یا چبھتا ہوا اسلوب بیان ایجاد کیا ہے یا ان کے ایک افسانے کا مجموعی تاثر یا فضا دوسرے افسانے کی فضا سے مماثل ہوتی ہے۔ غرض کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے جس سے آدمی پہلی نظر میں پہچان سکتا ہے کہ افسانہ کس کا ہے۔ کرشن چندر، منٹو، عصمت، بیدی، ممتاز مفتی، اشک سب کے یہاں ایسی امتیازی صفات موجود ہیں۔ اس کے برخلاف غلام عباس کو کسی چیز کا سودا نہیں ہے۔ نہ تو کسی خاص موضوع کا، نہ کسی خاص اسلوب کا، نہ کسی خاص جذباتی فضا کا۔ اسی چیز سے انہیں نقصان بھی پہنچا ہے اور فائدہ بھی۔ یہی ان کی کمزوری ہے اور یہی ان کی قوت۔

بات یہ ہے کہ جب دوسرے لوگوں نے لکھنا شروع کیا تو جو سیاسی، معاشی، سماجی اور نفسیاتی پیچیدگیاں پردے ہی پردے میں نشوونما پا رہی تھیں، اب واضح ہو چکی تھیں۔ اب ہر حساس نوجوان کے لئے بغاوت یا کم سے کم بیزاری لازمی ہو گئی تھی۔ اس کی نفرت اور اس کی محبت کے مرکز متعین تھے۔ اب وہ اپنا کام صرف لکھنا نہیں سمجھتا تھا بلکہ چند چیزوں کے خلاف اور دوسری چند چیزوں کے حق میں لکھنا خیال کرتا تھا۔ ہر لکھنے والے نے اس وسیع دائرے کے اندر اپنی نفرت اور محبت کے لئے چند چیزیں چن لی تھیں۔ بہت حد تک اسی انتخاب نے اسے ایک خاص ذریعۂ اظہار بھی دے دیا تھا اور اس تعلق نے اس کے افسانوں میں ایک اہم آہنگی، وحدت اور انفرادیت پیدا کر دی تھی۔ ۳۶ء کے قریب والے دور میں ایسا ہونا ناگزیر تھا۔

مگر غلام عباس نے اس سے آٹھ دس سال پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ اس وقت متوسط طبقے کا نوجوان اپنے ماحول سے بڑی حد تک مطمئن تھا خصوصاً مسلمان نوجوان۔ چنانچہ اس زمانے کا ادب مسائل سے عموماً خالی ہوتا تھا۔ پریم چند کو چھوڑ کر اگر کوئی چھوٹا موٹا مسئلہ کہیں نظر آتا ہے تو عظیم بیگ چغتائی کے یہاں۔ ورنہ افسانہ نگار کی دلچسپیوں کو تو اس دنیا سے ماورا سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ غلام عباس نے بھی ابتدا 'الحمرا' کے افسانوں اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں سے کی۔ تو اگر ان کے یہاں ایسی نمایاں اندرونی وحدت نہیں ملتی جو فوراً ہماری توجہ کو جذب کر لے یا ہم پر چھا جائے تو اس کی ذمہ داری ان کی نشوونما کے زمانے پر ہے۔ تعریف کی بات تو یہ ہے کہ ان کا ذہنی ارتقا ان کے اکثر پیش روؤں اور ہم عصروں کی طرح، وہیں کا وہیں نہیں رک گیا بلکہ وہ بڑھ کر اگلی نسل والوں سے آملے۔ ان کے اندر پرانی اقدار سے ہٹ کر چلنے کے وہ سب انداز ہیں جو دوسرے نئے افسانہ نگاروں میں ملتے ہیں۔

البتہ وہ بے تابی، وہ بے صبری، وہ جھنجھلاہٹ، وہ شدت نہیں ہے جو نوعمر باغیوں میں ہوتی ہے، اور نہ وہ بھولا پن ہے جو ایک دفعہ تو مخالف پر بھی غالب آجاتا ہے۔ دوسرے لکھنے والوں کا افسانہ تو ایک دھواں دھار حملہ کرتا ہے، جس کے ریلے میں مخالف مورچہ اٹھتا چلا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف غلام عباس کے انداز میں مصالحت کا رنگ ہوتا ہے جیسے انہیں اپنے اوپر پورا اعتماد ہو یا مخالف کی نیک نیتی پر بھروسہ ہو کہ وہ تھوڑی سی رد و کد کے بعد مان ہی جائے گا۔

ایک خاص زمانے میں نشوونما پانے سے غلام عباس پر یہ اثرات مرتب ہوئے ہیں، چاہے انہیں کھونا کہئے یا پانا۔ البتہ ایک چیز ایسی ہے جسے کھرے منافع کے سوا اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ ۳۶ء میں تو لوگ اپنی بات کہنے کے لئے ایسے تڑپ رہے تھے کہ ان میں اتنا صبر تھا ہی نہیں جو پہلے بات کہنے کا طریقہ سیکھتے۔ اب تو چند باتیں ایسی تھیں جو لکھنے والوں کو اپنا ذریعۂ اظہار بنا کر دنیا کے سامنے آنا چاہتی تھیں اور ان کے سامنے ادیب اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کرتا تھا۔ مگر ۲۹ء کے قریب کوئی چیز ظاہر ہونے کے لئے ایسی بے قرار نہیں تھی۔ کوئی آدمی اس وجہ سے ادیب بنتا تھا کہ وہ ادیب بننا چاہتا تھا۔ ادیب بننے کے لئے آدمی خاص قسم کے، ورائی موضوع استعمال میں لاتا تھا اور خاص قسم کے ادبی الفاظ، فقرے ازبر کرتے۔ جو لوگ ذرا سمجھدار تھے وہ پامال موضوعات سے بچنے کے لئے ذرا سی کاوش اور بیان کے ذریعوں اور اسالیب کا استعمال سیکھنے کے لئے تھوڑی سی محنت بھی گوارا کر لیتے تھے۔ اس رسم کے ماتحت غلام عباس نے بھی اپنی زبان اور بیان کو سنوارنے کی شعوری کوشش کی اور کسب سے یہ چیزیں حاصل کیں۔ چنانچہ ان کی زبان نئے افسانہ نگاروں کو دیکھتے ہوئے غیر معمولی طور پر صاف ستھری، سادہ اور رواں ہے۔ آلائشوں اور الجھیڑوں سے پاک۔ جن مطالب کو وہ بیان کرنا چاہتے ہیں ان کے اظہار پر قادر، اپنی صلاحیتوں سے واقف، اپنی حدوں کے اندر بالکل مطمئن اور ان سے متجاوز ہونے کے خیال سے گریزاں۔ یہ تو بیان مجموعی اعتبار سے نئے افسانہ نگاروں میں کمیاب ہیں۔ عصمت چغتائی کی نثر کا تو خیر کہنا ہی کیا، وہ تو جتنا کہنا چاہتی ہیں اس سے کہیں زیادہ کہہ جاتی ہیں مگر غلام عباس کا یہ وصف ہے کہ وہ جو کہنا چاہتے ہیں اسے کہہ ضرور دیتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ کہیں کوئی کسر رہ جائے اور پڑھنے والا تشنگی محسوس کرے۔ وہ اپنی بساط سے بڑھ کر بات کہنے کی کوشش بھی نہیں کرتے جسے ان کی زبان یا اسلوب سنبھال نہ سکے۔ اگر انہیں کسی پیچیدگی یا باریکی کا بیان منظور ہوتا ہے تو وہ پہلے ٹھہر کے اسے سمجھ لیتے ہیں اور پھر جس حد تک وہ ان کی گرفت میں آتی ہے اسی حد تک کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے انداز میں بڑا توازن، اعتدال اور قرار پیدا ہو گیا ہے جو بے تکلفی

جمود ہرگز نہیں ہے۔ غلام عباس کی قوتِ بیان کا بہترین مظہر ان کا افسانہ 'آنندی' ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زبان و بیان ہی نے اسے افسانہ بنایا ہے ورنہ ایک چٹکلہ تھا۔ مگر مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اظہار کے معاملے میں ان کی احتیاط اب حد سے بڑھنے لگی ہے۔ سنبھال سنبھال کے قدم اٹھانا بڑی ضروری چیز ہے بلکہ نئے ادب کے ماحول میں تو قابلِ ستائش ہے۔ مگر اتنا سنبھلنا بھی اچھا نہیں کہ قدم ہی رکنے لگے۔ اس کشاکش میں پڑھنے والے کا ذہن کھٹکے کھانے شروع کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے آدمی افسانے کی فضا میں جذب ہوتے ہوتے پھر الگ ہو جاتا ہے۔ یہ چیز افسانے کی اثر انگیزی میں ذرا سی مانع ہوتی ہیں۔

میں نے کہا تھا کہ غلام عباس کو کسی چیز کا سودا نہیں ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے یہ افسانے پختہ عمر کو پہنچ کے لکھے ہیں۔ جب ہیجان اور ہنگامہ آرائی کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور زندگی میں ان کی ایک جگہ معین ہو چکی تھی اس لئے ان کے افسانوں میں بڑی متانت اور ضبط آ گیا ہے...... صرف انداز بیان ہی نہیں بلکہ مشاہدے میں، تفصیلات کے انتخاب میں، افسانے کی تراش خراش میں۔ اگر ہم مجموعی حیثیت سے ان کے افسانوں کی فضا کا تعین کرنا چاہیں تو اسے ایک معتدل فضا کہنے کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں؟ مگر اس دھیمے پن کے پیچھے وہ تمام چیزیں چھپی ہوئی ہیں جو دوسرے نئے افسانہ نگاروں کے یہاں دھڑا دھڑ ابل آتی ہیں۔ جو باتیں اوروں کے یہاں بلا خیز بن کے آتیں وہ یہاں بڑی نرمی اور ملائمت کے ساتھ آتی ہیں۔ 'آنندی'، 'سمجھوتا'، 'حمام میں' ان سب افسانوں کی یہی کیفیت ہے۔ غرض کہ اعتدال پسندی اور توازن غلام عباس کے افسانوں کے بیان اور خیال دونوں پر حاوی ہے اور یہی ان کے رنگ کو سب سے الگ کرتی ہے۔

غلام عباس کے متعلق مجموعی طور سے کوئی بات کہنا چاہیں تو سب سے پہلے نظر ان کی فنی خصوصیات کی طرف جاتی ہے۔ غالباً نئے افسانہ نگاروں میں یہ امتیاز انھیں کو حاصل ہے۔ موضوع، خیال یا جذبے کی وحدت ان کے یہاں جلدی سے نہیں ملتی۔ مگر پھر بھی ان کے افسانوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کریں تو ایک نتیجہ ضرور مرتب ہوتا ہے۔ غلام عباس کی دلچسپی اور تحقیق و تجسس کا مرکز یہ احساس ہے کہ انسان کے دماغ میں دھوکہ کھانے کی بڑی صلاحیت ہے، بلکہ فریب خوردگی کے بغیر اس کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ اور وہ ہر قیمت پر کسی نہ کسی طرح کا ذہنی فریب برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے مجموعے میں دس افسانے ہیں جن میں سے پانچ کا موضوع وضاحتاً یہی ہے۔ اور یہی پانچ افسانے غلام عباس کے بہترین افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں کردار یا تو کسی نئے فریب

میں مبتلا ہوتے ہیں یا کسی فریب کا پردہ چاک ہوتا ہے۔ 'جواری' کا ہیرو اپنے ذہنی فریب کے نشے میں ایسا مست ہے کہ وہ ذلیل ہونے کے بعد بھی نہیں چونکتا بلکہ اپنے آپ کو خوش رکھنے اور دوسروں کو بھی اسی نشے کے دو ایک گھونٹ پلانے کی جان توڑ کوشش کرتا رہتا ہے۔ 'کتبہ' میں باپ کے خوابوں کی عمارت تو ڈھے جاتی ہے مگر بیٹا باپ کی قبر پر کتبہ نصب کر کے اپنے لئے اہمیت کا ایک نیا فریب ایجاد کرتا ہے۔ 'حمام میں' کے کرداروں کے سارے ذہنی فریب خاک میں مل جاتے ہیں اور وہ صاف صاف اس کا اعلان کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر پھر بھی ان فریبوں کے بغیر انہیں اپنی زندگی ہی ناممکن نظر آنے لگتی ہے۔ چنانچہ وہ اس شکست و ریخت کے احساس ہی کو اپنے شعور سے مٹانے کی فکر شروع کر دیتے ہیں۔ انہیں زندگی کی چند تلخ حقیقتوں کو راستہ دینا پڑتا ہے اور وہ اپنے مطالبات میں ترمیم گوارا کر لیتے ہیں تاکہ زندہ رہ سکیں۔ 'سمجھوتا' کے ہیرو نے اخلاقیات کی دیوار کے پیچھے جھانک کے دیکھ لیا ہے مگر وہ ذرا اسی قسم کا آدمی ہے۔ دل شکستہ نہیں ہوتا اپنے نئے علم سے فائدہ اٹھاتا ہے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی عقلیت پسندی بھی ایک فریب نہیں ہے؟ وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اخلاقی اقدار سے سمجھوتا کیا ہے۔ مگر یہ سمجھوتا دراصل اس نے اپنے آپ سے کیا ہے اور ایک نئی قید کو آزادی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ 'آنندی' میں ایک فرد کیا پوری جماعت نے اپنے آپ کو جان بوجھ کر دھوکے میں مبتلا کیا ہے۔ شہر آنندی کی تعمیر اور اس کی آبادی اور رونق میں روز بروز اضافہ انسانی حماقت کے قصر کی تعمیر ہے۔ 'آنندی' میں جو نئی اینٹ دوسری اینٹ پر رکھی جاتی ہے وہ اس قصر کو بلند تر اور مستحکم تر بناتی ہے۔ 'آنندی' کیا بن رہا ہے ایک نیا فریب بن رہا ہے۔ اسی وجہ سے شہر کی تعمیر ایک خاص طرح کی معنویت اختیار کر لیتی ہے اور اس کے طول طویل بیان ہی میں ساری افسانویت ہے۔ یوں دیکھنے میں تو شہر بننے کی کہانی بڑے مزے لے لے کر بیان کی گئی ہے مگر دراصل یہ نظارہ ہی ایک دبا دبا زہر خند ہے، جیسے انسانی حماقت کے نئے سے نئے ثبوت مہیا کرنے میں مصنف کو لطف آ رہا ہو۔

یہ ہے غلام عباس کے افسانوں کا مرکزی اور بنیادی جذبہ...... انسان کی فریب خوردگی اور حماقت۔ یہ احساس بڑے اندوہ و الم یا شدید کلبیت کا موجب بن سکتا ہے مگر غلام عباس کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ یہاں بھی ان کے مزاج کی اعتدال پسندی آڑے آئی۔ وہ اس فریب خوردگی اور حماقت پر نہ تو رنج کا اظہار کرتے ہیں نہ غم و غصے کا نہ طبیبانہ طمانیت کا۔ انھیں انسان کی اس بنیادی کیفیت پر کچھ تاسف بھی ہوتا ہے، کچھ ہنسی بھی آتی ہے، کچھ حیرت بھی ہوتی ہے۔ مگر فی الجملہ وہ کشمکش و پیچ میں پڑ جاتے ہیں کہ آخری فیصلہ کیا کریں۔ چنانچہ وہ کوئی آخری فیصلہ نہیں کرتے۔ بلکہ ایک طرح ہم کہہ سکتے

ہیں۔ان کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ جب انسانی زندگی مسلسل فریب ہے ہی تو پھر فریبوں کو قبول کرنے کے سوا اور کیا چارۂ کار ہے۔ 'تمام' میں سے تو صاف نتیجہ یہی مرتب ہوتا ہے کہ انسان کو زندہ رہنا ہے تو فریبوں سے چھٹکارہ ممکن نہیں۔ چنانچہ غلام عباس کے افسانوں کا آخری تاثر تسلیم و رضا کا ہے۔ان کے افسانوں کی یہی کیفیت اور بھی نمایاں ہو جائے گی اگر ہم ان کا مقابلہ منٹو کے افسانے 'نیا قانون' سے کریں۔ منٹو نے بھی انسان کی ذہنی فریب خوردگی کا نقشہ دکھایا ہے۔ منٹو کا افسانہ پڑھ کر یا تو انسان کی ذہنی بے چارگی پر جھنجھلاہٹ ہوتی ہے یا شکست کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ غلام عباس کا افسانہ پڑھ کر آدمی زندگی کی شرائط سے سمجھوتہ کرنے کو راضی ہو جاتا ہے۔

بہر حال اس سے پتہ چلتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے غلام عباس کے افسانے ایک مرکزی وحدت سے ایسے خالی نہیں ہیں جیسے پڑھنے والوں کو معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ یہ وحدت ذرا دیر میں ہاتھ آتی ہے۔ جہاں غلام عباس کا ایک منفرد لب و لہجہ، ایک منفرد انداز بیان اور ایک منفرد وضعی احساس ہے۔ وہاں ان کے احساسات کی بھی ایک علیحدہ وسعت ہے۔ صرف فنی اعتبار سے نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے بھی وہ ایک انفرادیت اور ایک مستقل شخصیت رکھتے ہیں جس کی نئے افسانوی ادب میں ایک ممتاز جگہ ہے۔

اب چونکہ ان کی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ اس لئے ان پر مجموعی حیثیت سے غور و فکر کیا جا سکتا ہے اور نئے ادب میں ان کی جگہ پورے انصاف کے ساتھ مقرر کی جا سکتی ہے۔ اور ان کی جگہ یقیناً کسی اور افسانہ نگار سے گھٹ کے نہیں ہوگی۔

* *

غلام عباس

ن ۔ م ۔ راشد

چند برس ہوئے ایک کہانی شائع ہوئی 'آنندی' جس نے عباس کے لئے یکا یک اردو کے بڑے افسانہ نگاروں میں جگہ پیدا کر دی۔ اس افسانے نے پڑھنے والوں کے دل میں کئی سوال از سر نو اجاگر کر دیئے۔ کیا خیر و شر کا کوئی مجرد وجود ہے یا یہ دونوں محض اضافی اقدار ہیں؟ کیا شر کا نتیجہ ہمیشہ شر ہی ہوتا ہے یا شر کرنے والے اکثر بزرگ اپنی تمام نیک نیتی کے باوجود بے سوچے سمجھے شر کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں؟ کیا ہماری تمام تہذیبی ترقی کا تانا بانا وہ عورت تو نہیں جو حقیر مزد کے بدلے ہماری ناگفتہ بہ خواہشات کی تسکین بہم پہنچاتی ہے؟

اس کہانی میں غلام عباس نے اس عورت کے گرد اگرد جس طرح ایک شہر، ایک پورے شہر کی تعمیر منزل بہ منزل دکھائی تھی۔ وہ ایک طرف تو پوری تہذیبی ترقی کی تمثیل تھی۔ دوسری طرف اخلاق کے ان نیک دل اور نیک نیت نگہبانوں پر ایک خندۂ تضحیک تھا، جو ہر تجربے کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ گناہ کو اگر شہر بدر یا انسان بدر کر دیا جائے تو ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جاتا ہے، اور پھر کبھی سر نہیں اٹھاتا۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ قانون کے ایک ہی تازیانے سے ہر بدی کو ہمیشہ کی نیند سلایا جا سکتا ہے۔

یوں تو کسبیوں اور ان کی زندگی پر ہزاروں افسانے اور مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ جن میں کسی

قحبہ کے وجود کو انسانی تہذیب کے دامن کا داغ بتایا گیا ہے، کہیں اس کے وجود کا جواز پیش کیا گیا ہے، اور کہیں اس کو قابلِ رحم اور مجبور ہستی جان کر در گذر کر دیا گیا ہے لیکن عباس کی یہ کہانی کسی ایسے نقطۂ نظر کی حامل نہ تھی۔ اس کی کئی کہانیوں میں قحبہ یا اغوا شدہ عورتیں یا مرد کے سامنے بے بس عورتیں آئی ہیں، لیکن کہیں بھی اس کا مقصد ان کی زندگی کا مطالعہ کرنا یا اس پر کسی اخلاقی یا فلسفیانہ نقطۂ نظر سے خیال آرائی کرنا نہیں۔ بلکہ وہ ان کو محض بہانہ بنا کر مرد، ازلی طور پر خوش فہم مرد کی ہستی کے تضاد اور اس کی ذہنی ثنویت کا خاک اڑاتا ہے۔

یہ اس کی کئی کہانیوں کا پسندیدہ موضوع ہے کہ انسان اکثر ایسے عقائد اور خیالات سے وابستہ رہتا ہے جن کا جواز اسے خود بھی بیشتر نظر نہیں آتا۔ ان عقائد اور خیالات کے باوجود اور ان ظاہری اعمال کے باوجود جو ان عقائد کی بنا پر انسان سے سرزد ہوتے ہیں، انسان کے دل میں طرح طرح کی خفیہ آرزوئیں لرزتی رہتی ہیں جو معاشرت اور اردگرد کے دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے بندھنوں کی وجہ سے کھل کر ظاہر نہیں ہوتیں، محض چھپ چھپ کر دیکھتی رہتی ہیں۔ اور اس سے کبھی دانستہ اور کبھی بے ارادہ وہ کام کراتی ہیں جو اس کے ظاہری عقائد سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔

غلام عباس ہمارے بہت سے جانے بوجھے افسانہ نگاروں سے بے حد مختلف ہے۔ اس کا فن نرم رو اور سبک سیر ہے۔ وہ منٹو کی طرح زندگی کے بخیے نہیں ادھیڑتا، وہ عسکری کی طرح کم عمری میں بالغ ہو جانے والے بچے کی طرح چھپے روزنوں میں سے زندگی کو نیم برہنہ نہیں دیکھتا۔ وہ عزیز احمد کی طرح ناکام مصلح بن کر کسی فاسد ذات کی تسکین بھی نہیں کرتا۔

غلام عباس محض چھوٹے آدمی کا داستان گو ہے۔ اسے کبھی وہ شہر کے کسی دور افتادہ محلے میں جا ڈھونڈتا ہے اور کبھی کسی گاؤں سے جا نکالتا ہے۔ سب سے پہلے اس کے گرد و پیش کی تصویر کھینچتا ہے کیونکہ اس کے لئے یہ تصور کرنا بھی ممکن نہیں کہ کوئی انسان ماحول سے الگ تھلگ اپنے اندر ہی زندگی بسر کر رہا ہو۔ اس کا کوئی کردار اپنے آپ میں سرمست نہیں، بلکہ اپنے ماحول کا لازمی جزو ہے، پھر ہمیں اس کے ظاہری حلیے لباس اور حرکات و سکنات سے پوری تفصیل کے ساتھ آگاہ کرتا ہے، تاکہ اس کی معاشرتی حیثیت ہمارے ذہن نشین ہو جائے۔ اس کے بعد کہانی میں اس کے عمل اور گفتگو سے اس کے تمام خدوخال کی ایسی واضح تصویر ہمارے سامنے آنے لگتی ہے کہ اس کا ایک ایک پہلو ہم پر روشن اور اجاگر ہو جاتا ہے۔ غلام عباس نے اپنی کہانیوں میں شہروں کے گمنام محلوں اور ان کے مکانوں کی نہایت دلآویز تصویریں پیش کی ہیں، جو اس کے کرداروں کے لئے پس پردے کا کام دیتی ہیں۔

پھر اس کے اکثر کرداروں کے وجود میں ایک عجیب و غریب ثنویت پائی جاتی ہے۔ ان کا ایک چہرہ اکثر دکھاوے کے لئے ہوتا ہے جس کی حیثیت گویا خطیب کی چرب زبانی کی ہے، جس سے وہ لوگوں کے دل موہنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرا چہرہ ان کے دل کا آئینہ ہوتا ہے دل کی ان کہی ہوئی خواہشات کا آئینہ جو ہر بندھن سے آزاد رہنا چاہتی ہیں۔ عباس کے کرداروں کی یہی ثنویت کبھی اخلاق کی پابندی، اور اخلاق کی آزادی کی کشمکش بن جاتی ہے، اور کبھی جدید و قدیم کے ٹکراؤ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، تاہم اس کے کردار دھوکا نہیں کرتے۔ دیانت داری سے "گناہ" کے مرتکب ہوتے ہیں اور محض اپنی ازلی انسانی مجبوریوں کی وجہ سے ان کی بظاہر بے حیائی میں بھی اکثر ان کی زندگی بدستور قائم رہتی ہے، جیسے 'سرخ جلوس' کے یاتری میں یا 'آنندی' والے غریق میں۔

اس ثنویت کی بنا پر ہمیں غلام عباس کی اکثر کہانیوں میں ایسے دو دو کردار نظر آتے ہیں، جو بڑی حد تک ایک دوسرے کے متوازی چلتے ہیں اس حد تک متوازی بھی نہیں کہ کبھی ایک دوسرے کا راستہ نہ کاٹیں لیکن دونوں کرداروں ساتھ ساتھ آویزاں ہوتے ہیں، جیسے ترازو کے دو پلڑوں میں رکھ دیئے گئے ہوں۔ مثلاً 'بردہ فروش' کے دو بڈھے، 'اس کی بیوی' میں گنگی اور نسرین، 'سایہ' کے شمشاد اور مختار، اور 'بھنور' کی بہار اور گل، 'غازی مرد' میں چراغ بی بی اور رحمتے یا چراغ بی بی اور گلزار۔ 'کرتی بابو کی ڈائری' میں تو کئی لڑکیاں ایک ہی تار سے لٹک رہی ہیں۔ یہاں ثنویت کلیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ 'ایک درد مند دل' میں یہ ثنویت دو مشاغل، یعنی علم و فن کی کشمکش کی صورت میں اور دو تماشے میں ایک ہی آدمی کے دوگانہ رویے میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس 'تنکے کا سہارا' میں حاجی صاحب اور امام نور الہدیٰ گویا ایک ہی آرزو کے دو پرتو ہیں۔ غلام عباس اپنے کرداروں پر اپنی اس دوہری نگاہ سے ایک طرح دوہری ظفر پیدا کرتا ہے، ان دونوں کو تھوڑی دور دوش بدوش چلاتا ہے، پھر الگ کر لیتا ہے پھر وہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی شخصیت اصلی شخصیت کا کھوکھلا پن، اس کی ظاہرداری اور اس کے نیچے جھوٹ کی آہستہ آہستہ پردہ دری کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے اکثر کردار دل میں وہ باتیں چھپائے پھرتے ہیں، جنہیں وہ اپنے آپ پر بھی ظاہر کرنے کی جرأت نہیں رکھتے اور اپنی اس کشمکش کے باوجود اخلاقی اعمال یا ان کی خواہش ان کے ضمیر کی گہرائیوں میں خنک گراں بن کر پڑی رہتی ہے۔

غلام عباس پر امن، پر آہنگ گھریلو زندگی کا فنکار ہے، جس میں محض وقفہ وقفہ سے طلاطم بھی اٹھتے لگتے ہیں جو اس آہنگ کو برہم کر دیتے ہیں۔ خوب صورت رستے بستے گھر موت سے آشنا ہوتے ہیں۔

ہوا ہے پیارے بچے ناگہاں زندگی کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے عباس ان بدنصیب عورتوں کے لئے بھی پرامن زندگی کا خواہاں رہتا ہے جو اخلاقی یا معاشرتی نقطۂ نظر سے راندی گئی ہیں، وہ نہیں چاہتا کہ کوئی ایسا شخص جو خود نفسیاتی بربریت کا شکار ہو ان کی زندگی میں کوئی ناقابل برداشت ہیجان پیدا کر کے چلا جائے، وہ نہیں چاہتا کہ ان کی زندگی جو معاشرت اور عالم انسانی کے روز مرہ کے بندھنوں سے آزاد ہو چکی ہے، پھر ان میں جکڑ دی جائے وہ اس نیکی اور اس احسان کا بھی حامی نہیں جو انسانی فریضے کی صورت میں نازل ہو اور دوسرے انسانوں کو مجبور اور مظلوم بنا کر چھوڑ دے، وہ اس کا مخالف ہے، کہ کسی انسان کی طبعی صلاحیتوں پر وہ بار ڈالا جائے جو خود ایک عظیم گناہ بن کر رہ جائے۔

یوں تو غلام عباس کے بھی کردار زندگی کے تمام دکھوں کے ساتھ ہر قدم پر مصالحت کرنے کے عادی ہیں، اور زندگی کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہتے ہی کو اپنے لئے راہ نجات جانتے ہیں لیکن اس کے افسانوں کی قریب قریب سبھی عورتیں خاص طور پر مرد کی 'خدمت گزار' (تیج ارتی بی بی) مرد کی خواہشات کے سامنے بے بس (بیوہ سیدانی) اس کے اصلی یا خیالی دکھ درد کی داستان سن کر گداز ہو جانے والی (نسرین) یا مرد کو ہر حالت میں خدا کی دین سمجھنے والی (بہار) نظر آتی ہے۔ تاہم عباس ان افسانہ نگاروں میں نہیں، جو مرد کو ہمیشہ عورت کے حق میں رہزن ثابت کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ اس کے مردانہ کرداروں میں کچھ ایسے بھی ہوں تو رکھتے ہوں، بظاہر اکثر عورت کے محافظ بھی ہیں۔ یوں نہیں کہ ان کی حیوانی خواہشات سرے سے دب گئی ہوں، جیسی چاہے کبھی مذہب، اور کبھی معاشرت کی آڑ لے کر وہ بے بس مجبور عورت کے نگہبان اور خیر اندیش ضرور بن جاتے ہیں، اور اس کو ہر قسم کی اذیت سے بچانے کے لئے ہر طرح کے جائز ناجائز اعمال کو روا رکھتے ہیں، وہ عورتیں خود ہر حالت میں مرد کے ساتھ نباہ کی قائل ہیں۔ اور اس سے الگ ہونا انہیں اکثر گوارا نہیں ہوتا۔ گناہ اس کے کسی کردار کا پیچھا نہیں کرتا۔ وہ سب کے سب جائز و ناجائز کو زندگی کی تفریح اور لذت کا جزو سمجھتے ہیں۔ جیسے اس کے بغیر زندگی کے کھوکھلے اور بے مزہ ہو جانے کا ڈر ہو۔ اس کے کرداروں میں کہیں ایسے نوجوان ہیں جن کی آرزوئیں دل کی دل میں رہ جاتی ہیں، کہیں وہ جو ایک آئینے میں دو صورتیں دیکھ کر دل بہلا لیتے ہیں، جو روتے ہیں، تو ایک عورت کے کندھے پر سر رکھ کر، اور پرستش کرتے ہیں، تو دوسری عورت کی، جن میں ایک غائب ہے اور دوسری حاضر ہے، اور دونوں ایک دوسری میں مخلوط ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کہیں وہ ادھیڑ عمر کے مرد ہیں، جو کسی مجبور عورت پر رحم کھا کر اس سے عقد کر لیتے ہیں، کہیں وہ جو

دوسروں پر احسان کرنے کی کوشش میں دن رات ایک کر دیتے ہیں، اور پھر اس احسان کو جتلا دینا بھی انہیں گوارا نہیں ہوتا۔ وہ عمر رسیدہ لوگ ہیں، جو زندگی کی دوڑ میں نئی پود سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اور اس کا غصہ ایک ایسے غریب پر نکالتے ہیں، جسے وہ اپنے خیال میں فضول جدیدیت کی تمثیل سمجھتے ہیں، پھر وہ غریب لوگ ہیں، جو روایتی انداز میں امیروں کی خدمت گزاری کو اپنی پوری زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں۔ ایسے تعلیم یافتہ لوگ جو ان پڑھوں کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کے کرتا دھرتا بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگ جنہیں بعض دفعہ چھوٹے چھوٹے لالچ دوست داری کے اصولوں سے بھی منحرف کر دیتے ہیں۔

مجھے بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ غلام عباس کے افسانوں کے ہیرو اس کے افسانوں کے لئے اتنے اہم نہیں جتنے وہ ضمنی کردار جن سے اس کے افسانوں کے اندر زندگی کا پورا میلہ صورت پکڑتا ہے۔ اس میلے میں طرح طرح کے لوگ آتے جاتے ہیں۔ سرکاری افسر، کلرک، فن کار، کالجوں کے طلباء اور طالبات، اخباروں کے نمائندے، نرسیں، اینگلو انڈین لڑکیاں، مزدور پیشہ لوگ، بیمہ ایجنٹ، خوانچہ فروش، عشق میں شعر کہنے والے، گولیاں کھلانے والے، پرانے نوکر اور مامائیں، نمازی پرہیزگار، کسان وغیرہ وغیرہ۔ غلام عباس کی دنیا اس بے پناہ خلقت سے بھری پڑی ہے۔ انہیں میں سے وہ اپنے بڑے کرداروں کو نکالتا ہے اور انہیں کے اندر انہیں پھر سے ڈال دیتا ہے۔ انہیں کی مدد سے وہ انسانی دنیا کی چھوٹی بڑی کوتاہیوں پر پڑتا ہے۔ انہیں کے اعمال سے غلام عباس اپنا بنیادی تصور ہم پر واضح کرنا چاہتا ہے کہ انسان کی دنیا میں کوئی چیز اور کوئی قدر مستقل نہیں۔ انسان ہمیشہ سے دوسرے انسان کی حیلہ سازیوں کے سامنے بے بس چلا آ رہا ہے اور ان حیلہ سازیوں سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ یہی ہے، کہ انسان شر کو بھی خیر کے پہلو بہ پہلو چلنے دے، تاکہ دونوں کے آہنگ سے دنیا زیادہ خوب صورت اور زیادہ رنگین ہوتی چلی جائے۔

'جاڑے کی چاندنی' غلام عباس کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ جیسے پہلے مجموعہ 'آنندی' میں کئی افسانے 'آنندی'، 'جواری'، 'حمام میں'، 'کتبہ' اردو ادب میں لازوال مقام رکھتے ہیں۔ اسی طرح اس مجموعے کی کہانیاں 'سایہ'، 'بردہ فروش'، 'اس کی بیوی'، 'غازی مرد'، 'باہے والا' یقیناً زندہ جاوید رہیں گی کیونکہ اردو ادب کے اس دور میں جب اکثر ادیب محض جوش و خروش کے سہارے زندہ ہیں، خواہ وہ سیاسی عقائد کی حمایت، یا مخالفت میں، یا جنسی نظریات کے اظہار کی صورت میں نمودار ہو، غلام عباس ہی غالباً وہ واحد افسانہ نگار ہے، جس کا فن انسانی زندگی کے رنگا رنگ مسائل کا احاطہ کرتا ہے، جتنے زندگی

سے گہری محبت ہے، اتنی گہری محبت کہ وہ اس کے بخیے ادھیڑتا ہے، بناتا ہے، ننگا کرتا ہے، نہ اپنی انا سے اسے مرعوب کرتا ہے بلکہ زندگی کو اپنا محرم راز جانتا ہے۔ اس سے سرگوشیاں کرتا ہے، اور اس کی سرگوشیاں سنتا ہے۔

**

غلام عباس کا افسانوی ادب

فضیل جعفری

شاعروں کی طرح افسانہ نگاروں میں بھی ایک عام کمزوری یہ پائی جاتی ہے کہ جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی ہے وہ اپنے آپ کو دہرانے کے عمل میں گرفتار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بسا اوقات موضوعات کے ساتھ ساتھ پیش کش کے انداز میں بھی یکسانیت در آتی ہے۔ اردو کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں منٹو اور کرشن چندر اس سلسلے میں سامنے کی مثالیں ہیں۔ کسی حد تک قرۃ العین حیدر پر بھی یہ مفروضہ صادق آتا ہے۔ لیکن آخر یہی لوگ کیوں۔۔۔؟ موپاساں اور مام جیسے اساتذۂ فن بھی اس کمزوری سے اپنا دامن نہیں بچا سکے۔ چنانچہ میرے نزدیک یہ کمزوری بڑے اور اہم افسانہ نگاروں کی مجموعی قد و قامت پر چھینٹے اڑانے میں تو کامیاب ہو سکتی ہے لیکن ان کے قد کو گھٹانے کی قدرت نہیں رکھتی۔ البتہ وہ افسانہ نگار جو اس کمزوری سے اپنا دامن بچا لے جانے کی سکت اور ہمت کے مالک ہوتے ہیں وہ یقیناً زیادہ فائدے میں رہتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ایسا وہی لوگ کر پاتے ہیں جو اچھا لکھنے کے ساتھ ساتھ نسبتاً کم لکھتے ہیں۔ کم لکھنے کے اپنے الگ نقصانات ہیں۔ اس حقیقت سے قطع نظر اردو افسانے کے مجموعی پس منظر میں راجندر سنگھ بیدی اور غلام عباس کے نام خصوصی طور سے لئے جا سکتے ہیں۔

ان دونوں نے اپنے مشہور ہم عصروں کے مقابلے میں نسبتاً کم لکھا اور وقتی طور پر ہی لیکن بہر حال خسارے میں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے تک بیدی کا نام کرشن اور منٹو کے بعد ہی نہیں عصمت چغتائی تک کے بعد لیا جاتا تھا۔ اور یہ کام ہما شما نہیں آل احمد سرور جیسے مشاہیر کرتے تھے۔ جہاں تک بیدی کا معاملہ ہے گذشتہ چند برسوں میں ان کی افسانوی حیثیت انقلابی تبدیلیوں سے دوچار ہوئی ہے۔ اس عرصے میں ان کے افسانوی فن کو پرکھنے اور سمجھنے کی نہ صرف سنجیدہ کوششیں کی گئی ہیں۔ بلکہ نقادوں کا ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو گیا ہے جو انہیں منٹو، کرشن اور عصمت پر ترجیح دیتا ہے۔

اس کے برعکس غلام عباس پر نظر ڈالئے تو پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ ممتاز شیریں سے لے کر وارث علوی تک فکشن کے سبھی اہم نقاد ان کا نام بیدی، منٹو اور کرشن وغیرہ کے ساتھ لیتے رہے ہیں لیکن نہ تو ان کے بارے میں کسی نے تفصیل سے لکھا اور نہ انہیں وہ عوامی مقبولیت حاصل ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے اور ہیں۔ اس تعلق سے محمد حسن عسکری کا خیال ہے کہ چونکہ غلام عباس اوسطاً سال بھر میں صرف ایک افسانہ لکھتے تھے اس لئے وہ اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح مقبول نہ ہو سکے۔

میری رائے میں عوامی سطح پر اس عدم مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ۱۹۳۶ء کے بعد کا افسانوی ادب دو مرکزی دھاروں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ اپنی اپنی انفرادی خصوصیات کے باوجود اس وقت کے سبھی اور قابل ذکر افسانہ نگار یا تو سماجی حقیقت نگاری کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے یا پھر ان کے ہاتھ میں جنسی حقیقت نگاری کا جھنڈا ہوتا تھا۔ چنانچہ روایتی طور پر اگر بیدی، کرشن، قاسمی اور اشک وغیرہ کے نام پہلے گروہ سے وابستہ ہو گئے تو دوسری طرف منٹو، حسن عسکری، عصمت چغتائی اور عزیز احمد وغیرہ کو دوسرے گروہ کا نمائندہ سمجھا جانے لگا۔ ویسے اس مفروضے کو قطعاً کسی منطقی کلیے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر اگر منٹو کے بعض افسانے سماجی حقیقت نگاری کے میدان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں تو دوسری طرف بیدی نے اپنے کئی افسانوں میں نفسیاتی اور جنسی حقیقت نگاری کو ایک نئی افسانوی معنویت بخش دی ہے۔

غلام عباس ساری زندگی اپنے انفرادی جوہر پر زور دینے کے قائل رہے۔ انہوں نے ابتدا سے ہی اور بطور اصول اپنے آپ کو کسی ادبی گروہ یا تحریک سے منسلک نہیں کیا۔ جہاں تک سماجی اور معاشرتی اقدار کا سوال ہے وہ ان کے افسانوں میں بھی بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔ اسی طرح نہ صرف یہ کہ انہوں نے جنسی مسائل کو اپنے لئے کبھی شجر ممنوعہ نہیں سمجھا بلکہ یہ بھی کہ انہوں نے ان مسائل

کو اپنے کئی افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ وہ ان مسائل کے پیش کش میں منٹو کی طرح جذباتیت کی لہر میں بہہ جانے کے بجائے محتاط اور متوازن رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء کے بعد والے دور میں "سیاست" اور "صحت مند معاشرہ" ادب کی کلیدی اصطلاحیں ہوا کرتی تھیں۔ اس تعلق سے بحث کرتے ہوئے غلام عباس نے یوں لکھا ہے کہ:

> ہر ادب صحت مند معاشرہ چاہتا ہے۔ وہ ادب نہیں جو معاشرے پر تنقید نہ کرے لیکن تحریک بنا کر اس کے پیچھے پڑ جانا اصولی بات نہیں۔ ترقی پسندی ادب سے زیادہ سیاسی تحریک تھی۔

اب یہ الگ بات ہے کہ غلام عباس خود اپنے وضع کردہ اصول پر سختی کے ساتھ عمل نہیں کر پائے۔ انہوں نے تحفظ نظریہ پاکستان اور مسلم لیگی سیاست کے زیر اثر "چک" اور "اوتار" جیسے جو افسانے رقم کئے انہیں سستے اور محدود سیاسی پروپگنڈے کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ طے ہے کہ ان افسانوں کی سطحیت غلام عباس کے افسانوی ادب کی مجموعی سطح کو مجروح نہیں کرتی۔

اپنے افسانوی رویے کی تشریح کرتے ہوئے غلام عباس ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں:

> میں لوگوں کے لئے نہیں لکھتا اور نہ ہی بیرونی نظریات اور سیاست میرے پیش نظر ہوتی ہے۔ مجھے کبھی پروا نہیں ہوتی کہ میری کہانی مقبولیت حاصل کرتی ہے یا نہیں۔ میں صرف اپنے لئے لکھتا ہوں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک ماہر موسیقار اسٹیج پر بھی ستار بجا کر ذاتی تسکین حاصل کرتا ہے۔۔۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے سن کر دوسرے بھی تسکین حاصل کر لیتے ہیں یا کر سکتے ہیں۔

غلام عباس نے یہ بات ۱۹۸۱ء میں کہی لیکن سچ پوچھئے تو فن کے تعلق سے ابتدا ہی ان کا یہی رویہ تھا۔ اگر اس رویے کو ایک پرانے کلیشے کی مدد سے بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ فنکار کا بنیادی مکتب خود اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسی بات کو ہم قدرے مختلف انداز میں کہنا چاہیں تو پھر کہیں گے کہ ہر حقیقی فنکار کے پاس زندگی اور اس کے مختلف مظاہرات کے بارے میں کچھ نظریات ہوتے ہیں۔ وہ اپنے نظریوں کا احترام بھی کرتا ہے اور حسب ضرورت ان کا فنی اظہار بھی کرتا ہے۔ لیکن نظریات کی تشہیر اس کا فنی مقصد نہیں ہوتا کیونکہ اس طرح اس کے فن کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔

فنکار کا اپنی ذات کے ساتھ کمٹنٹ ہونے کا مطلب بے کراں وسعتوں سے ہم کنار ہوتا ہے۔ فنکار کی ذات چونکہ مجمع البحرین بھی ہوتی ہے اور مجمع الضدین بھی اس لئے اپنی ذات سے کمیٹڈ فنکار کے سامنے خیالات، موضوعات، لفظیات اور اسالیب کا پورا شہر آباد ہوتا ہے اس کی نگاہیں کبھی کسی کھڑکی پر جم جاتی ہیں تو کبھی وہ دروازے کے پیچھے آباد دنیا کے اسرار و رموز کو دریافت کرتا ہے۔ کبھی اسے کسی عمارت کی بوسیدگی پسند آتی ہے تو کبھی وہ عمارت کے مکینوں کے دلوں میں جھانک کر ان اچھے برے شریفانہ اور غیر شریفانہ جذبات کو دیکھ لیتا ہے جو عام آدمیوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔

اب جہاں تک مقصدیت کا سوال ہے وہ ہر فن پارے میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتی ہے۔ غلام عباس نے بھی فن کی مقصدیت سے کبھی انکار نہیں کیا بلکہ ان کا تو ایقان تھا کہ مقصد کے بغیر کوئی کہانی لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ ہاں وہ جدید ادیبوں اور شاعروں کی طرح ہی ادب کی مقصدیت اور ادب کے ذریعے سیاسی پروپیگنڈے میں فرق کرنے کے قائل تھے۔ اسی لئے وہ کرشن چندر کو پسند بھی کرتے تھے اور ان کی خالص پروپیگنڈے والی کہانیوں کو ناپسند بھی کرتے تھے۔ انہیں اس بات کا افسوس تھا کہ کرشن چندر کی بعض بے حد اہم کہانیاں مثلاً ''کالو بھنگی''، ''بت جاگتے ہیں'' اور ''مہا لکشمی کا پل'' اچھے مجموعی فنکارانہ فریم ورک کے باوجود سیاسی پروپیگنڈے کا شکار ہو کر رہ گئیں۔

غلام عباس کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۲۲ء میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر بہ مشکل ۱۲،۱۳ سال تھی۔ افسانوی ادب کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں اس دور میں حکیم احمد شجاع کے رسالے ''ہزار داستان'' کو خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل تھی۔ عباس نے سب سے پہلے اسی رسالے کے لئے ٹالسٹائی کے مشہور افسانے ''جلا وطن'' کا ترجمہ کیا تھا۔ بقول خود ان کا پہلا طبع زاد افسانہ ''[illegible]'' ماہنامہ کارواں کے سالنامے میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ مجھے ان کے کسی مجموعے میں نظر نہیں آیا۔ بحیثیت افسانہ نگار، غلام عباس کو جس افسانے سے غیر معمولی شہرت ملی وہ ہے ''آنندی''۔ انتظار حسین نے ''آنندی'' کو سماجی حقیقت نگاری کا نقطۂ عروج قرار دیا ہے۔ بقول انتظار صاحب یہ افسانہ اس وقت لکھا گیا ''جب اردو میں حقیقت نگاری کا شور تو بہت تھا لیکن رومانی افسانہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ لیکن غلام عباس تو رومانی افسانے کو بہت پہلے ہی بائے بائے کر چکے تھے۔''

ن۔م۔ راشد کا خیال ہے کہ ''آنندی'' کی اشاعت کے ساتھ ہی غلام عباس کا شمار بڑے افسانہ نگاروں میں ہونے لگا تھا۔ راشد کے نزدیک اس عظمت کا حقیقی سبب یہ ہے کہ:

غلام عباس منٹو کی طرح زندگی کے بخیے نہیں ادھیڑتا، وہ عسکری کی طرح کم

عمری میں بالغ ہو جانے والے بچے کی طرح پیچیدہ روزنوں میں سے زندگی کو نیم برہنہ نہیں دیکھتا، وہ عزیز احمد کی طرح ناکام معلم بن کر کسی فاسد ادا کی تسکین نہیں کرتا۔۔۔''

(دیباچہ۔ جاڑے کی چاندنی)

میں سردست راشد کے مندرجہ بالا دیباچے کی تفصیلی بحث کے موقف میں نہیں ہوں۔ محض یہ لکھ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ غلام عباس کو ن۔ راشد کی طرف سے عطا کی جانے والی خلعتِ فاخرہ سے کوئی فائدہ پہنچا اور نہ قارئین نے ان کی اس رائے کا کوئی نوٹس لیا۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے مجھے راشد کی تمام تر عظمت کے باوجود فکشن ہی نہیں خود شاعری کے بارے میں ان کی تنقیدی بصیرت خاصی مشکوک نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے مضامین میں یہاں وہاں فراق، یگانہ اور کئی دوسرے شاعروں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے انہیں پڑھ کر یہ شک یقین میں بدل جاتا ہے۔

افسانے کے بارے میں راشد کی تنقیدی بصیرت تقریباً صفر تھی۔ چنانچہ ''جاڑے کی چاندنی'' کے دیباچے میں انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ان کا اصل مقصد غلام عباس کی تعریف و توصیف سے زیادہ منٹو، عسکری اور عزیز احمد سے (غالباً) اپنی کسی ذاتی رنجش کا انتقام لینا تھا۔ یہاں برمحل تذکرہ یہ بھی کر دوں کہ عسکری صاحب غلام عباس کے دو تین سب سے زیادہ پسندیدہ افسانہ نگاروں میں سے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مختصر افسانے کے استاذ الاساتذہ چیخوف سے (اردو کی حد تک) یا تو وہ خود متاثر ہوئے ہیں یا پھر عسکری صاحب۔ اس بارے میں انتظار حسین کا کہنا ہے کہ چیخوف تک تو غلام عباس اور عسکری ساتھ ساتھ چلے لیکن آگے چل کر دونوں کے راستے الگ الگ ہو گئے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ غلام عباس نے تو ایک وفادار شاگرد کی طرح چیخوف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا لیکن عسکری صاحب راستے سے بھٹک کر مارسل پروست اور [illegible] جوائس کی طرف نکل گئے۔

سچ تو یہ ہے کہ عسکری صاحب کے یہاں چیخوف کا اثر ہی نہیں اس کی تقلید کا بھی رجحان دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ غلام عباس وسیع تر تخلیقی سطح پر چیخوف سے متاثر ضرور ہوئے لیکن انہوں نے شعوری طور سے اس عظیم افسانہ نگار کی تقلید نہیں کی۔ دراصل انہوں نے کسی کی بھی تقلید نہیں کی۔ اور اسی حقیقت میں ان کی انفرادیت کا راز مضمر ہے۔

سلیم احمد نے اپنے مضمون ''غلام عباس کے افسانے'' (مطبوعہ ''دائرے'' کراچی

جولائی۔اگست ۱۹۹۱ء) میں جہاں غلام عباس کے افسانوی ادب سے متعلق ہر طرح کی دوسری اوٹ پٹانگ باتیں لکھی ہیں وہاں یہ زبردست انکشاف بھی فرمایا ہے کہ پطرس، تاثیر، محمد حسن عسکری وغیرہ غلام عباس کے دوست ہی نہیں "ادبی مشیر" بھی تھے۔ یہ لوگ غلام عباس کو مختلف موضوعات دیا کرتے تھے جن کی بنیاد پر عباس صاحب افسانوی شہکار تخلیق کر دیتے تھے لیکن انہیں یہ معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ ان کے اکثر افسانے کسی حد تک "مغربی تخلیق سے ماخوذ ہوتے تھے۔" شمیم احمد کا یہ الزام نہ صرف بچکانہ بلکہ بدنیتی پر مبنی ہے۔ غلام عباس کا پہلا افسانوی مجموعہ "آنندی" ۱۹۴۷ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس میں کل ۱۰ افسانے ہیں۔ دوسرے مجموعے "جاڑے کی چاندنی" (طبع اول ۱۹۶۰ء) میں ۱۳ افسانے ہیں۔ تیسرا مجموعہ "کن رس" پہلی بار ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں صرف ۹ افسانے ہیں۔ بعد ازیں انہوں نے چند اور افسانے مثلاً "بندروالا" "دوتی" اور "رینگنے والے" لکھے۔ ایک عام اندازے کے مطابق غلام عباس کے افسانوں کی مجموعی تعداد ۳۰۔۳۵ سے زیادہ نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو اس فہرست میں "گوندنی والا تکیہ" اور "دھنک" کو بھی شامل کر لیں۔

مطلب یہ کہ غلام عباس پر اتنا سنگین الزام لگانے سے قبل شمیم احمد کا فرض تھا کہ وہ اپنے مفروضے کے ثبوت میں قابل قبول شواہد فراہم کرتے۔ عباس کے افسانوں کی مختصر تعداد کے مدنظر یہ کوئی مشکل کام بھی نہیں تھا۔ لیکن شمیم احمد نے اس پس منظر میں محض ایک افسانے "ناک کاٹنے والے" کا نام لیا ہے جو ان کے نزدیک مولیئر کے کسی ڈرامے سے ماخوذ ہے۔ اس سلسلے میں بھی موصوف کی احتیاط کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے مولیئر کے ڈرامے کا نام نہیں بتایا۔ ہمارے نزدیک شمیم احمد کی یہ الزام تراشی ایماندارانہ ادبی تنقید کے منافی ہے۔

دنیا کے بڑے بڑے لکھنے والوں سے متاثر ہونے کی بات الگ ہے۔ غلام عباس نے قدیم اردو داستانوں سے لے کر جدید مغربی افسانوی ادب تک کا بغور اور بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ وہ بھی درجنوں دوسرے اہم لکھنے والوں کے مانند موپاساں اور چیخوف کو دنیا کے عظیم ترین افسانہ نگار سمجھتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ٹالسٹائی کے افسانے Death of Ivan Ilych، جوائس کے The Dead، لارنس کے The Woman Who Road Away اور آئیون بنن کے Gentleman From Fransisco کو بھی دنیا کے عظیم افسانوں میں شمار کرتے تھے۔ اس کے باوجود غلام عباس کی کسی تخلیق پر ان عظیم تحریروں کی کوئی قابل شناخت چھاپ نظر نہیں آتی۔

غلام عباس کے جو آدھے درجن کے قریب انٹرویو میری نظر سے گذرے ہیں ان کی بنا پر

آسانی کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اردو افسانے کو یورپی اور بین الاقوامی افسانوں کے معیار کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھنے کے قائل تھے۔ اس حد تک کہ اگر وہ اپنے لئے کسی موضوع کا انتخاب کرتے اور اتفاقیہ طور سے انہیں کسی مغربی زبان میں اس موضوع پر یا پھر اس سے ملتے جلتے ہوئے موضوع پر بھی کوئی افسانہ نظر آ جاتا تو وہ اس موضوع کو فوراً ترک کر دیتے۔ اردو افسانوں کے تعلق سے بھی ان کا یہی رویہ تھا۔ انہوں نے کبھی بھی اپنے کسی ہم عصر کے کسی کامیاب افسانے کو سامنے رکھ کر کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ اس معاملے میں ان کی سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ وہ اگر خود کسی موضوع پر ایک بار افسانہ لکھ دیتے تو پھر متعلقہ موضوع خواہ کتنا ہی کشادہ کیوں نہ ہو وہ اسے دہرانا پسند نہیں کرتے تھے۔

افسانہ نگاری کے سلسلے میں غلام عباس کا ایمان تھا کہ افسانہ نگار کو وہی لکھنا چاہئے جو اس کے اپنے تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہو۔ یہاں بطور وضاحت یہ عرض کر دوں کہ افسانوی ادب کے تناظر میں مشاہدے اور ذاتی تجربے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ ہر واقعہ خود افسانہ نگار پر گذرا ہو۔ تجربات وسیلہ در وسیلہ بھی افسانہ نگار تک پہنچتے ہیں۔ کسی کا سنایا ہوا کوئی واقعہ یا اخبار میں شائع ہونے والی کوئی خبر بھی تخیل کی مدد سے افسانہ نگار یا ناول نگار کا ذاتی تجربہ بن جاتی ہے۔

مثال کے طور پر بین الاقوامی شہرت یافتہ ناول نگار جوزف کونریڈ کا دعویٰ ہے کہ اس نے اپنا جنوبی امریکی ناول Nostromo اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر لکھا ہے۔ اب اگر منطقی طور پر دیکھا جائے تو کونریڈ ساری زندگی جنوبی امریکہ نہیں گیا۔ ہاں وہ نوعمری میں میکسیکو کے بندرگاہ تک ضرور گیا تھا جہاں کسی نے اسے ایک کہانی سنائی تھی۔ کونریڈ کا کمال یہی ہے کہ اس نے اس کہانی کو بنیاد بنا کر جو ناول لکھا اسے پڑھ کر آپ جنوبی امریکہ کے بارے میں سب کچھ جان لیتے ہیں۔ اسی طرح جیلانی بانو نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ان کی کہانی "نرسیا کی باولی" کا ماخذ دراصل ایک اخباری خبر ہے جسے ان کے افسانوی تخیل نے ذاتی تجربے کی شکل عطا کر دی ہے۔ اس افسانے پر بننے والی ٹی۔ وی فلم بھی بڑی مقبول ہوئی۔

چنانچہ غلام عباس جب یہ بات بہ اصرار کہتے ہیں کہ ان کا ہر افسانہ ان کے ذاتی تجربے یا مشاہدے پر مبنی ہوتا ہے یا یہ کہ وہ اپنی کہانیوں کا مرکزی کردار خود ہوتے ہیں تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اپنے کسی افسانے کے لئے زندگی کی جس "قاش" کا بھی انتخاب کرتے ہیں اس کا تعلق محض انسانی رویوں سے زیادہ ان کی اپنی انفرادی حسیت اور افسانوی تخیل و تجربے کی ندرت سے ہوتا ہے۔ جہاں تک لفظی معنی میں ذاتی تجربے کا تعلق ہے انہوں نے اپنے ایک افسانے "اوورکوٹ" کی

بطورِ خاص نشاندہی کی ہے:

> اس کہانی کا خیال یوں سوجھا کہ دلی میں ایک بار گرمی کی رات ہم ایک موٹر میں نظام الدین اولیاء کو جانے والی سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ مقصد محض تفریح اور گپ بازی تھا۔ کار پطرس بخاری چلا رہے تھے اور کار کے دوسرے مسافروں میں تاثیر، فیض، کرنل مجید اور خاکسار شامل تھا۔ میں نے اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ یہ اوورکوٹ اور مفلر بالکل ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ میں نے صرف پھٹا ہوا بنیان اور پاجامہ پہن رکھا ہے۔ موٹر چلی جا رہی تھی اور شعر و شاعری پر دلچسپ بحث ہو رہی تھی کہ راستے میں سڑک کے بیچوں بیچ ایک ٹرک کچھ زیادہ تیز رفتاری سے سامنے آگیا۔ اگر پطرس صاحب جلدی سے موٹر ایک طرف نہ کر لیتے تو ٹکر ہو جانے میں کوئی کسر نہ رہ جاتی۔ مجھے خیال آیا کہ فرض کرو کہ اگر ٹکر ہو گئی ہوتی تو ہم سب لوگ مرے پڑے ہوتے یا زخمی۔ ہمیں اس حالت میں اسپتال پہنچایا جاتا تو دیکھنے والے یہ دیکھ کر حیران ہو جاتے کہ سب لوگ تو ٹھیک ٹھاک ہیں لیکن ایک شخص نے عجیب حلیہ بنا رکھا ہے کہ اوپر سے قیمتی کوٹ اور مفلر ہے اور اندر پھٹا ہوا بنیان اور پاجامہ ہے۔۔۔۔

غلام عباس نے اس مخصوص صورتِ حال کو افسانوی تخیل، استعاراتی بیانیہ اور حسی پیکر تراشی کی مدد سے ایک ایسی تخلیقی شکل عطا کر دی ہے جو متذکرہ بالا سیاق و سباق سے تھوڑی بہت یا یوں کہیے کہ اشاراتی مطابقت و مشابہت رکھنے کے باوجود ایک نرالی شان اور گہرے تاثر کی حامل ہے۔ یہ حقیقت اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ غلام عباس ان افسانہ نگاروں سے قطعاً الگ ہیں جو اپنے تجربات کو نہایت ہی معصومیت کے ساتھ سیدھے سادے انداز میں اگل دیتے ہیں۔ عباس انسانی صورتِ حال کو نہ صرف بدل دینے پر قادر ہیں بلکہ اسے ہم عصر معاشرتی پس منظر میں بیان کر کے قاری اور تخلیق کے درمیان وہ داخلی ربط بھی قائم کر دیتے ہیں جو افسانے کو دوامی دستاویز بنا دیتا ہے۔

"اوورکوٹ" کا بے نام اور نوجوان ہیرو بظاہر خاصا فیشن ایبل بلکہ ارسٹوکریٹ نظر آتا ہے۔ بادامی رنگ کے اوورکوٹ کے کاج میں شربتی رنگ کا ایک ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا ہے۔ کوٹ کے رنگ کی مناسبت سے سر پر فلیٹ ہیٹ ایک خاص انداز میں ٹیڑھی رکھی ہوئی ہے۔ گلے کے گرد سفید

ریشمی گلوبند لپٹا ہوا ہے۔ یہ نوجوان ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں بید کی ایک چھوٹی سی چھڑی پکڑے ہوئے شہر کے مرکزی بازار سے گزرتا ہے۔ ان تمام چیزوں کو گہری افسانوی معنویت عطا کرنے کی غرض سے غلام عباس نے ماحول کشی سے بلکہ خوبصورت اور موثر ماحول آفرینی سے کام لیا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> اس وقت شام کے اندھیرے کے ساتھ سردی اور بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی یہ شدت ناخوشگوار نہ تھی بلکہ لذت پرستی کی ترغیب دیتی تھی۔ شہر کے عیش پسند طبقے کا تو کہنا ہی کیا، وہ تو اس بہانے کچھ زیادہ ہی کھل کھیلتا ہے۔ تنہائی میں بسر کرنے والے بھی اس سے ورغلائے جا سکتے ہیں۔ وہ اپنے کونوں کھدروں سے نکل کر محفلوں، مجمعوں میں جانے کی سوچنے لگتے ہیں تاکہ جسموں کے قرب سے گرمی حاصل ہو۔ حصولِ لذت کی یہی جستجو لوگوں کو مال پر کھینچ لائی تھی۔

اوورکوٹ کا ہیرو اس طبقے کا نمائندہ ہے جسے کھل کھیلنے اور دادِ عیش دینے کے مواقع حاصل نہیں ہیں لیکن جو بہرحال زندگی کی گہما گہمی، چہل پہل، بھیڑ بھاڑ اور لذت پرستی سے لطف اندوز ہونے کا خواہاں نظر آتا ہے۔ یہ افسانہ غربت کا رزمیہ ہے اور نہ مرثیہ بلکہ یہ ایک ایسا سفر ہے جس کا انجام المناک ہے لیکن اس انجام تک پہنچتے پہنچتے قاری ایسے موڑوں سے نکلتا ہوا گزرتا ہے کہ چند لمحوں کے لئے ہی سہی لیکن زندگی کی محرومیاں اور ناکامیاں خوشدلی اور شگفتگی کا روپ دھار لیتی ہیں۔

نوجوان پہلے ایک پارک کی ایک خالی بنچ پر بیٹھتا ہے۔ جیب خالی ہونے کے باوجود گجرے فروش لڑکے سے دس کا چینج مانگتا اور پھر ٹہلتے ہوئے پیدل میں خوش ہوتا ہے اور گلی کی سگرٹ خرید کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کا اگلا پڑاؤ انگریزی موسیقی کی ایک دکان ہے جہاں سے وہ تازہ ریکارڈوں کی فہرست طلب کر کے کوٹ کی جیب میں اڑس لیتا ہے۔ دکان سے نکلنے کے بعد وہ پھر سڑک پر رواں ہو جاتا ہے۔ اسی اثنا میں اس کے قریب سے ایک نوجوان جوڑا گزرتا ہے۔ اس جوڑے میں سے ایک عجیب لیکن مانوس سی کشش اور جاذبیت محسوس ہوتی ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ تو اسے عورت کا ایسا قرب کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا ہے۔ ان کی بات چیت سے نوجوان پر یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ وہ دونوں غیر شادی شدہ "پریمی" ہیں۔ لڑکی حاملہ ہو چکی ہے۔ لڑکا اسے حمل ضائع کرنے کے لئے ورغلاتا ہے لیکن لڑکی کے اندر چھپا ہوا ماں کا جذبہ اسے ایسا کرنے کی اجازت

نہیں دیتی۔ وہ نوجوان کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیتی ہے۔

واضح رہے کہ "اوورکوٹ" آزادی سے پہلے اس خالص روایتی مشرقی معاشرے میں لکھا جانے والا افسانہ ہے جب ہمارے یہاں تو کیا مغرب میں بھی جنسی بے راہ روی کی آزادی (Permissiveness) کا وہ تصور موجود نہیں تھا جو آج نظر آتا ہے۔

نوجوان اس جوڑے کی گفتگو میں کچھ اس درجہ محو ہو جاتا ہے کہ اسے سامنے سے آتے ہوئے تیز رفتار ٹرک کا احساس تک نہیں ہوتا۔ زخمی حالت میں جب وہ اسپتال پہنچایا جاتا ہے اور آپریشن روم میں اس کے کپڑے اتارے جاتے ہیں تو نرسوں اور ڈاکٹروں کو پتہ چلتا ہے کہ "نوجوان کے گلوبند کے نیچے نکٹائی اور کالر کیا سرے سے قمیص ہی نہیں تھی۔ ایک بوسیدہ سویٹر جو وہ پہنے ہوئے تھا اس میں جگہ جگہ سے سوراخ تھے۔ اس کی جرابیں نہ صرف پھٹی ہوئی تھیں بلکہ ایک پاؤں کی جراب دوسرے پاؤں کی جراب سے مختلف تھی۔" اس کے کوٹ کی جیب سے جو چیزیں برآمد ہوئیں وہ یہ تھیں۔

> ایک چھوٹی سی کنگھی، ایک رومال، ساڑھے چھ آنے، ایک بجھا ہوا آدھا سگرٹ، ایک چھوٹی سی ڈائری جس میں لوگوں کے نام اور پتے لکھے تھے، نئے گراموفون ریکارڈوں کی ایک ماہانہ فہرست اور کچھ اشتہار جو سیر گشت کے دوران میں اشتہار بانٹنے والوں نے اس کے ہاتھ میں تھما دیے تھے۔ اور اس نے انہیں اوورکوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ افسوس کہ اس کی بید کی چھڑی جو حادثے کے دوران میں کہیں کھو گئی تھی اس فہرست میں شامل نہ تھی۔

جیسا کہ آپ نے دیکھا لباس اور موسیقی سے لگاؤ کی حد تک تو غلام عباس نے اس نوجوان کو کسی حد تک خود سے شناخت کرنے کی کوشش کی ہے۔ باقی جو کچھ بھی ہے افسانوی تخیل کی ایجاد ہے۔ لیکن پورے افسانے میں قاری کو کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہونے پاتا کہ وہ حقیقت کے بجائے افسانے سے دوچار ہے۔ غلام عباس کا انسانیت پرست تخیل انہیں متذکرہ بالا ماحول کا حصہ بنا دیتا ہے۔ افسانہ نگار کے معاشرتی مشاہدات ہمارے اپنے تجربات میں ڈھل جاتے ہیں۔ نوجوان کا انجام یقیناً المناک ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ نوجوان میں اپنے آپ کو بہلانے اور خوش رکھنے کی جو خواہش تھی وہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکی ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی قاری کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ افسانہ نگار نے محض افسانے کو ختم کرنے کے لیے مرکزی کردار کو مار ڈالا ہے۔

بطرس بخاری نے غلام عباس کے کرداروں سے بحث کرتے ہوئے ایک جگہ بڑے پتے کی بات کہی ہے۔

> ان کے کیریکٹر بڑے بے بضاعت لوگ ہوتے ہیں جنہیں راہ چلتے میں شاید آپ نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ غلام عباس کو ان کی تنگ و تاریک زندگی میں طرح طرح کی دلچسپیاں نظر آتی ہیں اور ان کی صحبت میں انہیں ایک مشفقانہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ وہ ان کی حقیر آرزوؤں کو بھی سمجھتے ہیں، ان کی مکاریوں اور فریب کاریوں کو بھی جانتے ہیں لیکن ان پر برہم نہیں ہوتے صرف مسکرا دیتے ہیں۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کرداروں کی تخلیق، ان کے ارتقا اور ان کی پیش کش کا سارا معاملہ براہ راست افسانوی تخلیق کا حصہ ہوتا ہے۔ موضوعات کے انتخاب کا تعلق بھی اسی تخلیق سے ہوتا ہے۔ کرداروں کے سلسلے میں غلام عباس نے وہ رویہ اختیار نہیں کیا جو ہمیں ان کے اہم ترین ہم عصروں یعنی منٹو، بیدی، کرشن اور عصمت وغیرہ کے یہاں نظر آتا ہے۔ منٹو وغیرہ کے بیشتر افسانوں میں ہم واضح طور سے نشاندہی کر سکتے ہیں کہ افسانہ نگار کی ہمدردیاں کس کردار کے ساتھ ہیں اور کس کے ساتھ نہیں۔ انتہائی شکلوں میں تو یہاں تک کہنے کو جی چاہتا ہے کہ بیدی، منٹو اور کرشن نے اپنے اپنے کرداروں میں اپنے جذباتی رہنما تلاش کر لیے تھے۔ اس سلسلے میں غلام عباس کا رویہ قطعاً مختلف ہے۔

ان کے کرداروں میں خواہ ان معنی میں گہرائی اور پیچیدگی نہیں ملتی کہ ہر کردار کی علامتی تشریح و تفہیم کی جا سکے۔ یا پھر ان کے کردار اس سماجی ثقافتی طمطراق کے حامل نہ ہوں جو قرۃ العین حیدر کے کرداروں کا وصف ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ غلام عباس کے بیشتر کردار اپنے تمام معمولی پن کے باوجود افسانوی تناظر میں غیر معمولی ثابت ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی بھی کردار خواہ بظاہر کتنا ہی چھوٹا اور معمولی نظر آئے ان کے مجموعی افسانوی فریم ورک کے اعتبار سے بے کار یا فالتو نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی سطح پر اس کا افسانوی ارتباط بہرحال قائم رہتا ہے۔

اردو افسانے کے قارئین کو پریم چند کے زمانے سے ہی مثالی کرداروں کی عادت پڑ گئی تھی۔ کرشن چندر اور منٹو کے یہاں بھی مثالی کردار وافر تعداد میں نظر آتے ہیں۔ غلام عباس کے کردار اگر مثالی نہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر اپنے لیے عموماً بے حد معمولی طبقوں سے تعلق رکھنے والے کرداروں کے انفرادی المیہ اور ان کے انفرادی مسائل کو منتخب کیا ہے۔ دراصل غلام عباس

اس راز کو پا گئے تھے کہ کسی ایک عہد کے مخصوص سیاسی اور سماجی مسائل آنے والے زمانوں میں نہ صرف اپنا ارتباط کھو دیتے ہیں۔ بلکہ ایک حقیقی فن کار کی حیثیت سے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ نئے زمانے کے نئے لوگ بسا اوقات عہد گذشتہ کے سیاسی و معاشرتی مسائل کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں۔

اس صورت حال کے برخلاف انسانی جبلتوں اور جذبات و احساسات کی عمومی اہمیت بہر طور برقرار رہتی ہے۔ انفرادی انسانی کرداروں کے رنگ بھی پھیکے نہیں پڑتے۔ اس حد تک کہ بسا اوقات سماجی اور اخلاقی بحران بھی انھیں تبدیل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ "سیاہ و سفید" کی ممولہ، "کن رس" کا فیاض، "بھنور" کے حاجی شفاعت احمد، "سایہ" کا سبحان، "اس کی بیوی" کا بے نام نوجوان ہیرو، "غازی مرد" کی چراغ بی بی اور "بردہ فروش" کی جمی ایسے ہی کردار ہیں جو متعلقہ افسانوں کے موضوع اور پلاٹ سے قطع نظر بھی قاری کا ساتھ نہیں چھوڑتے بلکہ برابر اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔

غلام عباس کے بیشتر افسانوں میں جو غیر معمولی داخلیت پائی جاتی ہے وہ ایسے ہی کرداروں کے توسط سے آئی ہے۔ بحیثیت افسانہ نگار وہ جس طرح ایک کردار سے دوسرے کردار تک سفر کرتے ہیں اور اس سفر میں وہ جس طرح قاری کو نہ صرف اپنے ساتھ بلکہ ایک قدم آگے رکھتے ہیں وہ چیز ان کے افسانوں کو خود بخود زیادہ موثر بنا دیتی ہے۔ ان کے افسانوں کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ کرداروں کی خارجی زندگی کا استعمال محض داخلی پہلوؤں کو ابھارنے اور اجاگر کرنے کے مقصد سے کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کے افسانوں میں موجود آخری تفصیل تک قاری پر کوئی نہ کوئی اثر ضرور مرتسم کرتی ہے۔

مثال کے طور پر آئیے ان کے ایک نسبتاً کم مشہور افسانے "بردہ فروش" پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔ بردہ فروشی کو عام طور سے دنیا کا قدیم ترین پیشہ سمجھا جاتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے بردہ فروشی ماہر نفسیات و عمرانیات کا ہی نہیں فکشن نگاروں کا بھی محبوب موضوع رہا ہے۔ اردو کے افسانہ نگاروں نے بھی اس کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ منٹو کے تو کئی فنکارانہ شاہکار بردہ فروشی کے ارد گرد ہی گھومتے ہیں۔ خود غلام عباس کے مشہور افسانہ "آنندی" کا مرکزی موضوع بھی ہے۔ لیکن آنندی میں غلام عباس کا بنیادی نقطہ نظر جنسی نہیں بلکہ معاشی اور عمرانی ہے۔

اس کے برخلاف انھوں نے "بردہ فروش" میں ایسے کرداروں کے ذریعے جو بیک وقت قابل یقین بھی ہیں اور ناقابل یقین بھی، اس موضوع کو ایک بالکل ہی نئے زاویے سے برتا ہے۔ افسانے کے آغاز کے لئے آدھی رات کے وقت کا انتخاب اس پیشے کے سرد و گرم سے علامتی مطابقت

رکھتا ہے۔ افسانے کے پہلے پیراگراف میں پنجاب کے ایک چھوٹے سے دیہاتی ریلوے اسٹیشن کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ یہاں آدھی رات کو کوئی ایکسپریس ٹرین آنے والی ہوتی ہے۔ پلیٹ فارم پر دس بارہ سے زیادہ مسافر نہیں ہیں۔ ان مسافروں میں دو ایسی عورتیں ہیں جو سب سے الگ تھلگ نظر آتی ہیں۔ ایک ادھیڑ عمر کی دیہاتن ہے اور دوسری ایک نوجوان بنی ٹھنی ہوئی الھڑ سی لڑکی۔ دونوں کی بات چیت سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کا نام جمی اور لڑکی کا ریشماں ہے۔

کہانی کی کھلتی ہوئی پرتوں کے ساتھ قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ جب ریشماں کی عمر صرف ۵ سال تھی اسی وقت اس کو کسی نے اغوا کر لیا تھا۔ اس معصوم کو آخر تک یہ پتہ نہیں چل پاتا کہ وہ کہاں کی رہنے والی تھی اور اس کے ماں باپ کون تھے۔ جیسے ہی اس نے جوانی کی سرحد پر قدم رکھا اغوا کرنے والے نے اسے جمی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ جمی عام معنی میں بردہ فروش ہی نہیں بلکہ بہت ہی چٹی ہوئی شاطر ٹھگ بھی ہے۔ وہ ہمیشہ ایسے مالدار بوڑھوں کی تلاش میں رہتی تھی جن کی پہلی بیویاں مر چکی ہوتی تھیں۔ ایسے لوگوں سے وہ ریشماں کے من مانے دام وصول کرتی تھی۔

جمی نے ٹھگی کا جو طریقہ کار اپنایا تھا وہ یہ تھا کہ ریشماں کی شادی کے بعد بھی وہ اس سے تعلق قائم رکھتی تھی۔ دھیرے دھیرے جب ریشماں اپنے شوہر کے گھر میں موجود تمام نقدی اور زیورات کے بارے میں معلوم کر لیتی تو جمی تمام دولت سمیت اسے کسی دور دراز کے مقام پر بھگا لے جاتی اور از سر نو یہی ڈرامہ دہرایا جاتا۔ جمی اور ریشماں کا موجودہ سفر اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس بار جمی نے ریشماں کو کرم دین نامی جس بوڑھے کھوسٹ کے ہاتھ فروخت کیا تھا اس کے گھر میں زیورات بھی برائے نام تھے اور وہ ریشماں کو زدوکوب بھی بہت کرتا تھا۔

اب جمی ریشماں کو زیادہ روپے کے عوض جس ۶۰ سالہ شخص کے حوالے کرنے جا رہی تھی اس کا نام چودھری گلاب دین تھا۔ چودھری صاحب کا جنسی جوش بھی اگرچہ سرد پڑ چکا تھا اور وہ نماز روزے کے بھی پابند تھے۔ دوسری طرف ریشماں کے لئے جو ایک جسم سے دوسرے جسم کا سفر کرتے کرتے تھک چکی تھی جنسی حظ و تلذذ کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے طے کر لیا کہ اب وہ اپنی باقی ماندہ زندگی گلاب دین کے گھر میں ہی گذار دے گی۔

چند ماہ بعد جب جمی لوٹ کر آئی اور ریشماں کو اطلاع دی کہ اب زیورات اور نقدی کے ساتھ وہاں سے بھاگ نکلنے کا وقت آ گیا تھا کیوں کہ اس نے ریشماں کے لئے ایک ایسا خریدار ڈھونڈ لیا تھا جو دو ہزار روپے کو تیار تھا تو اس بار ریشماں نے سختی کے ساتھ جمی کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ دونوں

سمجھتے ہیں اور پھر اسی شعور کو بنیاد بنا کر کرداروں کی بلندی یا ان کی پستی کا اندازہ لگاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی کہانیاں شعور کے ذریعے زینہ بہ زینہ آگے بڑھتی ہیں۔ ہم جس انسانی شعور کی بات کر رہے ہیں اس کے سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ غلام عباس اجتماعی شعور کو اہمیت دینے کے بجائے انوکھے، تنہا اور سوچتے ہوئے شعور کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

مسائل سے بھری ہوئی اس دنیا کو سمجھنے اور پیش کرنے کا یہ ان کا اپنا طریقہ کار ہے۔ لیکن وہ خصوصیت ہے جو انھیں تخلیقی سطح پر ہم عصر سماج کا نقاد بنا دیتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں خود ایک فریق بن کر سماج کو اپنی براہ راست تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور تب ان کا معاشرتی بیانیہ اتنا سپاٹ ہوتا ہے کہ قاری پہلی ہی نظر میں "دیار حب" یا خود کو دیکھ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے کیا انکشاف کر لیا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ وہ اپنے بیشتر افسانوں میں زوال پذیر اور زوال آمادہ معاشرے کے کسی نہ کسی پہلو کو زیر بحث لے آتے ہیں، ایک فنکارانہ حیثیت سے ان کا رویہ ہمیں الگ تھلگ (Detached) رہنے والا محسوس ہوتا ہے۔ اشیا، مظاہرات اور افراد کو بھی قدرے اور کبھی خاصے فاصلے سے مشاہدہ اور مطالعہ کرنے والی عباسی تکنیک کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی تشریح کے لئے ہمیں علامتی اور استعاراتی میدانوں کی خاک چھاننی پڑے۔

سیدھی سادی سی بات ہے کہ سماج میں رہنے بسنے والے عام شہریوں اور اسی سماج میں رہ کر تخلیقی کام کرنے والے فنکار میں کچھ نہ کچھ فرق بہر حال ہوتا ہی ہے۔ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ جس طرح کوئی بھی فن زندگی سے مکمل علیحدگی اختیار کر کے پنپ نہیں سکتا ٹھیک اسی طرح کوئی بھی تخلیقی فنکار اپنے شہری فرائض سے غافل یا ان کا منکر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس حقیقت کے ساتھ جو ایک دوسری یا اور زیادہ اہم حقیقت جڑی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تخلیقی عمل اپنی بنیادی سرشت کے اعتبار سے داخلی عمل ہوتا ہے۔ اگر کوئی فنکار زندگی کا آئینہ محض ہو کر نہیں رہ جانا چاہتا تو اسے دوران تخلیق خود کو زندگی کے عمومی رویے اور روز مرہ والے دھارے سے الگ رہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ ایسے کے بغیر آپ زندگی کو صرف معروض کے طور پر برت سکتے ہیں اور نہ ہی اسے معروضی انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔

غلام عباس تکنیک کے اس گر سے اوپندر ناتھ اشک، اختر اورینوی، ہاجرہ مسرور اور سہیل عظیم آبادی وغیرہ سے ہی زیادہ نہیں بلکہ کرشن چندر اور عصمت چغتائی سے بھی زیادہ واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تکنیک اس حد تک مکمل ہے کہ وہ اسلوب اور افسانوی ساخت و بافت کا جزو لاینفک ہونے کے ساتھ ساتھ موضوع، مواد اور بیانیہ کا بھی ناقابل تقسیم حصہ بن جاتی ہے۔ اس

کے درمیان اچھی خاصی مار پیٹ بھی ہوئی۔

یہیں سے کہانی ایک نیا رخ اختیار کرتی ہے۔ انتقام کی آگ میں جھلستی ہوئی بھی کی سمجھ میں جب کچھ نہیں آتا تو وہ واپس جا کر کرم دین کو ریشماں کے موجود پتے سے آگاہ کر دیتی ہے۔ کرم دین یہ اطلاع ملتے ہی وہاں پہنچ جاتا ہے۔ دونوں بوڑھوں میں زبردست جنگ ہوتی ہے۔ بردہ فروش بھی عقل سے کام لیتے ہوئے اچانک ثالث بن جاتی ہے اور دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے "اگر تمہیں وہ سارا روپیہ مل جائے جو تم نے اس پر خرچ کیا ہے تو کیا تم اسے مجھے دے دو گے۔"

دونوں کچھ دیر سوچتے رہے۔ اس کے بعد کرم دین نے کہا۔

"اگر میرے چار سو روپے مجھے واپس مل جائیں تو پھر چاہے وہ بھاڑ میں جائے، میری بلا سے!"

"تم چار سو کے بجائے پانچ سو لے لینا اور چودھری گلاب تم کیا کہتے ہو؟"

"اگر کرم دین کو اعتراض نہیں تو مجھے بھی اعتراض نہیں" چودھری نے دھیمے لہجے میں کہا۔

بالآخر بھی ان دونوں شریف آدمیوں کا حساب بے باق کر کے ریشماں کو لے جاتی ہے۔ افسانے کے آخر میں غلام عباس نے ریشماں کی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"ریشماں اس خنک چاندنی میں ایک خواب کے سے عالم میں چلی جا رہی تھی۔ نہ تو اس کے کان کچھ سن رہے تھے نہ آنکھیں کچھ دیکھ رہی تھیں اور نہ یہ خبر تھی کہ قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔"

یہ انداز غلام عباس کا خاص اور منفرد افسانوی اسلوب ہے۔ وہ اپنے کرداروں کو بسا اوقات ایسی صورت حال سے دوچار کر دیتے ہیں جہاں سے بھاگ نکلنا عام طور سے ممکن نہیں ہو پاتا۔ غلام عباس مسئلے کا حل پیش کرنے کے بھی قائل نہیں ہیں۔ لیکن بردہ فروش کا جو سماجی پہلو ہے اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قاری افسانے کے اختتام پر اس کے عنوان کی ذو معنویت سے متعلق سوچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کے سامنے سوالوں کا ایک سوال یہ اٹھتا ہے۔ حقیقی معنی میں بردہ فروشی کا کام بھی جیسی عورتیں کرتی ہیں یا پھر گلاب دین اور کرم دین جیسے صوم و صلوٰۃ کے پابند وہ لوگ بردہ فروش ہیں جن کے لئے ان کی منکوحہ بھی چاول اور گیہوں جیسی اجناس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ غلام عباس کے تخلیقی میڈیم کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام طور سے سطحی مشاہدات پر گہرائی میں جا کر بات کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے افسانوی شخص کو سطح پر تیرتے ہوئے نہیں دیکھا جا سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ اس وسیع پیچیدہ اور گنجلک کائنات میں انسانی شعور کو اہم ترین اور واضح ترین قدر

تکنیک کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اگر ہم ان کے افسانوں میں پائے جانے والے انفرادی انسانی رشتوں پر غور کریں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے متعدد افسانوں میں ان رشتوں کا ایسا دائرہ نما حلقہ تیار کر دیا ہے جس میں مختلف کردار ایک دوسرے سے قریب بھی نظر آتے ہیں اور دور بھی رہتے ہیں۔ اس حلقے میں شامل ہر فرد ایک دوسرے کو ٹکڑوں میں تو سمجھ لیتا ہے لیکن پوری طرح نہیں سمجھ پاتا۔ مزید یہ کہ غلام عباس کرداروں کے آپسی تعلقات کے استحکام یا ان میں وقتاً فوقتاً پیدا ہونے والی خارجی اور داخلی تبدیلیوں کے بارے میں کھل کر کچھ نہیں کہتے۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ کرداروں کی دماغی اور ذہنی کیفیات کو بیان کرنا مجموعی افسانوی تاثر کے حق میں مضر ثابت ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں ''حمام میں'' میرے نزدیک ان کا ایک بے حد کامیاب اور موثر افسانہ ہے۔ فرخندہ نامی ایک اٹھائیس سالہ عورت کے اردگرد گھومنے والا یہ افسانہ کرداروں کی تعداد نیز واقعات کی کثیر الجہتی کے اعتبار سے دراصل ایک ناولٹ کا مرتبہ رکھتا ہے۔ افسانے کے پہلے پیراگراف میں فرخندہ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے۔

''نام تو تھا اس کا فرخندہ بیگم۔ مگر سب لوگ فرخ بھائی فرخ بھائی کہا کرتے تھے۔ یہ ایک طرح کی رسم سی پڑ گئی تھی۔ ورنہ رشتہ ناتا تو کیا، کسی نے اس کے مرحوم شوہر کو دیکھا تک نہ تھا۔۔۔۔ وہ چھوٹے سے قد کی ایک چھوٹی سی عورت تھی۔ مگر اس کا چہرہ اس کے قد کے تناسب سے کافی بڑا تھا۔۔۔ اس کی عمر اٹھائیس برس کے لگ بھگ تھی۔ مگر دیکھنے میں وہ اس سے کہیں کم عمر معلوم ہوتی تھی۔ پہلی ہی نظر میں جو چیز دیکھنے والے کو اپنی جانب متوجہ کرتی۔ وہ اس کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک تھی۔ جس نے اس کے چہرے کے سادہ خدوخال کو حد درجہ جاذب نظر بنا دیا تھا۔''

یہ تعارفی جملے اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ فرخندہ ہر لحاظ سے ایک بے حد معمولی عورت ہوتے کے باوجود غیر معمولی شخصیت کی حامل ہے۔ شہر میں فرخندہ کا نہ کوئی رشتے دار تھا نہ سرپرست۔ وہ کسی بھی معیار سے کوئی ''اچھی'' یا ''بری'' عورت بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس کا گھر مختلف قسم کے لوگوں کے لئے ایک صاف ستھرے کلب یا پھر یوں کہئے کہ ذہنی پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے یہاں مستقل آنے والوں میں پچاس سالہ ڈاکٹر ہمدانی بھی تھے، ادھیڑ عمر والا بیمہ ایجنٹ بھٹناگر بھی تھا، بے حد امیر باپ کا خوش رو اور شرمیلا ۲۲ سالہ بیٹا دیپ کمار بھی تھا، نوجوان انقلابی شاعر شکیبی بھی تھا، ایک باکمال مصور اور فوٹوگرافر مسٹر سنگھا بھی تھے اور ان سب کے علاوہ فرخ کے گھر پر آنکھیں پھیرے پڑے رہنے والے ایک عدد مولانا صاحب بھی تھے۔

ڈاکٹر ہمدانی طب یونانی، ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی تینوں قسموں کے ماہر سمجھے جاتے تھے گو کہ ان کے پاس کسی بھی پیتھی کی کوئی باقاعدہ سند نہیں تھی۔ ۲۲ سالہ دیپ کمار ''اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالسلطنت میں آیا تھا۔ مگر ایم۔اے میں فیل ہونے کے بعد ایسا دل برداشتہ ہوا۔ کہ نہ تو باپ کے بے شمار خطوں اور تاروں کا کوئی جواب دیا۔ اور نہ گھر جانے کا نام ہی لیا۔'' مولانا صاحب کسی چھوٹے سے گاؤں سے فقہ اور حدیث کا درس لیتے آئے تھے۔ کچھ دن ایک مسجد میں پیش امامی بھی کی۔ پھر ایک دن انہوں نے بڑی مسجد کے مولانا صاحب کا وعظ سنا۔ خدا معلوم اس وعظ سے ان پر کیا بیتی کہ انہوں نے نہ صرف حدیث وفقہ سے بلکہ مسجد سے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناطہ توڑ لیا۔ نوجوان شاعر شکیبی کے کچھ کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ہاں افسانہ نگار قاسم نے گذر اوقات کے لئے ترام میں کنڈکٹری قبول کر لی تھی۔

کبھی کبھی وہاں ایک خان صاحب بھی آجاتے تھے جو عام طور پر نشے میں ہوتے تھے۔ وہ فرخندہ خانم سے کبھی گانا سنانے یا کبھی سینما چلنے کی فرمائش کرتے جنہیں فرخندہ تو ہنس کر ٹال جاتی لیکن ان حرکتوں پر اس کے دیگر احباب بے حد ناراض ہوتے۔

جیسا کہ آپ نے دیکھا یہ سارے لوگ کسی نہ کسی سطح پر سماج سے کٹے ہوئے ایسے آدھے ادھورے قسم کے افراد ہیں جن کے لئے فرخندہ کا گھر ذہنی اور روحانی پناہ گاہ ہے۔ یہ سب مل کر ایک دوسرے کی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس عجیب وغریب پورٹریٹ گیلری میں فرخندہ کو ہی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرخندہ آخر ہے کون؟ شریف گھرانوں کو چھوڑیے۔ اس طرح کی محفلیں تو پیشہ ور عورتوں کے یہاں بھی نہیں جما کرتیں۔ غلام عباس نے اس سوال کا جواب محسن عدیل کے حوالے سے دیا ہے جو کئی ناولوں کا مصنف ہے لیکن جس کا ایک ناول بھی منظر عام پر نہیں آسکا۔ عدیل فرخندہ کا سب سے پرانا دوست تھا ''کوئی سال بھر پہلے جب وہ اپنے شوہر کی جوانا مرگی کے بعد سسرال والوں کی سختیوں سے تنگ آکر بھاگ آئی تھی۔ تو ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر سب سے پہلے اس کی ملاقات عدیل ہی سے ہوئی تھی۔ اور عدیل ہی نے اسے اس مکار بڑھیا کے پنجے سے چھڑایا تھا۔ جو اسے کسی کھاتے پیتے گھر میں اتالی کی جگہ دلوانے کا لالچ دے کر نکال لائی تھی۔''

مطلب یہ ہوا کہ فرخندہ لاوارث اور غریب ہونے کے باوجود پڑھی لکھی اور ایک باعزت زندگی گذارنے کی خواہش مند خاتون تھی۔ اسٹیشن پر عدیل سے ملاقات فرخندہ کے لئے نعمت غیر مترقبہ

ثابت ہوئی۔ ایک ادیب ہونے کے ناتے عدیل جذبۂ انسانیت سے سرشار تھا۔ اس نے فرخندہ کو نہ صرف ایک ٹوٹا پھوٹا گھر کرائے پر دلوا دیا بلکہ اس کے لئے ایک سلائی مشین اور روزمرہ کام کاج کے لئے دس بارہ سال کے ایک چھوکرے کا بھی انتظام کر دیا۔

فرخندہ کی محفل میں شریک ہونے والے اس کی معمولی سی آمدنی میں برابر کے شریک تھے۔ تھوڑا بہت چندہ دے کر سب کے سب رات کا کھانا اسی کے یہاں کھاتے تھے۔ اوپر یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ فرخندہ جوان اور قبول صورت ہونے کے علاوہ بے سہارا بھی تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کے یہاں آنے جانے والوں میں اس کے لئے جنسی جذبات کا جوار بھاٹا نہ اٹھتا ہوگا لیکن وہ سب کے ساتھ ایسی مادرانہ اور خواہرانہ شفقت سے پیش آتی کہ کسی کو بھی کبھی اس سے اظہار محبت کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ خان صاحب مستثنیات میں سے تھے اور اسی لئے دوسرے لوگ انہیں برادری سے خارج رکھتے تھے۔

اسی دوران چھوکرا اعتقاد فرخندہ کے واحد ذریعۂ معاش یعنی سلائی مشین کے ساتھ غائب ہو گیا۔ مختلف احباب نے فرخندہ کی مدد کرنے یعنی سلائی مشین خرید دینے کا وعدہ تو کیا لیکن کسی کو بھی اپنا وعدہ پورا کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ ہاں دوستوں کے آنے جانے اور فرخندہ کے گھر رات کا کھانا کھانے کا سلسلہ حسب دستور جاری رہا۔ دھیرے دھیرے اس کے سارے چھوٹے موٹے زیور ہی نہیں گھر کے برتن تک بک گئے۔

ایک شام جب محفل جمی ہوئی تھی مولانا اچانک ایک نو وارد کے ساتھ داخل ہوئے۔ یہ نو وارد فرخندہ کے تمام دوستوں کے مقابلے میں نہ صرف جداگانہ بلکہ رئیسانہ شان کا حامل تھا۔ "بلند و بالا قد چوڑا سینہ۔ لمبے لمبے ہاتھ پاؤں۔ عمر تقریباً چالیس برس۔ گندمی رنگ آنکھیں چھوٹی چھوٹی جن میں سرمے کے ڈورے۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ ان کو مَل دیا ہوا سر سے پیر تک دیہاتی امارت اور بانکپن کا نمونہ۔۔۔"

سرخ بانات کی واسکٹ۔ سیاہ قیمتی شیروانی طلائی گھڑی، چوڑی دار پاجامہ اور مخملی ٹوپی وغیرہ اس کی امارت کی ظاہری اور واضح نشانیاں تھیں۔ مولانا نے اہل محفل سے نو وارد کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میر نوازش علی ان کے ہم وطن اور خاندانی رئیس تھے۔ کسی مقدمے کے سلسلے میں گاؤں سے شہر آئے ہوئے تھے۔ اچانک ان سے ملاقات ہو گئی اور وہ انہیں یہاں لے آئے۔

میر نوازش علی کی آمد سے پوری محفل درہم برہم ہو جاتی ہے۔ حاضرین کے دل و دماغ پر ایک

ایسا خوف سا چھا جاتا ہے۔ محسن عدیل اور ادیب کمار میر صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے طنز و استہزا سے بھی کام لیتے ہیں۔ میر صاحب جیب سے پانوں کی ڈبیا نکال کر وہاں موجود لوگوں کو پان پیش کرتے ہیں لیکن کوئی بھی میر صاحب کو شکر گزار ہونے کا موقع نہیں دیتا۔ آخر میں فرخندہ کو میر صاحب پر رحم آ جاتا ہے اور وہ

"لائیے مجھے دیجئے۔"

کہتے ہوئے "ایک خاص ادا کے ساتھ مسکراتے ہوئے" ڈبیا لے لیتی ہے۔ اچانک مولانا صاحب کھانے کی فرمائش کر دیتے ہیں۔ فرخ جھینپ سی جاتی ہے کیونکہ گھر میں کچھ کھلانے کے لئے موجود ہی نہیں۔ احباب مولانا کی اس سادہ لوحی پر ناراض ہو کر انہیں گھورنے لگتے ہیں۔ نوازش علی اس شام کی دعوت اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔ محسن عدیل اور ادیب کمار کھانے میں شریک نہیں ہوتے۔ جمال آرا، شجی وغیرہ فرخ کے کہنے سے دستر خوان پر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس موڑ تک پہنچتے پہنچتے کہانی تقریباً آدھا سفر طے کر چکی ہوتی ہے۔ لیکن اب اس سفر کی سمت اچانک بدل جاتی ہے۔ میر صاحب ایک تجربہ کار ورغلانے والے شخص Seducer کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ جہاں تک فرخندہ کا سوال ہے اس کا ماضی بھی تلخ تجربات سے عبارت ہے اور اس کے حال کو بھی خوشگوار نہیں کہا جا سکتا۔ چونکہ وہ متاہل زندگی گزار چکی ہے اس لئے اسے معلوم ہے کہ ایک بھری پری عورت ہونے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ بھری پری ہونے کے لئے گھریلو زندگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس کے یہاں آنے جانے والوں میں کوئی اہم شخص نہیں ہے۔ وہ سب کے سب کسی نہ کسی فرسٹریشن کا شکار اور سہارے کی تلاش میں ہیں۔

ہم نے یہ نتائج افسانے کے بین السطور سے اخذ کیے ہیں۔ غلام عباس نے نہ تو فرخندہ کو یہ سب سوچتے یا کہتے ہوئے دکھایا ہے اور نہ ہی دوسرے کرداروں کے درمیان اس تعلق سے کوئی بات چیت ہوتی ہے۔ افسانے میں جو ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ورغلانے والا شخص یعنی Seducer تین ملاقاتوں کے بعد منظر سے غائب ہو جاتا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ فرخندہ کے ساتھی ایک عجیب سے مخمصے میں پڑ جاتے ہیں۔ ایک طرف تو انہیں اس بات کی خوشی ہے کہ نوازش علی نامی بلا سے بہت جلد چھٹکارا مل گیا لیکن دوسری طرف وہ فرخندہ میں ہونے والی نمایاں تبدیلیوں کو بھی محسوس کر رہے تھے۔ کہاں تو بننے سنورنے سے کوسوں دور بھاگتی تھی اور کہاں اب اس کے لباس اور چہرے سے طرح طرح کے عطریات اور غازوں کی خوشبوئیں پھوٹا

کرتیں۔ اس نے گھر کے کام کاج کے لئے نوکرانی بھی رکھ لی تھی۔ گھر سے باہر قدم نہ رکھنے والی فرخندہ اب ہفتے میں دو تین دن وہ دو تین تین گھنٹے غائب رہنے لگی تھی۔ اگر کسی ایک چیز کی باقاعدگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا تو وہ تھی نماز۔ نماز کے معاملے میں اس کا جوش و خروش پہلے سے بھی بڑھ گیا تھا۔

اس دوپہر وہ گئی تو کافی تاخیر سے لوٹی۔ رات کے ۱۰ بج چکے تھے۔ اس کے سارے دوست شدتِ انتظار سے تلملا رہے تھے۔ لیکن وہ آتے ہی سیدھے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہیں سے آواز دی:

"مولانا صاحب! ذرا پانی کا گھڑا تو اٹھا کر اندر رکھ دیجئے!" یہ جملہ سارے دوستوں کی پیٹھ پر تازیانہ بن کر پڑا۔ لیکن اگلے دن جب فرخندہ نہ کہیں باہر گئی اور نہ ہی اس نے سنگھار کیا بلکہ اپنے ہاتھوں سے کھانا پکا کر سبھوں کو کھلایا تو دوستوں کے دلوں سے گردِ ملال چھٹ گئی۔ یہ سلسلہ چار دنوں تک چلتا رہا۔ سارے دوست خوش تھے کہ "وہ اپنی پچھلی حرکتوں سے تائب ہوکر پھر ان کی وفا شعار اور اطاعت گزار فرخ بھابھی بن گئی ہے۔"

لیکن پانچویں دن وہ پھر اچانک غائب ہوگئی۔ دس بج گئے۔ سب انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔ اچانک ناول نگار محسن عدیل نے کروٹ بدلی اور مولانا سے دیگچے میں پانی بھر کر گرم کرنے کی فرمائش کی۔ مولانا کے استفسار پر اس نے کہا "بات یہ ہے، اس دن وہ آئی تھیں تو رات کو ہی اور پھر غسل کیا تھا ٹھنڈے پانی سے۔ آج سردی بہت زیادہ ہے۔ میں نے سوچا بیکار بیٹھے ہیں اور کچھ نہیں تو لگے ہاتھوں پانی ہی گرم کردیں۔"

یہ کہتے کہتے اس نے پہلو بدلا، اپنا سر گاؤ تکیے پر ڈال دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ اس سطر کے ساتھ ہی کہانی "حمام میں" ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ زندگی کی طرح کہانی کا تسلسل بھی برقرار رہتا ہے۔ غلام عباس یہ نہیں بتاتے کہ اس رات یا اس کے بعد فرخندہ گھر لوٹی یا نہیں، کیا وہ میر نوازش علی یا کسی اور کے ساتھ کہیں چلی گئی۔ کیا اس نے شادی کرلی، وغیرہ۔ ہاں اس کے سارے دوست کہانی ختم ہونے تک اسی گھر پر موجود رہتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ جو کچھ بھی ہوا وہ ان کی مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں ہوا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان سبھوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی حالات سے سمجھوتہ کرلیا ہے۔

غلام عباس بطور اصول نہ تو عورت اور مرد کے بیچ موجود رشتے یا تعلقات کی حقیقی نوعیت کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور نہ ہی رازہائے سربستہ پر سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ انہیں راز کو راز

ہی رہنے دینے میں لطف آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیان کی رفتار بہت مدھم اور سچ پوچھئے تو پرسکون رہتی ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں میں اگر ایک خاص طرح کی حیرت پائی جاتی ہے تو اس کا بنیادی سبب غلام عباس کا یہ ایقان ہے کہ معاشرتی اعتبار سے خواہ کوئی فرد کتنا ہی معمولی اور بے وقعت کیوں نہ نظر آئے اس کی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو، اس کا کوئی نہ کوئی مشاہدہ یا تجربہ یقیناً ایسا ہوتا ہے جو خالصتاً اس کا اپنا ہوتا ہے اور جس پر پوری طرح اس کی اپنی شخصیت کی چھاپ ہوتی ہے۔ اسی وصف نے غلام عباس کو انسانی وجود میں پائے جانے والے مضمرات کا افسانہ نگار بنا دیا۔ وہ عموماً فرد کے ظاہری اعمال سے زیادہ اس کی ذات میں پوشیدہ سچائی کی دریافت پر زور دیتے ہیں۔

اس طرح غلام عباس کے افسانوں کے تفصیلی مطالعے کے بعد ہمیں اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگتی کہ ہر فرد بجائے خود ایک جہانِ معنی کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ افرادی انفرادیت کو انہوں نے ایسی چابکدستی اور فنی مہارت کے ساتھ برتا ہے کہ ان کا ہر افسانوی کردار، ہر موضوع اور ہر تجربہ زندگی سے گہری مطابقت رکھنے کے باوجود عام یا (Common Place) نہیں بننے پاتا۔

مثال کے طور پر عورت کی بے وفائی کے موضوع کو ہی لے لیجئے۔ دنیا کی ہر زبان میں اس موضوع پر افسانے لکھے گئے ہیں۔ اردو افسانے کے باوا آدم منشی پریم چند کے افسانے "نئی بیوی" کو اس سلسلے میں بطور مثال پیش کیا جاتا رہا ہے۔ صرف ایک جملے میں اس افسانے کا لب لباب پیش کرنا ہو تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک نوجوان عورت کی شادی ایک دولت مند لیکن ایسے معمر شخص کے ساتھ ہو جاتی ہے جو جنسی اعتبار سے اسے مطمئن نہیں کرسکتا۔ چنانچہ وہ عورت اپنے جسم کی آگ بجھانے کی خاطر گھر کے دیہاتی نوکر کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی غیر فطری عمل نہیں ہے لیکن فنی برتاؤ کے لحاظ سے اسے کوئی غیر معمولی یا بے حد اہم افسانہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے برخلاف اسی موضوع کو غلام عباس نے اپنے افسانے "اس کی بیوی" میں جس انداز میں برتا ہے وہ منفرد بھی ہے اور اچھوتا بھی۔

"اس کی بیوی" ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو شدید قسم کی نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہونے کے باوجود کسی ذہنی یا جنسی پرورژن کا شکار نہیں ہونے پاتا۔ افسانے کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے:

"دونوں تیسری منزل کے ایک کمرے میں تھے۔"

یہ تیسری منزل دراصل ایک تیسرا وجود ہے جو جسمانی طور سے موجود نہ ہونے پر بھی سوتے جاگتے ان دونوں کے درمیان موجود رہتا ہے۔ افسانے کا پچیس سالہ بے نام ہیرو نسرین نامی ایک

پیشہ ور عورت کو چند دنوں کے لئے خرید لیتا ہے اور اسی کے گھر قیام کرتا ہے۔ نسرین جوان ہی نہیں بے حد خوبصورت بھی ہے۔ تجرا س کی پیشہ ورانہ ادائیں ختم بالائے ستم کا درجہ رکھتی ہیں۔ لیکن نوجوان کو اس کی ہر ادا پر کسی اور عورت کی بالکل ویسی ہی ادا یاد آ جاتی ہے۔ مثلاً اگر نسرین آئینے کے سامنے ایک طرز خاص سے بال سنوارتی ہے تو نوجوان اسے بتاتا ہے کہ نجمہ بھی ایسا ہی کیا کرتی تھی۔ اگر نسرین اسے گرویدہ کرنے کے لئے عطر حنا کا استعمال کرتی ہے تو وہ فوراً بول اٹھتا ہے کہ نجمہ کو بھی یہی خوشبو بہت پسند تھی۔

پہلی رات جسمانی اختلاط کے بغیر گزر جاتی ہے، جو کم از کم نسرین کے لئے غیر متوقع بلکہ انہونی قسم کی چیز ہے۔ صبح جب وہ اٹھتی ہے تو نوجوان کو غائب پا کر مطمئن ہو جاتی ہے کہ کوئی دیوانہ تھا جو مفت میں اتنی موٹی رقم دے کر چلا گیا۔ لیکن گھنٹے بھر بعد ہی نوجوان گوشت اور ترکاری کا تھیلا سنبھالے واپس آ جاتا ہے۔ وہ ضد کر کے کھانا پکانے میں نسرین کا ہاتھ بٹاتا ہے اور شام میں اسے خالص گھریلو عورت کی طرح برقعہ پہنا کر اپنے ساتھ رکشہ میں شہر کی سیر کرانے لے جاتا ہے۔

دھیرے دھیرے ایک طرف اگر نسرین اس کے تکلّف پن کی عادی ہو جاتی ہے تو دوسری طرف اس کے ذہن میں نوجوان کی ذاتی زندگی کے تہ خانوں تک پہنچنے کی خواہش بیدار ہو جاتی ہے۔ کافی کریدنے کے بعد ایک رات نوجوان اس پر انکشاف کرتا ہے کہ اس کی بیوی نجمہ باوفا نہیں تھی وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔ یہ بات اسے نجمہ کے نام آئے ہوئے اس خط سے معلوم ہوئی تھی جو اتفاقاً اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

"اور تم پھر بھی اسے چاہتے رہے؟" نسرین حیران ہو کر پوچھتی ہے۔

نوجوان نسرین کو مزید بتاتا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کی زندگی کے آخری لمحے تک اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اس کے راز سے واقف تھا۔ ہاں اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ نجمہ عالم نزع میں اس سے کچھ کہنے، کچھ بتلانے کے لئے بے چین تھی۔

اس افسانے کے آخری منظر میں غلام عباس نے بڑی مہارت کے ساتھ جنسی خواہش اور لذت پرستی کو خالص محبت کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ نسرین طوائف نہ رہ کر محض ایک عورت بن جاتی ہے۔ ساری کہانی سننے کے بعد جب وہ اس کی بغل میں لیٹتی ہے تو گہری نیند کے عالم میں نوجوان کو ایک بچے کے مانند اپنی بانہوں میں بھینچ لیتی ہے۔ دوسری سطح پر اس رات نوجوان کو بھی نسرین سے وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو اپنی بیوی سے نہیں مل سکا تھا اور جس کے لئے وہ ترس رہا تھا۔

افسانے کے اختتام پر ہم یہ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ آخر نجمہ نے مرنے سے پہلے عام حالات میں اپنے شوہر کو سب کچھ کیوں نہیں بتا دیا۔ کیا اسے یہ خوف تھا کہ افشائے راز کے بعد وہ شوہر کی نظروں سے گر جائے گی۔ مزید یہ کہ کیا مرتے وقت اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ اب تک اپنے شوہر کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو دھوکہ دیتی آئی تھی۔ کیا وہ اعتراف گناہ کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا اور سکون کی موت مرنا چاہتی تھی۔

غلام عباس ان میں سے کسی سوال کا جواب فراہم نہیں کرتے۔ سارا معاملہ قاری کے صواب دید پر چھوڑ دیتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی اس افسانے میں نہ تو نجمہ ایک مثالی عورت کے روپ میں ابھرتی ہے اور نہ ہی نوجوان کو ایک مثالی مرد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو یقیناً ایک ایسی رومانویت پیدا ہو جاتی ہے جو افسانے کو ناقابل یقین بنا دیتی۔

"مجبوری" اس حلقے کا ایک نسبتاً زیادہ چونکا دینے والا افسانہ ہے۔ افسانے کا پہلا پیراگراف ہی قاری کو ششدر کر دینے کے لئے کافی ثابت ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔۔۔

> پہلے پہل جب اسے پتہ چلا کہ اس کی بیوی بھاگ گئی تو وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ شادی کا پہلا ہی سال اور ایسی انہونی سی بات! کسی طرح یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مگر جب بار بار اس کے کمرے میں جا کر اس کی چیزیں گم پایا۔ یہاں تک کہ اس کا بچپن کا فوٹو تک جس میں وہ ایک کبوتر کو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں تھامے مسکرا رہی تھی۔ اس کی سنگھار میز پر سے غائب تھا۔ تو شک کی کوئی وجہ باقی نہ رہی۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک خاصا خطرناک قسم کا واقعہ ہے۔ شادی کے چند مہینوں کے اندر ہی ایک ایسے شخص کی بیوی کا بھاگ جانا، جس نے اسے جی جان سے چاہا ہو، جس کے بغیر وہ کسی پارٹی میں نہ شریک ہوا ہو اور جس کے لئے اس نے تمام پرانے دوستوں سے تعلقات منقطع کر لئے ہوں کوئی معمولی سانحہ نہیں ہے۔ غلام عباس نے اس موضوع کو بڑے ہی معروضی اور غیر جذباتی انداز میں برتا ہے۔

ایک فنکار کی حیثیت سے ان کی ہمدردیاں نہ تو مرد کے ساتھ ہیں اور نہ وہ عورت کو اس کی بے وفائی اور بدچلنی کے باوجود بے وقعت Humiliate کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں تک مرد کا تعلق ہے وہ اس نازک صورت حال میں غیر معمولی نوعیت کی عملی عقل Practical Wisdom سے کام لیتے

ہوئے رشتے داروں اور دوستوں کو اس حادثے کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا۔

شروع شروع اس کے دل میں انتقام کی آگ بہت تیز رہتی ہے۔ "وہ اکثر خیال ہی خیال میں اپنی بیوی کا گلا اس وقت تک دباتا رہتا جب تک اس کی آنکھیں باہر نہ نکل پڑتیں۔ پھر وہ اس بے جان جسم کو زمین پر پٹخ دیتا۔"

لیکن دھیرے دھیرے اسے یہ سارا عمل مضحکہ خیز ہی نہیں حماقت آمیز بھی معلوم ہونے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ یا تو عمر بھر کی جنسی اور جسمانی دباؤ غالب آ گیا یا پھر اس نے اپنی بے وفا بیوی سے انتقام لینے کی یہ ترکیب نکالی کہ قحبہ خانوں کے چکر کاٹنے اور ہر رات کسی نئی عورت کو خریدنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

چند دنوں بعد ایک صبح جب وہ دفتر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا، کسی نے بہت ہی آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

اس نے "کون؟" کہہ کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ " اس کی مفرور بیوی سودائیوں کا سا حال بنائے کھڑی تھی......"

وہ کچھ دیر تو خاموش کھڑی رہی، پھر اچانک اس کے قدموں میں گر پڑی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مجھے بخش دو، مجھے بخش دو ...... میں جانتی ہوں اب تم مجھ سے سخت نفرت کرتے ہوگے۔ میری صورت دیکھنے کے بھی روادار نہ ہوگے۔ مگر میں تم سے محبت نہیں مانگتی ...... میں اس لائق ہی نہیں ہوں ...... میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ مجھ پر رحم کرو، مجھے صرف اپنے گھر میں پناہ دو۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی۔ آہ! میں اندھی ہو گئی تھی، مجھے بخش دو، مجھ سے سخت فریب کیا گیا تھا۔"

اس کی یہ حالت دیکھ کر نوجوان کے دل میں، بظاہر یہ تجسس بھی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ آخر کہاں اور کس کے ساتھ بھاگی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتا کہ عورت مکاری یا عیاری سے کام لے رہی تھی یا پھر کوئی زخمی واقعی اسے ورغلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ان سارے سوالات کو، بیوی کے ساتھ ہی وہ گھر کی دہلیز پر چھوڑ کر دفتر چلا جاتا ہے۔

اس کے بعد اس کی بیوی ہر طرح اس کا خیال رکھنے لگی۔ ہر صبح میز پر تازہ پھول گلدان میں سلیقے سے سجے ہوئے ملتے، غسل خانے سے نکل کر ڈریسنگ روم میں جاتا تو نیا جوڑا کیل کانٹے سے لیس ملتا۔ رات کے کھانے پر اس کی پسندیدہ سبزیاں موجود ہوتیں۔ وہ ایک صبح مسکراہٹ کے ساتھ

سوچتا کہ شاید اسے ایک بار پھر رام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن اس نے شب گردی اور عیش پرستی والا اپنا طریقہ نہ چھوڑا۔ دھیرے دھیرے تین ماہ گزر گئے۔

ایک صبح جب وہ دفتر کے لئے نکل رہا تھا تو "ایک خاتون ٹیکسی ساڑی میں ملبوس تھی اس کو مسکراتی ہوئی اچانک اس کے پاس سے گزر گئی" یہ اس کی مفرور بیوی تھی۔

اس دن وہ صبح سے ہی کسی طوائف کے یہاں جانے کے لئے بے چین تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کی جیب بالکل خالی تھی۔ پیسوں کے لئے اس نے یوں تو کئی دوستوں کو فون کیا لیکن سبھوں نے مہینے کی آخری تاریخوں کا بہانہ بنا دیا۔ وہ رات گئے تک یونہی بازاروں کی سیر کرتا رہا۔ اچانک اس کے ذہن میں یہ خیال کسی کوندے کے مانند لپکا تھا کہ اس کی بیوی بے وفا ہونے کے باوجود صورت شکل کے اعتبار سے ان طوائفوں سے بہتر تھی۔ اس نے سوچا:

"یہ سچ ہے کہ میری بیوی باعصمت نہیں لیکن آخر وہ عورتیں بھی کون سی منزّہ ہیں جن کے پیچھے میں قلاش ہو گیا اور جن سے ملنے کے لئے میں آج بھی تڑپ رہا ہوں۔" اسی سوچ میں غلطاں وہ گھر پہنچا تو دیکھا کہ اس کی بیوی ابھی جاگ رہی تھی۔ وہ اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ "اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی سیڑھیوں پر دبے قدم چڑھتا اس کے پاس آ رہا ہو۔"

اس جملے کے ساتھ ہی افسانہ ختم ہو جاتا ہے۔ آخری منزل ظاہر ہے کہ "سمجھوتہ" کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ اتنے نازک موضوع پر غلام عباس کے سوا کوئی دوسرا شخص اتنا کامیاب اور موثر افسانہ نہیں لکھ سکتا تھا۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا "سمجھوتہ" کے آغاز اور انجام دونوں میں زبردست ڈرامائیت پائی جاتی ہے۔ غلام عباس کی دوسری بہت سی کہانیوں کی طرح اس کہانی کی کامیابی کا راز کرداروں کی غیر معمولی انفرادیت میں مضمر ہے۔ "سمجھوتہ" کے میاں بیوی دونوں اپنی اپنی ذات میں اس حد تک منفرد ہیں کہ سماج میں ایسا "جوڑا" ڈھونڈھنے سے بھی نہیں مل پائے گا۔ افسانوی عمل اتنا گٹھا ہوا اور اس حد تک داخلیت آمیز ہے کہ قاری کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے کہ دونوں میں سے کس کردار کو "ہیرو" سمجھے اور کسے ولن!

جس انداز میں اور جن حالات میں میاں بیوی سمجھوتے پر مجبور ہو جاتے ہیں وہ تو سمجھ میں آ جاتے ہیں لیکن اس طرح کے سمجھوتے کا کوئی منطقی جواز فراہم کرنا مشکل ہے۔ غلام عباس کے بیشتر افسانوں کے مانند سمجھوتہ میں بھی کرداروں کی تعداد بے حد محدود ہے۔ سچ پوچھئے تو اس افسانے میں صرف دو ہی کردار ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے یہ تعداد خاصی اہم ہے۔ اگر سمجھوتہ میں کوئی ایک بھی اور

کردار ہوتا تو پورا افسانوی برتاؤ بدل جاتا۔ ساتھ ہی ساتھ تاثر کی وحدت بھی ختم ہو جاتی۔

افسانے میں ہمیں تاثر کی جو وحدت اور شدت نظر آتی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ پورا معاملہ میاں بیوی کے درمیان ہی محدود رہتا ہے۔

لٹی لٹائی حالت میں رحم کی بھیک مانگتی ہوئی عورت کا گھر واپس آ جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ جس سفر پر دانستہ یا ورغلائے جانے (Seduction) کے نتیجے میں روانہ ہوئی تھی وہ سفر بری طرح ناکام ہو چکا ہے پھر شوہر جس غیر جذباتی اور پرسکون انداز میں گھر میں رہنے کی اجازت دے دیتا ہے، اس کے مدنظر صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ انسانی جذبات و اعمال کسی بندھے ٹکے فارمولے کے پابند نہیں ہوتے۔

بالکل یہی بات غلام عباس کے مجموعی افسانوی فن کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ''اس کی بیوی'' اور ''سمجھوتا'' دونوں کا موضوع عورت بلکہ بیاہتا عورت کی بے وفائی ہے۔ لیکن دونوں کے برتاؤ میں بعد المشرقین نظر آتا ہے۔ ''سمجھوتا'' میں اگر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ جبلت، محبت سے زیادہ طاقتور محرک ہے تو ''اس کی بیوی'' کا مرکزی خیال جبلت یا جسمانی خواہش کے بجائے محبت سے عبارت ہے۔ اس کی بیوی کا مرد کردار بے وفا بیوی کے انتقال کے بعد بھی اس کی یادوں کو حقیقت میں بدلنے کے لئے سرگرداں رہتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کی طرح غلام عباس نے بھی اپنے کئی افسانوں میں عورت کو بطور موضوع برتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ ہمیشہ مثالی کرداروں کے بجائے افراد پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں اس لئے ان کے یہاں بے مثال موضوعاتی تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ ویسے ان کا بنیادی رویہ ایک ہیومنسٹ (Humanist) کا رویہ رہتا ہے۔ انہوں نے بڑی محنت سے اپنے لئے ایک ایسا افسانوی تناظر تخلیق کیا ہے جس کی مدد سے وہ مختلف صورتحال میں مختلف عورتوں کے دکھ سکھ، ان کے سوچنے سمجھنے کے طریقوں، ان کے مصائب، خواہشات اور تجربات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عورتوں کے جنسی استحصال کے تعلق سے غلام عباس کے افسانے ''بردہ فروش'' کا مفصل ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ''سایہ'' اس روایتی معاشرے کی کہانی ہے جہاں عورتیں بے زبان گایوں کی طرح ہوتی ہیں۔ بچپن سے ہی لڑکیوں کی پرورش و پرداخت اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ پوری سنجیدگی اور دیانت داری کے ساتھ والدین کی مرضی کو زندگی کی اہم ترین قدر سمجھنے لگتی ہیں۔ اعلیٰ تعلیم بھی ان لڑکیوں اور عورتوں میں وہ اخلاقی جرأت نہیں پیدا کر پاتی کہ وہ اپنے اچھے برے سے متعلق خود سوچ سکیں یا کوئی

فیصلہ کر سکیں۔ ان کی سرشت میں احتجاج نام کی کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہوتا۔

''سایہ'' شہر کے ایک ممتاز لیکن نو دولتیے گھر کے وکیل اور ان کے افراد خانہ خصوصاً بڑی صاحبزادی کی کہانی ہے جو نعمان نامی اس غریب، شریف اور بوڑھے خوانچہ فروش کی زبانی بیان کی گئی ہے جو وکیل صاحب کی کوٹھی کے زیر سایہ خوانچہ لگاتا تھا۔

پانچ برس کے عرصے میں وہ وکیل صاحب کے کنبے سے ہی نہیں ان کے دور و نزدیک کے رشتہ داروں سے بھی بخوبی واقف ہو گیا تھا۔ اسے ان کے بارے میں ایسی باتیں بھی معلوم تھیں جو وکیل صاحب کے ہر وقت کے ملنے جلنے والے اور گہری دوستی تک نہیں جانتے تھے۔ مثال کے طور پر وہ اس راز سے بھی واقف تھا کہ وکیل صاحب کے والد جو قصاب تھے مگر بیٹے کے کہنے پر انہوں نے یہ پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ پردے میں رہنے والی عورتوں کا ناک نقشہ، ان کی سیرت اور ان کا سبھاؤ اس سے چھپا نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیگم صاحب کے سارے بچے ایک ہی چھاتی کا دودھ پی کر پلے ہیں کیوں کہ دوسری چھاتی میں دودھ نہیں اترتا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ نعمان کو تاک جھانک سے دلچسپی تھی اور نہ ہی چھپ کر دوسروں کی باتیں سننے کا شوق تھا۔ یہ ساری تفصیل اسے گھر کی بوڑھی ملازمہ فرصت کے اوقات میں آ کر سنایا کرتی تھی۔ باقی سب کچھ نعمان کا اپنا مشاہدہ تھا۔

نعمان آئے دن دیکھتا کہ وکیل صاحب کے کالج میں پڑھنے والے دونوں بیٹوں اقبال اور خورشید کے ساتھ ان کا ایک دوست ریاض بھی آتا اور گھر کے عین مقابل کمرے میں گھنٹوں گپ شپ کرتے۔ ریاض بار بار خدا حافظ کہتا لیکن رخصت نہ ہو پاتا۔ ''اس دوران وکیل صاحب کے مکان کی دوسری منزل میں جہاں بڑی صاحبزادی کا کمرہ تھا، برابر ایک رنگین سایہ جالیوں کے پیچھے حرکت کرتا رہتا جسے نعمان کی کن انکھیوں کے سوا کوئی آنکھ نہ دیکھ پاتی۔''

''سایہ'' خاصہ طویل افسانہ ہے۔ لیکن پورے افسانے میں ریاض اور بڑی صاحبزادی کے درمیان انسیت یا محبت کے بارے میں اس جملے کے علاوہ کوئی دوسرا جملہ نہیں ملتا۔ یہ اشاراتی انداز غلام عباس کا طرۂ امتیاز ہے۔ ویسے یہ ایک جملہ بھی صورتحال کی عکاسی کے لئے بہت کافی ہے۔ لفظ ''سایہ'' کے ساتھ ''رنگین'' کی صفت کا استعمال بڑی صاحبزادی کے جذبات کا غماز ہے جب کہ ریاض کا بار بار خدا حافظ کہنے کے باوجود وہاں سے نہ جا سکنا اس کے مثبت ردعمل کی نشاندہی کرتا ہے۔ لیکن دونوں کے بیچ مشرقی تہذیب، قدیم روایات اور اس زمانے کے معیار سے خاندانی وقار کی چٹانیں پڑی تھیں

ہوئی ہیں۔

خود ریاض بڑھ کر "چق اٹھانے" کی سکت رکھتا ہے اور نہ ہی بڑی صاحبزادی میں اتنی ہمت ہے کہ وہ خود چق سے باہر آجائیں۔ مختار اور شمشاد یوں تو گھنٹوں ریاض کے ساتھ افلاطون اور ارسطو کے فلسفے پر دھواں دھار بحث کرتے ہیں لیکن انھیں اپنی ناک کے نیچے کی صورت حال کی خبر نہیں لگ پاتی۔

ایک دن فرط مسرت سے سرشار بڑی بی بی سبحان کو اطلاع دیتی ہیں کہ بڑی بٹیا کی منگنی طے ہو گئی ہے۔ وکیل صاحب کے ہونے والے سمدھی ڈاکٹر ہیں اور یہ لڑکا جس کا نام صغیر احمد ہے لیاقت کے اعتبار سے بی اے ہے۔

جلد ہی سبحان کو بڑی بٹیا کی طبیعت کے ناساز ہونے کی اطلاع ملی۔ پھر ایک دن علی الصبح سبحان کی نظر شمشاد پر پڑی جو کاندھوں پر سائیکل اٹھائے ہوئے جلد جلد سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔ اس نے صرف بنیان اور نیکر پہن رکھا تھا اور ابھی ڈاڑھی بھی نہیں مونڈی تھی۔ پتہ چلا کہ وہ ڈاکٹر کو بلانے جا رہا تھا۔

"سبحان کا ماتھا ٹھنکا" چھوٹے صاحبزادے جب اسکول جانے لگے تو پتہ چلا کہ رات سے باجی کی طبیعت خراب ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سرسام ہو گیا ہے۔"

اس دن شمشاد اور مختار کالج سے جلد گھر آ گئے۔ شام کو حسب معمول ہاکی کھیلنے بھی نہیں گئے۔ اسی طرح نہ تو وکیل صاحب اس روز کچہری گئے اور نہ ہی چق کے پیچھے سایہ نظر آیا۔ دن ختم ہو گیا۔ سبحان نے رات گئے تک ٹھیلا نہیں اٹھایا۔ آدھی رات کے بعد گھر گیا بھی تو نیند نہیں آئی۔ صبح تین بجے کے قریب جب ذرا اونگھنے لگا تو اچانک ایک سمت سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور وکیل صاحب کے مکان کی طرف بھاگا مگر گھر میں بدستور خاموشی تھی۔ اس نے پتھر مار کر کتے کو بھگا دیا۔

چونکہ غلام عباس اپنے عمومی افسانوی طریق کار کے اعتبار سے "صفر انجام" (Zero Ending) کے قائل ہیں اس لئے اس افسانے میں بھی وہ قاری کو یہ نہیں بتاتے کہ اس صبح کے بعد کیا ہوا۔ گھر والوں کو بڑی بٹیا کی بیماری کے حقیقی سبب کا علم ہو پایا یا نہیں، اس کی شادی آخرکار کس کے ساتھ ہوئی۔ البتہ افسانہ نگار نے افسانے کے آخر میں دو ایسے اہم اشارے ضرور کئے ہیں جن سے قاری اپنے طور پر کچھ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ علی الصبح کسی گھر کے سامنے کتے کا بھونکنا بدشگونی کی علامت ہے۔ روایتی

عقیدے کے مطابق اسے موت کا اعلان بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن افسانے کی آخری سطر میں چونکہ سبحان کتے کو پتھر مار کر بھگا دیتا ہے اس لئے بظاہر یہ خطرہ ٹل جاتا ہے۔ دوسرا اشارہ "سرسام" نامی بیماری ہے جس کا بڑی بٹیا کے لئے انتخاب کر کے غلام عباس نے زبردست فنی مہارت اور چابکدستی کا ثبوت دیا ہے۔ "سرسام" کا مریض مسلسل بڑبڑاتا رہتا ہے اور غیر شعوری طور سے شعور اور لاشعور میں موجود تمام رازوں کا اگل دیتا ہے۔ اس طرح اس کی شادی صغیر کے ساتھ ہوئی ہو یا نہیں لیکن ان کے گھر والے بیماری کے دوران ان کے حقیقی جذبات سے ضرور واقف ہو گئے ہوں گے۔ بڑی صاحبزادی کی بیماری کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ ریاض کی محبت میں مبتلا ہونے کے باوجود لمحے بھر کے لئے بھی ماں باپ کے تئیں مکمل اطاعت گزاری اور خاندانی وقار کے مطالبات کے تحت سے اپنی اخلاقی ذمہ داری کو فراموش نہیں کر پاتی۔ اس کی بیماری اپنی داخلی حمیت اور اپنے دلی جذبات پر قابو پانے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس کے دل میں ریاض کے لئے جو جوار بھاٹا اٹھتا ہے اسے اس کی نسوانیت دبا دیتی ہے۔ وہ خود اپنے جذبات و احساسات کے ساتھ بے ایمانی کی مرتکب ہوتی ہے لیکن اسے ماں باپ کا دل دکھانا منظور نہیں ہے۔

"سیاہ و سفید" بھی روایتی مسلم معاشرے سے وابستہ اخلاقی نظام کی کہانی ہے۔ محمود نثر ایک چھوٹے سے قصبے کے اسکول میں استانی ہے۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد اس کے قریبی عزیزوں میں صرف ایک بڑی بہن ساجدہ ہے جو دور دراز کے کسی مقام پر اپنے شوہر اور بال بچوں میں مگن ہے۔ ادھر محمود کے بالوں میں چاندی کا اضافہ ہونے لگا ہے۔ وہ آئے دن بڑے انہماک کے ساتھ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سر سے نقرئی بالوں کو اکھاڑتی رہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہ محمود کے جذبات ابھی تک سرد نہیں ہوئے اور اس کے دل میں گھر بسانے کی لگن موجود ہے۔ یہی لگن اسے چھٹیوں میں بڑی بہن کے پاس دہلی لے جاتی ہے۔

ایک شام جب وہ تنہا کناٹ پلیس پر گھوم رہی ہوتی ہے اسے احساس ہوتا ہے کہ ایک شریف صورت نوجوان کچھ فاصلے سے اسے گھور رہا ہے۔ وہ جدھر جدھر جاتی ہے نوجوان پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ محمود بھی اس میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔ لیکن اگلی شام جب وہ پھر اسی مقام پر پہنچتی ہے تو وہی بظاہر شریف صورت نوجوان اپنے لچے لفنگے قسم کے دوستوں میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔ محمود کو دیکھتے ہی وہ جس قسم کے اوباش حرکات و سکنات کا مظاہرہ کرتا ہے اس سے محمود سہم جاتی ہے اور تیزی کے ساتھ اپنے گھر کی طرف لوٹنے لگتی ہے۔ تو جوان آہیں بھرتا اور فقرے چست کرتا ہوا اس کا پیچھا کرتا ہے۔

کرتی رہتی۔ مسعودہ کسی طرح گھر تو پہنچ جاتی ہے لیکن دوسرے ہی دن دلی سے اپنے گاؤں روانہ ہو جاتی ہے۔

اس کے باوجود کہ ہم مسعودہ کو مثالی یا ٹائپ کردار نہیں کہہ سکتے۔ وہ یقیناً اس متوسط طبقے کی نمائندگی کرتی ہے جس کی اکثریت طبقی لحاظ سے تردد میں ہوتی ہے۔ اس طبقے کے لوگ ساری زندگی جدوجہد کرتے ہیں۔ بیشتر ناکام رہتے ہیں لیکن کسی بھی حال میں ذاتی وقار (Grace) کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

متوسط اور نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے دوسرے افسانے مثلاً ''بحران''، ''جواری بھتیجا''، ''غازی مرد''، ''ہمسائے''، ''فینسی ہیئر کٹنگ سیلون'' وغیرہ یوں تو سب کے سب کسی نہ کسی پہلو سے منفرد ہیں اور روٹی کپڑا اور مکان سے ہٹ کر بھی اس طبقے کے افراد کو درپیش مسائل سے بحث کرتے ہیں لیکن ان افسانوں میں ''کتبہ'' کو یقیناً خصوصی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایک سیدھا سادہ اور براہ راست قسم کا افسانہ ہے۔ غلام عباس نے اپنی افسانوی عادت کے مطابق ''کتبہ'' میں متوسط طبقے کی بے کسی، ناکام آرزوؤں، دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جانے والی خواہشوں اور جھوٹے افتخار سے بے کیف و بے لطف زندگی کو جس درد مندی کے ساتھ پیش کیا ہے اسے بیشتر نقادوں نے بجا طور پر سراہا اور اس کی داد دی ہے۔

''کتبہ'' شریف حسین نامی اس کلرک کی کہانی ہے جس کی ماہانہ تنخواہ سے بیوی بچوں کے لئے دو وقت کی روکھی سوکھی کا تو کسی طرح انتظام ہو جاتا ہے لیکن جسے مہینے کے ابتدائی چار پانچ دنوں کو چھوڑ کر جب وہ آدھی سواری والے تانگے میں بیٹھ کر خوش ہو لیتا ہے، سارا مہینہ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر تک کی خاصی طویل مسافت پیدل طے کرنی پڑتی ہے۔

اسی دوران ایک دن جب اس کی بیوی مع بچوں کے اپنے میکے گئی ہوئی تھی اور اسے گھر پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی اور نہ ہی گھر میں کوئی ایسا اثاثہ تھا جس کی حفاظت کی فکر اسے لاحق ہوتی وہ شام میں دفتر سے چھوٹ کر خراماں خراماں ٹہلتا ہوا گھر جا رہا تھا۔ جامع مسجد سے گزرتے ہوئے اس کی نظر اچانک سنگ مرمر کے ایک صاف و شفاف اور خوبصورت ٹکڑے پر پڑ گئی جو ایک کباڑی کی دکان پر رکھا ہوا تھا۔ شریف حسین نے یونہی شوقیہ اس ٹکڑے کے دام پوچھ لیے۔

''تین روپے!'' سن کر وہ آگے بڑھ گیا لیکن کباڑی کے یہ کہنے پر کہ ''کیوں حضرت! چل دیے؟ آپ بتا دیجئے کیا دیجئے گا!'' اس کے قدم رک گئے۔ ہم تو جانتے ہیں کہ متوسط طبقے کے لوگوں

کو اپنی عزت کا کچھ زیادہ ہی خیال ہوتا ہے۔ شریف حسین نے بھی اس ''توقف'' سے کہ کہیں کباڑی اسے کنگال نہ سمجھ لے ''ایک روپیہ!'' کہہ دیا۔

شریف حسین کو یقین تھا کہ کباڑی اتنے کم دام قبول نہیں کرے گا اور اس طرح وہ وہاں سے اپنی عزت بچا کر بھاگ لینے میں کامیاب ہو گا۔ لیکن شومئی قسمت سے کباڑی سنگ مرمر کا وہ ٹکڑا ایک روپیہ میں ہی دینے کو تیار ہو گیا۔ اسے مجبوراً وہ ٹکڑا خریدنا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی شریف حسین کے دل میں یہ خواہش بیدار ہوئی کہ وہ اس ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا لے اور اسے اپنے گھر کے باہر ''نیم پلیٹ'' کے طور پر لگا دے۔ قریب ہی ایک سنگ تراش کی دکان تھی جہاں چند آنوں میں یہ کام بھی ہو گیا۔

گھر پہنچ کر شریف حسین پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ اس کے مکان کے دروازے کے باہر ایسی کوئی جگہ نہیں کہ اس پر وہ لگایا جا سکے۔ چنانچہ اس نے اپنی کوٹھری کی اس واحد الماری میں جس کے کواڑ بھی نہیں تھے، اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کو ڈال دیا۔ شریف حسین ساری عمر یہ خواب دیکھتا رہا کہ کسی طرح اسے سامنے کے اس گھر سے نجات مل جائے اور وہ چھوٹا ہوا ہی سہی لیکن اپنا ذاتی مکان ہو جس پر وہ اپنے نام کی تختی چسپاں کر سکے۔ یہ سوچتے سوچتے شریف حسین بوڑھا ہو کر ملازمت سے سبکدوش ہو گیا لیکن مکان بنانے کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔

پنشن کے کوئی تین برس بعد نمونیا کی بیماری میں شریف حسین کا انتقال بھی ہو گیا۔ اس کی موت کے بعد جب اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کرا رہا تھا تو اس کی نظر اچانک اس مرمریں ٹکڑے پر پڑ گئی جس پر اس کے باپ کا نام کھدا ہوا تھا۔ بیٹے کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔

''اگلے روز وہ کتبے کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا اور اس سے کتبے کی عبارت میں تھوڑی سی ترمیم کرائی اور پھر اسی شام اسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔''

ایک کلرک کا کلرک بیٹا اپنے متوفی باپ کے لئے اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتا تھا! ''کتبہ'' میں غلام عباس نے متوسط طبقے کے مصائب اور مسائل کی بھرپور ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دکھایا ہے کہ کس طرح اس طبقے کے افراد ساری عمر بہتر اور نسبتاً خوشحال زندگی کے خواب دیکھتے اور اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد کرنے میں بسر کر دیتے ہیں۔ لیکن ہاتھ ان کے موت کے سوا کچھ نہیں آتا۔ بسا اوقات یہ سلسلہ نسل در نسل ایک ہی انداز میں چلتا رہتا ہے۔ اس طبقے کے لوگ عام طور پر اپنے بچوں کے لئے غربت اور بے کسی کا ورثہ ہی چھوڑ پاتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم شریف حسین کو انفرادی کردار کے علاوہ ایک ایسا مثالی کردار بھی کہہ سکتے ہیں جو اپنے طبقے کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

"کتبہ" اپنی افسانوی تکنیک میں غلام عباس کے زیادہ تر افسانوں سے الگ ہے۔ اس افسانے میں تاثر پیدا کرنے کی غرض سے انہوں نے پوری بات کہہ دی ہے۔ بصورت دیگر یعنی عام طور سے وہ اپنے استاد معنوی یعنی چیخوف کی طرح اپنے کرداروں سے متعلق مسائل کا بیان تو نہایت فنی بے تکے انداز میں کرتے ہیں لیکن مسائل کا حل نہیں بتاتے۔ اسی طرح واقعات کے بیان میں وہ کہیں بھی اپنی مصنف والی حیثیت کا فائدہ اٹھا کر دخل در معقولات سے کام لینے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ وہ کرداروں کے ارتقا اور انہیں خاطر خواہ موثر بنا کر پیش کرنے پر اپنی پوری فنی مہارت صرف کرنے کے قائل ہیں نہ تو وہ کرداروں کو اپنی مرضی کے مطابق سانچوں میں ڈھالتے ہیں اور نہ ہی ان کے راستوں یا ان کی منزل کا تعین کرتے ہیں۔ کرداروں کے تعلق سے ان کا رویہ ہمیشہ ایک غیر جانب دار مشاہد کا رویہ ہوتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے قبولیت عام کو مدنظر رکھتے ہوئے افسانے نہیں لکھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ انہوں نے لکھتے ہوئے شعوری طور پر کبھی بھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ بازار میں کس طرح کی کہانیاں زیادہ مقبول ہو رہی ہیں۔

مثال کے طور پر تقسیم کے بعد ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات بیشتر افسانہ نگاروں کے لئے مصرع طرح کی حیثیت رکھتے تھے۔ جس طرح طرحی مشاعروں کے لئے لکھی گئی بعض غزلیں بے حد کامیاب ثابت ہوئی ہیں، ٹھیک اسی طرح کئی افسانہ نگار اس موضوع پر لازوال افسانے سپرد قلم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن غلام عباس اپنی تمام انسانی ہمدردی کے باوجود اس طرحی مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے۔ آگے چل کر جب انہوں نے بقول شمیم احمد پاکستانی حکام یا پھر پاکستانی عوام کے ایک مخصوص طبقے کو خوش کرنے کے لئے "سرخ جلوس"، "چکر"، "اوتار" اور "دھنک" جیسی کہانیاں لکھیں بھی تو انہیں زبردست ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ حقیقت یہی ہے کہ ہنگامی مسائل پر فنی مہارت کے ساتھ لکھنا نہ تو ان کے بس کی بات تھی اور نہ ہی یہ ان کا میدان تھا۔ اس خاص تناظر میں بیدی اور منٹو یقیناً غلام عباس کے مقابلے میں بڑے افسانہ نگار ہی نہیں بڑے فنکار بھی ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں ہم یہ بات ایک سے زائد بار کہہ چکے ہیں کہ غلام عباس کے کردار اپنی تمام تر انفرادیت کے باوجود بے حد عام اور معمولی ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق روزمرہ زندگی سے ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں کے واقعات بھی عام زندگی سے ہی ماخوذ ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ اپنے کرداروں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے اس لئے ان کے بعض کردار فلاکت کی پیداوار ہونے کے باوجود انفرادی ننگے پن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ غلام عباس کا کمال یہ ہے کہ وہ اس ننگے پن کو بھی فن کی اعلیٰ

بلندیوں تک پہنچانے پر قادر تھے۔ مختلف اقسام کی منافقت بھی بہر حال عام زندگی کا ایک اہم پہلو ہی ہے۔ مثال کے طور پر "محفوظ" کے حاجی شفاعت احمد جن کے یہاں طوائفوں کی اصلاح کرنے اور انہیں معاشرے کا خوش حال خاتون کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور وہ اپنے مشن میں زمین، جائیداد، مکان، کھیت سب کچھ کھو کر بھی اس جنون سے نہیں نکل پاتے۔ ان کا تعلق بھی حقیقی دنیا سے بہر حال برقرار رہتا ہے۔ اس کل میں جس طرح طوائفیں شفاعت احمد کا تمسخر اڑاتی ہیں اور ان سے ٹھٹھا کرتی ہیں اس پر سنجیدہ سے سنجیدہ قاری بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مگر اس سے بہر حال ان اقدار کی اہمیت کم نہیں ہوتی جن کے لئے حاجی صاحب نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ دیکھنے میں حاجی شفاعت احمد جیسے لوگ انجام کار مایوسی اور ناکامی کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن غلام عباس کے یہ افسانے تخلیقی طور سے ہمارے تجربات و مشاہدات میں اضافے کے مترادف ہیں۔

غلام عباس کے افسانوی ادب میں "آنندی" کو جو حیثیت حاصل ہے اس سے افسانے کے سبھی قارئین واقف ہیں۔ اس افسانے کے تعلق سے انتظار حسین کی رائے مضمون کی ابتدا میں نقل کی جا چکی ہے۔ میں نے جان بوجھ کر آنندی سے بحث نہیں کی ہے۔ ویسے میری ناچیز رائے میں ان کا افسانہ "کن رس" "آنندی" کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر تخلیق ہے۔ ممتاز شیریں نے اپنے مضمون "تکنیک کا تنوع ۔۔۔ ناول اور افسانے میں" میں "آنندی" کا تنقیدی خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

> آنندی میں ایک اتفاقی احساس اور وسعت ہے۔ اس میں ایک یا دو کردار نہیں بلکہ پورا شہر آنندی کا کردار ہے اور غلام عباس نے اسے اپنی ساری کہانی کے ساتھ رچتا بستا دکھایا ہے۔ یہ شہر اجڑ کر دوسری جگہ بس جاتا ہے۔ اس بننے میں مجموعی نقل مکانی نہیں ہے بلکہ آہستہ آہستہ یہ شہر بستا ہے۔ "بازار حسن" کے مرکز کے ارد گرد ایک بارونق شہر کے بننے میں تین سال لگ جاتے ہیں...... شہر کے بس جانے پر کہانی ختم نہیں ہوتی بلکہ ایک پورے دائرے میں گھوم کر پھر نقطہ آغاز پر آ جاتی ہے۔ اس نئے شہر کے عین بیچ میں بھی ایک ریزولیوشن پیش ہو رہا ہے کہ ان بازاری کسبیوں کا وسط شہر میں رہنا برے اثرات پیدا کر رہا ہے اور انہیں شہر بدر کر دیا جانا چاہئے۔ چنانچہ اس بار جو قطعہ زمین ان کے لئے تجویز کیا گیا وہ پہلے سے دگنے فاصلے پر تھا۔ اور پھر ذکار

> نے آخری جملے میں یہ اشارہ بھی چھپا رکھا ہے کہ خواہ یہ فاصلہ اس سے بھی کنا بڑھ جائے لیکن یہی داستان ہر دفعہ دہرائی جائے گی اور یہ قطعہ بازار حسن کو وسط میں لئے ہوئے پھر ایک بارونق شہر میں تبدیل ہو جائے گا۔

آنندی دراصل افسانے سے زیادہ ایک طرح کی عمرانی تاریخ ہے۔ افسانے کے ذریعے غلام عباس نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ روایتی اخلاقی معیارات کے مطابق نیکی اور بدی کے جو تصورات ہیں وہ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بسا اوقات بدی نیکی کے مقابلے میں زیادہ پرکشش ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روایتی اخلاقیات کے ٹھیکے دار بار بار بازار حسن کو شہر کے وسط سے دور لے جا کر بساتے ہیں لیکن ہر بار وہ جگہ پھر ایک بارونق شہر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک طرح کا خالص سیکولر عمل ہے۔

چونکہ ہمارے آپ کے دور کا قاری اجتماعی نفسیات پر انفرادی مسائل اور الجھنوں کو ترجیح دیتا ہے اور چونکہ فی زمانہ سماجی منظر نگاری کے مقابلے میں انفرادی ذات کی کشمکش زیادہ اہمیت کی حامل ہے اس لئے فطری طور پر ہمیں "کن رس" میں زیادہ افسانوی کشش محسوس ہوتی ہے۔

عام طور پر غلام عباس اپنے افسانوں کے عنوانات اور موضوعات کی تشریح سے گریز کرتے ہیں۔ بہت سے افسانوں میں تو آخری پیراگراف یا آخری سطر پڑھنے کے بعد ہی قاری پر عنوان کا بھید کھلتا ہے لیکن چونکہ "کن رس" کی اصطلاح عام فہم نہیں ہے اس لئے غلام عباس نے اس افسانے کا آغاز یوں کیا ہے۔

> بعض لوگوں کو گانے بجانے سے قدرتی لگاؤ ہوتا ہے۔ خود چاہے بے سرے ہی کیوں نہ ہوں مگر سریلی آواز پر جان دیتے ہیں۔ راگ ان پر جادو کا سا اثر کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ گانے بجانے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں جیسے کسی کو کوئی نشہ لگ جائے۔ صاحب ثروت ہوئے تو عمر بھر گویوں کی پرورش کرتے رہے نہیں تو استادوں کی جوتیاں سیدھی کر کے ہی اپنے ذوق کی تسکین کر لی۔ دراصل انہیں لوگوں کے لئے موسیقی روح کی غذا کی مصداق ہوتی ہے۔

غلام عباس کو بذات خود موسیقی سے زبردست اور فطری لگاؤ تھا۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق انہوں نے اوائل عمری میں ہی موسیقی میں ایسی مہارت پیدا کر لی تھی کہ انہیں ۱۰۰ روپے ماہانہ پر والکن سکھانے کی نوکری مل گئی تھی لیکن موسیقی کے شوق پر ادب کا ذوق غالب آ گیا اور انہوں نے سو روپے کی

نوکری ٹھکرا کر ۴۰ روپے ماہانہ پر ایک رسالے کی ادارت قبول کر لی۔

میرے نزدیک "کن رس" کے ہیرو فیاض کو غلام عباس کا ہی عکس سمجھا جائے تو مناسب نہیں ہوگا لیکن اس افسانے کے توسط سے انہوں نے موسیقی کے شوق کو انتہائی عروج پر ضرور پہنچا دیا ہے۔ فیاض کا المیہ یہ تھا کہ وہ ایک بے حد غریب گھرانے میں ہی پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا گھرانہ بڑا مذہبی اور صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ فیاض کو بچپن سے ہی حمد اور نعت ترنم سے پڑھنے کے علاوہ قوالی کی محفلوں میں شریک ہونے کا شوق تھا۔ چوری چھپے وہ کبھی کبھار ایسے پارسی ڈرامے بھی دیکھ لیتا تھا جن میں شروع سے آخر تک گانے ہی گانے ہوتے تھے۔ فیاض ابھی کالج میں ہی تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ پھر اس کی شادی بھی ہو گئی۔ تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد اسے محکمہ آبکاری میں ملازمت مل گئی اور وہ موسیقی کو یکسر فراموش کر کے ایک روایتی شریف آدمی کی زندگی جینے میں مصروف ہو گیا۔

> ایک دن وہ اپنی دھن میں مست چلا جا رہا تھا کہ اچانک اس کے کانوں میں کسی ساز کے بجنے کی دھیمی دھیمی آواز پڑنی شروع ہوئی۔ جب وہ قریب پہنچا تو اس نے بجلی کے کھمبے کی روشنی میں دیکھا کہ سڑک کے قریب ہی باغ کے ایک گوشے میں کوئی شخص فقیروں جیسی گدڑی اوڑھے ایک بڑا سا ساز بجا رہا ہے۔

یہ استاد حیدری خان تھے جو اپنے تمام کمال کے باوجود زمانے کی ناقدری کا شکار ہو گئے تھے۔ فیاض کے وجود میں سرایت کیا ہوا موسیقی کا شوق اچانک کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ وہ خان صاحب کو اپنے گھر لے آیا۔ ہر رات دفتر سے واپسی پر سرود سیکھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فیاض کی بیوی نے ابتداء میں یہ کہہ کر احتجاج کیا کہ "یہ اکا یکی کیسا شوق لگ گیا ہے تمھیں۔ قدم دھرتی ہو گے!" لیکن فیاض کا شوق رفتہ رفتہ جنون میں بدل گیا۔ اس حد تک کہ حیدری خان کے کہنے پر اس نے اپنی بچیوں نجمہ اور سلیمہ کو رقص کی تعلیم دلوانی شروع کر دی۔ وہ شریفوں کا محلہ تھا اور فیاض کے گھر جو کچھ ہو رہا تھا وہ شرفاء کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ آخر ایک دن محلے کی مسجد کے پیش امام صاحب نے نہایت ہی نرمی کے ساتھ فیاض سے مکان خالی کر دینے کی درخواست کی۔

استاد حیدری خان نے دو چار دنوں کے اندر ہی فیاض کو یہ خوش خبری سنائی کہ انہوں نے ایک ایسے علاقے میں اس کے لئے دو کمروں کا فلیٹ ڈھونڈ لیا ہے جہاں اسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ ہوگا۔ فیاض، اصغری، نجمہ اور سلیمہ، استاد حیدری خان کی رہنمائی میں فوراً اس فلیٹ میں منتقل

ہو گئے۔ استاد فیاض کو یہ کہہ کر کہ "اندر سے کنڈی لگا لینا...... جب تک میں نہ آؤں کنڈی نہ کھولنا۔ اگر مجھے دیر ہو جائے تو گھبرانا نہیں" الٹے پاؤں سیڑھیاں اتر گئے۔"

چونکہ چاروں بے حد تھکے ہوئے تھے اس لئے فوراً ہی سو گئے اور دو ڈھائی گھنٹے بے خبر خراٹے بھرتے رہے۔ سب سے پہلے فیاض بیدار ہوا۔ بیدار ہوتے ہی فیاض نے "خود کو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پایا۔ وہ جانتا تھا کہ بجلی کا بٹن کہاں ہے۔ مگر اس خیال سے اس نے روشنی نہ کی کہ کہیں اصغری اور بچیوں کی نیند نہ اچٹ جائے۔ وہ اندھیرے میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا بالکونی کی طرف گیا اور اس کے آہنی کٹہرے پر جھک کر اس نواح کی سیر دیکھنے لگا۔"

اب فیاض نے جو نقشہ دیکھا وہ خاصا حیران کن تھا۔ آس پاس کے تمام فلیٹوں میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے والے کمرے میں اجلی چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا۔ پاندان، خاصدان، پیکدان سب سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہاں کسی پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مکینوں اور مہمانوں کا البتہ ابھی تک کچھ پتہ نہ تھا۔

فیاض نے جب کمرے سے نظر ہٹا کر نیچے کی طرف دیکھا تو اسے اور بھی حیرت ہوئی۔ وہ دکانیں جن میں اس نے سہ پہر کو آٹا، دال، چاول، گوشت اور سبزی فروخت ہوتے ہوئے دیکھا تھا بند ہو چکی تھیں۔ ان کے بجائے کہیں پھولوں کے گجرے دکھائی دیتے تو کہیں عطر کی رنگ برنگی شیشیاں نظر آ گئیں۔ کسی دوکان کے سامنے انواع واقسام کی مٹھائیوں کے تھال سجے ہوئے تھے تو کہیں نظر بندی کا تماشا ہو رہا تھا۔ غرض کہ پوری گلی میں میلے کا سا سماں تھا۔

"فیاض کو اپنے فلیٹ کے سامنے جو کمرہ خالی نظر آیا تھا اب اس میں چہل پہل ہونے لگی تھی لوگ آتے جاتے اور گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھتے جاتے تھے۔ یکبارگی طبلے پر تھاپ پڑی اور ایک غیرت ناہید دبلی پتلی پشواز پہنے چھم سے محفل میں کودی اور رقص کرنے لگی......"

"فیاض ایک حیرت کے عالم میں بالکونی پر کھڑا یہ ماجرا دیکھ رہا تھا کہ اسے محسوس ہوا جیسے اندھیرے میں کوئی سایہ سا اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ فیاض کچھ لمحے ساکت و جامد کھڑا رہا سائے نے بھی حرکت نہ کی۔ آخر اس نے گردن پھیر کر دیکھا تو وہ اس کی بیوی اصغری تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ "کن رس" کے آخری مراحل سے گزرتے ہوئے ہمیں "آنندی" یاد آ جاتا ہے۔ لیکن تکنیک اور برتاؤ دونوں اعتبار سے "آنندی" اور "کن رس" میں کافی فرق ہے۔ آنندی کا بنیادی تعلق اجتماعی نفسیات اور شہری اخلاقیات کے ایک مخصوص پہلو سے ہے جب کہ

"کن رس" ایک ایسا غنائی المیہ ہے جس کی ہر سطر کسی غمگین اور دل ہلا دینے والی دھن سے مشابہت رکھتی ہے۔

غلام عباس نے شروع سے آخر تک افسانے کی ہر چھوٹی بڑی تفصیل کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ موسیقی کے تعلق سے فیاض کے فطری لگاؤ کی تکمیل استاد حیدری خان کی شکل میں ہوتی ہے۔ اسے بجا طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا ہے۔ حیدری خان کے طور طریقوں کو غلام عباس نے بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اصغری ایک ایسی مشرقی عورت کی علامت ہے جس کے بدن پر ہی نہیں روح پر بھی اس کے مجازی خدا کی حکمرانی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شروع شروع میں تو وہ فیاض کے بدلے ہوئے رویے کے خلاف احتجاج کرتی ہے لیکن بھرپور خلوص کے ساتھ شوہر کے سامنے سپر ڈال دیتی ہے۔ نجمہ اور سلیمہ دونوں بچیاں معصومیت کے جیتے جاگتے پیکر ہیں۔ وہ جس خشوع وخضوع کے ساتھ کلام پاک پڑھتی ہیں بالکل اسی انداز میں ناچ گانے کی تعلیم بھی حاصل کرتی ہیں۔

حالانکہ فیاض اپنے شوق اور استاد حیدری خان کی بدولت شرفاء کے محلے سے اٹھ کر بازارِ حسن میں آ جاتا ہے لیکن پورے افسانے میں ایک بھی جملہ ایسا نہیں ہے جو خان صاحب کی بدنیتی کی طرف اشارہ کرتا ہو۔ وہ جس طبقے کے نمائندے ہیں اس کے مطابق غریب خاندانوں کی لڑکیوں کا مستقبل اسی طرح سنوارا جا سکتا ہے۔

فیاض کا پورا سفر اگرچہ کہ معقولیت سے بے معقولیت کی طرف ہے لیکن دراصل وہ ایک سحر زدہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ سحر آخر کار ڈھائی گھنٹے کی نیند کے بعد ٹوٹتا جب وہ سو کر اٹھا اور "خود کو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پایا۔" یہ جملہ درحقیقت افسانے کا کلیدی جملہ ہے۔ جس محلے میں چاروں طرف روشنیاں ہی روشنیاں ہوں وہاں فیاض کا خود کو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پانا اس بات کا ثبوت ہے کہ واقعی اس کی آنکھ کھل چکی ہے۔ اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ غیر ارادی اور غیر رضا کارانہ طور سے نہ صرف اپنی بلکہ اپنے افراد خانہ کی بربادی کا سبب بھی بن چکا ہے۔ مستقبل اچانک اس کے سامنے سوالیہ نشان بن کر آ کھڑا ہوتا ہے۔

فیاض کی بیوی اندھیرے میں سائے کی طرح اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ دونوں خاموش ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے احساسات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اگر اس کے بعد غلام عباس ایک جملہ بھی لکھ دیتے تو افسانے کا تاثر مجروح ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔ فیاض اور اصغری کی

خاموشی حالات کے سامنے سپر ڈال دینے کی علامت نہیں بلکہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ خود کو اور اپنی نسلوں کو اس اندھکار سے نکالنے کی بابت سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔

غلام عباس خواہ ''کن رس'' جیسا درد مندی سے بھرپور افسانہ لکھیں یا ''سجدہ''، ''سیاہ و سفید'' اور ''اندھیرے میں'' جیسے افسانوں میں متوسط طبقے کے مسائل و مصائب کو پیش کریں۔ ''ایک دردمند دل'' میں بیرونی ملک میں جا بسنے والوں (N.R.Is) کے مسئلے سے بحث کریں جن پر وطن سے بے وفائی کا الزام لگایا جاتا ہے یا ''بابے دا'' اور ''جواری'' میں ہلکے پھلکے مزاحیہ کرداروں کی تصویر کشی کریں وہ حالات و واقعات سے زیادہ انسانی احساسات اور انسانی جبلتوں کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

حالات اور واقعات کے رخ، وقت اور آگے بڑھتے ہوئے زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن احساسات و جذبات اور انسانی جبلتوں کا ارتقا ہر زمانے میں یکساں طور سے قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غلام عباس کے وہ افسانے جنہیں لکھے ہوئے کافی سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے ہمیں اپنی موجودہ زندگی سے مربوط نظر آتے ہیں۔ غلام عباس ایک بڑے افسانہ نگار ہی نہیں ایک بڑے فنکار بھی تھے۔ افسانہ نگاری تو افسانہ نگار کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے، فنکاری کا تناظر ہر دور میں بدل جاتا ہے لیکن اس کی تازگی اور شادابی میں فرق نہیں آتا۔ چنانچہ غلام عباس کے افسانے آج بھی ہمیشہ کی طرح تازہ اور شاداب نظر آتے ہیں۔



غلام عباس: 'جاڑے کی چاندنی'

ڈاکٹر آفتاب احمد

'جاڑے کی چاندنی' — 'آنندی' کے مصنف غلام عباس کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے، جس نے غلام عباس کو 'آنندی' کے مصنف کے طور پر یاد کیا ہے۔ اس لئے کہ 'آنندی' وہ افسانہ ہے جس نے اپنے مصنف کو ایک ہی جست میں چوٹی کے افسانہ نگاروں میں شامل کر دیا تھا۔ غلام عباس کا یہ مجموعہ ان کی چودہ کہانیوں پر مشتمل ہے اور پہلے مجموعہ 'آنندی' کی اشاعت کے بعد لکھی ہوئی کہانیوں کے انتخاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

غلام عباس عام آدمی کے داستان گو ہیں، ان کو عام آدمی کی ذہنی اور جذباتی کیفیات اور زندگی کے معمولی واقعات و حالات کے مطالعہ میں منہمک رہنا زیادہ پسند ہے۔ ان کی حساس طبیعت آئے سامنے کی باتوں میں وہ حیرت اور گہرائی ڈھونڈ لیتی ہے جس پر دوسروں کی نظر عموماً نہیں پڑتی۔ ان کے ہاں تیز اور شدید جذبات یا چونکا دینے والے مضامین کو دخل نہیں۔ ان کے لئے سنگین اور ہولناک حقائق اور زندگی کے بظاہر پرشکوہ اور بلند آہنگ پہلو بھی اپنے اندر کوئی خاص کشش نہیں رکھتے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ دھیمے مزاج اور کم سجاؤ کے افسانہ نگار ہیں۔ انہیں عام آدمی کی عام زندگی سے زیادہ دلچسپی ہے اور اس دلچسپی کا ایک نمایاں پہلو ان کی بے پایاں ہمدردی ہے۔ انسانوں کی جو الجھنیں،

کمزوریوں اور غلط اندیشیوں پر بھی غلام عباس کا ردِ عمل کسی شدید طنز و تضحیک کی صورت میں نہیں بلکہ صرف ایک خندۂ زیرِ لب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک خندۂ زیرِ لب جس میں زندگی سے محبت بھی جھلکتی ہے اور زندگی سے لطف لینے کی صلاحیت بھی۔

انسانوں سے غلام عباس کی بھرپور دلچسپی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ انسانوں کو عموماً گروہوں، خاندانوں، محلے والوں، اور شہر والوں کی صورت میں دیکھتے ہیں اور ان کو ان کے ماحول اور گرد و پیش کے پس منظر میں پیش کرتے ہیں۔ غلام عباس کے ہاں اکیلا اور تنہا انسان اپنے توہمات میں الجھا ہوا انسان بہت کم نظر آتا ہے۔ انسان کی تنہائی کا وہ جاں گداز احساس جو جدید ادب کے بہت سے حصے پر دھند کی طرح چھایا ہوا ہے۔ عباس کے ہاں ناپید ہے۔ عباس کے کردار سوشل کردار ہیں، اور ایک مخصوص معاشرے سے وابستہ۔ ان کی انفرادیت میں اجتماعیت کی ایک رمق بھی موجود ہے۔ جس سے ان کی انفرادیت میں زیادہ معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ 'اوور کوٹ' وہ ایک کہانی ہے جس میں عباس نے ایک تنہا کردار پیش کیا ہے۔ مگر یہاں بھی تنہائی کردار کے دماغ پر ایک عذاب بن کر مسلط نہیں ہوئی، وہ بھری دنیا کا ایک فرد ہے اور ہر ہر قدم پر اس سے اپنا رشتہ قائم رکھتا ہے۔

عباس کی جس مخصوص طرزِ احساس کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہ ان کی کہانیوں میں مختلف انداز سے ظاہر ہوئی ہے۔ جو تسلیم و رضا اور قبولیت عباس کے اپنے مزاج میں ہے، وہی ان کے کرداروں میں بھی نمایاں ہے۔ یہ کردار زندگی میں اپنی محرومیوں کے باوجود عموماً اپنے حال میں مست اور اپنی خود فریبیوں میں خوش رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ نہ اپنے آپ سے الجھتے ہیں نہ دوسروں سے دست و گریباں ہوتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ اور ایک دوسرے کا سہارا بن کر چلتے ہیں۔ اسے خوش اعتقادی کہیے یا کچھ اور مگر یہ حقیقت ہے کہ اپنے آپ سے مطمئن افراد کی جو قطار عباس کے افسانوں میں نظر آتی ہے وہ کہیں اور مشکل ہی سے نظر آئے گی۔ 'اوور کوٹ' کا نوجوان ہو یا 'بھنور' کے حاجی صاحب، 'تنکے کا سہارا' کی بیوہ سیدانی ہو یا 'غازی مرد' کی چھاتیلی بی بی یہ سب اور اسی قسم کے دوسرے کردار عباس کی کہانیوں کا سرمایہ ہیں۔ ان کرداروں نے اپنی زندگیوں کو ہر رنگ میں قبول کر رکھا ہے ان کی کشمکش بھی ایک داخلی سکون اور طمانیت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔

عباس کے ہاں زندگی ایک ہنگامہ گیر و دار کی بجائے ایک نرم رو تسلسل کی صورت میں نظر آتی ہے۔ یہاں انسان مادی وسائل کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بدلتے ضرور ہیں مگر ان کی زندگی ایک نہ ختم ہونے والے تسلسل بلکہ یوں کہیے کہ ایک دائرے میں گھومتی ہے۔ عباس کے ہاں یہ ایک بنیادی

حقیقت ہے۔ 'آنندی' کی کامیابی کا راز علاوہ اس کے انوکھے موضوع کے ایک یہ بھی تھا کہ عباس نے پہلی دفعہ ایک بڑے پیمانے پر زندگی کی اس بنیادی حقیقت یعنی ایک لامتناہی سلسلے کی ایک سچی تصویر پیش کی تھی۔ اس مجموعے کی کہانی 'بھنور' میں بھی اس حقیقت کا احساس جاری و ساری ہے۔ حاجی صاحب جس مشن کو لے کر اٹھتے ہیں اس کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ افسانے کے انجام پر وہ پھر اسی ابتدا سے دوچار نظر آتے ہیں۔ زندگی کے اس تسلسل کا احساس ہمارے کسی دوسرے افسانہ نگار میں اس انداز سے ظاہر نہیں ہوا۔

ہمارے جدید افسانے میں انسان کی بنیادی خباثت کا ذکر تو بہت ہوا ہے اور یہ کوئی قابلِ اعتراض بات بھی نہیں کیونکہ زندگی میں خباثت بھی ہے اور معصومیت بھی۔ لیکن جدید اردو افسانہ نگاروں میں شاید صرف عباس ہی کے ہاں انسان کی معصومیت کا شدید احساس ملتا ہے۔ ان کے کردار اپنی بوالعجبیوں، اپنی خود فریبیوں، اپنی غلط اندیشیوں کے باوجود معصوم اور بھولے آدمی ہیں۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ عباس کے کرداروں کی بنیادی خصوصیت کیا ہے تو میں کہوں گا ان کی معصومیت۔ جدید ادب میں انسان کی معصومیت کا اظہار کچھ دب کے رہ گیا ہے۔ عباس البتہ اس معاملے میں اگلے وقتوں کے لوگوں کی یاد دلاتے ہیں۔ وہ اگلے وقتوں کی اقدار پر یقین ہی نہیں رکھتے بلکہ اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔ عباس کو انسان کی معصومیت کا اتنا گہرا احساس ہے کہ خالص بدی اور خباثت کا کوئی نمونہ 'بردہ فروش' کی مائی جی کے سوا ان کی کہانیوں میں مشکل ہی سے ملے گا لیکن 'بردہ فروش' عباس کی کامیاب کہانی نہیں ہے۔ میرے خیال میں یہاں ان کے قدم ڈگمگا گئے ہیں اور اپنے مواد پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ اس کہانی کا نفسِ مضمون اس کی فضا اس کا پلاٹ غرض کوئی چیز بھی عباس کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ہاں کہانی کا وہ حصہ جہاں رشیدہ اپنی نئی زندگی کو قبول کرنے لگتی ہے۔ واقعی عباس کے رنگ میں ہے لیکن اس کے فوراً بعد جو جھکاؤ پیدا کیا گیا ہے اس سے بات اس طرح بگڑی ہے کہ پھر نہیں سنبھلی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ عباس نے یہ کہانی اپنے آپ کو بھلا کے لکھنے کی کوشش کی ہے اور اسی لیے یہ چھوٹے سروں کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے۔ 'اوور کوٹ' ایک اور کہانی ہے جس کی اٹھان تو عباس کے خاص رنگ میں ہوتی ہے۔ اس کا کردار بھی خاص عباس کا کردار ہے لیکن اس کے انجام سے احساس کو دھچکا لگتا ہے یہاں انہوں نے اپنے کردار کو ذرا ایک حد تک نذر کر کے اس کی خباثت اور خود فریبی کا پردہ چاک کیا ہے۔ مجھے رہ رہ کے خیال آتا ہے کہ کاش اس کہانی کا انجام کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ انجام ایک قسم کی ادبی سزا کی ہے جسے میں عباس سے منسوب

نہیں کر سکتا۔

عباس کے کردار اکثر و بیشتر نیک دل لوگ ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں۔ وہ ان سب اقدار کے حامل ہیں جن سے زندگی میں اور ذاتی رشتوں میں استواری اور خوب صورتی پیدا ہوتی ہے۔ انھیں دیکھ کے آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دنیا بہر حال رہنے کے قابل ہے زندگی بہر حال پر لطف چیز ہے۔ انسان بہر حال معصوم اور نیک ہے غلام عباس اسی بھرپور آسودگی اور طمانیت کے احساس کے افسانہ نگار ہیں۔ 'جاڑے کے چاندنی' کے افسانوں میں جاڑے کی چاندنی کی سی ٹھنڈک اور سکون ہے۔

میں نے یہاں غلام عباس کے افسانوی مزاج کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ ذاتی طور پر جو کہانیاں مجھے پسند ہیں ان میں 'اس کی بیوی'، 'مجھو بھیے والا'، 'سایہ' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں 'اس کی بیوی' میرے نزدیک اس مجموعے کا بہترین افسانہ ہے۔ یہاں عباس کے مزاج کی نرمی جس انداز سے ظاہر ہوئی ہے اور افسانے کے انجام پر جس انتہا کو پہنچی ہے۔ اس سے بے اختیار چیخوف کی بہترین کہانیوں کی یاد آتی ہے۔ خالص تکنیک کے لحاظ سے 'سایہ' اس مجموعہ کا بہترین افسانہ ہے۔ وکیل صاحب کا مکان اور اس کے مکین اس کے مرکزی کردار ہیں لیکن ان سب کا حال ایک اور کردار رمضان کی زبانی بیان کیا گیا ہے جو مکان کے باہر اپنی دکان لگائے مکان اور مکینوں کا خاموش مگر چوکس تماشائی ہے۔ افسانہ نگار نے اس زاویے سے کہانی کا تانا بانا جس چابک دستی سے تیار کیا ہے وہ واقعی قابلِ داد ہے۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ غلام عباس ایک مخصوص طرزِ احساس کے افسانہ نگار ہیں اور اس اعتبار سے انھیں اردو میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ وہ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں سب سے الگ ہیں اور اس حد تک مختلف کہ کسی دوسرے سے ان کا مقابلہ و موازنہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

* *

آنندی

(۱۹۴۸)

* اس مجموعے کا متن "آنندی" کے پہلے ایڈیشن ۱۹۴۸ء کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔

یہ افسانے میں نے دلی میں ۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مختلف وقتوں میں لکھے۔ اس لحاظ سے یہ میرے دلی کے قیام کی یادگار ہیں۔ اور ان میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی افسانوں کا تمدنی اور جغرافیائی پس منظر بھی دلی ہی ہے۔ اگرچہ میں نے ۱۹۳۹ء سے پہلے بھی متعدد افسانے لکھے تھے مگر اس مجموعہ کی مندرجہ بالا خصوصیت کے پیش نظر ان کو اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

غلام عباس

جواری

پولیس نے ایسی ہوشیاری سے چھاپہ مارا تھا کہ ان میں سے ایک بھی بچ کر نہیں نکل سکا تھا اور پھر جاتا بھی تو کہاں بیٹھک کا ایک ہی زینہ تھا جس پر پولیس کے سپاہیوں نے پہلے ہی قبضہ جما لیا تھا۔ رہی کھڑکی۔ اگر کوئی من چلا جان کی پروا نہ کر کے اس میں سے کود بھی پڑتا تو اول تو اس کے گھٹنے ہی سلامت نہ بچتے۔ اور بالفرض زیادہ چوٹ نہ آئی تو بھی اسے بھاگنے کا موقع نہ ملتا۔ کیونکہ پولیس کے صف در جن سپاہی نیچے بازار میں بیٹھک کو گھیرے ہوئے کھڑے تھے — اور یوں وہ سب کے سب جواری جن کی تعداد دس تھی پکڑ لیے گئے تھے۔

اتفاق سے اس دن جو جواری اس بیٹھک میں آئے تھے۔ ان میں دو ایک پیشہ وروں کو چھوڑ کر باقی سب کبھی کبھار کے شوقیہ کھیلنے والے تھے اور یوں بھی عزت دار اور آسودہ حال تھے۔ ایک ٹھیکہ دار تھا۔ ایک سرکاری دفتر کا عہدہ دار۔ ایک مہاجن کا بیٹا تھا۔ ایک لاری ڈرائیور تھا اور ایک شخص چمڑے کا کاروبار کرتا تھا۔

ان میں دو شخص ایسے بھی تھے جو بے گناہ پکڑ لیے گئے تھے۔ ان میں ایک تو سن رسیدہ بزاز تھا۔ ہر چند وہ کبھی کبھی کھیل بھی لیا کرتا تھا۔ مگر اس شام وہ قطعاً اس مقصد سے وہاں نہیں گیا تھا۔ وہ دکان پر ایک دوست کو بٹھا کر دس کے نوٹ کی ریزگاری لینے آیا تھا۔ ریزگاری لے چکا تو چلتے چلتے ایک کھلاڑی

کے پتوں پر نظر پڑ گئی۔ پتے غیر معمولی طور پر بٹتے تھے۔ یہ دیکھنے کو کہ وہ کھلاڑی کیا چال چلتا ہے، یہ ذرا سی دیر رکا تھا کہ اتنے ہی میں پولیس آ گئی اب پھر کہاں جا سکتا تھا!

دوسرا شخص ایک عمر رسیدہ وثیقہ نویس تھا۔ جو ٹھیکیدار کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا اس بیٹھک میں پہنچ گیا تھا۔ ٹھیکیدار سے اس کی پرانی صاحب سلامت تھی اور وہ چاہتا تھا کہ ٹھیکیدار اس کے بیٹے کو بھی چھوٹا موٹا ٹھیکہ کا کام دلا دیا کرے۔ یہ وثیقہ نویس کئی دن سے ٹھیکیدار کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اور آخر ملا بھی تو کہاں جہاں نہ تو ٹھیکیدار کو کھیل سے فرصت تھی۔ اور نہ اسے اتنے آدمیوں کے سامنے مطلب کی بات کہنے کا یارا۔ ٹھیکیدار کھیل میں منہمک تھا اور وثیقہ نویس اس سوچ میں کہ وہ کون سی ترکیب ہو سکتی ہے جس سے یہ کھیل گھڑی بھر کے لئے تھم جائے اور دوسرے سب لوگ اٹھ کر باہر چلے جائیں مگر اس قسم کی کوئی صورت اسے نظر نہ آتی تھی۔ ادھر ٹھیکیدار تھا کہ گھنٹوں سے برابر کھیلے چلا جا رہا تھا۔ آخر وثیقہ نویس مایوس ہو کر چلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں پولیس آ گئی اور جواریوں کے ساتھ اسے بھی دھر لیا گیا۔

ان دونوں نے اپنی بے گناہی کے بہتیرے ثبوت پیش کئے مگر پولیس نے ایک نہ سنی۔ باقی کے لوگ پولیس کے اس اچانک دھاوے سے ایسے دم بخود رہ گئے تھے کہ کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ سپاہیوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ پہلے تو سب کو بیٹھک سے نیچے اتارا۔ پھر ان کے گرد گھیرا ڈال انہیں پیدل تھانے لے چلے۔

یہ بھی قسمت ہی ہوا کہ جھٹپٹا وقت تھا۔ محلے میں زیادہ لوگوں کی نظر نہ پڑی اور یہ لوگ کوٹ کے کالر یا پگڑی کے شملے میں منہ چھپائے، تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے جلد ہی تھانے پہنچ گئے۔ جہاں تھانیدار کے حکم سے ان سب کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

حوالات کی یکسوئی میں جب ان لوگوں کو تماشائیوں کی استہزا بھری نظروں اور سپاہیوں کے کڑے تیوروں اور کرخت لہجوں سے امان ملی اور جان پہچان کے لوگوں سے مڈبھیڑ کا خوف بھی نہ رہا تو قدرتی طور پر سب سے پہلے ان کا دھیان بیٹھک کے مالک کی طرف گیا جو ان سب کے ساتھ ہی حوالات میں بند تھا۔ ہر شخص اسی کو اپنی بربادی کا باعث سمجھتا تھا۔ چنانچہ سب کو اس پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اگر یہ شخص احتیاط کو کام میں لاتا۔ مکان کو سرائے نہ بنا لیتا کہ ہر ایرا غیرا منہ اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ بیٹھک کے باہر کسی مخبر کا انتظام کرتا۔ نیز پولیس والوں سے اپنے تعلقات خوش گوار رکھتا تو ان لوگوں پر یہ برا وقت کبھی نہ آتا۔

بیٹھک کے مالک کا نام تو خدا جانے کیا تھا مگر سب لوگ اسے بجو بجو کہا کرتے تھے۔ یہ شخص درمیانے قد اور چھریرے بدن کا تھا۔ شربتی آنکھیں جن میں سرمے کے ڈورے۔ سلیٹی رنگت۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ چہرے پر چیچک کے ہلکے ہلکے سے داغ۔ دانت پانوں کے کثرتِ استعمال سے سیاہی مائل سرخ ہو گئے تھے۔ گھنگھریالے بال جو ہر وقت آنولے کے تیل میں بسے رہتے۔ بائیں طرف سے مانگ نکلی ہوئی دائیں طرف کے بال ایک لہر کی صورت میں پیشانی پر پڑے ہوئے ململ کا کرتا جس میں سونے کے بٹن لگے ہوئے۔ گلے میں چھوٹا سا سونے کا تعویذ۔ سیاہ ڈورے میں بندھا ہوا۔ اس کا کرتا ہمیشہ اجلا ہوتا۔ مگر دھوتی میلی کچیلی۔ سردیوں میں اس لباس پر ایک پرانا سرخ دوشالہ زری کے حاشیے والا اوڑھ لیا کرتا۔ اس کی حرکات میں بلا کی پھرتی تھی۔ جتنی دیر میں کوئی مشاق سے مشاق جواری ایک دفعہ تاش پھینٹے اور بانٹے۔ یہ اتنی دیر میں کم سے کم دو دفعہ تاش پھینٹتا اور بانٹ دیتا تھا۔

بجو پہلے ہی سے اس حملے کے لئے تیار تھا۔ پولیس کے چھاپہ مارنے سے لے کر اس وقت تک تو اس نے چپ سادھے رکھی تھی اور اس سارے قضیے میں اس کا رویہ ایک بیگانے کا سا رہا تھا۔ مگر اب جب سب طرف سے اس پر تیز تیز نظروں کے حملے شروع ہوئے تو اس نے ایک عجز بھری اور اپنی مدافعت میں ایک لطیف مسکراہٹ جس میں خفیف سی شوخی بھی ملی ہوئی تھی اپنے ہونٹوں پر طاری کی۔ یہ مسکراہٹ چند لمحے قائم رہی۔ پھر اس نے نہایت اطمینان کے ساتھ سب پر ایک نظر ڈالی اور بڑی خود اعتمادی کے لہجے میں کہا:

”آپ لوگ بالکل بھی فکر نہ کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ میں سے کسی کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ میرے ہاں پچھلے پانچ برس میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسے تو کیا کہنا چاہئے۔ بس سمجھو مذاق!“

جواریوں نے بجو کی اس بات کو سنا پر اس سے ان کے غصے میں ذرا بھی کمی نہ ہوئی۔ بعض نے گردن ہلائی بعض نے بازو جھٹک دیئے۔

”ہوں ــــ مذاق سمجھیں۔ یہ اچھی رہی!“ ٹھیکیدار نے کہا۔

”لاحول ولا قوۃ“ پھیری کے سوداگر نے ذرا جھنک کر کہا۔ ”عجب آدمی ہو یار! یہاں لاکھ کی عزت خاک میں مل رہی ہے اور تم اسے مذاق بتا رہے ہو!“

”ناراض کیوں ہوتے ہو شیخ جی۔ میں نے جو کہا آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے نکلو گے مونچھ پر تاؤ دیتے!“

"چل ہٹ لپاڑیا کہیں کا۔" ٹھیکیدار نے کہا۔

"لپاڑیا کون۔ میں؟" نکو نے تنک کر کہا۔ "خیر جو جی میں آئے کہہ لو۔ مگر میں پھر کہتا ہوں کہ تم میں سے کسی پر آنچ تک نہ آئے گی۔"

وہ جواری جو کسی سرکاری دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھا اسے جوئے سے سخت نفرت تھی مگر جب کبھی اس کی بیوی بچوں کو لے کر میکے جاتی تو اسے اس بیٹھک ہی کی سوجھتی۔ دفتر سے اٹھ کر سیدھا یہیں کا رخ کیا کرتا۔ ہر بار ہارتا اور اپنے کو کوستا۔ عہد کرتا پھر کبھی نہ آؤں گا۔ مگر اگلے روز سب سے پہلے پہنچتا۔

اس شخص نے نکو کی یہ بات سنی ان سنی کر کے فریاد کے لہجے میں کہنا شروع کیا:

"ارے بھائی میں لٹ گیا۔ میں سرکاری آدمی ہوں۔ میری عزت دو کوڑی کی ہو گئی۔ ہائے میرے بیوی بچے۔ نکو! تو نے مجھے برباد کر دیا۔ ہائے——"

"سنو تو سہی ملک صاحب!"

"ارے کیا خاک سنوں، ہائے وہ کون سا منحوس دن تھا جب میں نے تیری صورت دیکھی۔ ارے یارو! میں سرکاری ملازم۔ اگر میرے دفتر والوں کے کان میں بھنک بھی پڑ جائے تو بدنامی—— ارے بدنامی کو تو گولی مارو۔ یہاں پندرہ برس کی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ ہائے میرے بیوی بچے——"

مہاجن کا بیٹا جس نے دولت کمانے کا یہ سہل اور دلچسپ طریقہ نیا نیا سیکھا تھا اب تک تو بڑے ضبط سے کام لے رہا تھا۔ مگر ملک کا یہ واویلا سن کر یکبارگی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"صبر کرو چھوٹے شاہ جی صبر کرو۔" نکو نے کہا۔ "تم تو یار عورتوں کی طرح رونے لگے۔ مرد ہو۔ ارے بھائی یہ تو بات ہی کچھ نہیں ہے۔"

"میرے باپ کو پتہ چل گیا۔" مہاجن کے بیٹے نے سسکیاں لے لے کے کہا۔ "تو وہ ایک دم مجھے گھر سے نکال دیں گے۔"

"ارے یار چھوڑو بھی۔ کوئی گھر سے نہ نکالے گا۔" نکو نے کہا۔

"نکو" ملک نے کہا۔ "یہ سب تیرا کیا دھرا ہے۔"

"ملک صاحب" نکو نے پرزور لہجہ میں کہا۔ "آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں آپ میری بات مانیں۔ میں جو کہہ رہا ہوں کہ آپ پر ذرا آنچ نہ آئے گی۔ یوں نکال لاؤں گا جیسے مکھن میں سے بال

نکالتے ہیں۔"

"بس رہنے دے بھائی" ملک نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا۔ "اگر یہی دم خم تھا تو پولیس کو آنے ہی کیوں دیا ہوتا!"

"ملک صاحب آپ میری بات مانیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ بات اصل میں یوں ہے کہ تھانے دار اپنا ہی آدمی ہے۔ سمجھے آپ۔ وہ میرا بڑا مہربان ہے۔ وہ آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ میرے منہ پر تھوک دینا اگر کچھ کہا۔"

نکو کی یہ بات سن کر سب جواری پل بھر کو خاموش کچھ سوچتے رہے۔ بعض تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق اس کی بات پر یقین کر لینا چاہتے تھے اور بعض کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کچھ فیصلہ نہیں کر سکے کہ انہیں نکو پر بھروسہ کرنا چاہئے یا نہیں۔ البتہ یہ ظاہر تھا کہ رفتہ رفتہ ان کا غصہ اترتا جا رہا تھا۔

"دیکھو نکو" چھرے والے شیخ جی نے کہا۔ "میں سو پچاس کی پروا نہیں کرتا مگر میری عزت بچ جائے ویسے بات تو کچھ بھی نہیں ہے اور یوں خود میرا بہنوئی سب انسپکٹر پولیس ہے مگر تو پتہ ہے کس سے کہنے والی بات ہے!"

"شیخ جی آپ ذرا بھی چنتا نہ کریں۔ میں جو کہہ رہا ہوں اسے آپ مذاق نہ سمجھیں کبھی کبھی دل لگی کر لیا کرتا ہے میرا یار۔"

"کون؟" مسکین بیچارے لاری والے کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ وہ اتنے بڑے بڑے آدمیوں کو اس مصیبت میں اپنا ساتھی دیکھ کر اپنا دکھڑا بھول گیا تھا۔

"ارے بھئی آپ کے تھانے دار صاحب بہادر۔" یہ کہہ کر نکو ہنس پڑا۔

وہ جواری جو لاری چلاتا تھا کونے میں کھڑا کچھ دیر نکو کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے قریب آیا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگا:

"دیکھو نکو۔ مجھے صبح سویرے لاری میں خشک میوہ بھر کے دور لے جانا ہے ٹھیکیدار میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ اگر تیری واقعی یہاں کسی سے واقفیت ہے تو کوئی ایسی ترکیب کر کہ میں صبح سے پہلے پہلے یہاں سے خلاصی پا جاؤں۔"

یوں تو دھیرے دھیرے سبھی لوگ آخر کار نکو کی باتوں پر کان دھرنے لگے تھے۔ مگر اس لاری ڈرائیور نے جس لہجہ میں نکو سے خطاب کیا۔ اس نے قطعی طور پر نکو کے ساتھیوں میں اس کا اقتدار قائم

کر دیا۔ بگو نے بھی اسے محسوس کیا اور اپنی اس کامیابی پر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ البتہ لاری ڈرائیور نے جماعت سے علیحدہ ہو کر تنہا اپنی ذات کے لئے جو سفارش کی تھی اس کو سب نے ناپسند کیا اور اسے لاری ڈرائیور کی خود غرضی اور کمینگی پر محمول کیا گیا۔

بگو نے، جس کے لہجے میں اب اور بھی زیادہ خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی، لاری ڈرائیور سے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا:

"مرزا جی۔ میری جان۔ گھبراؤ نہیں۔ اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔"

"انتظام ونتظام خاک نہیں ہوگا۔" اچانک وشیتو نولیس نے جھلا کر کہا۔ "مرزا تم بھی اس ڈھنگے کی باتوں میں آ گئے جو سر پر پڑی ہے اسے خود ہی بھگتو۔"

بگو نے وشیتو نولیس کے اس غیر متوقع حملے کو بڑی چابکدستی سے روکا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"لو بڑے میاں کی بات سنو۔" اس نے کہا۔ "ہوں انتظام نہیں ہوگا اور یہاں مال جو کھلایا جاتا ہے ہر مہینے۔ بھائی میں پھر کہتا ہوں کہ اسے مذاق ہی سمجھو۔ میں ہندو مسلمان والی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ کسی کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ وہ یوں کہ تھانے دار — اب کیا بتاؤں تمہیں۔" وہ ہنس پڑا۔ "کیسے جو دیا بتاتی آدمی ہے — اب تم بھولے کے ہی رہو گے۔ پر ذکر مت کرنا بیٹھنا کسی سے ورنہ پھنس جاؤ گے۔ میرا دوش نہیں ہوگا۔ وہ بات یوں ہے کہ تھانے دار — اب تم سے کیا چھپانا — بھئی میری اس کی رشتہ داری ہے۔ سن لیا! کیوں بڑے میاں اب تو ہو گئی تسلی۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو پچھلے پانچ برس سے اتنے بڑے شہر میں یہ دھندا بھلا کیسے چلتا رہتا۔"

بگو نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اقتدار کی عمارت پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم ہو چکی تھی۔

ان جواریوں میں ایک شخص تھا جس کے بشرے سے کوئی صدمہ یا رنج ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس سارے واقعہ کے دوران میں بالکل خاموش رہا تھا وہ اٹھائیس برس کا ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ لباس اور وضع قطع کی طرف سے خاصا بے پروا معلوم ہوتا تھا۔ مدت ہوئی اس شخص نے ناتجربہ کاری کی وجہ سے ایک خاصی معقول رقم ہاری تھی۔ بس اسی دن سے یہ عہد کر رکھا تھا کہ جس روز ہاری ہوئی رقم کو واپس جیت لوں گا جوئے کا پھر کبھی نام نہ لوں گا۔ اس بیٹھک میں آنے سے گھنٹہ دو گھنٹے پہلے کسی باغ میں بیٹھ کر کھیل کا ایک پروگرام سا بنایا کرتا۔ چالیں تک سوچ رکھتا۔ بے حد احتیاط سے کھیلتا۔ نہ تاؤ کھاتا نہ جوش میں آتا۔ مگر بدقسمتی سے ہاری ہوئی رقم روز بروز بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا قرض بھی۔

اس شخص کو رسوائی، قید اور جرمانے کا تو ذرا غم نہ تھا۔ البتہ اس بات کی فکر ضرور تھی کہ یہ سب کے سب ذرا ڈر گئے ہیں۔ بچ گئے جب بھی اور پھنس گئے جب بھی اس بیٹھک کا رخ نہ کریں گے۔

ادھر بگو نے اب حالات پر پورا قابو پا لیا تھا۔ اگرچہ وہ رات رات میں کسی کی ضمانت کا بھی انتظام نہیں کر سکا تھا۔ تاہم اس نے کسی نہ کسی طرح ہر شخص کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ تھانے دار اگر اس کا قریب کا نہیں تو دور کا قرابت دار ضرور ہے اور صبح ہوتے ہی اسے رہا کر دیا جائے گا۔ چنانچہ سب لوگ زمین پر وہ پھٹے پرانے بدبودار کمبل بچھا کر جو سپاہیوں نے لا دیئے تھے، چپکے سے ہو کر پڑ رہے۔

"اوہوں غضب ہو گیا!" اچانک بگو نے کہا اور وہ لیٹے لیٹے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیوں کیوں خیر تو ہے؟" اندھیرے میں جواریوں نے پوچھا۔

"بھئی اگر پتہ ہوتا کہ یہاں رات کاٹنی پڑے گی تو تاش ساتھ لیتے آتے اور مزے سے ساری رات کھیلتے...... کہو تو ابھی کسی سپاہی کو بھیج کر تاش اور موم بتی منگا لوں؟"

"نہ بابا معاف کرو۔" کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔

"تم جانو۔" بگو نے بے پروائی سے کہا گویا ایسا نہ کرنے میں انہیں کا نقصان ہے۔ "ورنہ اچھی خاصی دل لگی رہتی۔ صبح کو تھانے دار کو سناتے تو وہ بھی خوب ہنستا......"

اگلے روز صبح کوئی نو بجے کے قریب ایک سپاہی حوالات کے سلاخ دار دروازے کے باہر آ کر کھڑا ہوا اور بلند آواز سے پکار کر کہنے لگا:

"او جواریو! اٹھو۔ تمہاری داروغہ صاحب کے سامنے پیشی ہے۔"

جواری دیر سے اس حکم کے منتظر تھے۔ سب کی نظریں بے اختیار بگو کی طرف اٹھ گئیں۔ بگو نظریں ترچھی کر کے ایک خاص ادا سے مسکرا دیا۔

پانچ منٹ کے بعد یہ دسوں آدمی تھانے کے چھوٹے سے میدان میں قطار باندھے کھڑے تھے۔ پانچ منٹ، دس منٹ، آدھا گھنٹہ گزر گیا مگر تھانے دار کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس دوران میں بگو برابر اپنے لطیفوں، پھبتیوں اور ہنسی مذاق کی باتوں سے اپنے ساتھیوں کا دل بہلاتا رہا۔ مگر جب ایک گھنٹہ گزر گیا اور تھانے دار نظر نہ آیا تب تو سب جواری بہت گھبرائے۔ ہنسی ان کے ہونٹوں سے غائب ہو گئی، سب کے چہرے اتر گئے اور ایک بدگمانی کی لہر ان میں چلی۔ وہ بار بار فکرمندی کے ساتھ بگو کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھتے اور بگو جواب میں ہر ایک کو ہاتھ سے صبر کا اشارہ کر دیتا۔ اس

عرصے میں دو تین سپاہی ان جواریوں کے پاس سے گزرے اور بلّو نے ہر ایک کو "خاں صاحب جی! خاں صاحب جی" کہہ کر اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ مگر نہ تو انھوں نے بلّو کی بات کا کوئی جواب دیا اور نہ پلٹ کر ہی اس کی طرف دیکھا۔

آخر جب انھیں کھڑے کھڑے پورے دو گھنٹے گزر گئے اور ان کی ٹانگیں تھک کر چور ہو گئیں تو ایک سپاہ ولاری تھانے کے اندر داخل ہوئی۔ اس میں سے تھانے دار اور کئی سپاہی نکلے۔ تھانے دار کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے اور سپاہیوں کے کندھوں پر بندوقیں۔ انھیں خالی ہاتھ لوٹتے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ جس مہم پر وہ صبح ہی صبح گئے تھے اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی اور یہ مہم ضرور کچھ بڑی ہی اہم ہوگی جبھی تو تھانے دار پریشان سا نظر آ رہا تھا۔

بلّو دور ہی سے تھانے دار کو دیکھ کر اچھل پڑا۔

"وہ آ گیا میرا موتیوں والا۔" اس نے کہا۔ "بس اب گھبراؤ نہیں۔ دو تین ہی منٹ میں بیڑا پار ہوا چاہتا ہے۔"

یہ کہہ کر بلّو نے دور ہی سے تھانے دار کو ایک فرشی سلام کیا۔ تھانے دار کی یا تو اس پر نظر نہیں پڑی یا پھر اس نے دانستہ نظریں پھیر لیں اور وہ سپاہیوں کی بارکوں میں چلا گیا۔

"بلّو" رفیقو نے طعن آمیز لہجہ میں کہا۔ "میں جانوں تھانے دار کی تم پر نظر نہیں پڑی ورنہ وہ تمہارے سلام کا جواب ضرور دیتا۔"

"اجی توبہ کرو۔" بلّو نے کہا۔ "تھانے دار میرے سلام کا جواب کبھی نہیں دے گا۔ بھائی وہ اس وقت رعب میں ہے۔ رعب میں کیا سمجھے! تھانے داری ہے کچھ مذاق تھوڑا ہی ہے۔ ہم سے سیدھے منہ بات کرے تو سپاہیوں پر رعب کیسے جمائے۔ کل کو کوئی سپاہی اسے ناک چنے نہ چبوا دیں۔ اور سپاہی تم جانو مداری کے بندر کی طرح ہوتے ہیں کہ جب تک لاٹھی نظر آتی رہے ڈگڈگی پر ناچتے رہتے ہیں۔ جہاں مداری نے ذرا ڈھیل دی وہیں لگے اچھلنے سر پر سوار ہونے......"

پانچ منٹ کے بعد تھانے دار چند سپاہیوں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا بارکوں میں سے نکلا اور ان جواریوں کے پاس سے گزرتا ہوا تھانے کے پھاٹک پر جا کھڑا ہوا اور وہاں کھڑے کھڑے بدستور سپاہیوں سے باتیں کرتا رہا۔

اتنے میں تھانے کے دفتر میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ذرا سی دیر میں ایک سپاہی دوڑتا ہوا تھانے دار کے پاس پہنچا۔ جب تھانے دار تیزی سے واپس آ رہا تھا تو بلّو نے ایک بار پھر اسے سلام کیا۔ تھانے دار

نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دفتر میں چلا گیا۔

"کہا تھا نا!" بلّو نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "میرے سلام کا جواب نہیں دے گا۔ کیوں جواب دے؟"

سب جواری خاموش رہے۔

"ایک دن۔" بلّو نے پھر کہنا شروع کیا۔ "تھانے میں بس وہ اور میں ہی تھے کوئی سپاہی آس پاس نہیں تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ ایسی گدگدیاں کیں کہ ہنسا ہنسا کے برا حال کر دیا۔"

تھانے دار کوئی آدھ گھنٹے تک دفتر کے اندر ہی رہا۔ یہ لوگ پھر بے صبر ہو چلے تھے۔ اتنے میں وہی سپاہی جس نے صبح آ کر پیشی کی اطلاع دی تھی۔ دفتر سے نکلا اور سیدھا ان کے پاس آ کر اپنے اکھڑ لہجے میں کہنے لگا:

"او جواریو! سنو۔ داروغہ صاحب نے حکم دیا ہے کہ تم سب کے سب دھوتی پاجامہ کھول کے زمین پر ایک قطار میں اوندھے لیٹ جاؤ۔ پھر تم میں سے سرے والا آدمی ایک ایک کرکے اٹھے اور ہر ایک کے دس دس جوتے لگا کے خود دوسرے سرے پر اوندھا لیٹتا جائے۔ غرض اسی طرح سب کے سب باری باری ہر ایک کے دس دس جوتے لگا دیں۔"

تھانے دار کا یہ حکم اتنا غیر متوقع تھا کہ سب جواری ہکا بکا رہ گئے۔ اور سراسیمہ ہو کر سپاہی کا منہ تکنے لگے۔

"الّوؤں کی طرح میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ اگر حکم سمجھ میں نہ آیا ہو تو پھر سنا دوں؟" یہ کہہ کر جواب کا انتظار کیے بغیر سپاہی نے وہی الفاظ پھر دہرا دیے۔

اس پر چھیتو، لیس اور من سکھ جواری بے اختیار آگے بڑھ کر سپاہی کے قدموں سے لپٹ گئے۔

"خاں صاحب ہم بالکل بے قصور ہیں۔" انھوں نے یک زبان ہو کر گڑگڑا کر کہا۔ "یہ سب لوگ گواہی دیں گے کہ ہم بالکل بے گناہ ہیں۔ جس وقت پولیس آئی ہم نہ تو کھیل رہے تھے اور نہ اس ارادے سے وہاں گئے تھے۔ ہم بے گناہ ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ ہم بالکل بے قصور ہیں۔"

"میں کچھ نہیں کر سکتا۔" سپاہی نے کہا۔ "داروغہ صاحب کا یہی حکم ہے۔"

"خاں صاحب جی! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ آپ ہماری طرف سے ہاتھ جوڑ کر حضور سے کہہ دیں کہ ہم دونوں بے گناہ پکڑے گئے ہیں۔ سب لوگ اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔"

"میں گواہی ووہی کچھ نہیں جانتا۔" سپاہی نے کہا۔ "داروغہ صاحب نے سب کے لیے یہی حکم

دیا ہے۔ ہاں اور سنو۔ انھوں نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ راضی نہ ہوں تو ان سب کو پھر حوالات میں بند کر دیا جائے۔ دیکھو دیر نہ کرو۔ مجھے داروغہ صاحب کے ساتھ ابھی ابھی باہر جانا ہے۔ لاری تیار کھڑی ہے۔ تم نے دیر کی تو میں پھر سب کو حوالات میں بند کر دوں گا۔"

شیخ قولیس اور من سنگھ دونوں مایوس ہو کے پھر قطار میں آ کھڑے ہوئے۔ ان کا یہ انجام دیکھ کر کسی جواری کو لب ہلانے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور وہ سخت پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ ان کی نظریں بار بار بُلّو پر پڑتی تھیں۔ مگر وہ ان کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں تھانے کے دفتر کی دیواروں پر گڑی ہوئی تھیں جو گویا دیواروں کو چھیدتی ہوئی تھانے دار کو ڈھونڈ نکالنا چاہتی تھیں۔

"دیکھو دیکھو۔" سپاہی نے کہا۔ "تم لوگ دیر کر رہے ہو۔ مجھے مجبوراً تم سب کو حوالات ہی میں بند کر دینا پڑے گا۔"

اس پر بھی جواری ابھی لیت و لعل ہی کر رہے تھے کہ اچانک کسی کے دھڑام سے زمین پر گرنے کی آواز آئی۔

یہ بُلّو تھا جو دھوتی کھولے زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر من سنگھ کی ہمت بندھی اور اس نے بھی بُلّو کی پیروی کر ہی دی۔ اکاؤنٹنٹ ملک اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ سپاہی نے پیچھے سے آ گدی سے پکڑ زبردستی نیچے بٹھا دیا۔ اور اس نے ناچار اپنے نیکر کے بٹن کھول دیئے۔

سپاہی کے اس سلوک کو دیکھ کر دوسرے جواری آپ ہی آپ زمین پر لیٹ گئے۔ صرف چھرے والے شیخ جی کھڑے رہ گئے ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور صورت سے انتہا درجہ کی مظلومی برس رہی تھی۔ ان کا ہاتھ بار بار کمر بند پر پڑتا تھا مگر وہیں رہ جاتا تھا۔

ایسے معزز اور شریف صورت آدمی کو ایسی پریشانی میں دیکھ کر سپاہی کا دل پسیج گیا اور وہ جان بوجھ کر وہاں سے ٹل گیا۔ شیخ جی نے دل کڑا کیا پگڑی کے شملے سے آنسو پونچھے۔ گردن پھرا کر اپنے اردگرد نظر ڈالی اور پھر انتہائی مجبوری کے ساتھ بالآخر انھوں نے بھی تھانے دار کے حکم کی تعمیل کر دی۔

سرے پر لاری ڈرائیور تھا۔ سب سے پہلے جوتے لگانے کی اسی کی باری تھی۔ جس وقت وہ اٹھا تو بُلّو زور سے کھنکھارا۔ "مرزا جی سنبھل کے۔" اس نے کہا۔ "سب اپنے ہی آدمی ہیں یہاں۔ دیکھنے میں ذرا کام ٹھیک پڑے مگر...... سمجھ گئے نا......"

لاری ڈرائیور نے ابھی پانچ تک ہی گنتی کی تھی کہ وہی سپاہی تھانے کے دفتر سے نکلا اور اسے

ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "داروغہ صاحب کہتے ہیں۔" اس نے پاس آ کر کہا۔ "اگر تم لوگوں نے ٹھیک طرح سے جوتے نہ لگائے تو میں اپنے سپاہیوں سے جوتے لگواؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ پھر چلا گیا۔

جواریوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ خود ہی آپس میں زور زور کے جوتے لگوا لیں۔ چنانچہ کوئی تین منٹ کے بعد جب ہر ایک نے دس دس جوتے لگا لیے تو وہ اس کام سے نمٹ کر کپڑے جھاڑ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اتنے میں وہی سپاہی پھر آیا اور کہنے لگا۔ "جاؤ۔ آپ کے داروغہ صاحب نے تمہارا قصور معاف کر دیا ہے۔ پھر کبھی جوا نہ کھیلنا۔"

یہ لوگ تھانے میں سے یوں نکلے جیسے اپنے کسی بڑے ہی عزیز قریبی رشتہ دار کو دفن کر کے قبرستان سے نکلے ہوں۔ تھانے سے نکل کر کوئی سو گز تک تو وہ چپ چاپ گردنیں ڈالے چلا کیے۔ اس کے بعد بُلّو نے یکبارگی زور کا قہقہہ لگایا اتنے زور کا کہ وہ ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ "کیوں دیکھا!" اس نے کہا۔ "نہ چالان نہ مقدمہ نہ قید نہ جرمانہ۔ میں نہ کہتا تھا اسے مذاق ہی سمجھو!"

۱۹۳۷ء

ہمسائے

اس پہاڑی پر دو فقط دو ہی گھر تھے۔ مکان تو اصل میں ایک ہی تھا۔ مگر بعد میں اس کے مالک نے اس کے بیچوں بیچ لکڑی کی ایک پتلی سی دیوار کھڑی کر کے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اور اب اس میں الگ الگ دو خاندان رہتے تھے۔ پہاڑوں پر مکان ویسے ہی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس پر دو حصوں میں بٹ جانے سے اس کی مکانیت محض نام کو رہ گئی تھی۔ چنانچہ اس کے رہنے والوں کو اگر یہ تسلی نہ ہوتی۔ کہ وہ گرمی کا زمانہ پہاڑ پر بسر کر رہے ہیں۔ تو وہ بہت ہی آزردہ رہا کرتے۔

لکڑی کا بنا ہوا انگریزی وضع کا یہ مکان جس پر سرخ روغن کیا گیا تھا۔ پہاڑی کی ایک ڈھال پر واقع تھا۔ اس تک پہنچنے کے لئے لکڑی کا ایک لمبا زینہ چڑھنا پڑتا تھا۔ مکان کے سامنے تھوڑی سی زمین تھی جس کو ہموار کر کے پھلواری بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر وہ پھلواری بے توجہی کا شکار ہو کے رہ گئی تھی۔ اور اب اس میں ڈیلیا کا ایک آدھ پودا ہی رہ گیا تھا۔ جو گویا بڑی ڈھٹائی سے اس کی یاد کو قائم رکھنے پر مصر تھا۔

اس پھلواری کے سرے پر لکڑی کا ایک بنچ رکھا تھا۔ اس پر بیٹھتے تو نیچے وادی کا حسین مگر اداس اداس منظر دکھائی دیتا۔ جتنی دیر سورج غائب رہتا۔ ہلکی ہلکی نیلی دھند مکڑی کے جالے کی طرح اس منظر پر چھائی رہتی۔ اور ایسا نظر آتا۔ جیسے پانی میں عکس دیکھ رہے ہوں۔ جب سورج نکلتا۔ تو دھندلکا کی

سنہری ہو کر اس مرقع کو اور بھی حسین بنا دیتی۔ مگر چند ہی لمحوں کے بعد آنکھوں میں چکا چوند ہونے لگتی۔ اور دیکھنے والا جلد ہی اپنی نظریں پھیر لیتا۔

اگست کی ایک صبح کو ابھی آفتاب نے مشرقی سلسلۂ کوہ کی دو پہاڑیوں کے بیچ میں سے سر نکالا ہی تھا کہ ایک چھوٹا سا لڑکا ایک گھر میں سے نکلا۔ اس کی عمر مشکل سے آٹھ نو برس کی ہوگی۔ اس نے سرخ اون کا ٹوپ اور اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں بادامی رنگ کا فل بوٹ تھا۔ جس کے کنارے اوس میں بھیگ بھیگ کے سیاہ پڑ گئے تھے۔ لکڑی کے برآمدے سے اترتے ہی لڑکے کی نظر بے اختیار ساتھ والے گھر کی طرف اٹھ گئی۔ مگر اس کا دروازہ ابھی بند تھا۔ لڑکے کی نظریں اس کی طرف سے اس طرح ہٹ گئیں۔ گویا وہ کوئی مٹھائی یا کھلونوں کی دکان ہو۔ جسے دکان دار اپنی سستی کی وجہ سے وقت پر نہ کھولتا ہو۔ اس کے بعد اس کی نظر سامنے ڈیلیا کے پودے پر پڑی۔ جس میں ایک بڑا سا سرخ پھول صبح کی سنہری دھوپ میں بڑی تمکنت سے جھم جھما رہا تھا۔ اس پھول نے لڑکے کے دل کو لبھا لیا۔ اور وہ لپک کر اس کی طرف گیا۔ وہ کئی لمحوں تک حیرت سے اس کی طرف تکتا رہا۔ اوس کی ننھی ننھی بوندیں اس کی پنکھڑیوں پر لرز رہی تھیں اور ان میں پھول کا عنابی رنگ جھلملاتا ہوا بہت بھلا لگتا تھا۔ لڑکے نے ایک بار پھر ساتھ والے گھر پر نظر ڈالی۔ اور پھر بڑی احتیاط سے پھول کو توڑ لیا۔

وہ خوشی خوشی پھول کو ہاتھ میں تھامے ساتھ والے گھر کے برآمدے میں پہنچا۔ اور گھر کے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ مگر وہ اندر سے بند تھا۔ اس دروازے کے اوپر کے حصے میں شیشے جڑے ہوئے تھے۔ جن میں سے اندر کا اودے رنگ کا قنابی سا پردہ نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر دروازے کے پاس ہی کھڑا رہا۔ جیسے سوچ رہا ہو دروازہ کھٹکھٹائے یا نہیں کہ اتنے میں لکڑی کے فرش پر بھاری بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور ساتھ ہی چٹخنی کے کھلنے کی آواز آئی۔ لڑکا سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اور اس کا وہ ہاتھ جس میں ڈیلیا کا پھول تھا۔ آپ سے آپ پیٹھ کے پیچھے چلا گیا۔

ایک بھاری بھرکم آدمی شب خوابی کا لباس پہنے، کمبل کی بکل مارے ایک ہاتھ سے مسواک کرتا دوسرے میں تھیلا تھامے باہر نکلا۔ پہلے تو اس نے لڑکے کی طرف توجہ نہ کی۔ مگر برآمدے سے نیچے قدم رکھتے ہی وہ مڑا۔

''کیا بات ہے اکبر میاں؟'' اس نے لڑکے سے پوچھا۔

''جی کچھ نہیں۔'' لڑکے کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک اچانک مدھم پڑ گئی تھی۔

''بیری سے کھیلنے آئے ہو؟''

''جی......'' اور وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

''بیری تو سو رہی ہے ابھی۔''

لڑکے نے نظریں جھکا لیں۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

''تمہارے ہاتھ میں کیا ہے اکبر میاں؟'' اس شخص نے پوچھا۔

''جی پھول ہے۔'' اور اس نے ڈرتے ڈرتے پھول سامنے کر دیا۔ اس کا چھوٹا سا ہاتھ شبنم سے ابھی تک گیلا ہو رہا تھا۔

''بیری کے لئے؟''

''جی......''

''بیری تو سو رہی ہے۔ اور پھر ابھی سویرا بھی تو ہے۔''

لڑکے نے اس کا بھی کچھ جواب نہ دیا۔

''آج اتوار ہے نا۔ تم اور بیری دن بھر خوب کھیلنا۔''

یہ اس شخص نے چلتے چلتے کہا۔ پھر وہ مسواک کرتا ہوا کاٹھ کے زینے سے اتر گیا۔ اور اس پگڈنڈی پر ہو لیا جو بل کھاتی ہوئی نیچے پہاڑی کے دامن تک چلی گئی تھی۔ جب تک پگڈنڈی کے پیچ و خم اس شخص کو کبھی چھپاتے کبھی دکھاتے رہے، اکبر برابر برآمدے میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ آخر جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تو اکبر نے ایک اور بے ساختہ نظر ساتھ والے گھر پر ڈالی، اور پھر برآمدے سے اتر کر وہ ڈیلیا کے پودے کے پاس چلا آیا۔ جس میں اب کوئی دلکشی نہیں رہی تھی۔ وہ شاخ جس سے اس نے پھول توڑا تھا۔ ننگی لُچی سی نظر آ رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو ''اب مجھ میں اور کوئی پھول نہیں آئے گا۔''

اکبر پودے کے پاس سے ہٹ آیا۔ اور بنچ پر بیٹھ گیا۔ سورج اب لمبے لمبے پہاڑی بادلوں کو پیچھے چھوڑ کر پہاڑیوں کے جھرمٹ سے نکل آیا تھا۔ اور اس نے نڈر ہو کر اپنا سفر طے کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دھند جو نچلی وادی پر چھائی ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے دھوپ میں تحلیل ہو رہی تھی۔ اور نیچے کا منظر لحظہ بہ لحظہ نکھرتا آ رہا تھا۔ آس پاس کے مکانوں کی کھڑکیوں میں انسانی چہرے نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے۔ طرح طرح کی اضطراری حرکتیں ان سے ظاہر ہو رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ دماغ نے جس پر ابھی نیند کا اثر تھا۔ جسم کی حرکات پر قابو رکھنا شروع نہیں کیا۔

نیچے دور سے اکبر کے اسکول کی گرجا نما عمارت نظر آ رہی تھی۔ جس پر بادِ نما صور بنا ہوا تھا۔ ایک مکان کی انگنائی میں جو نشیب میں واقع تھا۔ ایک گرہستن چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے کپڑے نچوڑ نچوڑ کر الگنی پر ڈال رہی تھی۔ قریب ہی دیودار کی ایک شاخ پر ایک خوش رنگ چڑیا اپنی ننھی چونچ سے اپنی دم کے بال سونت رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ ادا سے چہک بھی اٹھتی تھی۔

اکبر اس نظارے میں ایسا محو ہوا۔ کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ اور اس نے ڈیلیا کے پھول کی ایک پتی نوچ لی۔ جب اسے اپنی اس حرکت کا علم ہوا۔ تو اس نے ایک ایک کر کے ساری پتیاں نوچ ڈالیں۔ اور ڈنٹھل کو ہوا میں اچھال دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ڈنٹھل کو نیچے دور تک کھڈ میں گرتے دیکھتا رہے گا۔ مگر وہ تھوڑی ہی دور پر ایک جھاڑی میں اٹک کر رہ گیا۔

ایکا ایکی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ سورج کی ساری روز دھوپ کو بادلوں کے ایک جھرمٹ نے چھپا لیا اور پھر ایک ہی دم بوندیاں آنے لگیں۔

گرہستن نے منہ اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا۔ اور پھر جلد جلد سارے کپڑے الگنی پر سے اتار لئے۔ جس گھر سے اکبر نکلا تھا۔ اس میں سے ایک اور لڑکا دوڑتا ہوا برآمدے میں آیا۔ اس کا لباس بھی قریب قریب ویسا ہی تھا۔ جیسا اکبر کا تھا۔ مگر اس کی عمر پانچ برس سے زیادہ نہ تھی۔

''بھائی جان۔'' اس نے چلا کر کہا۔ ''امی بلا رہی ہیں۔''

اکبر نے کچھ جواب نہ دیا۔

''بھائی جان۔ امی کہتی ہیں ناشتہ کر لو۔''

اکبر نے اب بھی کچھ جواب نہ دیا۔ وہ بدستور گھر کی طرف پیٹھ کئے بنچ پر بیٹھا رہا۔

لڑکا اندر چلا گیا۔ مگر پل بھر کے بعد وہ پھر آیا۔

''بھائی جان۔ امی خفا ہو رہی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''سن لیا سن لیا۔'' یا آخر اکبر نے گردن پھیری۔ ''آتا ہوں، آتا ہوں۔''

چھوٹا لڑکا پھر اندر چلا گیا۔ ایک لمحہ بھی نہ گزرا تھا۔ کہ ایک عورت جس کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والی بنفشی رنگ کی ساڑی کو لپیٹے پریشان ہوتی ہوئی برآمدے میں نمودار ہوئی۔

''اکبر بیٹے۔'' اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اندر کیوں نہیں آتے میرے لعل ناشتہ کیوں نہیں کرتے۔ بوندیاں آ رہی ہیں اور تم مینہ میں بیٹھے بھیگ رہے ہو۔ دادا بھی واوا۔ اور کہیں زکام ہو گیا تو۔ ابھی تو بیماری سے اٹھے ہو۔ جلدی سے آ جاؤ میرے پیارے۔''

"میں آ ہی رہا تھا بھائی جان۔" اکبر نے بنچ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ مینہ سے بچنے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتا، بیچ بیچ قدم اٹھاتا برآمدے میں آیا۔ اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ایک بار پھر ساتھ والے گھر کے دروازے پر نظر ڈالی۔

مینہ کوئی پاؤ گھنٹہ تک برسا کیا۔ اس کے بعد ایک دم مطلع صاف ہو گیا۔ اور سورج نے پہلے سے بھی زیادہ بلند ہو کر اپنا سفر شروع کر دیا۔

دونوں لڑکے پھر اسی گھر سے نکلے۔ اکبر تو ڈیلیا کے پودے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور چھوٹا لڑکا ساتھ والے گھر کے برآمدے میں پہنچا۔ اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے بے دھڑک دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

"بیری!" اس نے چلا کر کہا۔

"بیری!!" اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر اور بھی زور سے چلا کر کہا۔ "تمھیں بھائی جان بلا رہے ہیں۔ سچ مچ کا ہوائی جہاز ہے ان کے پاس۔ آ کر دیکھو۔"

"کیا ہے منیر میاں؟" اندر سے ایک ننھی سی آواز آئی۔

"دروازہ کھولو۔" منیر نے کہا۔

"چٹخنی لگ رہی ہے۔ میرا ہاتھ نہیں جاتا۔ امی غسل خانے میں ہیں۔"

"رات ماموں ہمارے لئے بڑا اچھا ہوائی جہاز لائے۔" منیر نے کہا۔

"کہاں ہے وہ ہوائی جہاز؟"

"بھائی جان کے پاس۔"

"اچھا میں آتی ہوں۔"

پانچ منٹ کے بعد دروازہ کھلا۔ اور ایک ننھی سی لڑکی جس کی عمر کوئی سات برس کی ہوگی۔ برآمدے میں آئی۔ اس نے ہلکے سبز رنگ کا پھولدار ریشمی کرتا اور گھیر دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ فراک کے اوپر فیروزی اون کا کوٹ نما سویٹر تھا۔ دونوں شانوں پر ایک ایک چٹیا تھی۔ جس کے سرے پر سفید ربن بندھا ہوا تھا۔ سینے پر آسمانی رنگ کے ہوائی ریشم کا ننھا سا دوپٹہ لہرا رہا تھا۔ پاؤں میں چھوٹے چھوٹے سبز سوئیڈ کے سینڈل تھے۔

ان دونوں بھائیوں کو بنچ پر بیٹھے دیکھ کر وہ ایک جھونکے کی طرح ان کے پاس پہنچی۔ جیسے ہی منیر کی نظر اس کے چہرے پر پڑی، وہ ٹھٹھا مار کے ہنسنے لگا۔

"اوہو ہو ہو بیری!" اس نے کہا۔ "کتنا پوڈر مل رکھا ہے تم نے۔ تمہاری پلکیں کیسی سفید ہو رہی ہیں پوڈر سے۔"

"کب؟" لڑکی کی ساری چونچال کافور ہو گئی۔

"چپ رہو منیر۔" اکبر نے چھوٹے بھائی کو ڈانٹ بتائی۔

"ذرا شیشے میں جا کر منہ تو دیکھو۔" منیر نے کہا۔

بیری نے انگلی سے اپنے گال کو چھوا۔ تھوڑا سا پوڈر اس کی انگلی کے سرے پر لگ گیا۔

"دیکھا......"

"بس جی بس۔" بیری نے اچانک بگڑ کر منیر کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہم نہیں بولتے تم سے۔"

"منیر تم چپکے نہیں رہتے تو میں پیٹ دوں گا تمھیں۔" اکبر نے منیر پر آنکھیں نکالیں۔

"اکبر میاں۔" بیری منیر کو بالکل نظر انداز کر کے گویا وہ وہاں موجود ہی نہ تھا۔ اکبر کی طرف متوجہ ہوئی۔ "کہاں ہے وہ ہوائی جہاز جو تمہارے ماموں رات لائے ہیں؟"

"ابھی دکھاتا ہوں۔"

"ہے کہاں وہ؟"

"گھر میں رکھا ہے۔"

"تو لاؤ ابھی۔"

"ابھی لاتا ہوں۔"

"نہیں ابھی لاؤ۔"

"گھر میں رکھا ہے چل کے دیکھ لو نا اندر۔"

"نا بھئی ہم نہیں جانے کے تمہارے گھر۔" بیری نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ "اس دن تمہاری امی خفا ہوئی تھیں ہم پر۔"

"واہ، تم پر تھوڑا ہی خفا ہوئی تھیں۔ وہ تو مجھ سے کہہ رہی تھیں۔"

"تو تم ہمیں لا دو نا ہوائی جہاز!"

"اچھی بات، تم یہیں ٹھہرو جانا نہیں۔ میں ابھی لاتا ہوں۔" اور وہ گھر کی طرف دوڑا۔ منیر ٹکٹکی باندھے بیری کے چہرے کو تک رہا تھا۔ مگر بیری نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ وہ بیچ

وادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ عین اس وقت وہ شخص جو صبح کمبل اوڑھے تھیلا لے کے گیا تھا۔ کاٹھ کے زینے پر چڑھتا دکھائی دیا۔ اور بیری مارے خوشی کے "ابا جان" "ابا جان" چلاتی ہوئی اس کی طرف دوڑی۔

جس وقت اکبر ہوائی جہاز لے کر گھر سے باہر آیا۔ تو بیری ابا کے تھیلے کو جو پھل اور سبزی وغیرہ سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف سے پکڑے ان کے ساتھ ساتھ گھر میں داخل ہو رہی تھی۔

پانچ منٹ گزر گئے۔ اکبر اور منیر بنچ کے پاس کھڑے بیری کی راہ دیکھا کیے مگر وہ باہر نہ آئی۔

اکبر نے منیر کو ہوائی جہاز دے کر کہا۔ "یہ ہوائی جہاز لے جا کر بیری کو دکھا دو۔"

"آپ نہیں چلتے؟"

"نہیں میں یہیں ٹھہرتا ہوں۔ کہنا بھائی جان تمہیں بلا رہے ہیں شاباش۔"

لکڑی کا یہ ہوائی جہاز جس پر ہلکا ہلکا آسمانی رنگ کیا گیا تھا۔ خاصا بڑا تھا۔ منیر اسے بڑی مشکل سے سنبھالتا ہوا بیری کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا مگر اسے اندر جانے کی جرأت نہ ہوئی۔

"بیری" اس نے باہر ہی سے چلا کر کہا۔ "لو دیکھو یہ ہوائی جہاز!"

بیری آم چوستی ہوئی دروازے کے پاس آئی۔

"ہیں! کہاں رہے ہو تم ...... اچھا تو یہ ہے ہوائی جہاز جو کل تمہارے ماموں لائے ہیں!! اوہ کتنا بڑا ہے!"

"بھائی جان سامنے کھڑے ہیں۔ تمہیں بلا رہے ہیں۔"

بیری اور اکبر کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اکبر اسے دیکھ کر بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور مسکرانے لگا۔

"منیر میاں۔" بیری نے کہا۔ "اپنے بھائی جان سے کہو میں ٹھہر کے آؤں گی۔ ہم آم چوس رہے ہیں اس وقت۔"

منیر ہوائی جہاز لے کر اکبر کے پاس پہنچا۔ دونوں بنچ پر بیٹھ گئے۔ اور وادی کی سیر دیکھنے لگے۔ دس منٹ گزر گئے۔ مگر بیری نہ آئی۔

آسمان پر رفتہ رفتہ بادل پھر چھا گئے تھے۔ اب کے بادل بہت گھنے اور قریب تھے۔ چنانچہ ہر طرف بھاپ ہی بھاپ پھیل گئی۔ جس نے ہر چیز کو اوجھل کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دم زور کا مینہ پڑنے لگا۔ اکبر اور منیر کو ہوائی جہاز اٹھا کر گھر میں گھستے ہی بنی۔

یہ بارش کوئی گھنٹہ سوا گھنٹہ تک رہی۔ اور اس کے بعد پھر دھوپ نکل آئی۔

"بیری۔" اکبر ایک ہاتھ میں ایک بڑی سی گیند لئے جس پر انگریز بچوں کی رنگین تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ اور دوسرے میں ایک بڑی سی کتاب تھامے، بیری کے دروازے پر کھڑا تھا۔

"بیری۔" اس نے دوبارہ آہستہ سے کہا۔

"کیا ہے اکبر میاں؟" بیری نے اس کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

"تم تو آئیں ہی نہیں!"

"کب؟"

"اس وقت۔"

"اوہ۔ مینہ جو پڑ رہا تھا موسلا دھار۔ کہاں ہے ہوائی جہاز؟"

"وہ تو میں نے رکھ دیا۔ لو دیکھو یہ تصویروں کی کتاب!"

"اسی لڑکی کی کہانی ہوگی جو پڑھا نہیں کرتی تھی؟"

"ہاں۔"

"واہ یہ تو ہم دیکھ چکے ہیں۔" اس نے تنک کر کہا۔

"اچھا تو آؤ گیند سے کھیلیں۔"

"ہم گیند سے نہیں کھیلتے بھئی۔ امی کہتی ہیں۔ پھسلن ہو رہی ہے۔ باہر نہ جانا پاؤں رپٹ گیا تو کھڈ میں گر کر ہڈی پسلی چور چور ہو جائے گی۔"

"اچھا تو ہم تمہارے برآمدے ہی میں کھیلیں گے۔"

"بھئی شام کو کھیلیں گے۔ اس وقت تو ہم ابا اور امی کے ساتھ کچھ خریدنے جا رہے ہیں۔"

اور سچ مچ تھوڑی ہی دیر بعد بیری ابا کی انگلی پکڑے جنھوں نے اس وقت ڈھیلا ڈھالا انگریزی سوٹ اور ہیٹ پہن رکھا تھا۔ کاٹھ کے زینے سے اترتی دکھائی دے رہی تھی۔ پیچھے پیچھے اس کی امی مصری وضع کا سیاہ ریشمی برقعہ پہنے پان چباتی ہوئی آ رہی تھیں۔ اکبر بنچ پر بیٹھا ان لوگوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ اس کی نظر بار بار بیری پر پڑتی تھی۔ جس نے اب گلابی دار پاجامہ اور دوپٹہ اتار کر فراک پہن لیا تھا۔ دور سے اس کی گوری گوری بھری بھری پنڈلیاں بہت بھلی لگتی تھیں۔ اس کے کان کے پاس بھورے بالوں کی ایک لٹ ہوا سے اڑ اڑ کے بار بار اس کے منہ پر آ پڑتی تھی۔ جسے وہ اپنے ننھے سے ہاتھ سے ہٹا ہٹا دیتی تھی۔

اکبر بنچ پر بیٹھا دیر تک اس چھوٹے سے گامزن قافلے کو پگڈنڈی کی بھول بھلیوں میں غائب

ہوتے اور ابھرتے دیکھا کیا۔ آخر جب وہ پہاڑی کے سب سے نچلے موڑ پر آخری جھلک دکھا کر اوجھل ہوگیا تو اس نے اپنی نظریں اس طرف سے ہٹالیں۔

بارش کبھی کی تھم چکی تھی۔ مگر ہوا کا کوئی تیز جھونکا چلتا۔ تو دیودار کے درختوں سے بوندیاں جھڑنے لگتیں۔ دور کہیں کوئی نالا تھا۔ جس کا پانی بارش کی وجہ سے زور شور سے بہنے لگا تھا۔ اس کی شائیں شائیں کی آواز یہاں ایسی صاف سنائی دے رہی تھی۔ کہ معلوم ہوتا تھا نالا کہیں آس پاس ہی ہے۔

ایک درخت پر ایک بڑا سا نیل کنٹھ اپنی کھوکھلی آواز سے چیخا۔ پر تولے۔ ہوا میں ایک زقند بھری اور پھر دوسرے درخت پر آ بیٹھا۔ بظاہر اس نقل مکانی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔

دور افق کے پاس وہ پہاڑیاں جو عموماً بادلوں کے غبار میں کھوئی کھوئی رہتی تھیں۔ اچانک مطلع صاف ہوجانے سے اب واضح طور پر نظر آرہی تھیں۔ وہ دور تک ایک کے پیچھے ایک اس طرح دکھائی دے رہی تھیں جیسے شرمیلی لڑکیاں بڑی عمر کی لڑکیوں کی اوٹ لے کر جھانک رہی ہوں۔ بعض پہاڑیاں ہری بھری تھیں اور بعض بالکل منڈ۔ مگر وہ آپس میں ایسی غلط ملط ہو رہی تھیں۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی لحاف کو بے ترتیبی سے ہٹا کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور لحاف کی کہیں تو اوپر کی سبز مخمل دکھائی دے رہی ہے اور کہیں اندر کا خاکستری استر۔

اکبر اس نظارے کو ایسی محویت سے دیکھ رہا تھا۔ کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا۔ کہ اس کے تین ہم جماعت اس کی بنچ کو گھیرے کھڑے ہنس رہے ہیں۔

"او ہو! تم لوگ ہو۔" وہ چونک اٹھا۔ "تم کب آئے؟"

"اکبر۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ چلو ہمارے ساتھ فٹ بال کھیلنے!"

"تم جاؤ۔ مجھے کام ہے بھئی۔" اکبر نے کہا۔

"واہ۔ یہ خوب کہی۔" دوسرے لڑکے نے کہا۔ "نہیں تمہیں چلنا ہوگا۔ دیکھو ہم نے آج ہی تو یہ نیا فٹ بال خریدا ہے۔"

"نہیں میں آج نہیں جاؤں گا۔"

"آخر کیوں؟"

"مجھے کام جو کرنا ہے بھئی۔"

"کیسا کام؟"

"یہ کام ...... وہ اسکول کا کام جو دیا تھا ماسٹر صاحب نے!"

"تو تم سچ مچ نہیں چلو گے؟"

"نہیں آج نہیں کل۔" اور وہ بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور گھر کی طرف چل دیا۔

"رہنے دو بھئی۔" ایک لڑکے نے کہا۔ "نہیں چلتا تو نہ چلے۔" اور وہ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

شام کے چھ بج چکے تھے۔ جب پیری اپنے ابا اور اماں کے ساتھ واپس آئی۔ اس نے ایک بچی گود رکھی تھی۔

ابا جیب سے چابی نکال کر کمرے کا دروازہ کھولنے لگے۔ امی برقعہ اتار کر برآمدے کی ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ وہ بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

ذرا سی دیر میں پیری گھر میں بچی چھوڑ کر باہر بنچ کے پاس آگئی۔ جہاں اکبر بیٹھا ہوا تھا۔

"پیری تم آگئیں!" اور وہ جلدی سے بنچ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "کچھ خرید لیا؟"

"ہاں۔ میرا بڑا خوب صورت ریشمی سوٹ بنے گا۔ اس پر گلاب کے بڑے بڑے پھول ہیں۔ اور پھر ابا نے ہمیں بندی اور ٹسی بھی لے دی۔ اور نئی چپل بھی۔ پھر ہم نے سنٹ بھی خریدا۔ لپ اسٹک بھی اور نیل پالش بھی۔" اس کی آنکھیں خوشی سے ناچ رہی تھیں۔

"پیری تم ......"

"مجھے پیری نہ کہا کرو جی۔" ایک لحظہ میں وہ بگڑ گئی۔

"پھر کیا کہا کروں؟"

"میرا نام ہے امیر النساء بیگم۔" یہ کہتے کہتے اس کے لہجے میں بڑوں جیسی سنجیدگی پیدا ہوگئی۔

"مگر تمہاری امی تو تمہیں پیری ہی کہتی ہیں۔"

"او ہو۔"

"اور تمہارے ابا بھی۔"

"انہیں کہنے دو۔"

"ہم بھی تو تمہیں پیری ہی کہیں گے ...... پیری!"

"دیکھو جی میں پھر کہے دیتی ہوں۔ مجھے پیری نہ کہا کرو۔"

"اگر کہوں تو......؟"

"ہم تم سے نہیں بولیں گے......جاؤ میں تم سے نہیں بولتی۔ میں گھر جاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اکبر کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ پل بھر کو رکی۔ پھر گھر کا رخ کر کے پھلواری میں دوڑتی ہوئی تتلی کی سی ادا کے ساتھ آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اکبر نے اسے واپس بلانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چند لمحے دم بخود کھڑا رہا۔ پھر بنچ سے آ کر اسی بنچ پر بیٹھ گیا۔

ذرا سی دیر میں سورج ڈوب گیا۔ اور آس پاس کی پہاڑیاں قرمزی بادلوں میں کھو گئیں۔ نیچے وادی میں جا بجا سفید سفید دھوئیں پھوٹ رہے تھے۔ درختوں کی چوٹیوں سے، مکانوں کی چھتوں سے، پہاڑیوں کی ڈھلانوں سے جس سے وادی کا منظر دھندلا دھندلا ہو گیا تھا۔ اکبر کی نظر اپنے اسکول کی عمارت پر پڑی۔ جس کے بادنما مور کو اس وقت ابخرات کے غبار نے نظروں سے اوجھل کر رکھا تھا۔ بلاشبہ اس کے ہم جماعت ابھی تک اسکول کی گراؤنڈ میں فٹ بال کھیل رہے ہوں گے۔ اس کو اس بات کا افسوس نہیں تھا۔ کہ وہ ان کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ اور نہ اس کی پروا کہ شاید وہ اس سے ناراض ہو گئے ہوں۔ رہا اسکول کا کام۔ تو اس کی بھی اس کو زیادہ فکر نہ تھی۔ شاید کوئی بہانہ کارگر ہو جائے۔ اور وہ اگلے روز ماسٹر کی جھڑکیوں اور تھپڑ سے بچ جائے۔

ہوا میں اب خاصی خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے مٹھیاں بھینچ کر بغلوں میں دبا لیں اور شانوں کو سکوڑ لیا۔ شاید اسے بیری کو بیری نہیں کہنا چاہیے تھا...... وہ سوچ رہا تھا۔ خواہ مخواہ کی لڑائی اس نے مول لی۔ وہ اب خاصی بڑی ہو گئی ہے۔ ہلکے سبز رنگ کے پھولدار ریشمی کرتے اور گلی دار پاجامے میں وہ کتنی سمجھدار معلوم ہوتی تھی۔ اکبر کی آنکھیں بھر بھر آ رہی تھیں۔ مگر وہ رونا نہیں چاہتا تھا۔

اب شام ہو چکی تھی۔ نیچے وادی پر اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے درختوں کے تنوں سے لپٹنا، مکانوں کا احاطہ کرنا اور پہاڑیوں پر لمبے لمبے سائے ڈالنا شروع کیا۔ ذرا سی دیر میں اکبر کا اسکول، کلاک گھر اور دوسری عمارتیں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمین سے آسمان تک ایک سیاہ چادر تن گئی۔ جو انسان حیوان شجر حجر ہر شے کو اپنے میں لپیٹنے لگی۔ اور بالآخر اس نے اکبر کو بھی چھپا لیا۔ اس کے جسم ہی کو نہیں۔ اس کی روح کو بھی۔

۱۹۳۷ء

کتبہ

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پُر فضا باغوں اور پھلواریوں میں گھری ہوئی قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے۔ جو دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ان عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں۔ جن میں کم و بیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ دن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواریوں ہی میں محدود رہتی ہے۔ مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور چوڑی چکلی سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اس علاقے تک جاتی ہے۔ ایک ایسے دریا کا روپ دھار لیتی ہے۔ جو پہاڑوں پر سے آیا ہو۔ اور اپنے ساتھ بہت سا خس و خاشاک بہا لایا ہو۔

گرمی کا زمانہ۔ سہ پہر کا وقت۔ سڑکوں پر درختوں کے سائے لمبے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ حال تھا۔ کہ جوتوں کے اندر تلوے جلے جاتے تھے۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی گزری تھی۔ سڑک پر جہاں جہاں پانی پڑا تھا۔ ابخرات اٹھ رہے تھے۔

شریف حسین کلرک درجہ دوم معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا۔ اور اس بڑے پھاٹک کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔ جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے۔ گھر کو لوٹتے ہوئے آدھے راستے تک تانگے میں سوار ہو کر جانا ایک ایسا لطف تھا۔ جو اسے مہینے کے شروع کے صرف چار

پانچ روز ہی ملا کرتا تھا۔ اور آج کا دن بھی ان ہی مبارک دنوں میں سے ایک تھا۔ آج خلاف معمول تنخواہ کے آٹھ روز بعد بھی اس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ آنے پیسے پڑے تھے۔ وجہ یہ تھی۔ کہ اس کی بیوی مہینے کے شروع ہی میں بچوں کو لے کر میکے چلی گئی تھی۔ اور گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ دن میں دفتر کے طوائی سے وہ چار پوریاں لے کر کھالی تھیں۔ اور اوپر سے پانی پی کر پیٹ بھر لیا تھا۔ رات کو شہر کے کسی سستے سے ہوٹل میں جانے کی ٹھہرائی تھی۔ بس بے فکری ہی بے فکری تھی۔ گھر میں کچھ ایسا اثاثہ تو تھا نہیں۔ جس کی رکھوالی کرنی پڑتی۔ اس لئے وہ آزاد تھا۔ کہ جب چاہے گھر جائے۔ اور چاہے تو ساری رات سڑکوں ہی پر گھومتا رہے۔

تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلنی شروع ہوئیں۔ ان میں ٹائپسٹ، ریکارڈ کیپر، ڈسپیچر، اکاؤنٹنٹ، ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجہ اور حیثیت کے کلرک تھے۔ اور اسی لحاظ سے ان کی وضع قطع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی۔ مگر بعض ٹائپ خاص طور پر نمایاں تھے۔ سائیکل سوار آدھی آستینوں کی قمیص، خاکی زین کے نیکر اور چپل پہنے، سر پر سولا ہیٹ رکھے اکلائی پر گھڑی بندھے، رنگدار چشمہ لگائے، بڑی بڑی توندوں والے بابو چھاتا کھولے، منہ میں جیبڑی بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے، ان فائلوں کو وہ قریب قریب ہر روز اس امید میں ساتھ لے جاتے۔ کہ جو گتھیاں وہ دفتر کے قل غپاڑے میں نہیں سلجھا سکے۔ ممکن ہے گھر کی یکسوئی میں ان کا کوئی حل سوجھ جائے۔ مگر گھر پہنچتے ہی وہ گرہستی کاموں میں ایسے الجھ جاتے۔ کہ انہیں دیکھنے تک کا موقع نہ ملتا اور اگلے روز انہیں یہ مفت کا بوجھ جوں کا توں واپس لے آنا پڑتا۔

بعض من چلے نوجوان سائیکل اور چھاتے سے بے نیاز۔ ٹوپی ہاتھ میں، کوٹ کاندھے پر، گریبان کھلا ہوا جس میں ٹوٹ جانے پر انہوں نے سیفٹی پن سے بند کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور جس کے پیچھے سے چھاتی کے گھنے بال پسینے میں تر بتر نظر آتے تھے۔ یہ رنگروٹ سستے سلے سلائے ڈھیلے ڈھالے بدقطع سوٹ پہنے۔ اس گرمی کے عالم میں واسکٹ اور نکٹائی کا ٹرنک سے لیس، کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو تین تین فاؤنٹین پن اور پنسلیں لگائے خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔

گو ان میں سے زیادہ تر کلرکوں کی مادری زبان ایک ہی تھی۔ مگر وہ لہجہ بگاڑ بگاڑ کر غیر زبان میں باتیں کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ وہ طمانیت نہ تھی۔ جو کسی غیر زبان پر قدرت حاصل ہونے پر اس میں باتیں کرنے پر اکساتی ہے۔ بلکہ یہ کہ انہیں دفتر میں دن بھر اپنے افسروں سے اسی غیر زبان میں بولنا پڑتا تھا۔ اور اس وقت وہ باہم بات چیت کر کے اس کی مشق بہم پہنچا رہے تھے۔

ان کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ایسے کم عمر نوجوان بھی جنہیں کم عمری ہی میں روزگار مل گیا۔ جن کی ابھی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں۔ اور جنہیں ابھی سکول سے نکلے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے۔ اور ایسے عمر رسیدہ بھی، جو وہ کچھ بھی جن کی ناک پر سالہا سال عینک کے استعمال کے باعث گہرا نشان پڑ گیا تھا۔ اور جنہیں اس سڑک کے اتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے پچیس پچیس تیس تیس برس ہو چکے تھے۔ بعض کارکنوں کی پیٹھ میں کمر سے ذرا نیچے خم سا آ گیا تھا۔ اور کند استروں سے متواتر داڑھی مونڈتے رہنے کے باعث ان کے گالوں اور ٹھوڑی پر بالوں کی جڑیں پھوٹ گئی تھیں۔ جنھوں نے بے شمار ننھی ننھی پھنسیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

پیدل چلنے والوں میں بہتیرے لوگ ٹولی باندھ کر چلتے تھے۔ کہ دفتر سے ان کے گھر تک پہنچنے کا راستہ جاتے ہیں۔ ان کا فاصلہ کئے کے برابر ہے۔ ہر شخص افسروں کے چڑچڑے پن یا ماتحتوں کی نالائقی پر نالاں نظر آتا تھا۔

ایک تانگے کی سواریوں میں ایک کلرک شریف حسین ایک کالج میں سوار ہو گیا۔ تانگہ تھوڑی دیر میں شہر کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ شریف حسین نے اکنی نکال کر کوچوان کو دی۔ اور گھر کے بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف چل دیا۔ جس کی سیڑھیوں کے گرد ہر روز شام کو میوہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کی دکانیں سج جاتی تھیں۔ اور میلہ سا لگا کرتا تھا۔ یہاں بھی اس کی پسند کی چیزیں اور ہر وضع اور قماش کے لوگ یہاں ملتے تھے۔ اگر مقصد خرید و فروخت نہ ہو۔ تو بھی یہاں لوگوں اور چیزوں کو قریب سے دیکھنا بجائے خود ایک پر لطف تماشہ تھا۔

شریف حسین کچھ دیر تک جوتوں، کپڑوں، خوانچوں، تصویروں اور پرانے سامان بیچنے والے دکانداروں اور تصویر اتار دینے والے فوٹو گرافروں کے ٹھیلوں کے پاس ایک ایک دو دو منٹ رک کر دیکھتا اس طرف جا نکلا جہاں کباڑیوں کی دکانیں تھیں۔ یہاں اسے مختلف قسم کی بے شمار چیزیں نظر آئیں۔ ان میں سے بعض ایسی تھیں۔ جو اپنی اصلی حالت میں یقیناً صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہوں گی۔ مگر ان کباڑیوں کے ہاتھ پڑتے پڑتے یا تو ان کی صورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی۔ یا ان کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ جس سے وہ بیکار ہو گئی تھیں۔ چینی کے ظروف اور گلدان، بجلی کے بلب، اکھڑیاں، جلی ہوئی چیزیں یا ریڈیو کے پرزے، گراموفون کے کل پرزے، جراحی کے آلات، ستار، بھس بھرا ہرن، پیتل کے ٹوٹے پھوٹے، یہ وغیرہ یہ وغیرہ........

ایک دکان پر اس کی نظر سنگ مرمر کے ایک ٹکڑے پر پڑی۔ یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ مکمل باوقار ہوں

کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اکھاڑا گیا ہے۔ اس کا طول کوئی سوا فٹ تھا۔ اور عرض ایک فٹ۔ شریف حسین نے اس ٹکڑے کو اٹھا کر دیکھا۔ یہ ٹکڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا۔ کہ اس نے محض یہ دیکھنے کے لئے کہ بھلا کباڑی اس کے کیا دام بتائے گا۔ قیمت دریافت کی۔

تین روپے! کباڑی نے اس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے۔ مگر آخر اسے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے ٹکڑا رکھ دیا اور چلنے لگا۔

"کیوں حضرت چل دیئے؟ آپ بتائیے کیا دیجئے گا!"

وہ رک گیا۔ اسے یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم سی آئی۔ کہ اسے اس چیز کی ضرورت نہ تھی۔ اور اس نے محض اپنے شوق تحقیق کو پورا کرنے کے لئے قیمت پوچھی تھی۔ اس نے سوچا۔ دام اس قدر کم بتاؤ جو کباڑی کو منظور نہ ہوں۔ کم از کم وہ اپنے دل میں یہ تو نہ کہے۔ کہ یہ کوئی کنگلا ہے۔ جو دکانداروں کا وقت ضائع اور اپنی ہوس پوری کرنے آیا ہے۔

"ہم تو ایک روپیہ دیں گے۔" یہ کہہ کر شریف حسین نے چاہا۔ کہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ مگر اس نے اس کی مہلت ہی نہ دی:

"ارے میاں تو کچھ زیادہ نہیں دیں گے؟ سوا روپیہ بھی نہیں...... اچھا لے جائیے۔"

شریف حسین کو اپنے آپ پر غصہ آیا۔ کہ میں نے بارہ آنے کیوں نہ کہے۔ اب لوٹنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اس نے اس مرمریں ٹکڑے کو اٹھا کر دوبارہ دیکھا بھالا کہ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے۔ تو اس سودے کو منسوخ کر دے۔ مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا۔ نہ جانے کباڑی نے اسے اس قدر سستا بیچنا کیوں قبول کیا تھا۔

رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ تو اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اس کے ذہن میں آیا۔ خدا کے کارخانے عجیب ہیں۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ کیا عجب اس کے دن پھر جائیں۔ وہ کلرک درجہ دوم سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ بن جائے۔ اور اس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر چار سو ہو جائے...... یہ نہیں تو کم سے کم ہیڈ کلرکی ہی سہی۔ پھر اسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے۔ بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے۔ اور اس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے۔

مستقبل کی یہ خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی۔ کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا۔ یا اب اسے ایسا محسوس ہونے لگا۔ گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے

کی تلاش میں تھا۔ اور اگر اسے نہ خریدتا تو۔ بڑی بھول ہوتی۔

شروع شروع میں جب وہ ملازم ہوا تھا۔ تو اس کا کام کرنے کا جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ مگر دو سال کی سعی لاحاصل کے بعد رفتہ رفتہ اس کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور مزاج میں سکون آ چلا تھا۔ مگر اس سنگ مرمر کے ٹکڑے نے پھر اس کے خیالوں میں ہلچل ڈال دی۔ مستقبل کے متعلق طرح طرح کے خوش آئند خیالات ہر روز اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے دفتر جاتے، دفتر سے آتے۔ کوٹھیوں کے باہر افسروں کے نام کے بورڈ دیکھ کر۔ یہاں تک کہ جب مہینہ ختم ہوا۔ اور اسے تنخواہ ملی۔ تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کو شہر کے ایک مشہور سنگ تراش کے پاس لے گیا۔ جس نے بہت چابک دستی سے اس پر اس کا نام کندہ کر کے کونوں میں چھوٹی چھوٹی خوش نما بیلیں بنا دیں۔

اس سنگ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا ہوا دیکھ کر اسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا۔ کہ اس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا ہو۔

سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا۔ تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کتبہ پر سے اس اخبار کو اتار ڈالے۔ جس میں سنگ تراش نے اسے لپیٹ دیا تھا۔ اور اس پر ایک نظر اور ڈال لے۔ مگر ہر بار ایک نامعلوم حجاب جیسے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ شاید وہ راہ چلتوں کی نگاہوں سے ڈرتا تھا۔ کہ کہیں وہ اس کتبہ کو دیکھ کر اس کے ان خیالات کو نہ بھانپ جائیں۔ جو پچھلے کئی دنوں سے اس کے دماغ پر مسلط تھے۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس نے اخبار اتار پھینکا۔ اور نظریں کتبے کی دلکش تحریر پر گاڑے دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بالائی منزل میں اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ جیب سے چابی نکالی۔ قفل کھولنے لگا۔ پچھلے دو برس میں آج پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہوا۔ کہ اس کے مکان کے دروازے کے باہر ایسی کوئی جگہ ہی نہیں۔ کہ اس پر کوئی بورڈ لگایا جا سکے۔ اگر جگہ ہوتی بھی تو اس قسم کے کتبے وہاں تھوڑا ہی لگائے جاتے ہیں۔ ان کے لئے تو بڑا سا مکان چاہیئے۔ جس کے پھاٹک کے باہر لگایا جائے۔ تو آتے جاتے کی نظر بھی پڑے......

قفل کھول کر مکان کے اندر پہنچا۔ اور سوچنے لگا کہ فی الحال اس کتبہ کو کہاں رکھوں۔ اس کے حصہ مکان میں دو کوٹھریاں ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا۔ الماری صرف ایک ہی کوٹھری میں تھی۔ مگر اس کے کواڑ نہیں تھے۔ بالآخر اس نے کتبہ کو اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

ہر روز شام کو جب وہ دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا۔ تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کتبے ہی پر پڑتی۔ امیدیں اسے سبز باغ دکھاتیں۔ اور دفتر کی مشقت کی تکان کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کا جویا ہوتا۔ تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا۔ آرزوئیں اس کے سینے میں ہیجان برپا کر دیتیں۔ افسر کی ایک ایک نگاہِ لطف و کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

جب تک اس کے بیوی بچے نہیں آئے۔ وہ اپنے خیالوں ہی میں مگن رہا۔ نہ دوستوں سے ملتا۔ نہ کھیل تماشوں میں حصہ لیتا۔ رات کو جلدی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آ جاتا۔ اور سونے سے پہلے گھنٹوں عجیب عجیب خیالی دنیاؤں میں رہتا۔ مگر ان کے آنے کی دیر تھی۔ کہ نہ تو وہ فراغت ہی رہی۔ اور نہ وہ سکون ہی ملا۔ ایک بار پھر گرہستی کے فکروں نے اسے ایسا گھیر لیا۔ کہ مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دھندلی پڑ گئیں۔

کتبہ سال بھر تک اسی بے کواڑ کی الماری میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں اس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی۔ مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اب اس کے بیٹے کی عمر چار برس کی ہو گئی تھی۔ اور اس کا ہاتھ اس بے کواڑ کی الماری تک بخوبی پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا بیٹا کتبے کو گرا نہ دے۔ اسے وہاں سے اٹھا لیا اور اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔

ساری سردیاں یہ کتبہ اس کے صندوق ہی میں پڑا رہا۔ جب گرمی کا موسم آیا۔ تو اس کی بیوی کو گرم کپڑے رکھنے کے لئے اس کے صندوق میں سے فالتو چیزوں کو نکالنا پڑا۔ چنانچہ دوسری چیزوں کے ساتھ بیوی نے کتبے کو بھی نکال کر کاٹھ کے اس پرانے بکس میں ڈال دیا۔ جس میں ٹوٹے ہوئے چوکھٹے، بے بال کے برش، بے کار صابن دانیاں، ٹوٹے ہوئے کھلونے اور ایسی ہی اور دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔

شریف حسین نے اب اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔ کہ ترقی لیاقت ہی سے نصیب ہوتی ہے کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا۔ جس سے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا۔ اور اسے زیادہ تنگی نہ اٹھانی پڑتی۔

پے در پے مایوسیوں کے بعد جب اس کو ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے اور اس کے دل

سے رفتہ رفتہ ترقی کے تمام ولولے نکل چکے تھے۔ اور کتبے کی یاد تک ذہن سے محو ہو چکی تھی۔ تو اس کے افسروں نے اس کی دیانت داری اور پرانی کارگزاری کا خیال کر کے اسے تین مہینے کے لئے عارضی طور پر ہیڈ کلرک کی جگہ دے دی۔ یہ کلرک چھٹی پر جا رہا تھا۔

جس روز اسے یہ عہدہ ملا۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا۔ بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگا اسے اتنی جلدی گھر نہ پہنچا سکتا!

اگلے مہینے اس نے نیلام گھر سے ایک سستی سی لکھنے کی میز اور ایک گھومنے والی کرسی خریدی۔ میز کے آتے ہی اسے پھر کتبے کی یاد آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی سوئی ہوئی امنگیں جاگ اٹھیں۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے کاٹھ کی پیٹی میں سے کتبے کو نکالا صابن سے دھویا پونچھا اور دیوار کے سہارے میز پر ٹکا دیا۔

یہ زمانہ اس کے لئے بہت کٹھن تھا۔ چونکہ وہ اپنے افسروں کو اپنی بہتر کارگزاری دکھانے کے لئے چوکس رہتے ہوئے کلرک سے دُگنا کام کرتا۔ اپنے ماتحتوں کو خوش رکھنے کے لئے بہت سا ان کا کام بھی کر دیتا۔ گھر پر آدھی رات تک فائلوں میں غرق رہتا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ہاں جب کبھی اسے اس کلرک کی واپسی کا خیال آتا۔ تو اس کا دل بجھ سا جاتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا۔ ممکن ہے وہ اپنی چھٹی کی میعاد بڑھوا لے۔ ...... ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے...... ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے۔

مگر جب تین مہینے گزر گئے۔ تو نہ تو اس کلرک نے چھٹی کی میعاد ہی بڑھوائی۔ اور نہ بیمار ہی پڑا۔ ناچار شریف حسین کو اپنی پرانی جگہ پر آ جانا پڑا۔

اس کے بعد جو دن گزرے۔ وہ اس کے لئے بڑی مایوسی اور افسردگی کے تھے۔ تھوڑی سی خوش حالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اسے اپنی حالت پہلے سے بھی زیادہ ابتر معلوم ہونے لگی تھی۔ اس کا جی کام میں مطلق نہ لگتا تھا۔ مزاج میں آلکس اور حرکات میں سستی سی پیدا ہونے لگی۔ ہر وقت بیزار بیزار سا رہتا۔ نہ کبھی ہنستا نہ کسی سے بولتا چالتا۔ مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیور جلد ہی اسے راہِ راست پر لے آئے۔

اب اس کا بڑا لڑکا ہائی سکول میں پڑھتا تھا اور چھوٹا چوتھی میں۔ اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی، سینا پرونا سیکھتی۔ اور گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جما لیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ اسکول کا کام کیا کرتا۔ چونکہ میز کے ہلنے سے کتبے کے گر جانے کا خطرہ رہتا

تھا۔ اور پھر اس نے میز کی بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی۔ اس کے لڑکے نے اسے اٹھا کر پھر اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

سال پر سال گذرتے گئے۔ اس عرصے میں کتبے نے کئی جگہیں بدلیں۔ کبھی بے کواڑ کی الماری میں تو کبھی میز پر۔ کبھی صندوقوں کے اوپر تو کبھی چارپائی کے نیچے۔ کبھی بوری میں تو کبھی کاٹھ کے بکس میں۔ ایک دفعہ کسی نے اٹھا کر باورچی خانے کے اس بڑے طاق میں رکھ دیا۔ جس میں روزمرہ کے استعمال کے برتن رکھے رہتے تھے۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی۔ دیکھا تو دھوئیں سے اس کا سفید رنگ ویسا پڑ چلا تھا۔ اٹھا کر دھویا پونچھا۔ اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔ مگر چند ہی روز میں اسے پھر غائب کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھ دیئے گئے۔ جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اسے تحفے میں دیئے تھے۔ رنگ میلا پڑ جانے سے کتبہ الماری میں رکھا ہوا بدنما معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب کاغذی پھولوں کے سرخ سرخ رنگوں سے الماری میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔ اور ساری کوٹھری دہک اٹھی تھی۔

اب شریف حسین کو ملازم ہوئے پورے تیس برس گذر چکے تھے۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ اور پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم آ گیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی اس کے دماغ میں خوش حالی و فارغ البالی کے خیالات چکر لگاتے۔ مگر اب ان کی کیفیت پہلے کی سی نہ تھی۔ کہ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو۔ تصورات کا ایک تسلسل ہے۔ کہ پہروں ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اب اکثر اوقات ایک آہ دم بھر میں ان تصورات کو اڑائے جاتی۔ اور پھر بیٹی کی شادی۔ لڑکوں کی تعلیم۔ اس کے بڑھتے ہوئے اخراجات۔ پھر ساتھ ہی ساتھ ان کے لئے نوکریوں کی تلاش۔ یہ ایسی فکریں نہ تھیں۔ کہ پل بھر کو بھی اس کے خیال کو کسی اور طرف بھٹکنے دیتیں۔

پچپن برس کی عمر میں اسے پنشن مل گئی۔ اب اس کا بڑا بیٹا ریل کے مال گودام میں کام کرتا تھا۔ چھوٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا۔ اور اس سے چھوٹا انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اپنی پنشن اور لڑکوں کی تنخواہیں سب مل ملا کے کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے لگ بھگ آمدنی ہو جاتی تھی۔ جس میں بخوبی گذر ہونے لگی تھی۔ علاوہ ازیں اس کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا بیوپار شروع کرنے کا بھی تھا۔ مگر مندے کے ڈر سے ابھی پورا نہ ہو سکا تھا۔

اپنی کفایت شعاری اور بیوی کی سلیقہ مندی کی بدولت اس نے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں خاصی دھوم دھام سے کر دی تھیں۔ ان ضروری کاموں سے نپٹ کر اس کے جی میں آئی۔ کہ حج کر

آئے۔ مگر اس کی توفیق نہ ہو سکی۔ البتہ کچھ دنوں مسجدوں کی رونق خوب بڑھائی۔ مگر پھر جلد ہی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں نے دھاوا شروع کر دیا۔ اور وہ زیادہ تر چارپائی ہی پر پڑا رہنے لگا۔

جب اسے پنشن وصول کرتے تین سال گزر گئے۔ تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اٹھا۔ گرم گرم لحاف سے نکلا تھا۔ پچھلے پہر کی سرد اور تند ہوا تیر کی طرح سینے میں لگی۔ اور اسے نمونیہ ہو گیا۔ بیٹوں نے اس کے بہتر سے بہتر علاج معالجے کرائے۔ اس کی بیوی اور بہو دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں۔ مگر افاقہ نہ ہوا۔ اور وہ کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔

اس کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کر رہا تھا۔ کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری میں اسے وہ کتبہ مل گیا۔ بیٹے کو باپ سے بے حد محبت تھی۔ کتبے پر باپ کا نام دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالم میں اس کی خطاطی اور نقش و نگار کو دیکھتا رہا۔ اچانک اسے ایک بات سوجھی۔ جس نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔

اگلے روز وہ کتبے کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا۔ اور اس سے کتبے کی عبارت میں تھوڑی سی ترمیم کرائی۔ اور پھر اسی شام اسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

۱۹۳۰ء

حمام میں

(۱)

نام تو تھا اس کا فرخندہ بیگم۔ مگر سب لوگ فرخ بھائی فرخ بھائی کہا کرتے تھے۔ یہ ایک طرح کی دم ہی پڑ گئی تھی۔ ورنہ رشتہ تو کیا، کسی نے اس کے مرحوم شوہر کو دیکھا تک نہ تھا۔ وہ کسی کی بھائی بھی یا نہ تھی۔ مگر اس کی خدمت گزاریوں کو دیکھتے ہوئے یہ نام اس پر جچتا خوب تھا۔ اور وہ خود بھی اسے ناپسند نہیں کرتی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی۔ جو مردوں کی خدمت کا خاص جذبہ لے کر دنیا میں آتی ہیں۔ بچپن میں بھائیوں پر جان چھڑکتی ہیں۔ کنوار پنے میں باپ کو سکھ پہنچاتی ہیں۔ شادی کے بعد شوہر کی تابع داری کرتی ہیں۔ اور بڑھاپے میں بیٹوں کے ناز اٹھاتی ہیں۔

وہ چھوٹے سے قد کی ایک چھوٹی سی عورت تھی۔ مگر اس کا چہرہ اس کے قد کے تناسب سے کافی بڑا تھا۔ اگر کبھی وہ آپ کے سامنے فرش پر سر سے پاؤں تک چادر اوڑھے بیٹھی ہو، اور آپ نے اسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ اور اسے کسی ضرورت سے اٹھ کر کھڑا ہونا پڑے۔ تو آپ کی آنکھیں یہ انتظار ہی کرتی رہ جائیں گی۔ کہ ابھی وہ اور اونچی ہوگی۔

اس کی عمر اٹھائیس برس کے لگ بھگ تھی۔ مگر دیکھنے میں وہ اس سے کہیں کم عمر معلوم ہوتی تھی۔ پہلی ہی نظر میں جو چیز دیکھنے والے کو اپنی جانب متوجہ کرتی۔ وہ اس کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک تھی۔

جس نے اس کے چہرے کے سادہ خد و خال کو حد درجہ جاذب بنا دیا تھا۔ علاوہ ازیں بڑے بڑے دقیق مسائل کی گفتگو میں بھی اس کی کم علمی کو چھپائے رکھتی تھی۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ اور پیشانی پر بال کچھ ایسے پیچ دار تھے، کہ اسے مانگ نکالنے میں بہت دقت پیش آتی۔ چنانچہ وہ اکثر اپنے بالوں کو مردوں کی طرح پیچھے الٹ دیا کرتی۔ سفید کرتا، سفید شلوار اور اس کے ساتھ سفید ہی دوپٹہ۔ یہ سادہ مگر متین لباس اسے بے حد مرغوب تھا۔ اس لباس کے ساتھ جس وقت وہ شام کے جھٹپٹے میں مصلے پر اپنے سامنے موتیا کی ادھ کھلی کلیاں رکھ کر نماز میں مشغول ہوتی۔ تو دیکھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔

کبھی کبھی اپنے دوستوں کے اصرار پر وہ ساڑی بھی پہنا کرتی۔ مگر اس میں بھی بھڑکیلے رنگوں سے گریز کرتی۔ ساڑی کے ساتھ وہ ایک خاص بلاؤز پہنتی جس کا گلا بند ہوتا اور آستینیں پوری۔ یہ اس کی اپنی ایجاد تھی۔ ایسے موقع پر بادامی شکل کا ایک ننھا سا طلائی زیور جس میں نگینے جڑے ہوئے تھے۔ ایک سیاہ ڈوری کے ساتھ اس کے گلے میں بندھا ہوا نظر آیا کرتا۔

شہر کی فصیل کے پاس ایک بدبودار احاطے میں اس کا مکان تھا۔ مکان کی سیڑھیوں تک پہنچنے کے لئے ایک لمبی اور تنگ ڈیوڑھی میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ بارہ تیرہ ٹوٹی پھوٹی بے ڈھنگی سیڑھیوں کا زینہ چڑھنے پر ایک وسیع دالان آتا تھا۔ آدھا کھلا ہوا آدھے پر چھت۔ کھلے ہوئے حصے کے ایک کونے میں بیت الخلا تھا۔ اور چھت والے حصے میں دیوار سے ملا ہوا مٹی کا چولھا، چولھے کے اغل بغل دو کوٹھریاں تھیں۔ یہ تھی اس مکان کی مختصر کیفیت جس میں فرخ بھائی رہتی تھی۔

یہ ان مکانوں میں سے تھا۔ جن میں سفیدی وغیرہ یا تو اس وقت ہوتی ہے۔ جب وہ بنائے جاتے ہیں۔ اور یا پھر اس وقت جب ان کی خرید و فروخت کی بات چیت ہو رہی ہوتی ہے۔ اس مکان کی دیواروں کو دیکھ کر، جن پر سے چونے کا پلستر اکھڑ کر اینٹیں نظر آنے لگی تھیں۔ گمان ہوتا تھا، کہ کم سے کم پچھلے تیس برس میں اس کے مالکوں کے ساتھ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ دیواروں میں جگہ جگہ کوب نکل آیا تھا۔ دھوئیں نے دروازوں اور چھت کی کڑیوں پر سیاہی پھیر کر ان کے نقش و نگار کو چھپا لیا تھا۔ دونوں کوٹھریوں میں ایک ایک طاق تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ شروع شروع میں یہ طاق بہت چھوٹے چھوٹے ہوں گے۔ جیسے پرانی وضع کے غریب متوسط گھروں میں دیا رکھنے کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ مگر کرایہ داروں نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اینٹیں نکال نکال کے انہیں کافی فراخ کر لیا تھا۔ اور اب وہ اس نقب کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ جسے چور گھر کا [illegible]

چھوڑ گئے ہوں ـــــ مگر ان سب باتوں کے باوجود اس مکان کی شان میں کیا کیا قصیدے نہ کہے گئے۔ کن کن خوب صورت ناموں سے اسے موسوم نہ کیا گیا۔ اور وہ کون سے زاویے رہ گئے۔ جن سے اس کے در و دیوار کی تصویر کشی نہ کی گئی!

مکان کی ظاہری خستہ حالی سے قطع نظر جہاں تک اس کی اندرونی صفائی اور رکھ رکھاؤ کا تعلق تھا۔ کوئی شخص فرخندہ کی نفاست پسندی اور ستھرا پن پر حرف نہ رکھ سکتا تھا۔ وہ صبح شام دالان اور کوٹھریوں میں جھاڑو دیتی۔ اور ہنڈیا چولہے اور دوسرے کاموں سے جو وقت بچتا اسے مکان کی لیپ پوت ہی میں گزارا کرتی تھی۔ دونوں کوٹھریوں میں سے جس کی حالت نسبتاً بہتر تھی۔ اس نے اس میں چاندنی کا فرش کر کے اور گاؤ تکیے لگا کے اسے بیٹھنے کا کمرہ بنا لیا تھا۔ دیواروں پر گز گز بھر اونچی سیتل پاٹی لگوا دی تھی۔ تاکہ ٹیک لگانے میں دیوار کی مٹی کپڑوں میں نہ لگنے پائے۔ دوسری کوٹھری اس کی خواب گاہ، غسل خانے اور سنگھار کے کمرے کا کام دیتی تھی۔ اسی کوٹھری میں وہ تخت بھی تھا۔ جس پر وہ فرائض پنجگانہ ادا کیا کرتی تھی۔ علاوہ ازیں اس کے کپڑوں کا صندوق، روزمرہ کے استعمال کے برتن اور دوسرا چھوٹا موٹا سامان بھی اسی میں رہتا تھا۔

ہرچند اس نے اپنی گزشتہ زندگی کا ذکر کرنا کبھی پسند نہیں کیا۔ تاہم اس سے ملنے والا اس کی چال ڈھال اور طرز گفتگو سے پہلی ہی ملاقات میں جان لیتا تھا۔ کہ وہ اس غریبانہ ماحول میں رہنے کی عادی نہیں ہے۔ اس کا مکان حقیر اور چھوٹا سا سہی۔ مگر اس کا دروازہ ہر اس شخص کے لئے کھلا رہتا۔ جسے رات سر چھپانے کو کہیں جگہ نہ ملی ہو۔ اسی طرح اس کا دسترخوان۔ جس پر خواہ دونوں وقت دال یا بھجیا ہی بنتی ہو۔ ہر بھوکے کو اس کے حصے کا بھوجن دینے میں کبھی بخل نہ کرتا تھا۔

کبھی کبھی دوست بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق دسترخوان کی آرائش میں اس کا ہاتھ بٹاتے۔ مثلاً کوئی صاحب شام کو کام سے لوٹتے ہوئے ڈبل روٹی خریدتے لاتے۔ ڈبل روٹی اپنی اور دال بھاجی فرخ بھائی کے ہاں کی۔ کوئی صاحب نصف درجن کیلے یا پاؤ بھر مونگ پھلی لفافے میں لیے آتے۔ کوئی صاحب تیسرے پہر چھوکرے کے ہاتھ سالم مرغی بھجوا کر کہلوا دیتے:

"میاں نے سلام کہا ہے۔ اور کہا ہے کہ رات کو کھانا وہ اور ان کے ایک دوست یہیں کھائیں گے۔"

کبھی دسترخوان پر کھانے والے زیادہ ہوتے۔ اور کھانا کم۔ تو کوئی صاحب جیب سے جھٹ چونی نکال چھوکرے کو دیتے۔ کہ جا جھٹ پٹ بازار سے چار گرم گرم روٹیاں اور چار کباب لے آ۔ وہ

ان باتوں کا کبھی برا نہ مانتی بلکہ ایسی نظروں سے ان صاحب کی طرف دیکھتی۔ گویا ان دونوں میں پوری پوری مفاہمت ہے۔

اس کو تنگی کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ جو موجود ہے وہ حاضر ہے۔ جو موجود نہیں اس کی تو فکر ہی نہیں۔ نہ اس نے اپنی حیثیت کو کبھی چھپانے کی کوشش کی۔ نہ کسی خشک دعوت یا اگلی پچھلی کسر دعوت کے ذکر سے ہی پوری کرنی چاہی۔ اگر کسی نے اس کی کچھ مدد کی۔ تو متشکرانہ قبول کر لی۔ مگر خود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔

کھانے پینے ہی پر موقوف نہیں وہ اور طرح سے بھی اپنے دوستوں کی خدمت کرنے سے دریغ نہیں کرتی تھی۔ مثلاً صبح کو دن نکلنے سے کچھ ہی مدت پہلے کوئی صاحب آ نکلے:

"بھابی میری پتلون کا بٹن اکھڑ گیا ہے۔ کم بخت ابھی ابھی راستے ہی میں اکھڑا ہے۔ میں ویسے ہی دفتر چلا جاتا مگر راستے میں تمہارا گھر پڑتا تھا۔ خیال آیا تمہیں سے ٹنکواتا چلوں۔ اور کہیں سے اکھڑا ہوتا تو گذارہ ہو جاتا۔ کم بخت سامنے ہی سے اکھڑا ہے۔"

اور وہ ایک شفیق بہن کی طرح پیار اور ملامت کی ملی جلی نظروں سے ان صاحب کی طرف دیکھتی ہوئی گویا کہہ رہی ہو تمہیں تم بہت شریر ہو۔ تم اپنے کپڑے سنبھال کر کیوں نہیں رکھتے۔ اور وہ جلدی جلدی بٹن ٹانک دیتی۔

یا مثلاً کوئی صاحب اچانک رات کے دو بجے آ کر اس کے مکان کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیتے۔

"فرخ بھابی۔ فرخ بھابی۔ میری بیوی کنڈی نہیں کھولتی۔ کہتی ہے وہیں جاؤ جہاں رات بھر غائب رہتے ہو۔ خدا کے لئے تم چل کر اسے سمجھاؤ۔"

اور وہ اسی وقت آنکھیں ملتی اور دوپٹہ سنبھالتی ہوئی ان صاحب کے ہمراہ ہو لیتی۔ یہ اور بات ہے۔ کہ اس قسم کی مہموں سے عموماً اسے ناکام اور خفیف ہو کے لوٹ آنا پڑتا۔

اس کے ہاں یوں تو کبھی کبھی دن کو بھی ہنگامہ برپا رہا کرتا۔ مگر اصل محفل رات کو آٹھ بجے کے بعد ہی سجا کرتی تھی۔ سب سے پہلے عموماً محسن عدیل آیا کرتا۔ وہ درمیانے قد کا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ تیس کے قریب عمر۔ زرد چہرہ۔ آنکھیں بڑی بڑی اداس اور ایسی بے نور کہ معلوم ہوتا بس بجھا ہی چاہتی ہیں۔ اگر وہ اپنے کو ذرا سنبھالے ہوئے رکھتا۔ تو خاصہ معقول آدمی معلوم ہوتا۔ مگر اس کے بال اکثر وحشیوں کی طرح بڑھے ہوئے ہوتے۔ داہنے ہاتھ کی انگلیاں سگرٹ نوشی سے مستقل طور پر پیلی ہوئی تھیں۔ جیسے کسی نے آیوڈین پینٹ کیا ہو۔ ناخنوں میں نیلا نیلا سا میل بھرا ہوا۔ اگر کبھی چلتے چلتے آئینے پر نظر پڑ

جاتی تو دیا سلائی یا سگریٹ کی ڈبیا کے کنارے سے اوپر اوپر سے میل کرید لیتا۔ سردی گرمی ہر موسم میں ایک سیاہ بوسیدہ سی شیروانی پہنے رہتا۔ اور ایک سرخ سوتی مفلر جس میں جابجا سوراخ ہو گئے تھے۔ ہر وقت گلے میں ڈالے رکھتا۔ جب اس کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہو جاتی۔ تو کسی شام وہ اس سے کہتی:

"عدیل میاں۔ ایک بہت ضروری کام میں آپ سے مشورہ لینا ہے۔ کل دوپہر کو میرے ہاں تشریف لایئے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ دیکھئے بھولئے گا نہیں۔ بڑا ہی ضروری کام ہے۔"

اور جب عدیل اگلے روز دوپہر کو اس کے ہاں پہنچتا۔ تو وہ ادھر ادھر کی باتوں میں اس سے کہتی:

"عدیل میاں کچھ اپنے کپڑوں کی بھی فکر ہے۔ دیکھئے آپ کی شیروانی میں کھونچ لگ رہی ہے۔ لایئے میں سی دوں۔ ورنہ شیروانی زیادہ پھٹ جائے گی۔"

عدیل کے سوکھے ہوئے زرد گالوں پر ہلکی سی سرخی دوڑ جاتی۔ اور وہ اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا۔

"نہیں نہیں، رہنے دو تکلیف نہ کرو۔ پھر کبھی سہی۔"

مگر وہ اس کی ایک نہ سنتی۔ اور شیروانی اتروا ہی لیتی۔ پھر بجائے سینے کے وہ اسے لے جا کر پانی کے ٹب میں ڈال دیتی۔ عدیل اس کا منہ تکتا کا تکتا رہ جاتا۔ ادھر وہ جھٹ شیروانی کو ٹب سے نکال تسلے میں ڈال اس پر صابن رگڑنا شروع کر دیتی۔

تھوڑی دیر میں چھوکرا حجام کو لئے ہوئے آ جاتا۔

"میاں حجام آ گیا ہے۔ خط بنوا لیجئے۔"

اور اب عدیل سمجھ جاتا۔ اس کے ہونٹوں پر مہر لگ جاتی۔ اور وہ ان باتوں کو دل ہی دل میں سخت ناپسند کرتے ہوئے بھی چپ چاپ اس کا ہر حکم مانے جاتا۔ جیسے کوئی بھیڑ بال کٹائی کے وقت دو چار دفعہ ممیں کرنے کے بعد اپنی قسمت کو اپنے مالکوں کے ہاتھ سونپ چپ سادھ لیتی ہے۔ وہ کپڑے اتار کر ہلکی سی چادر باندھ لیتا۔ اور حجامت کرانے بیٹھ جاتا۔ ادھر شیروانی کے بعد فرخندہ اس کا کرتا پاجامہ اور مفلر دھوتی۔ ساتھ ساتھ حجام کو تاکید بھی کرتی جاتی:

"خلیفہ جی۔ بال کافی چھوٹے ہوں گے۔ دیکھنا ہاتھوں اور پیروں کے ناخن لینا نہ بھول جانا۔"

حجامت کے بعد عدیل کو گرم پانی سے نہلایا جاتا۔ وہ خود اس کی پیٹھ اور سر میں صابن ملتی۔ اس کے بعد وہ اپنے صندوق میں سے پلنگ کی ایک اجلی چادر نکال کر اسے دیتی:

"لیجئے عدیل میاں۔ اسے لپیٹ کر دھوپ میں چارپائی پر بیٹھ جایئے۔ ذرا سی دیر میں کپڑے

سوکھا چاہتے ہیں۔ میں اتنے میں استری گرم کر آتی ہوں۔"

عدیل دھوپ میں چارپائی پر بیٹھا پہلے سے بھی زیادہ اداس نظروں سے اسے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آتے جاتے دیکھتا رہتا۔ اور اس کی لبریز آنکھوں سے بوند ٹپکنے کے بالکل قریب ہو جاتی۔

غرض اس طرح دو تین گھنٹے میں اسے آدم صورت بنا دیا جاتا۔

محسن عدیل ایک ناول نویس تھا۔ مگر بدقسمتی سے ابھی اس کا جوہر اہل وطن پر نہیں کھلا تھا۔ اسے اپنا پہلا ناول لکھے پانچ برس ہو چکے تھے۔ مگر ابھی تک اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس طویل قصے میں مصنف نے حیرت انگیز واقعیت اور جامعیت کے ساتھ جنسی لذتوں کا کھوج لگانے کی سعی کی تھی۔ خیر یہ تو کچھ زیادہ قابل اعتراض بات نہ تھی۔ مشکل یہ تھی کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنے نظریوں کے جواز میں پیغمبروں اور اوتاروں کی خانگی زندگیوں کو تختۂ مشق بنایا تھا۔ اور یہ ایسی بات تھی کہ کتاب کا شائع ہوتے ہی ضبط ہو جانا یقینی امر تھا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ کوئی ناشر اسے چھاپنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

کتب فروشوں نے عدیل کو معقول معاوضہ پیش کرتے ہوئے مشورہ دیا تھا کہ ناول میں سے قابل اعتراض حصوں کو حذف کر دو۔ مگر وہ مسودے میں سے ایک لفظ بھی کاٹنے کو تیار نہ تھا۔ وہ کہا کرتا:

"ایک سچا فن کار ہمیشہ اپنی روح کو تخلیقات میں منتقل کیا کرتا ہے۔ میری روح اچھی ہو یا بری میں مادی منفعت کے لئے اسے بدلنے کو ہرگز تیار نہیں ہوں۔"

عدیل کو اپنی اس ضد کے طفیل کافی تنگ دست ہونا پڑا تھا۔ اور وہ رفتہ رفتہ تصنیف و تالیف کے کام ہی سے بددل ہو گیا تھا۔ جب اس کی ناداری حد سے بڑھ جاتی۔ تو ایک دوست اسے کسی چھاپے خانے سے زیر طبع کتابوں کے کچھ پروف پڑھنے کے لئے لا دیا کرتا۔ اور اس طرح اسے دو چار روپے مل جایا کرتے۔

عدیل سے فرخندہ کی دوستی سب سے پرانی تھی۔ اب سے کوئی سال بھر پہلے جب وہ اپنے شوہر کی جوانا مرگی کے بعد سسرال والوں کی سختیوں سے تنگ آ کر بھاگ آئی تھی۔ تو ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر سب سے پہلے اس کی ملاقات عدیل ہی سے ہوئی تھی۔ اور عدیل ہی نے اسے اس مکار بڑھیا کے پنجے سے چھڑایا تھا۔ جو اسے کسی کھاتے پیتے گھر میں استانی کی جگہ دلوانے کا لالچ دے کر نکال لائی تھی۔ پھر چونکہ اس کے میکے میں اس کا کوئی حقیقی رشتہ دار زندہ نہیں تھا۔ جو اس کی معاش کا

کفیل ہوتا۔ یہ عدیل ہی تھا۔ جس نے اس کے رہنے سہنے کا انتظام کیا تھا۔ اور اسی کے مشورے سے اس نے قسطوں پر سلائی کی مشین لے کر ٹکائیاں بوٹے وغیرہ سینے کا کام شروع کیا تھا۔ جو اس نے اسکول میں اپنی ایک شفیق استانی سے سیکھا تھا۔ عدیل ہی نے نہ معلوم کہاں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر بارہ چودہ برس کا ایک ہوشیار سا لڑکا لا دیا تھا۔ جو نہ صرف گھر کا اوپر کا کام ہی کیا کرتا بلکہ ہر روز تیسرے پہر اس کی تیار کی ہوئی ٹکائیاں وغیرہ بیچنے بھی جایا کرتا۔ غرض وہ عدیل کی بڑی قدر کرتی اور اسے ملک کا بہت بڑا صناع سمجھتی تھی۔

محسن عدیل کے بعد یا تو بیمہ ایجنٹ بھلا کر آتا۔ اور یا ڈاکٹر ہمدانی یا دونوں ساتھ ساتھ آتے۔ بھلا کر ادھیڑ عمر کا بھاری بھر کم آدمی تھا۔ گندمی رنگ۔ میلے رنگ کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہا کرتیں۔ ان کو دیکھ کر ایسا گمان ہوتا۔ گویا کسی حاصل نہ ہو سکنے والے مطلب کے بر لانے کے لئے نت نئی چالوں کا تصور پیش رہتا ہے۔ فرخ بھائی کے ہاں آتے ہی وہ اپنی بادامی رنگ کی پتلون اتار کے اور تہہ کر کے ایک کونے میں رکھ دیتا۔ اور ایک پرانی سی دھوتی باندھ لیتا جو اسی مقصد کے لئے اس نے وہاں لا کر رکھ دی تھی۔ جس روز وہ معمول سے کچھ سویرے آ جاتا۔ اور فرخندہ ابھی ہنڈیا چولھے ہی میں لگی ہوتی۔ تو وہ کسی سے بات نہ کرتا۔ بس جیب سے تاش کا پیکٹ نکال اکیلا ہی فرش پر بازی لگاتا رہتا۔

انشورنس والے عموماً ہر اس جگہ جانے کے آرزومند رہا کرتے ہیں۔ جہاں دو چار صورتیں مل بیٹھتی ہوں۔ کہ شاید وہاں کوئی شکار ہاتھ آ جائے۔ اور بھلا کر بھی فرخ بھائی کے ایک دوست کے ذریعے اس کے ہاں یہی مقصد لے کر پہنچا تھا۔ مگر یہاں اسے اپنے ڈھب کی کوئی آسامی تو نظر نہ آئی۔ البتہ یہاں کا ماحول اسے ایسا راس آ گیا۔ کہ یہ جگہ شام گزارنے کے لئے مستقل طور پر اس کا ٹھکانہ بن گئی۔

ڈاکٹر ہمدانی کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ مگر دیکھنے میں وہ چالیس سے زیادہ کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ گٹھا ہوا جسم سرخ و سفید چہرہ۔ ڈاڑھی مونچھ صاف۔ سر کے بال تقریباً غائب۔ ایک آنکھ پر سنہری زنجیر والا چشمہ لگایا کرتا۔ ململ کا کرتہ۔ بوسکی کا تہمد۔ پاؤں میں سلیپر۔ ہاتھ میں ایک موٹی سی چھڑی چاندی کی موٹھ والی۔ سردیوں میں اس لباس میں فقط اس قدر اضافہ ہوتا۔ کہ پشمینے کی ایک خود رنگ چادر کو ایک خاص ڈھب سے تہہ کر، چھاتی پر لپیٹ، بغل سے نکال شانے پر اس طرح ڈال لیتا۔ کہ اس میں ایک بارعب سیاسی لیڈر کی سی ادا پیدا ہو جاتی۔

وہ طب یونانی، ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی تینوں میں ماہر سمجھا جاتا تھا۔ گو باقاعدہ طور پر ان میں

سے کسی کی سند بھی اس کے پاس نہ تھی۔ اس نے ذاتی طور پر انسانی روگوں کا مطالعہ کیا تھا۔ اور علاج کے تینوں مروجہ اصولوں کو ملا کر ایک نیا طریقہ نکالا تھا۔ جس کے باعث غیر طبی حلقوں میں اس کی کافی شہرت تھی۔ وہ اپنی چھوٹی سی دارالتجارب میں اپنے آپ کو بند کر کے عجیب و غریب اور پراسرار تجربے کیا کرتا۔ جن کا حال کسی کو معلوم نہ تھا۔ فرخ بھائی ایک مرتبہ اس کے زیر علاج رہ چکی تھی۔ اور یہیں ان کی دوستی کی ابتدا تھی۔

سیڑھیوں میں ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دیتی۔ اور سب جان لیتے کہ دیپ کمار آ رہا ہے۔ وہ ایک بائیس سال کا خوش رو شرمیلا نوجوان تھا۔ چمپئی رنگ۔ گھنگھریالے بال۔ وہ ایک امیر زمیندار کا بیٹا تھا۔ اور اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالسلطنت میں آیا تھا۔ مگر ایم۔ اے میں فیل ہونے کے بعد ایسا دل برداشتہ ہوا۔ کہ نہ تو باپ کے بے شمار خطوں اور تاروں کا کوئی جواب دیا۔ اور نہ گھر جانے کا نام ہی لیا۔ اس کا مخصوص لباس یہ تھا۔ کھدر کا کرتا کھدر کا پاجامہ پیروں میں چپل اور سر سے ننگا۔ سردیوں میں ایک سپید کمبل جس کے حاشیے پر سرخ سرخ ڈورے تھے، اوڑھ لیا کرتا۔ باپ کی نشانی یہی ایک کمبل اس کے پاس رہ گیا تھا۔

اسے فرخندہ کے ہاں عدیل لایا تھا۔ فرخندہ نے پہلی ہی ملاقات میں اس سے کہا تھا: "آپ کے لئے فلم لائن بہت موزوں رہے گی۔" یہ سن کر اس کے رخسار کانوں تک تمتما اٹھے تھے۔ کوئی مہینے بھر کے بعد جب وہ فرخندہ سے کسی قدر بے تکلف ہو گیا۔ تو ایک دن جھجکتے ہوئے پوچھا:

"فرخ بھائی کیا میں سچ مچ فلم لائن کے لئے موزوں ہوں؟"

فرخندہ مسکرا دی:

"تو کیا اس دن آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہوا تھا؟"

دیپ کمار یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا۔ اور پھر کبھی اس موضوع پر گفتگو نہیں کی۔

عدیل، بھلا کر، ڈاکٹر ہمدانی اور دیپ کمار کے آ جانے سے اب محفل خاصی جم جاتی۔ ادھر فرخندہ بھی عشا کی نماز سے فارغ ہو کر محفل میں آ بیٹھتی۔ علاوہ ازیں 'مولانا' جو اکثر فرخندہ ہی کے ہاں پڑے رہتے تھے اور زیادہ تر وقت سونے میں گزارتے تھے۔ اپنی کملی سنبھالتے ہوئے آ کر شریک محفل ہو جاتے۔

نام تو خدا جانے ان کا کیا تھا۔ مگر سب انہیں 'مولانا' کہا کرتے تھے۔ یہ مقدس خطاب دلوانے میں ان کی بزرگی یا دین داری سے کہیں زیادہ ان کی چھوٹی سی کر بڑی ڈاڑھی نے حصہ لیا تھا۔

کلوں پر تو بال خال خال تھے۔ البتہ ٹھوڑی خوب بھری ہوئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، ناک پتلی اور ستواں، کان بڑے بڑے، کہتے تھے مسجد کے ملاں نے کھینچ کھینچ کر بڑے کر دیئے تھے۔

یہ حضرت دیہات کے رہنے والے تھے۔ ادھیڑ عمر میں علم دین کی تکمیل کا شوق چرایا۔ اور یہ اپنے گاؤں کو خیر باد کہہ کر شہر پہنچے۔ کچھ دنوں مختلف مسجدوں میں فقہ حدیث وغیرہ کا درس لیتے رہے۔ پھر ایک مسجد کے امام بنا دیئے گئے۔ جو ٹوٹی ہوئی اور شہر سے دور ایک اجاڑ سے مقام میں تھی۔ مسجد کے قریب ہی سے ریل کی لائن گزرتی تھی۔ نمازی تو اس مسجد میں شاذ ہی کبھی آتا۔ البتہ ریل گاڑیاں دن رات گذرا کرتیں۔ مولانا دن بھر حجرے میں اپنی جھلنگی چارپائی پر پڑے حجرے کے شگاف میں سے آنے جانے والی گاڑیوں کی سواریوں کو اداسی سے دیکھتے رہتے۔ ان کا معمول تھا کہ جمعہ کے جمعہ کپڑے دھو کر شہر کی جامع مسجد میں جایا کرتے۔ جہاں ایک مشہور عالم دین جمعہ کی نماز کے بعد وعظ کیا کرتے۔ ایک دن وہ وعظ کو جانے لگے تو اپنی ساری درسی کتابیں بھی ساتھ لیتے گئے۔ پورے دو گھنٹے تک وہ حضوری قلب کے ساتھ عالم صاحب کا وعظ سنتے رہے۔ جب وعظ ختم ہوا۔ تو وہ زار و قطار رو رہے تھے۔ روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ مسجد سے نکل کر انہوں نے اپنی ساری کتابیں ایک نادار طالب علم کو دے دیں۔ اس کے بعد پھر کسی نے ان کو کسی مسجد یا درس میں نہیں دیکھا۔

فرخندہ سے ان کی ملاقات یوں ہوئی کہ پچھلے سال جاڑوں کی ایک شام کو وہ ایک بازار سے گذر رہی تھی۔ کہ اس نے دیکھا۔ ایک شخص کمبل اوڑھے سرکاری نل کے کنارے بیٹھا زور زور سے کانپ رہا ہے۔ وہ ٹھہر گئی۔ اس پر اس شخص نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

"میں بیمار ہوں۔ اس شہر میں میرا کوئی نہیں۔ میں بچوں کو کلام مجید پڑھا سکتا ہوں اگر کہیں کام مل جائے........"

غرض فرخندہ انہیں گھر لے آئی۔ چھ سات روز میں وہ بالکل تندرست ہو گئے مگر وہ دن اور آج کا دن، نہ تو انہوں نے بچوں کو کلام مجید پڑھانے کا کبھی ذکر کیا۔ اور نہ فرخندہ کے ہاں سے جانے کا نام ہی لیا۔ وہ گھر کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹا دیا کرتے مثلاً برتن مانجھ دیئے۔ چولھے میں آگ سلگا دی۔ کنوئیں سے پانی بھر لائے۔ اور اگر کبھی فرخندہ کے سر میں درد ہوتا۔ تو دیر تک اس کی پیشانی کو دباتے اور آیات قرآنی پڑھ پڑھ کر دم کرتے رہتے۔ علاوہ ازیں کبھی کبھی فرخندہ کے دوستوں کا چھوٹا موٹا کام بھی کر دیا کرتے۔ مگر ہمیشہ ناخوشی کے ساتھ۔ وہ سب کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر کھانا

کھاتے تھے۔

زیادہ دیر نہ ہونے پائی۔ کہ نوجوان انقلابی شاعر شگیلی بھی آ پہنچا۔ وہ تھا تو جلد ساز مگر طبع موزوں رکھتا تھا۔ نفسیات کے ایک پروفیسر کی صحبت نے جو اس سے جلدیں بندھوایا کرتا تھا اسے شاعر بنا دیا تھا۔ شگیلی کا تخلص اسی کا رہین منت تھا۔ چیچک رو تھا مگر آواز خدا کی دین ہے۔ جس وقت لہک لہک کر اپنا کلام سناتا۔ تو اپنی کم روئی اور خستہ حالی کے باوجود ایک خاص طرح کا حسن اور بھولپن اس کے چہرے پر برسنے لگتا۔ اس نے مزدوروں کے متعلق متعدد نظمیں لکھی تھیں۔ ہر چند ان میں عروض وغیرہ کی غلطیاں جا بجا پائی جاتی تھیں۔ پھر بھی ان میں سے بعض واقعی معرکے کی تھیں۔ خصوصاً وہ نظم جس میں ایک مزدور اپنی شادی کے روز حجام سے خط بنوانے جاتا ہے۔ اس کی حجامت کا یہ عالم ہے کہ پے در پے استرے کے زخم کھاتا ہے۔ اور بالآخر اپنا نصف منڈا ہوا منہ لئے اٹھتا ہے۔ حقیقت نگاری اور انقلابی مزاج کی عمدہ ترین مثال تھی۔

یہ محفل اپنے عروج پر نہیں آ پہنچتی تھی۔ جب تک کہ قاسم نہ پہنچتا۔ وہ ٹرام کمپنی میں کرایہ لگانے پر ملازم تھا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وہ ایک افسانہ نویس بھی تھا۔ اس نے ٹرام کی نوکری محض بیکاری کی وجہ سے کی تھی۔ مگر دو چار ہی روز میں جب اس نے دیکھ لیا کہ اس کے ذریعے اسے انسانی کردار کے مطالعہ کا، جو اس کی افسانہ نویسی کے لئے از بس ضروری تھا، کس قدر نادر موقع ملتا ہے۔ تو اسے اس کام سے بے حد دلچسپی ہو گئی۔ چنانچہ جب بعد میں ایک دوست نے اس کے لئے کسی اور جگہ بہتر ملازمت تلاش کی۔ تو اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ سچ یہ ہے کہ ٹرام میں اس کی مڈبھیڑ اس قدر گوناگوں انسانوں سے ہوتی تھی۔ کہ نہ تو ریل میں ممکن ہے۔ اور نہ جہاز میں۔ کیونکہ ان کے مسافر عموماً لمبے لمبے سفر کرتے ہیں۔ مگر ٹرام میں ہر پانچ منٹ کے بعد پوری کھیپ کی کھیپ نئے مسافروں کی لے لیجئے۔

وہ دراز قامت اور خوش شکل نوجوان تھا۔ ٹرام کی میلی اور پھٹی ہوئی وردی میں بھی وہ ایک فوجی کی سی شان رکھتا تھا۔ دنیا میں اس کا کوئی عزیز یا رشتہ دار نہ تھا۔ دوپہر کو تنور پر گنواروں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیتا۔ اور شام کو ٹرام کے ایک اسٹیشن کے قریب سے نان کباب خرید لاتا۔ اور چلتی گاڑی میں کھڑے کھڑے کھا لیتا۔ اگلے اسٹیشن پر ٹرام رکتی۔ تو سرکاری نل سے پیٹ بھر کر پانی پی لیتا۔ غرض بہت مرنجاں مرنج آدمی تھا۔

قاسم اور شگیلی، محسن عدیل کے دوستوں میں سے تھے۔ اور پہلے پہل اسی کے ذریعے فرخندہ بائی کے ہاں آئے تھے۔ یہ سب لوگ محفل کے خاص رکن تھے اور قریب قریب ہر روز کے آنے والے۔ ان

کے علاوہ کچھ اور اصحاب بھی تھے۔ مگر ان کے آنے کا کچھ ٹھیک نہ تھا۔ جب آنے لگتے۔ تو متواتر کئی کئی دن آتے رہتے۔ اور جب نہ آتے تو مہینوں شکل نہ دکھاتے۔

ان میں ایک صاحب تھے مسٹر سنگھا۔ جو ایک باکمال مصور اور فوٹوگرافر تھے۔ مگر اپنے فن سے فائدہ اٹھانا ان کی قسمت میں نہ تھا۔ کیونکہ نہ کبھی کوئی اسٹوڈیو نصیب ہوا۔ اور نہ کبھی کوئی بڑھیا سا کیمرہ خریدنے کی توفیق ہوئی۔ چنانچہ کبھی ادنیٰ تھیٹریکل کمپنیوں کے پردے رنگ کرتے کبھی دکانوں کے سائن بورڈ لکھ کر گذر اوقات کرتے۔ ان کی یہ بڑی تمنا تھی۔ کہ وہ فرخ بھائی کی ایک ایسی تصویر کھینچیں۔ جس میں وہ فوجی وردی پہنے گھوڑے پر سوار ہو۔ اور کئی مرتبہ اس کا اظہار بھی کر چکے تھے۔ مگر یہ تمنا پوری ہونے میں نہ آتی تھی۔

کبھی کبھی ایک خان صاحب بھی، مان نہ مان میں تیرا مہمان کے مصداق آ جایا کرتے۔ وہ کبھی تھانے دار رہ چکے تھے۔ مگر کسی بے اعتدالی کے باعث معطل کر دیئے گئے تھے۔ شملے دار پگڑی کلاہ پر بندھی ہوئی، مونچھوں کو بل دیا ہوا، سرخ سرخ آنکھیں، ہاتھ میں پتلی سی بید کی چھڑی جسے جا بجا لہراتے رہتے۔ پاؤں میں پشاوری چپل۔ خدا ہی جانتا تھا کہ وہ کس طرح گذر کیا کرتے تھے۔ مگر جب آتے پئے ہوئے آتے۔ اور آتے ہی فرمائش شروع کر دیتے:

"فرخندہ خانم۔ کبھی گانا نہ سنایا تم نے!"

"ایلو اور سنو" فرخندہ جواب دیتی۔ "یہ کس نے کہہ دیا آپ سے کہ میں گاتی ہوں۔"

"واللہ کہ تم ضرور گاتی ہو۔ اور آج ہم بے سنے نہ جائیں گے۔"

"خان صاحب۔ آپ باور کریں۔ میں گانا بالکل نہیں جانتی۔"

"فرخندہ خانم۔ تمہاری آواز واللہ بے حد رسیلی ہے۔ تم گایا کرو۔ سکھانے کا بندوبست ہم کر دیں گے۔"

"جی شکریہ!"

"بہت اچھا گویا ہے آج کل ہمارے ہاتھ میں۔"

"لو بھلا اس عمر میں میں کیا سیکھوں گی گانا۔"

"سینما کے پاس ہیں ریزرو کلاس کے۔ چلتی ہو فلم دیکھنے۔ چاہو تو مولانا کو بھی ساتھ لے چلو۔"

"جی مجھے تو معاف ہی رکھئے۔ ہاں مولانا جانا چاہیں تو انہیں شوق سے لے جایئے۔"

پھر وہ کچھ تامل کر کے حاضرین پر ایک نظر ڈالتے ہوئے فرخندہ سے دبی آواز میں پوچھتے:

"کھانا تو تم لوگ کھا چکے ہوگے؟"

"ہاں مدت ہوئی۔"

"اچھا تو ایک پان کھلا دو اور ہم چلیں۔"

ان خاں صاحب کا آنا فرخندہ کے سب دوستوں کو برا لگتا۔ مگر وہ خاموش اور کچھ کھنچے رہنے ہی میں مصلحت سمجھتے۔ آخر خدا خدا کر کے جب وہ رخصت ہوتے۔ تو سب لوگ اطمینان کا سانس لیتے۔

جب یہ محفل جم جاتی۔ تو گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتا۔ اس کے لئے کسی خاص موضوع کی پابندی نہ تھی۔ عام طور پر کسی اخبار کے ضمیمے کی خبر قتل یا لوٹ۔ یا کوئی واقعہ کسی مغنیہ کی آمد یا کسی لیڈر کا اغوا چھرا وغیرہ گفتگو کے آغاز کا باعث ہوتے۔ شروع شروع میں بات چیت دو ایک آدمیوں ہی تک محدود رہتی۔ مگر جلد ہی کوئی صاحب موضوع میں تھوڑی سی ترمیم کر کے شریک ہو جاتے۔ باتوں باتوں میں کوئی واقعہ مثال کے طور پر سنایا جا رہا ہوتا۔ تو سامعین میں سے کسی اور صاحب کو ویسا ہی یا اس سے ملتا جلتا واقعہ یاد آ جاتا۔ جسے وہ سنائے بغیر نہ رہتے۔ اسی طرح کسی صاحب کو بات کا کوئی پہلو کھٹکتا۔ جس کی تردید کرنا وہ ضروری سمجھتے غرض یوں رفتہ رفتہ سبھی لوگ گفتگو میں حصہ لینے لگتے۔

بعض اوقات گفتگو شروع ہی سے عالمانہ رنگ اختیار کر لیتی۔ ایسے موقعوں پر قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں دہرائی جاتیں۔ تاریخ کے لاینحل عقدوں کی گرہ کشائی کی جاتی۔ حکمرانوں اور جہاں بانوں کی حکمت عملیوں پر روشنی ڈالی جاتی۔ اقتصادیات، عمرانیات، نفسیات اور حیات بعد الممات پر خیال آرائیاں ہوتیں۔ اور فرخندہ انتہائی غور و خوض کے ساتھ اپنے رفیقوں کی تقریریں سنتی رہتی۔ ہر چند بہت سی باتیں اس کی سمجھ سے بالا ہوتیں۔ مگر اس سے اس کے انہماک میں ذرا فرق نہ آتا۔ وہ دل ہی دل میں ان کی قابلیت اور وسعت معلومات پر عش عش کر اٹھتی۔ اور جب اسے یہ خیال آتا۔ کہ علم و فضل کے یہ دریا اس کے چھوٹے سے ناچیز گھر میں بہائے جا رہے ہیں تو اس کی آنکھوں کی قدرتی چمک دوچند ہو جاتی۔ اور اس کا سانس تیز تیز چلنے لگتا۔

کبھی کبھی جادو اور دوسرے مخفی علوم پر بھی اظہار خیال کیا جاتا۔ صرف یہی ایک موضوع ایسا تھا۔ جسے وہ پسند نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اس کے ذکر سے اسے وحشت ہونے لگتی تھی۔ اس گفتگو میں سب سے زیادہ جوش و خروش سے حصہ مولانا لیا کرتے۔ ان کا قول تھا۔ کہ موجودہ تہذیب کی بے چینیوں اور ناانصافیوں کو دور کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ انسان سے بالاتر قوتوں پر قابو حاصل

کیا جائے۔ اور ان کی مدد سے دنیا میں انصاف، بھائی بندی اور امن قائم کیا جائے۔ وہ یہ بھی کہا کرتے، خدا جانے اس میں کہاں تک سچ ہے۔ کہ کم و بیش تمام قدیم تہذیبوں کے عروج و ترقی میں سفلی علوم کو بہت دخل رہا ہے۔

"مولانا صاحب" ڈاکٹر ہمدانی پوچھتا۔ "کیا جن و ملک آج بھی دنیا میں موجود ہیں؟"

"ہیں کیوں نہیں!؟"

"پھر وہ نظر کیوں نہیں آتے؟"

"اس لئے کہ انسان کے حواس کا ارتقا اس قدر کامل نہیں ہوتا۔ کہ وہ جن و ملک کا، جن کی روح انسان کی روح سے ارفع و اعلیٰ ہوتی ہے ادراک کر سکے۔"

"حواس کا کامل ارتقا کیسے ہوتا ہے؟" محسن عدیل دریافت کرتا۔

"سخت ریاضت اور قوتِ ارادی سے۔" مولانا جواب دیتے۔

"کیا کبھی آپ کو بھی جن نظر آیا؟" جھنجھا گر پوچھتا۔

"آیا کیوں نہیں۔" مولانا تمکنت سے فرماتے۔ "لیکن بھی صرف ایک بار۔"

اس کے بعد وہ مزے میں آ کر اس زمانے کا ایک واقعہ سنانا شروع کرتے۔ جب وہ ریلوے لائن کے پاس کوئی ہوئی مسجد میں رہتے تھے۔ اور انہیں سفلی علوم کا نیا نیا شوق ہوا تھا۔ ابھی ان کا جن طہارت کے لوٹے میں سے آدھا ہی نکلنے پاتا۔ کہ فرخندہ جو کچھ لمحے پہلے چپکے سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ واپس آ جاتی۔ اور مولانا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہتی:

"اجی مولانا صاحب قبلہ۔ یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ ذرا جا کر مسجد سے گھڑا تو بھر لائیے۔"

"لیکن وہ پانی کیا ہوا جو میں شام کو بھر کر لایا تھا؟" مولانا پوچھتے۔

جھنجھا گر بول اٹھتا:

"آپ کا کوئی یارِ غار جن آ کر پی گیا ہوگا۔" اور اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑتا۔

"بات یہ ہے مولانا صاحب۔" فرخندہ بیان کرتی۔ "اس میں جھینگر مرا پڑا تھا۔ میں نے لے کے سارا پانی لنڈھا دیا۔ جائیے جائیے میرے اچھے مولانا صاحب۔ ابھی تو مسجد کا دروازہ کھلا ہوگا۔ بند ہو گیا تو رات بھر سب کے سب پیاسے مریں گے۔"

اس وقت جب کہ وہ ایک محیر العقول چشم دید واقعہ سنا رہے ہوتے۔ انہیں یوں بات کو ادھ بیچ میں چھوڑ کے جانا سخت ناگوار گزرتا۔ گھڑے تک پہنچتے اور پھر اسے اٹھا کر سیڑھیاں اترنے میں تو انہیں

خاصا وقت لگ جاتا۔ مگر زینوں ہی سے باہر قدم رکھتے ہی ان میں یک لخت چستی پیدا ہو جاتی۔ یہ امید کہ شاید وہ واپس آ کر قصے کا سلسلہ اسی جگہ سے دوبارہ شروع کر سکیں۔ جہاں اچانک اسے منقطع کر دیا گیا تھا انہیں تیزی سے مسجد میں پہنچا دیتی۔ اور وہ جلد جلد کنوئیں سے پانی نکالنا شروع کر دیتے۔ مگر جب وہ گھڑا بھر کر گھر پہنچتے تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا پاتے۔ جہاں پہلے روحانیات کے اثر سے فضا میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ کا سا گمان ہونے لگا تھا۔ وہاں اب قہقہے لرز رہے تھے۔

نوجوان انقلابی شاعر شگفتی اپنی نظم "سرخ پرچم" سینتالیسویں بار ترنم سے سنا رہا تھا۔ یہ نظم کافی طویل تھی۔ اور فرخ بھائی کو حد سے زیادہ مرغوب۔ مولانا کا دل ٹوٹ جاتا۔ اور اس رات وہ پھر کسی سے بات نہ کرتے۔ اور جلد ہی کمل تان کے پڑ رہتے۔

اس محفل میں آئے دن اہم ملکی و معاشرتی مسائل پر گرما گرم بحثیں تو ہوا ہی کرتی تھیں۔ مگر اس شام اس مجلس کا جوش و خروش خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہوتا۔ جب کوئی صاحب کوئی نئی تجویز لے کر آتے۔ مثلاً ملک کی صحافت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ صحیح معنوں میں کوئی معقول روزانہ اخبار نکالا جائے۔ مگر معقولیت کے لئے چونکہ مالی ذرائع کا وسیع ہونا ضروری تھا۔ اس لئے فی الحال صرف ایک پیسے والے ضمیمہ ہی پر اکتفا کیا جاتا۔ اس کا کچھ زیادہ خرچ بھی نہ ہوگا۔ بیس پچیس روپے روز کے تو صرف سینما ہی کے اشتہار فراہم کئے جا سکتے ہیں۔ مگر نہ معلوم کام کی زیادتی کی وجہ سے یا ہر روز کی ذمہ داری کے خیال سے اس تجویز کا خیر مقدم زیادہ گرم جوشی سے نہ کیا جاتا۔ اور روزانہ اخبار کی اسکیم جھٹ ہی ہفتہ وار اور ہفتہ وار سے ماہانہ رسالے میں بدل جاتی۔ اس پر نئے سرے سے خرچ کی میزان جوڑی جاتی۔ رسالے کا نام اور اس کے اغراض و مقاصد تجویز کرنے پر کافی بحث ہوتی۔ رسالے کی ادارت کسی ایک صاحب کے سپرد نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ ایک پورا بورڈ اس کام کے لئے مقرر کرنا پڑے گا۔ جھنجھا گر اپنے انشورنس کے کام کے ساتھ ساتھ رسالے کے لئے کنوسنگ بھی کرتا رہے گا۔ ڈاکٹر ہمدانی اپنے مریضوں میں توسیعِ اشاعت کی کوشش کرے گا۔ نیز رسالے کے خریداروں کو اس کے ہاں کی ادویہ رعایتی قیمت پر دستیاب ہو سکیں گی۔ مقامی پروپیگنڈے کا کام ٹرام کے کنڈکٹر قاسم اور نوجوان انقلابی شاعر شگفتی کے سپرد ہوگا۔ رسالے کے سرورق اور اس کی ظاہری زیبائش کے لئے مسٹر سنگھا کی خدمات لی جائیں گی۔ رسالے کے دفتر کے لئے کچھ زیادہ تردد کی ضرورت نہیں۔ اس مطلب کے لئے بھلا فرخ بھائی کے گھر سے زیادہ موزوں جگہ اور کون سی ہو سکتی ہے...... غرض یہ سارے مرحلے طے ہو جاتے۔ اور اراکین مجلس کے شوق و گرم جوشی کو دیکھ کر یہاں

ہونے لگتا۔ کہ بس اب کے مہینے سے رسالہ نکلا ہی چاہتا ہے۔ مگر آخر میں ڈکلریشن داخل کرنے کا کام کچھ ایسا بے ڈھب ثابت ہوتا۔ کہ رسالے کی اشاعت برابر معرض تعویق میں پڑ جاتی۔ اور کچھ دنوں کے بعد یہ تجویز پرانی ہو کر اپنی ساری دلکشی کھو بیٹھتی۔

اسی طرح کبھی اس قسم کی تجویز ہوتی۔ کہ اہل وطن کی صحت ناقص غذا کے باعث روز بروز گرتی جارہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کے لئے وسیع پیمانے پر خالص دودھ اور گھی مہیا کیا جائے۔ یعنی ایک ڈیری فارم کھولا جائے۔ مگر سرمائے کی کمی اور قوم کی اہم ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے اس اسکیم میں بھی برابر ترمیمیں ہوتی رہتیں۔ یہاں تک کہ گائیں بھینسیں چھوٹی ہوتے ہوتے مرغیوں کی شکل اختیار کر لیتیں۔ اور آخر میں کوئی صاحب مرغیوں کی کسی متعدی بیماری کا ذکر کر کے سب کو ہمیشہ کی نیند سلا دیتے۔

ایسا ہی حشر نکاٹا طرزی، کھادی بھنڈار اور غریبوں کے ہوٹل کا ہوا۔

کسی کسی روز خصوصاً سخت سردی کی راتوں میں یہ مجلس خالص تفریحی بھی ہوا کرتی۔ اس شب تمام گفتگوؤں اور بحث مباحثوں کو بالائے طاق رکھ کر تاش کھیلا جاتا۔ عموماً ایک ہی کھیل غلام چور، جس میں ہر دفعہ چور کے لئے نرالی سے نرالی سزا تجویز کی جاتی۔

اس کھیل کی ابتدا عموماً یوں ہوتی۔ کہ محفل میں یکبارگی کسی صاحب کو سخت جاڑا لگنے لگتا۔ چنانچہ فرخ بھائی کے بستر سے اس کا ریشمی لحاف منگوایا جاتا۔ جسے چاروں طرف پھیلا کر سب لوگ اپنی اپنی ٹانگوں پر لے لیتے۔ پھر کوئی صاحب چپکے سے بھلا کر کے کوٹ کی جیب میں سے تاش نکال لیتے۔ اور کسی سے پوچھے گچھے بغیر لحاف ہی پر سب کو پتے بانٹنے شروع کر دیتے۔ چنانچہ اس طرح بغیر کسی تمہید کے کھیل شروع ہو جاتا۔ اور جب تک لالٹین میں تیل ختم نہ ہو جاتا۔ برابر جاری رہتا۔ بعض دفعہ اذانیں تک سنائی دے دے گئیں۔ اس رات تاش کے ساتھ ساتھ مونگ پھلی بھی خوب کھائی جاتی۔ چنانچہ فرش پر، لحاف پر، پتلونوں کی جیبوں میں، پاجامے کے نیفے میں غرض جس جگہ دیکھو۔ مونگ پھلی کے چھلکے ہی چھلکے ہاتھ آتے۔

یہ عجیب بات تھی کہ ہر چند فرخ بھائی کے دوستوں کی بے دینی کفر و الحاد کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ مولانا بھی اپنے بعض عقائد کی بنا پر سخت گمراہ سمجھے جاتے تھے۔ مگر وہ دینی معاملوں میں بڑی کٹر تھی۔ یہ ایک ایسا امر تھا۔ جس میں ان کے دوستوں کے قول اور کردار اس پر کچھ اثر نہیں ڈال سکے تھے۔ وہ سختی سے صوم و صلوٰۃ کی پابند تھی۔ ایسا تو کبھی ہوا۔ کہ اس نے کسی وقت کی نماز

قضا پڑھ لی ہو مگر یہ کبھی نہیں ہوا۔ کہ مطلق چھوڑ ہی دی ہو۔ جب نماز کا وقت ہوتا۔ تو وہ چپکے سے اٹھ کر اپنی کوٹھری میں چلی جاتی۔ اور فریضہ ادا کر کے چلی آتی۔ کبھی کبھی وہ محفل ہی میں اٹھتی دوپٹے کے نیچے تسبیح پھیرتی رہتی۔ اور ساتھ ہی ساتھ دلچسپی سے کھیل اور کھلاڑیوں کو بھی دیکھتی اور مسکراتی رہتی۔

(۲)

کہتے ہیں جب کسی پر برا وقت آتا ہے۔ تو خود بخود ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ کہ ان کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔

جنوری کی ایک صبح کو ابھی اندھیرا ہی تھا۔ کہ فرخندہ کی آنکھ کھل گئی۔ یوں تو وہ نماز کے لئے ہر روز منہ اندھیرے اٹھنے کی عادی تھی۔ مگر اس روز ابھی کچھ زیادہ ہی رات باقی تھی۔ دراصل اسے سوتے سوتے ایسا محسوس ہوا تھا۔ جیسے اس نے اپنی کوٹھری کے باہر دالان میں کچھ کھٹکا سا سنا ہو۔ اور وہ چونک بھی گئی تھی۔ پہلے تو اس نے سوچا۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہی ہو۔ پھر اسے مولانا اور ملازم لڑکے کا خیال آیا۔ جو ساتھ والی کوٹھری میں سویا کرتے تھے۔ ممکن ہے ان میں سے کوئی کسی ضرورت سے باہر نکلا ہو۔ یہ سوچ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر نیند نہ آئی۔ اس نے دل میں کہا کیوں نہ دروازے سے ان لوگوں سے پوچھ لوں۔ چنانچہ اس نے لیٹے ہی لیٹے پکار کر کہا:

"مولانا صاحب۔ اجی مولانا صاحب...... غفار۔ ارے او غفار!"

مگر دونوں میں سے کسی نے رسید نہ دی۔ اس نے سوچا۔ کوٹھری کا دروازہ بند ہے۔ اس پر یہ لوگ گہری نیند سو رہے ہوں گے۔ میری آواز بھلا کہاں سنائی دی ہوگی پھر خیال آیا۔ ان میں سے اگر کوئی باہر نکلا تھا۔ تو ظاہر ہے کہ وہ اتنی جلدی دوبارہ سو نہیں گیا ہوگا۔ جی تو ابھی گرم گرم بستر سے نکلنے کو نہیں چاہتا تھا۔ مگر دل میں وہم جو بیٹھ چکا تھا۔ مجبوراً اٹھی۔ سرہانے کی کھونٹی پر سے گرم چادر اتار اوڑھ لی۔ پھر لالٹین روشن کی۔ اسے ہاتھ میں تھام کر کوٹھری کی کنڈی کھول باہر نکلی۔

باہر اس وقت کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ اور ہوا تھی کہ زناٹے سے چل رہی تھی۔ دانتوں کی کٹکٹاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتی، سہمتی سہمتی دوسری کوٹھری کے دروازے پر پہنچی۔

"مولانا صاحب۔ اجی مولانا صاحب۔" اس نے پکار کر کہا۔

مگر مولانا نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ دروازے کو ہاتھ لگایا تھا۔ کہ کواڑ ایک دم سے

"جی ہوں" کر کے کھل گئے۔ وہ کچھ ڈر سی گئی۔ مگر پھر اس نے دل کو مضبوط کیا۔ اور جس ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اسے اونچا کر کے کوٹھری میں داخل ہو گئی۔ لالٹین کی روشنی میں اس نے دیکھا۔ کہ مولانا تو حسب معمول فرش پر اپنی کمل میں گٹھری سی بنے پڑے ہیں۔ مگر ملازم لڑکا غفار موجود نہیں۔ نہ اس کا بستر ہی اسے نظر آیا۔ معاً اسے اپنی سلائی کی مشین کا خیال آیا۔ جو اسی کوٹھری کے ایک کونے میں پڑی رہا کرتی تھی۔ اور اس کی نظریں آپ سے آپ اس کونے کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا — مشین وہاں نہیں تھی۔

"مولانا صاحب۔ مولانا صاحب" اس نے مولانا کو جھنجوڑتے ہوئے پُر اضطراب لہجے میں کہا۔ "اٹھیے! مجھے چوری ہو گئی۔"

"ایں چوری ہو گئی؟!" مولانا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ "کب؟ کس کے ہاں؟" اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے فرخندہ کا منہ تکنے لگے۔

"ہمارے ہاں اور کس کے!" فرخندہ نے کہا۔ "غفار میری سلائی کی نئی مشین چرا لے گیا۔"

"غفار؟"

"ہاں وہی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا!"

"تو پھر کہاں ہے وہ؟ بستر بھی تو نہیں ہے اس کا۔"

اس کے جواب میں مولانا نے اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو پھرا کر کوٹھری کا جائزہ لیا۔ لمحہ بھر خاموش رہے پھر وہ بڑبڑائے:

"ہائے تیرے مردود کی!"

"ابھی اس کی آدھی قسطیں بھی تو میں نے ادا نہیں کی تھی۔ ہائے اب کیا ہو گا۔ مجھے کئی دنوں سے اس کے طور بدلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ ایک بار خیال بھی آیا۔ کہ رات کو مشین اپنے کمرے میں رکھوا لیا کروں۔ مگر ایک تو اس میں جگہ ہی کہاں تھی۔ دوسرے آپ پر بھروسہ تھا۔ کہ آپ یہاں سوتے ہیں۔ دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔"

مولانا کچھ دیر قصورواروں کی طرح گردن جھکائے چپ بیٹھے رہے۔ علاوہ ازیں ابھی اعضا پر نیند کا کچھ نہ کچھ اثر باقی تھا۔ اچانک انہوں نے جھرجھری لی۔ اور بولے:

"فرخ بھائی۔ فکر نہ کرو۔ مشین کہیں نہیں جا سکتی۔ اللہ نے چاہا تو کل ہی پکڑا جائے گا مردود۔"

"میں سو رہی تھی۔ کہ کھڑکا سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ وہ ابھی ابھی نکلا ہے۔ کچھ دور نہیں گیا ہوگا۔ ہائے ہوتا کوئی ہمت والا۔ ابھی جا کر اسے پکڑ لاتا۔"

"گھبراؤ نہیں۔ میں ابھی اس کے پیچھے جاتا ہوں۔" اچانک مولانا کی مردانگی نے جوش مارا۔ مگر باہر اس وقت ایسی ہمت شکن سردی پڑ رہی تھی۔ کہ فوراً ان کو اپنے اس ارادے میں ترمیم کرنی پڑی۔

"پکڑ تو میں اسے ضرور لاؤں گا۔" وہ بولے۔ "پاتال میں ہوگا۔ پاتال سے بھی کان پکڑ کر کھینچتا ہوا لے آؤں گا۔ مگر ذرا دن نکل آنے دو۔ اس وقت اندھیرے میں کہیں چھپ گیا تو نظر تھوڑا ہی آئے گا سور کا بچہ۔"

"میں رہنے دو مولانا صاحب۔" فرخندہ نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ "اس وقت آپ کے جانے کی ضرورت نہیں۔ صبح کو میں خود ہی کسی کو تھانے بھیج کر رپٹ لکھوا دوں گی۔"

مولانا کو اپنے معقول عذر کے جواب میں یہ درشت کلام سننے کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتے رہے۔ پھر جانے کیا خیال آیا کہ انہوں نے تکیے کے نیچے سے اپنی پگڑی نکال دو ایک دفعہ اسے جھٹکا۔ اور پھر سر پر باندھ لیا۔ پھر کمل جھاڑ اس کی بکل ماری۔ اور جوتی پہن کوٹھری سے باہر نکل گئے۔

کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وہ ٹھٹھرتے ہوئے واپس آئے۔ اس اثنا میں فرخندہ غم سے نڈھال اپنی کوٹھری میں جا کر لیٹ رہی تھی۔

"میں سارے میں دیکھ آیا مردود کو۔" وہ فرخندہ کے پلنگ کے پاس آ کر کہنے لگے۔ "پہلے اسٹیشن پہنچا۔ وہاں سارے مسافر خانے دیکھ ڈالے۔ ایک ایک قلی سے پوچھا۔ جب کہیں نظر نہ آیا۔ تو وہاں سے سیدھا لاریوں کے اڈے پر پہنچا۔ ایک لاری میں دو مسافر سو رہے تھے۔ باقی سب خالی پڑی تھیں۔ پھر ادھر سے باغ میں دیکھتا بھالتا چھجو والی سرائے میں آیا۔ مگر وہاں بھی اس مردود کا کھوج نہ ملا...... بی بی تم فکر نہ کرو۔ تمہاری مشین کہیں جا نہیں سکتی۔ راستے میں مجھے جتنے سپاہی اور چوکیدار ملے۔ میں نے سب کو اس کا حلیہ بتا دیا ہے۔ میرے مولیٰ نے چاہا۔ تو آپ ہی آپ پکڑا ہوا آئے گا نامراد۔"

فرخندہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ ادھر اب مولانا نے بھی اس کی ضرورت نہ سمجھی۔ اور وہ اپنی کوٹھری میں آ کر پھر پہلے کی طرح دراز ہو گئے۔

اس شام جب فرخندہ کے دوستوں نے اس چوری کا حال سنا۔ تو سب کو انتہائی افسوس ہوا۔ خاص طور پر محسن عدیل کو سخت رنج اور غصہ تھا۔ کیونکہ اس لڑکے کو لانے اور فرخندہ کے پاس رکھوانے کی ذمہ داری اسی کی تھی۔ اس نے فرخندہ کو تسکین دیتے ہوئے کہا:

"بھائی فکر نہ کرو۔ میں غفار کے باپ کو جانتا ہوں۔ اور مجھے اس گاؤں کا بھی پتہ ہے۔ جہاں وہ رہتا ہے۔ اگر دو چار دن میں اس کا سراغ نہ ملا۔ تو میں خود اس گاؤں میں جاؤں گا۔ اور اس کا کھوج نکالوں گا۔"

دن میں تھانے میں رپٹ لکھوا دی گئی تھی۔ چنانچہ ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لئے ایک بے وردی حوالدار ایک سپاہی کو ساتھ لے کر موقع واردات کا معائنہ کر گیا تھا۔ فی الحال اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ چنانچہ سب نے فرخ بھائی کو صبر کی تلقین کی اور یقین دلایا۔ کہ ہم میں سے ہر ایک ہر روز شہر کے مختلف حصوں کا چکر لگائے گا۔ اور جہاں جہاں درزیوں کی دکانیں ہیں۔ ان سب سے پوچھ گچھ کرے گا۔ فرخندہ کے دوستوں کی یہ متفقہ رائے تھی کہ غفار مشین لے کر شہر سے باہر نہیں جا سکتا۔ کیونکہ خفیہ پولیس والے اسٹیشن اور شہر کے ناکوں کی کڑی نگرانی کرتے ہیں۔ اور جہاں کسی مشتبہ آدمی کو کوئی قیمتی چیز لے جاتے دیکھتے ہیں۔ وہیں روک لیتے اور تحقیقات کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ گمان غالب یہی ہے کہ اس نے چوری سے پہلے ہی کسی درزی سے بات طے کر رکھی ہوگی۔

فرخندہ گم سم بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہی۔ اس چوری سے اسے سخت دھکا لگا تھا۔ مشین کیا گئی۔ گویا روزی کا دھندا ہی جاتا رہا تھا۔ اب کلائیاں اور بٹوے سیئے تو کس سے۔ علاوہ ازیں جو کچھ سٹاک پہلے کا اس کے پاس تیار تھا۔ اس کی نکاسی کی بھی کوئی صورت نہیں رہی تھی۔ مستقبل کے خیال نے اسے دن بھر ایسا مغموم اور پریشان رکھا تھا کہ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ جب اس کے دوستوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ اسے سمجھانے لگے۔

"واہ فرخ بھائی واہ" قاسم نے کہا۔ "تم نے تو حد کر دی۔ میں تمہیں اتنے کمزور دل کی نہ سمجھتا تھا۔ ایسے واقعات تو پیش آتے ہی رہتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ انسان اپنے کو بھوکوں مار ڈالے۔"

"فرخ بھائی۔" انشورنس ایجنٹ جھنجھنا کر نے کہا۔ "اول تو پوری امید ہے کہ تمہاری مشین تمہیں مل جائے گی لیکن فرض کرو اگر نہ ملی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہفتہ بھر میں کسی اور مشین کا انتظام کر دوں گا۔ بس اب مطلق غم نہ کرو۔ اٹھو کھانا کھاؤ مولانا صاحب دستر خوان بچھا چکے۔"

"دستر خوان بچھ کر کیا کرے گا۔ کچھ پکا بھی ہو۔" مولانا نے کہا۔

"ارے بھئی گھر میں کچھ نہیں پکا۔ تو بازار تو نہیں اجڑ گیا۔" جھنجھنا کر نے یہ کہتے کہتے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال ایک نئی چمکدار اٹھنی نکالی۔

"بھئی ٹھہرو۔ ٹوٹے ہوئے پیسے میرے پاس بھی ہیں۔" قاسم نے کہا۔ اور اپنی قمیض کی جیب سے ریزگاری نکالی۔ اس میں ایک دونی۔ دو اکنیاں۔ چار ادھنے۔ اور تین پیسے تھے۔

"ایک دونی میرے پاس بھی ہے۔" نوجوان انقلابی شاعر شفیق نے اپنی شیروانی کی جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "اگر گر نہیں گئی تو........ نہیں گری نہیں۔ یہ رہی۔"

غرض بازار سے سالن روٹی اور کباب وغیرہ منگوائے گئے۔ اور روز کی طرح دستر خوان سجایا گیا۔ اور سب کھانے میں شریک ہوئے۔ مگر فرخ بھائی نے بڑے اصرار اور قسمیں دلانے کے بعد صرف چند لقمے کھائے اور اٹھ گئی۔

اس شام محفل خاصی اداس اور بے رونق رہی۔ اور سب لوگ جلد ہی اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

اس واقعہ کو چار دن گزر گئے۔ اس دوران میں نہ تو غفار کا کچھ پتہ چلا۔ اور نہ کلائیاں اور بٹوے وغیرہ بیچنے کے لئے کسی دوسرے آدمی کا انتظام ہی ہو سکا۔ علاوہ ازیں جھنجھنا کر نے دوسری مشین لانے کا جو وعدہ کر رکھا تھا۔ وہ بھی کسی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ فرخندہ نے اپنی پچھلے دن کی کمزوری کے بعد اپنا غم پھر کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ دوسرے روز سے اس کے ہاں پھر سے دونوں وقت چولہا جلنے لگا تھا۔ کچھ تو وہ پکا لیتی۔ اور کچھ اس کے دوست لے آتے۔ اور وہ پہلے کی طرح سب کے ساتھ مل کر کھا لیتی۔ کبھی کبھی وہ ہنس بول بھی لیتی۔ مگر دل ہی دل میں خوب سمجھتی تھی کہ اس حالت میں کے دن گزر ہو سکے گی۔

ساتویں روز سہ پہر کو جب گھر میں اس کے اور مولانا کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ تو اس نے مولانا سے بڑی لجاجت سے کہا: "مولانا صاحب۔ مجھے ابھی بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ جب تک دوسرے لڑکے کا انتظام نہیں ہو جاتا۔ میری کلائیاں اور بٹوے آپ بازار لے جائیں۔ تو کیسا رہے؟"

مولانا نے ایسی نظروں سے فرخندہ کی طرف دیکھا گویا یہ بات ان کی سمجھ میں مطلق نہیں آئی۔

"میرے اچھے مولانا صاحب آپ لے جائیں گے نا؟"

"بھئی بات یہ ہے۔ میں نے ایسا کام کبھی کیا نہیں۔"

"واہ۔ اس میں کون مشکل بات ہے۔ کلائیاں لے کر گھر گھر سے ہو جائیے۔ بولنے کی بھی

ضرورت نہیں۔ اگر کوئی دیکھنے کو ٹھہر جائے اور دام پوچھے تو بتا دیجئے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر......''

''مگر کیا؟''

''مجھے شرم آتی ہے۔''

''واہ محنت میں بھلا کیا شرم۔ کیا محنت کوئی عیب کی بات ہے؟''

''نہیں یہ بات تو نہیں مگر......''

غرض بڑی کھینچا تانی کے بعد مولانا بادل ناخواستہ کلائیاں اور بٹوے لے کر بازار گئے۔ فرخندہ دل ہی دل میں دعائیں مانگتی اور بے تابی سے ان کا انتظار کرتی رہی۔ آخر کوئی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب وہ واپس آئے۔ ان کے چہرے سے ایسی پریشانی اور تکان ظاہر ہو رہی تھی۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ کسی سخت آزمائش میں سے گزر کر آرہے ہیں۔ انہوں نے بتایا۔ کہ وہ صرف ایک بٹوا بیچ سکے۔ فرخندہ نے جب ان سے کلائیاں واپس لے کر گنیں۔ تو وہ دس میں سے پانچ غائب تھیں۔ وہ ہزار ہزار قسمیں کھانے لگے۔ کہ انہیں ان کا کچھ علم نہیں۔ بار بار یہی کہتے تھے۔ کہ اصل میں وہ تھیں ہی اتنی اور فرخندہ سے گننے میں غلطی ہوئی تھی۔ بہرحال یہ ظاہر تھا۔ کہ یا تو راستے میں ان سے کہیں گر پڑی تھیں۔ اور یا دیکھنے دکھنے میں یار لوگ اڑا لے گئے تھے۔

پورے دو ہفتے گزر گئے۔ محسن علی ابھی تک اس گاؤں میں نہیں جا سکا تھا۔ جہاں غفار کا باپ رہتا تھا۔ اس نے فرخ بھائی سے وعدہ تو کر لیا تھا۔ مگر ہر روز کچھ ایسا کام نکل آتا۔ کہ اس کا جانا معرض التوا میں پڑ جاتا۔ اس کے دوسرے دوستوں نے تھانے، اسٹیشن اور شہر کے گلی کوچوں کے بہتیرے چکر کاٹ لئے تھے۔ مگر نہ تو انہیں غفار ہی کہیں نظر آیا تھا۔ اور نہ مشین ہی کا کچھ سراغ مل سکا تھا۔

فرخندہ نے یہ زمانہ بڑے صبر اور حوصلے سے گزارا۔ اور اپنی ظاہری حالت کو برقرار رکھنے کے لئے انتہائی جدوجہد کی۔ وہ اپنے دوستوں کو اپنی پریشانیوں میں شریک کرنا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ نہ تو اس نے کسی دوست سے کوئی فرمائش کی اور نہ اشارے کنائے ہی سے کچھ مدد چاہی۔ اس کے دوست اپنی خوشی سے شام کو کھانے کے لئے کچھ لے آتے۔ تو اپنے ہاں کی دال بھاجی کے ساتھ اسے بھی دسترخوان پر چن دیتی۔ اور پھر ہنسی خوشی سب کے ساتھ مل کر کھا لیتی۔ محفل برخاست ہونے پر جب اس کے دوست اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ تو وہ دیر تک بستر پر پڑی اپنی حالت پر غور کرتی رہتی۔ اس مصیبت میں اسے اپنے کسی دوست سے گلہ یا شکایت نہ تھی۔ کیونکہ وہ خوب جانتی تھی۔ کہ خود ان میں

سے کسی کی حالت بھی اطمینان بخش نہ تھی۔ اگر دس روز کام کرتے تھے تو بیس روز بیکار پھرتے تھے۔ پھر جو مستقل طور پر کسی دھندے میں لگے تھے۔ ان کی آمدنی بھی اس درجہ قلیل تھی۔ کہ وہ اس میں بمشکل اپنا اور متعلقین کا پیٹ ہی بھر سکتے تھے۔ کسی دوسرے کی امداد تو کیا کر سکتے۔ ان ہی دنوں گھروں میں چرخی رات رات بھر چلا کرتی۔ یہاں تک کہ مؤذن کی آواز سنائی دینے لگتی۔ اور وہ جلدی سے اٹھ کر نماز کی تیاری میں لگ جاتی۔

اس نے اپنی کفایت شعاری اور سلیقہ مندی سے جو تھوڑی سی پونجی آڑے وقت کے لئے بچا رکھی تھی۔ وہ تو بیکاری کے پہلے ہی ہفتے کی نذر ہو چکی تھی۔ اس کے بعد گھر کی چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ان برتنوں کی باری آئی۔ جو بہت ضروری نہیں تھے۔ وہ چپکے چپکے مولانا کی معرفت انہیں بیچتی رہی۔ مولانا کو سخت تاکید تھی۔ کہ کسی سے کہنا نہیں۔ جب مہینہ ختم ہوا۔ اور مکان دار کا آدمی کرایہ اور مشین والا قسط کا تقاضا کرنے آیا۔ تو وہ مولانا کو ساتھ لے کر بازار گئی۔ اور اپنا وہ طلائی ہار جسے وہ کبھی کبھی سیاہ ربن کے ساتھ گلے میں باندھا کرتی تھی۔ سنار کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اور اس طرح کسی کو کانوں کان خبر ہوئے بغیر اس نے مکان کا کرایہ بھی ادا کر دیا۔ اور مشین کی قسط بھی دے دی۔

اسی زمانے کا ذکر ہے۔ ایک شام ابھی فرخ بھائی کی محفل میں چار پانچ ہی آدمی آئے تھے۔ کہ مولانا ایک اجنبی کو لئے ہوئے آ گئے۔ وہ دوپہر کے بعد سے نہ جانے کہاں غائب رہے تھے۔ دالان سے گزرتے ہوئے انہوں نے بڑی گرم جوشی سے اپنے ساتھی سے کہا:

''بے تکلف اندر تشریف لے چلئے میر صاحب۔ اپنا ہی گھر ہے۔'' ان کے لہجے سے بڑی چونچالی ٹپک رہی تھی۔

سب لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ یہ شخص کون ہے اور کیوں آیا ہے۔ فرخندہ نے جلدی سے سر پر دوپٹے کو درست کیا۔ وہ بار بار مولانا کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھتی تھی۔ مگر مولانا تھے۔ کہ التفات ہی نہ کرتے تھے۔

''آئیے آئیے۔ غریب خانہ میں تشریف لے آئیے —— اے آمدنت باعث آبادی ما..... ٹھہریئے میں ذرا فرش جھاڑ دوں۔''

کھونٹی پر ایک میلا سا تولیا ٹنگا ہوا تھا۔ مولانا نے جلدی سے اتار فرش کے ایک کونے کو جھاڑا۔ چاندنی کی سلوٹیں نکالیں۔ اور اجنبی کو اس جگہ بٹھا دیا۔ سب لوگ اس دوران میں آپ ہی آپ ذرا پرے سرک گئے تھے۔ ہر شخص نقادانہ نگاہوں سے نو وارد کو گھور رہا تھا۔ اور واقعی وہ شخص تھا بھی تقادوں

ان کے دیکھنے کی چیز۔ بلند و بالا قد۔ چوڑا سینہ۔ لمبے لمبے ہاتھ پاؤں۔ عمر تقریباً چالیس برس۔ گندمی رنگ آنکھیں چھوٹی چھوٹی جن میں سرمے کے ڈورے۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ ان کو مل دیا ہوا سر سے پیر تک دیہاتی امارت اور بانکپن کا نمونہ۔ کرتے میں سونے کے بٹن لگے ہوئے۔ اس پر سرخ بانات کی واسکٹ۔ اور اس پر سیاہ شیروانی۔ شیروانی کے سینے سے اوپر کے بٹن کھلے ہوئے جس کی وجہ سے نیچے کی واسکٹ اور کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ شیروانی کی جیب میں گھڑی جس کی طلائی زنجیر شیروانی کے کاج سے اٹکی ہوئی۔ زنجیر کے ساتھ ایک ننھا سا طلائی قطب نما آویزاں۔ ایک گھڑی کلائی پر بندھی ہوئی اس کے سنہرے رنگ کی حفاظت کے لئے اس پر سفید سلولائڈ کا خول چڑھا ہوا۔ شیروانی کے بٹن چاندی کے بڑے بڑے چوکور جن پر نیلا نیلا چاند تارا بنا ہوا۔ ایک ریشمی رومال شیروانی کی بائیں آستین کے اندر ٹھنسا ہوا، داہنے ہاتھ کی چھنگلیا میں سونے کی انگوٹھی جس میں بڑا سا ہلکے آسمانی رنگ کا نگینہ جڑا ہوا، چوڑی دار پاجامہ۔ پاؤں میں سرخ ریشمی جرابیں۔ سر پہ رامپوری وضع کی اودے رنگ کی مخملی ٹوپی۔

دو تین لمحے خاموشی رہی۔ جس کے دوران میں مولانا کے سوا ہر شخص بے چینی محسوس کرتا رہا۔

"آپ ہیں۔" بالآخر مولانا نے زبان کھولی۔ "میرے خاص کرم فرما اور ہم وطن میر نوازش علی۔ ہمارے قصبے کے سب سے بڑے تعلقہ دار قبلہ میر حشمت علی کے بڑے صاحب زادے۔ مجھے بچپن سے آپ کی دوستی کا فخر حاصل ہے......اور میر صاحب یہی ہیں ہماری فرخ بھائی۔ اور یہ ہیں ان کے وہ دوست جن کا حال میں راستے میں آپ سے عرض کر چکا ہوں۔"

تعارف کا یہ طریقہ فرخندہ کے دوستوں کو کچھ بے تکا معلوم ہوا۔ چنانچہ بعض نے منہ پھیر کر تو بعض نے ناک سکوڑ کر اظہار ناپسندیدگی کیا۔

"ہمارے میر صاحب کو شعر و شاعری سے خاص لگاؤ ہے۔" مولانا نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "ماشاء اللہ بچپن ہی سے ذہین تو ایسے تھے کہ سات برس کی عمر میں کلام مجید ختم کیا۔ دس برس کی عمر میں گلستاں اور بوستاں پڑھ لی۔ گیارہ برس کی عمر میں دیوان حافظ ختم کر لیا۔"

"بارہ برس کی عمر میں بھئی۔" میر صاحب نے دبی آواز میں قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"چلئے بارہ برس ہی میں سہی۔" مولانا نے خندہ پیشانی سے اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن بارہ برس کا سن بھی کوئی سن ہے۔ آج کل کے نئی روشنی کے زمانے کے کسی پڑھے لکھے سے کہئے تو حافظ کا ایک مصرع بھی صحیح پڑھ دے۔ بس بغلیں جھانکنے لگے گا وہیں۔ البتہ انگریزی انھوں نے نہیں

پڑھی۔ وہ یوں کہ خاندانی وضع داری کے خلاف تھا اور پھر ضرورت بھی کیا تھی۔ خدانخواستہ کسی انگریزی نوکری تھوڑا ہی کرنی تھی۔ اللہ رکھے اپنی لاکھوں کی جاگیر ہے۔ ہم جیسے جیسوں جوتیاں چٹخاتے ان کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں......"

"ارے بھئی چھوڑو بھی ان باتوں کو۔" میر صاحب بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔ دراصل وہ حاضرین کے چہروں سے بھانپ گئے تھے کہ وہ اس ذکر سے اکتا گئے ہیں۔ انھوں نے شیروانی کی جیب سے پانوں کی مراد آبادی منقش ڈبیا نکالی۔ اور اسے کھولتے ہوئے محسن عرفی کی طرف بڑھا دیا۔ جو ان کے قریب ہی بیٹھا تھا۔

"شوق فرمائیے۔"

"تسلیم۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔"

"آپ لیجئے۔" میر صاحب نے ڈبیا دیپ کمار کو پیش کی۔

"معاف کیجئے گا۔ پان تو میں بھی نہیں کھایا کرتا۔"

"ارے کھا بھی لو میرے یار۔" مولانا بولے۔ "ایسا ہی ہے تو تھوک دینا۔"

مگر دیپ کمار نے ڈبیا کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔ دو آدمیوں کے انکار کر دینے پر میر صاحب کو پھر کسی کو پان پیش کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

"لائیے، مجھے دیجئے۔" فرخندہ کو میر صاحب پر رحم آ گیا۔ اور وہ بولی۔ "اگرچہ یہ نہایت نازیبا بات ہوگی۔ کیونکہ پان پیش کرنے کا فرض تو میرا تھا۔" اور ایک خاص ادا کے ساتھ مسکراتے ہوئے اس نے میر صاحب سے ڈبیا لے لی۔ میر صاحب نے خوش خوش شیروانی کی دوسری جیب سے چھالیا کا بٹوا، جو کمخواب کا بنا ہوا تھا نکالا۔ اور بڑے تکلف سے پیش کیا۔

"میر صاحب یہ بٹوا تو بہت نفیس ہے۔" فرخندہ نے بٹوے کو ایک ماہر کی طرح پرکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کی نذر ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔"

"تسلیم۔" فرخ بھائی نے مسکرا کر کہا۔

مولانا کی باچھیں کھل گئیں۔

"فرخ بھائی خود بہت اچھے بٹوے بنانا جانتی ہیں۔" وہ میر صاحب سے بولے۔ "کبھی آپ بنا دیجئے۔ سلوا ہم دیں گے۔"

بجھا گرد دیر سے ضبط کئے بیٹھا تھا۔ مگر اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے اچانک بڑے زور سے جمائی لی۔ اور میر صاحب کو اس انداز سے مخاطب کرتے ہوئے گویا برسوں کی شناسائی ہے، کہنے لگا:

"کہیے میر صاحب۔ دلی کیسے آنا ہوا؟ تفریح یا کوئی اور مقصد تھا؟"

قبل اس کے کہ میر صاحب جواب دیتے۔ مولانا فوراً بول اٹھے۔

"اجی تفریح کی ان کو اپنے وطن میں کیا کمی ہے۔ یہاں تو ایک مقدمے کے سلسلے میں آئے ہیں۔"

"آپ کو یہاں کیسے لے گئے؟" بجھا گرد نے پوچھا۔

"یہ بھی حسن اتفاق تھا۔" مولانا بولے۔ "میں گھنٹہ گھر سے گذر رہا تھا۔ کہ میری نظر ایک بزاز کی دکان پر پڑی۔ دیکھا کہ ریشم کے تھانوں کے ڈھیر سامنے لگے ہیں۔ اور حضرت ہیں۔ کہ سب کو نا پسند کرتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے دیکھا تو پہچانا تھوڑا ہی——"

"بھئی مولانا صاحب۔" میر صاحب قطع کلام کر کے بولے۔ "میں پھر کہتا ہوں معاف کرنا۔ میں پہلے واقعی آپ کو نہیں پہچان سکا تھا۔"

"خیر وہ پہلے نہ سہی۔ بعد میں تو پہچان لیا نا۔ بس پھر میں اصرار کر کے انہیں ساتھ ہی لیتا آیا۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ جس میں اس بے کیف بات چیت کے بجائے سب کو ایک طرح کا سکون نصیب ہوا۔ محسن عدیل کے بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ اسے ان میر صاحب کا آنا اور سب کے درمیان یوں بے تکلف بیٹھنا اور فرخ بھائی سے باتیں کرنا سخت ناگوار گذر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے مولانا پر بھی بے حد غصہ آ رہا تھا۔ جس نے بغیر بتائے بغیر صاحب خانہ سے اجازت لئے ایک اجنبی کو ان سب کے سر پر لا مسلط کیا تھا۔

"کیوں تعلقہ دار صاحب۔" عدیل نے استہزا آمیز سنجیدگی سے میر صاحب کو مخاطب کیا۔ "آپ کے ہاں تو سب خیریت ہے نا؟"

"کیا مطلب؟" میر صاحب نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ گڑبڑ تو نہیں ہے کچھ؟"

"معاف کیجئے گا۔ میں اب بھی آپ کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا۔"

"اجی وہی تحریک چلی ہے نا آج کل کسانوں میں۔"

"کیسی تحریک؟ واللہ مجھے تو اس کا مطلق علم نہیں۔"

"اجی یہی کسان کہتے ہیں نا۔ زمین میں ہل ہم جوتتے ہیں۔ کھیتی کسانی ہم کرتے ہیں۔ جاڑے گرمی کی سب تکلیفیں ہم سہتے ہیں۔ مگر جب فصل پک کر تیار ہوتی ہے تو زمیندار سارے اناج کا دعویدار بن جاتا ہے۔ اور ہمارے لئے اتنا بھی نہیں چھوڑتا کہ ہمارے بیوی بچے وہ وقت اپنا پیٹ بھر سکیں۔ وہ کہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ زمیندار زمین کا مالک ہے۔ مگر وہ اتنی سی بات کا ہم سے بہت زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی محنت کا پورا پورا معاوضہ ملنا چاہئے۔ یہ تحریک رفتہ رفتہ مختلف صوبوں میں پھیلتی جا رہی ہے۔ اور وہ دن دور نہیں کہ ہمارے ملک کے کسان ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں اور تمام تعلقہ داروں اور زمینداروں کے خلاف بغاوت کر دیں۔"

"الحمدللہ" میر صاحب نے کہا۔ "میرا علاقہ اس قسم کی خرافات سے پاک ہے۔ اور بفضل میرے ہاں کے کسان سب کے سب خوش اور میرے وفادار ہیں۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ خوش ہیں۔"

"بس ہیں خوش۔"

"آخر اس کا کوئی ثبوت بھی؟"

"ثبوت؟ یہی کیا کم ثبوت ہے۔ کہ ان میں سے کسی نے آج تک مجھ سے کوئی شکایت نہیں کی۔"

"ممکن ہے وہ آپ کے پاس آتے ہوئے ڈرتے ہوں۔ یا ممکن ہے کہ وہ آپ کے ظلم و ستم سے اس قدر مایوس ہو چکے ہوں۔ کہ وہ آپ سے کسی انصاف یا رحم و کرم کی توقع ہی نہ رکھتے ہوں۔"

"اجی چھوڑیئے بھی۔" مولانا جنہیں اب صبر کی تاب نہ رہی تھی۔ اچانک بیچ میں بول اٹھے۔ "کیا قصے لے بیٹھے ہم تو میر صاحب کو لائے تھے کہ کچھ شعر و شاعری کی باتیں ہوں گی۔ کچھ گل و بلبل کے قصے دہرائے جائیں گے۔ کچھ میر صاحب کا دل بہلے گا۔ کچھ میر صاحب آپ کا دل بہلائیں گے۔ گھڑی دو گھڑی کے لئے پرلطف صحبت رہے گی۔ مگر یہاں خشک سیاسیات کی بحث چھڑ گئی۔ لاحول ولا قوۃ۔ ہاں شکیبی صاحب کوئی چٹکا چٹکا گیت نہ ہو جائے۔"

"مجھے تو اس وقت معاف ہی رکھئے۔" شکیبی نے جواب دیا۔ "صبح سے میرے سر میں درد ہے۔"

مولانا نے دیکھا۔ کہ یہ تیر کارگر نہیں ہوا۔ تو وہ فرخندہ کی طرف متوجہ ہوئے:

"فرخ بھابی۔ آج کچھ کھلاؤ گی نہیں۔ بھوکا ہی مارو گی؟"

اس غیر متوقع فرمائش پر فرخ بھابی اچانک جھینپ کر رہ گئی۔ مولانا نے آج شام جو رویہ اختیار کیا تھا۔ اس نے سب کو محوِ حیرت کر دیا تھا۔ اگر ان کا دماغ چل نہیں گیا تھا۔ تو وہ آج ضرور کوئی نشہ کر کے آئے تھے۔ جس نے ایک ہی دم ان کی سوئی ہوئی نامعلوم قوتوں کو بیدار کر دیا تھا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ فرخندہ کے ہاں ان کی حیثیت اگر نوکر کی نہیں۔ تو ایک ایسے غریب اور لاچار رشتہ دار کی ضرور تھی۔ جو اپنے نسبتاً خوش حال عزیزوں کے ٹکڑوں پر پڑا ہو۔ اور نوکر سے زیادہ کام کرتا۔ اور اس سے بدتر حال میں رہتا ہو۔ یا تو وہ عام تضحیک کا شکار ہو کر ہر وقت دبے دبے اور چپ چپ رہتا۔ اور کسی نے کوئی کام کرنے کو کہا۔ تو جل کڑھ کر کرتا۔ اور یا آج یہ حالت تھی کہ وہ خود صاحبِ خانہ بنے ہر ایک پر حکم چلا رہے تھے۔ پھر دنیا بھر کی زندہ دلی ان میں بھر گئی تھی۔ فرخندہ جو طبعاً حلیم تھی۔ ان کی اس کایا پلٹ پر دل ہی دل میں محظوظ ہو رہی تھی۔ مگر جب انہوں نے کھانے کی فرمائش کی۔ تو وہ جلبلا ہی تو اٹھی۔ کم بخت کو اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ ان دنوں کس قدر تنگی ترشی میں گذر رہی ہے۔ اس کے باوجود یہ ایک غیر آدمی کے سامنے رسوا کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ادھر فرخندہ کے دوست بار بار تیز تیز نظروں سے مولانا کو گھور رہے تھے۔ ان نظروں سے جو مستقبل قریب میں نہایت ناخوشگوار نتائج کی طرف کھلے بندوں اشارے کر رہی تھیں۔ مگر مولانا کو آج کسی کا ڈر نہ تھا۔

"ارے بھئی فرخ بھابی۔" وہ اپنی جو نچالی کو بدستور قائم رکھے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "تم تو سوچ میں پڑ گئیں۔ جو کچھ دال دلیا موجود ہے۔ لے آئیے۔ میر صاحب سے کیا پردہ یہ تو اپنے ہی آدمی ہیں...... ہاں بھئی ناگر صاحب کچھ ریزگاری ہو تو نکالئے کباب وباب کے لئے۔"

جھنا گر کے چہرے کا رنگ اچانک متغیر ہو گیا۔ اس کا ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب تک گیا۔ اور وہیں رہ گیا۔

اس پر میر صاحب نے کھنکھارا۔ اور حاضرین پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بڑی ملائمت سے کہا:

"حضرات میری گستاخی کو معاف فرمائیے گا۔ مجھے اس محفل کی بے تکلفی کا پورا پورا حال مولانا صاحب سے معلوم ہو چکا ہے۔ اور اسی لئے مجھے جرأت ہوئی ہے کہ دستر خوان میں کچھ میرا بھی حصہ ہو۔ یہ حقیر رقم اس خاکسار کی طرف سے قبول کیجئے۔"

قبل اس کے کہ فرخ بھابی یا محفل کا کوئی رکن احتجاج کرنے پاتا۔ انہوں نے جھٹ بٹوے میں

سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال فرش پر ڈال دیا۔

لمحہ بھر کے لئے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے ذلت، غصے، نفرت اور بیزاری کے ملے جلے جذبات کا وہ طوفان جو آدھ گھنٹے سے دلوں میں بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ یک لخت اپنے بند توڑ کر پھوٹ پڑے گا۔ مگر میر صاحب کے چہرے سے ایسا خلوص اور نیک نیتی برس رہی تھی۔ کہ کسی کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ اور وہ سب دم بخود رہ گئے۔

لمحہ بھر تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد میر صاحب نے مولانا سے کہا:

"حضرت جائیے۔ آپ ہی ہمت کیجئے۔"

"بسر و چشم۔" یہ کہہ کر مولانا نے فرش سے نوٹ اٹھا لیا۔ اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر وہ سیڑھیوں سے اتر گئے۔

وہ وقت جو ان کے جانے کے بعد محفل میں گذرا۔ انتہا درجے کا تکلیف دہ تھا۔ ہر چند بظاہر خاموشی رہی۔ مگر اندر ہی اندر ہر شخص بے کلی محسوس کر رہا تھا۔ فرخندہ میر صاحب سے معذرت کر کے عشاء کی نماز کے لئے اپنی کوٹھری میں اٹھ آئی۔ محسن علی جو گاؤ تکئے کے سہارے بیٹھا تھا۔ اس نے پہلو بدل کر اپنا سر گاؤ تکئے پر ڈال دیا تھا اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ دیپ کمار انگریزی اخبار کا ضمیمہ پڑھنے لگا تھا۔ حالانکہ لالٹین کی روشنی اس کے لئے ناکافی تھی۔ اور اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ جسے وہ بار بار انگلیوں سے پونچھ لیتا تھا۔ جھنا گر نے کوٹ کی جیب سے تاش نکال کر فرش پر بازی لگانی شروع کر دی تھی۔ ادھر میر صاحب نے بھی کسی کو قابلِ التفات نہ سمجھا تھا۔ وہ اس عرصے میں بڑی دلجمعی کے ساتھ پانوں کی ڈبیا سے پان نکال نکال کر کھاتے رہے۔ جب فرخندہ نماز سے فارغ ہو کر آئی۔ تو انہوں نے ایک پان اسے بھی پیش کیا۔ جسے اس نے تسلیم کر کے لے لیا۔

کوئی پون گھنٹے کے بعد مولانا کی آواز سیڑھیوں میں سنائی دی۔ وہ کسی کو سنبھل سنبھل کر آنے کی تاکید کر رہے تھے۔ یہ ہوٹل کا ایک بیرا تھا۔ جو ایک بڑا سا خوان اپنے کندھے پر اٹھائے ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

"ادھر سے آؤ بھئی اس کمرے میں۔ شاباش۔" مولانا پر اعتماد لہجے میں بیرے سے کہہ رہے تھے۔ "تمہیں خوش کر دیں گے۔"

کمرے میں ابھی دستر خوان بچھایا ہی جا رہا تھا۔ کہ دالان میں سے ٹرام کے کنڈکٹر قاسم کی آواز سنائی دی:

"آہا ہا ہو ہو ہو! فرخ بھائی! آج کیا بات ہے۔ بڑی بڑی ضیافتیں اڑ رہی ہیں یہاں۔ واللہ پلاؤ کی خوشبو نے بے چین کر دیا۔"

مگر جیسے ہی اس نے کوٹھری کے اندر قدم رکھا۔ اور ایک اجنبی کی صورت دیکھی اس کی ساری شوخی اور زندہ دلی کافور ہو گئی۔ اور وہ کھسیانا ہو کر رہ گیا۔

"آؤ بھئی قاسم۔" مولانا نے بڑے سرپرستانہ لہجہ میں قاسم سے کہا۔ "خوب وقت پر آئے۔ ان سے ملو۔ یہ میرے خاص کرم فرما میر نوازش علی ہیں۔"

قاسم کو اس قصے اور ملال کا کچھ علم نہ تھا۔ جو اس ناخواندہ مہمان کے خلاف اس کے دوستوں کے دلوں میں تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی جھینپ مٹانے کے لئے ضرورت سے زیادہ گرم جوشی کے ساتھ میر صاحب سے مصافحہ کیا۔

اب دسترخوان بچھ چکا تھا۔ محسن عدیل اور دیپ کمار تو کھانا کھا کر آنے کا عذر کر کے الگ ہو گئے۔ مگر مولانا، فرخ بھائی، میر صاحب اور قاسم کی متفقہ کوششیں بجنا گر اور شکیبی کو دسترخوان پر بٹھانے میں کامیاب ہو گئیں۔ اس عرصے میں میر صاحب ان لوگوں سے کسی قدر اور بے تکلف ہو گئے تھے۔ کھانا کھانے کے دوران میں انہوں نے سعدی کے دو ایک شعر بھی پڑھے۔ جو تھے تو فرسودہ مگر چونکہ طعام ہی کے متعلق تھے اس لئے پسند کر لئے گئے۔

کھانے کے بعد مولانا نے پھر شکیبی سے شعر کی فرمائش شروع کر دی۔ اب کے میر صاحب نے بھی اصرار کیا۔ اور فرخ بھائی نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ کہ ہاں ہاں بھئی ہو جائے وہی نظم۔ چنانچہ شکیبی کو "سر راہ گزر کھا" ایک مرتبہ پھر سناتے ہی بنی۔

رات کے کوئی دس بجے کا عمل ہوگا۔ کہ یہ محفل برخاست ہوئی۔ میر صاحب نے رخصت ہوتے وقت بڑی گرم جوشی سے فرخ بھائی اور اس کے دوستوں کا شکریہ ادا کیا۔ پھر وہ ان سے اجازت لے کر مولانا کو بھی اپنے ساتھ ہی لیتے گئے۔

اگلے روز صبح کوئی نو ساڑھے نو بجے مولانا واپس آئے۔ مگر اس شان سے کہ آگے آگے یہ دونوں بغلوں میں دو مرغ دبائے تھے۔ اور ان کے پیچھے پیچھے ایک پھل والا تھا جس کا ٹوکرا قسم قسم کی اجناس، ترکاریاں اور پھل پھلاری سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

"حضرت خیر باشد" فرخندہ نے مولانا اور پھل والے کو تعجب سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ سب کہاں سے اٹھا لائے؟"

"ارادہ تو یہی ہے فرخ بھائی۔ ابھی بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ مسکرائے۔ پھر دم لئے بغیر خود ہی کہنا شروع کیا۔ "میر صاحب نے تم کو سلام کہا ہے۔ وہ تمہارے حسن سلوک اور تمہاری طبیعت داری کی بے حد تعریف کرتے تھے۔ پھر کہنے لگے۔ رات ہوٹل کا کھانا نہایت بدمزہ تھا۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ آج محفل کے جملہ اراکین کی دعوت کروں۔ مگر چونکہ پردیس کا معاملہ ہے۔ اور میں ہوٹل میں مقیم ہوں۔ جہاں دعوت کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آپ کو یہ زحمت دی گئی ہے۔ میں اس کے لئے سخت شرمندہ اور معافی کا خواستگار ہوں۔"

شام سے پہلے ہی سب کھانے پک کر تیار ہو گئے۔ ادھر میر صاحب بھی وقت سے کچھ پہلے ہی آ گئے۔ اس وقت گھر میں فرخندہ اور مولانا کے سوا جو چولھے کے پاس بیٹھے تھے اور کوئی نہ تھا۔ میر صاحب کل کی نسبت آج کافی سادہ لباس پہن کر آئے تھے۔

"معاف کیجئے گا۔" وہ کہنے لگے۔ "میں ابھی سے حاضر ہو گیا ہوں۔ تاکہ انتظام میں میں بھی آپ لوگوں کا ہاتھ بٹاؤں۔"

یہ کہتے ہی انہوں نے بڑی بے تکلفی سے اپنی شیروانی اور ٹوپی اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دی۔ اور صرف کرتا پاجامہ پہنے ہوئے اپنے کو بڑی معصومیت کے ساتھ فرخ بھائی کے سامنے پیش کر دیا۔

فرخندہ نے میر صاحب پر سر سے پیر تک ایک نظر ڈالی۔ اس لباس میں وہ بڑے سیدھے اور گھریلو معلوم ہو رہے تھے۔ پھر اس نے لمحہ بھر کے لئے تامل کیا۔ گویا دل ہی دل میں سوچ رہی ہے۔ ان سے کیا خدمت لوں۔ دھیرے دھیرے ایک دلآویز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلتی گئی۔

"آپ کی ہمدردی کا شکریہ۔" آخر وہ بولی۔ "اب آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے دن میں ایک کھانا پکانے والی منگوائی تھی۔ قریب قریب سب کھانے پک چکے ہیں۔ آپ چل کر آرام سے اندر بیٹھئے۔"

اس شام جب فرخندہ کے دوستوں کو اس دعوت کا حال معلوم ہوا تو انہیں بہت تعجب ہوا۔ بعض نے تو اس بات کو سخت ناپسند کیا۔ مگر زیادہ تر نے اسے خوش طبعی میں اڑا دینا چاہا۔ کہ اچھا کاٹھ کا الو پھنسا ہے۔ بہر حال اس دعوت میں دیپ کمار کے سوا جو ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے محفل ہی سے اٹھ گیا تھا۔ اور سب لوگ شریک ہوئے۔ کھانا بے حد لذیذ تھا۔ فرخ بھائی نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے پکایا تھا۔ چنانچہ ہر شخص نے پیٹ بھر بھر کر کھایا۔ میر صاحب بار بار کھانے کی تعریفیں کرتے تھے۔ اب وہ سب لوگوں سے کافی گھل مل گئے تھے۔ اور ہر ایک سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے تھے۔ اہل محفل کو بھی

اب ان میں وہ کل والا عناد نہیں رہا تھا۔ یا کم سے کم وہ اس کو ظاہر نہیں کرتے تھے۔ محسن عدیل نے البتہ دو ایک دفعہ اشاروں کنایوں میں ان پر چوٹ کی۔ مگر وہ ایسی گہری تھی۔ کہ ڈاکٹر ہمدانی اور ایک آدھ اور کے سوا اسے کوئی نہیں سمجھ سکا۔ ڈاکٹر ہمدانی سے اور میر صاحب سے آج پہلی مرتبہ شناسائی ہوئی تھی۔ اور میر صاحب ڈاکٹر ہمدانی کی بذلہ سنجی سے بہت محظوظ ہوئے تھے۔

اس رات یہ محفل کوئی گیارہ بجے تک جاری رہی۔

اس سے اگلے روز میر صاحب سہ پہر ہی کو فرخندہ کے ہاں آ گئے۔ آج پہلے دن کی طرح وہ پھر بن ٹھن کر آئے تھے۔ آتے ہی انہوں نے بغیر کسی تمہید کے فرخندہ سے کہنا شروع کیا۔

"کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ۔ فرخندہ خانم۔ آپ بھی کہیں گی۔ کہ یہ روز روز کی مصیبت اچھی گلے پڑی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھے ایک امر میں آپ کی امداد کی اشد ضرورت ہے۔ وہ بات یہ ہے۔ کہ دو ایک ماہ میں میری چھوٹی ہمشیرہ کا عقد ہونے والا ہے۔ میں اپنے مقدمے کے سلسلے میں یہاں آنے لگا۔ تو قبلہ والد محترم نے فرمایا۔ جا تو رہے ہی ہو۔ بچی کے جہیز کے لئے پارچات بھی خریدتے لانا۔ سنا ہے دلی میں پارچات کی بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ میں نے حکم عدولی کرنا مناسب نہ سمجھا۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے۔ کہ میں اس معاملے میں جاہل مطلق ہوں۔ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ کہ آپ میرے ساتھ چل کر مجھے کپڑا دلوا دیں۔ مولانا کہتے ہیں کہ آپ ماشاءاللہ اس کام میں بہت ہوشیار ہیں اور پھر عورتوں کی پسند کچھ عورتیں ہی بہتر سمجھتی ہیں۔"

میر صاحب نے یہ درخواست کچھ ایسی سادگی کے ساتھ کی تھی۔ کہ نیک دل اور خدمت گزار فرخ بھابی کو انکار کرتے نہ بنی۔ چنانچہ تھوڑے سے تامل کے بعد وہ مولانا کو ہمراہ لے کر میر صاحب کے ساتھ ہولی۔ تھوڑی دور پر بازار میں میر صاحب کی ٹیکسی کھڑی تھی۔ تینوں اس میں سوار ہو چاندنی چوک روانہ ہو گئے۔

شام کا اندھیرا خاصا پھیل چکا تھا۔ جب یہ لوگ گھر لوٹے۔ واپسی پر میر صاحب ان کے ہمراہ نہیں تھے۔ وہ اپنے ہوٹل پر اتر گئے تھے اور ٹیکسی والے سے کہہ دیا تھا کہ ان کو ان کے گھر پہنچا آئے۔

اس رات جب محفل جمی۔ تو محسن عدیل نے آتے ہی فرخ بھابی اور مولانا سے پوچھنا شروع کیا:

"کیا آپ لوگ آج شام کو کہاں غائب ہو گئے تھے؟ میں دو دفعہ آیا۔ مگر گھر میں تالا پڑا دیکھ کر چلا گیا۔"

اس پر فرخندہ نے میر صاحب کا حال سنایا۔ کہ کس غرض سے وہ آئے۔ اور پھر کس طرح ان کے ساتھ جا کر اس نے ڈیڑھ ہزار روپے کا کپڑا ان کی ہمشیرہ کے جہیز کے لئے خریدا۔ آخر میں اس نے بتایا کہ جب سب کپڑا وغیرہ خرید چکے۔ تو میر صاحب نے زبردستی ایک بنارسی ساری سو روپے کی اسے بھی خرید دی۔ وہ بہتیرا نہیں نہیں کرتی رہی۔ مگر میر صاحب نے ایک نہ سنی۔ مولانا کو بھی ایک گرم اونی سویٹر لے دیا۔

پھر فرخندہ اپنی کوٹھری میں گئی۔ اور وہ ساری لا کر سب کو دکھائی۔

محسن عدیل کچھ دیر خاموشی سے ساری کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا:

"فرخ بھابی۔ اس میں شک نہیں۔ کہ یہ ساری بہت خوب صورت ہے۔ مگر میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ جس قدر بھی جلدی ہو سکے اسے لوٹا دو۔"

یہ سن کر فرخندہ کے چہرے کا رنگ ایک دم متغیر ہو گیا۔ اس نے گردن جھکا لی۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

"تم خود ہی سوچو۔" محسن عدیل نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ایک شخص جس سے ہماری جان نہ پہچان۔ ان دو دنوں سے پہلے ہم نے اسے کبھی نہیں دیکھا——"

"لیکن میں تو جانتا ہوں۔" مولانا بیچ میں بول اٹھے۔

"تم چپ رہو جی......ایک شخص جو کل ہی کی ملاقات میں دوسروں پر اس طرح بے دریغ روپیہ خرچ کرنے لگتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ اس کے دل میں کیا ہے......"

"لاحول ولا قوۃ" مولانا سے پھر چپ نہ رہا گیا۔ "عدیل میاں آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ خدانخواستہ انہوں نے فرخ بھابی کو یہ ساری کسی بری نیت سے تھوڑا ہی لے کے دی ہے۔ وہ تو ہمیشہ سے ایسے ہی فیاض واقع ہوئے ہیں۔"

"ہمیں ان کی فیاضی کی کوئی ضرورت نہیں۔" محسن عدیل نے ذرا گرم ہو کر کہا۔ "آخر کیا مطلب ہے اس کا؟"

محسن عدیل پھر فرخندہ کی طرف متوجہ ہوا:

"فرخ بھابی۔ میں نے جو کچھ کہا۔ آپ نے سن لیا۔ اب کے وہ آئیں تو یہ ساری انہیں لوٹا دینا۔ کہنا اس میں برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ آخر کیا حق ہے۔ ان کو اس قسم کا تحفہ دینے کا۔ اور اگر ہو سکے تو کسی طرح یہ بھی جتا دینا۔ کہ ہم سب لوگ ان کے یہاں آنے کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اگر تم

نہ ہوگی۔ تو پھر مجبوراً یہ ناگوار فرض ہمیں ادا کرنا ہوگا اور کون کہہ سکتا ہے۔ کہ اس کے نتائج کیا ہوں...... سمجھ گئیں؟"

"اچھی بات ہے۔" فرخندہ نے ہلکے سے کہا۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔ اور اس رات پھر محفل میں نہ آئی۔

اگلے روز محسن عدیل، جھنجھلا کر اور دیپ نگار سہ پہر ہی سے فرخندہ کے ہاں آدھمکے۔ وہ بڑی دیر تک بھرے بیٹھے میر صاحب کا انتظار کرتے رہے۔ مگر میر صاحب نہ آئے۔ دوسرے روز بھی یہ لوگ سویرے ہی سے آ گئے۔ مگر میر صاحب اس دن بھی نہ آئے معلوم ہوتا تھا۔ کہ یا تو مقدمے کے سلسلے میں انہیں فرصت ہی نہیں ملی۔ کہ ادھر کا رخ کرتے۔ اور یا پھر وہ شہر ہی سے چلے گئے ہیں۔ اسی طرح ایک ہفتہ گذر گیا۔ مگر انہوں نے فرخندہ کے ہاں اپنی شکل نہ دکھائی۔

اس قضیے کو بغیر کسی بدمزگی کے یوں آپ ہی آپ ختم ہوتا دیکھ کر فرخندہ کے دوستوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور ان میں پھر وہ پہلی سی خود اعتمادی پیدا ہوگئی۔ یہ سچ ہے۔ کہ شروع کے دو تین دنوں میں فرخ بھائی ان سے اور یہ فرخ بھائی سے کچھ کھنچے کھنچے سے رہے۔ اور فرخ بھائی زیادہ تر اپنی کوٹھری ہی میں رہی۔ مگر پھر آپ ہی آپ ملاپ ہو گیا۔ اور ان کی محفل میں پھر پہلی سی چہل پہل نظر آنے لگی۔

مگر ان کے دل کا یہ سکون فقط چند روزہ تھا۔ کیونکہ اس کے بعد جوں جوں دن گذرنے لگے۔ فرخ بھائی کے مزاج اور کردار میں ایک تبدیلی پیدا ہوتی گئی۔ انہوں نے دیکھا۔ کہ یا تو وہ سنگھار اور زیب و زینت سے کوسوں کوسوں بھاگتی تھی۔ یا اب وہ اس کا خاص اہتمام کرنے لگی تھی۔ شام کو محفل میں بیٹھتی۔ تو اس کے لباس اور چہرے سے قسم قسم کے عطروں، لوشنوں اور غازوں کی خوشبوئیں پھوٹا کرتیں۔ گھر کا کام کاج اب وہ خود نہیں کرتی تھی بلکہ ایک مہری کو نوکر رکھ لیا تھا۔ جو دونوں وقت آ کر کھانا پکا جاتی اور جھاڑو بہارو دے جایا کرتی تھی۔ علاوہ ازیں اس کی حرکات اور نگاہوں سے ایک سستی اور آلکس سی بھی ظاہر ہونے لگی تھی۔ اس زمانے میں کسی نے اسے سیتے پروتے نہیں دیکھا تھا۔ البتہ ایک چیز ایسی تھی۔ جس کی باقاعدگی میں اس نے ذرہ بھر فرق نہ آنے دیا تھا۔ اور وہ تھی نماز۔ وہ اب بھی اس فریضے کو پابندیٔ وقت کے ساتھ ادا کرتی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے۔ کہ اس کا مذہبی جوش کچھ پہلے سے بھی بڑھ گیا تھا۔

ایک اور تبدیلی جسے فرخ بھائی کے دوستوں نے محسوس کیا، یہ تھی کہ کیا تو پہلے وہ شاذ ہی کبھی گھر

سے باہر نکلتی تھی۔ اور کہاں اب وہ ہفتے میں دو دو تین تین دن پیچھے سے دوپہر کو گھنٹے دو گھنٹے کے لئے غائب ہو جایا کرتی۔ یہ لوگ مولانا سے پوچھتے تو وہ بڑے اطمینان سے جواب دیتے:

"میں کیا جانوں ابھی سے کہہ کے تھوڑا ہی جاتی ہیں۔"

فرخ بھائی سے پوچھا جاتا۔ کہ کہاں تھیں۔ تو لمحہ بھر کو اس کے رخساروں پر ہلکی سی سرخی دوڑ جاتی۔ مگر وہ جلد ہی سنبھل کر جواب دیتی:

"کہیں بھی نہیں۔ یہیں قریب ہی میری ایک سہیلی رہتی ہیں۔ مجھ سے سلائی کا کام سیکھتی ہیں۔ بیچاری بڑی اخلاص والی بیوی ہیں۔ میری بیماری کا حال سنا۔ تو کہنے لگیں۔ میرے ہاں ایک مشین فالتو پڑی ہے۔ تم چاہو تو لے جا سکتی ہو۔ مگر مجھے شرم آ گئی......" اور یہ لوگ سن کر خاموش ہو جاتے۔

ان ہی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک دوپہر کو وہ اپنی گھر سے غائب ہوئی۔ کہ رات کے آٹھ بج گئے۔ مگر اس نے صورت نہ دکھائی۔ آج تک کسی شام وہ محفل سے غیر حاضر نہ رہی تھی۔ اس پر جاڑے کا موسم۔ رات کے ساتھ ساتھ سردی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کے دوستوں کی تشویش بھی۔ جب نو بج گئے اور وہ نہ آئی تو ان لوگوں کو سخت پریشانی ہوئی۔ مولانا سے دوبارہ پوچھا گیا۔ ان کے پاس ایک ہی جواب تھا: "میں کیا جانوں!" جھنجھلا کر، قاسم اور دیپ نگار نے ارادہ کیا۔ کہ بازار میں جا کر اسے تلاش کریں۔ مگر ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ جائیں تو کہاں جائیں۔ اور پوچھیں تو کس سے پوچھیں۔ آخر جب دس بج چکے۔ تو سیڑھیوں پر اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اور وہ تیزی سے دالان سے گذرتی ہوئی اپنی کوٹھری میں پہنچ گئی۔

محسن عدیل، جھنجھلا کر اور دوسرے سب لوگ اس کی اس حرکت پر تلملا ہی تو گئے۔ یہاں اس کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ اور اس کے عوض میں یہ بے اعتنائی۔ کہ ان کو یہ جاننے تک کا مستحق نہیں سمجھا گیا۔ کہ آخر وہ اتنا عرصہ کہاں رہی۔ خیر تو تھی۔ اس پر کیا بیتی!

"میں جا کے پوچھتا ہوں۔" اچانک قاسم بولا۔

"نہیں۔ مت جاؤ۔" محسن عدیل نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "انہیں غرض ہوگی تو خود آئے گی۔"

مگر اس رات فرخ بھائی کو غرض نہ ہوئی۔ اور وہ نہ آئی۔ البتہ اس نے آواز دے کر مولانا کو بلایا:

"مولانا صاحب۔ ذرا پانی کا گھڑا تو اٹھا کے اندر رکھ دیجئے۔"

اس سے اگلے روز فرخ بھائی گھر سے کہیں باہر نہ گئی۔ بلکہ کسی قسم کا سنگھار بھی نہ کیا۔ شام کو جب اس کے دوست آئے۔ تو وہ ہر ایک سے ہنس ہنس کر ملی۔ مگر پچھلی رات کے واقعے کے متعلق ایک لفظ تک نہ کہا۔ ادھر لوگوں نے بھی مصلحتاً اس کا ذکر نہ کیا۔ مگر دل میں سب کے غبار بھرا تھا۔ اس دن اس نے اپنے دوستوں کے لئے دو تین قسم کے کھانے خود پکائے تھے۔ چنانچہ سب کو مجبور کر کے ان کی بھوک سے زیادہ انہیں کھلایا۔ اس رات وہ دیر تک بھی ان کے پاس سے نہ اٹھی۔ اور جب اس کے دوستوں میں سے کوئی رخصت ہونے لگتا۔ تو ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیتی۔ غرض اس طرح یہ محفل بڑی رات گئے تک جمی رہی۔

اس کے بعد جو چار دن گذرے۔ ان میں بھی اس نے گھر سے باہر قدم نہ نکالا۔ بلکہ بہت سادہ لباس پہنے وہ اپنے دوستوں ہی کی تواضع اور دلجوئی میں لگی رہی۔ اس پر اس کے دوستوں کے دلوں میں جو ملال تھا۔ وہ بڑی حد تک دور ہو گیا۔ انہوں نے خیال کیا۔ گو یہ زبان سے نہ کہے۔ مگر اس میں شک نہیں۔ کہ دل ہی دل میں یہ اپنی حرکتوں پر سخت نادم ہے۔ اور یہ ساری نوازشیں اس ندامت کو مٹانے ہی کے لئے تو ہیں۔ اور یہ کہ صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہنا چاہئے......

غرض اس کے دوستوں کے دل اس کی طرف سے صاف ہو گئے۔ اور انہیں پھر سے یقین ہو چلا کہ وہ اپنی پچھلی حرکتوں سے تائب ہو کر پھر ان کی وفا شعار اور اطاعت گزار فرخ بھائی بن گئی ہے۔

مگر پانچویں روز سہ پہر کو وہ پہلے سے بھی زیادہ بناؤ سنگھار کر کے کسی کو بتائے بغیر پھر غائب ہو گئی۔

جب وہ نو بجے تک نہ آئی۔ تو محسن عدیل نے ایک لمبی انگڑائی لیتے ہوئے جھنجھا گر سے کہا:

"بھئی جھنجھا گر۔ اب تو یہ حالت برداشت سے باہر ہوئی جا رہی ہے۔"

"اس میں کلام ہی کیا ہے۔" جھنجھا گر نے جواب دیا۔

"مجھے کئی دنوں سے ایک خیال آ رہا ہے۔" قاسم نے کہا۔

"وہ کیا؟" محسن عدیل نے پوچھا۔

"وہ یہ کہ جس سے کوئی ملنا چاہے۔ کہیں مل سکتا ہے۔ گھر نہ سہی باہر سہی۔"

"تمہارا اشارہ میر صاحب کی طرف ہے؟" جھنجھا گر نے پوچھا۔

"میر صاحب ہو یا کوئی اور ہو۔" قاسم نے کہا۔

لمحہ بھر تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد عدیل نے جیسے ایک گہری سوچ میں سے ابھرتے ہوئے

قاسم سے کہا:

"شاید تمہارا خیال صحیح ہے۔"

"پھر آخر اس کا کیا علاج کیا جائے؟" جھنجھا گر نے پوچھا۔

"علاج اس کا صرف ایک ہی ہے۔" عدیل نے کہا۔ "وہ یہ کہ ہم اس سے قطع تعلق کر لیں۔ اور یہاں کا آنا جانا بالکل چھوڑ دیں۔"

مگر فرخ بھائی اور اس کی محفل کے بغیر ان لوگوں کو اپنی زندگیاں اس قدر سونی سونی دکھائی دیں۔ کہ ہر شخص ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اور گفتگو آگے نہ بڑھ سکی۔

جب شہر کے گھڑیال نے دس بجائے۔ تو باہر بڑے زور کا کھٹکا ہوا۔ یکا یک محسن عدیل چونک اٹھا۔

"مولانا۔ مولانا۔" اس نے مولانا کو ہلایا۔ جو پاس ہی فرش پر کمبل تانے پڑے تھے۔

"کیا ہے بھئی؟" مولانا نے منہ سے کمبل ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"مولانا صاحب۔ آپ کو زحمت تو ہو گی۔ مگر ایک بہت ضروری کام ہے۔"

"سونے نہیں دو گے یار۔ کیا کام ہے؟" وہ بڑبڑائے۔

"میں پوچھتا ہوں۔ گھر میں کچھ لکڑیاں ہیں؟"

"ہاں ہوں گی دو چار۔"

"تو ذرا مہربانی کر کے چولھے میں آگ تو جلا دیجئے۔"

"ارے بھئی اس وقت آگ کا کیا کام؟"

"آپ جلایئے تو۔ کام بھی بتا دوں گا۔ اٹھئے اٹھئے ہمت کیجئے۔"

فرخ بھائی کی عدم موجودگی میں مولانا محسن عدیل سے دب جایا کرتے تھے۔ وہ نہ جانے منہ ہی منہ میں کیا کہتے ہوئے اٹھے۔ لالٹین کے پاس طاق میں دیا سلائی کی ڈبیا رکھی تھی۔ اسے اٹھایا اور کوٹھری سے باہر نکل آئے۔ تھوڑی ہی دیر میں تڑ تڑ کی آواز آنے لگی۔ ساتھ ہی مولانا نے للکار کر کہا:

"لو جل گئی آگ۔ اب کیا ہو گا؟"

"اب ایک دیگچے میں پانی بھر کر اس پر رکھ دیجئے۔"

مولانا کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا۔ انہوں نے جھنجھلا کر کہا:

"آخر بتاؤ تو پانی کیا ہو گا؟"

اس کا جواب سننے کے لئے سولا نا ہی نہیں بلکہ محسن عدیل کے سارے ساتھی بھی ان ہی جیسا اشتیاق رکھتے تھے۔ چنانچہ چھنا گر جو اکیلا ہی فرش پر بازی لگا رہا تھا اس کے ہاتھ میں تاش کا پتا پکڑا کا پکڑا رہ گیا۔ دیپ کمار سراغ رسانی کا ایک انگریزی ناول پڑھ رہا تھا۔ اس کی نظریں پڑھتے پڑھتے آخری الفاظ پر جم کر رہ گئیں۔ اور اس کے کان محسن عدیل کی آواز پر لگ گئے۔ قاسم اور شیخی پاس ہی پاس بیٹھے نہ جانے کن تصورات میں غرق تھے۔ دونوں نے چونک کر پر معنی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور پھر نظریں عدیل کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"ابھی تم نہیں سمجھے۔" آخر محسن عدیل نے کہا۔ اس کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے ایک سرگوشی سی بن گئی تھی۔ "بات یہ ہے۔ اس دن وہ آئی تھیں نا رات کو۔ اور پھر غسل کیا تھا ٹھنڈے پانی سے۔ آج سردی بہت زیادہ ہے۔ میں نے سوچا۔ بے کار بیٹھے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو تھے ہاتھوں پانی ہی گرم کردیں۔"

یہ کہتے کہتے اس نے پہلو بدلا۔ اپنا سر گاؤ تکیے پر ڈال دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

۱۹۴۷ء

ناک کاٹنے والے

تین شخص چغے پہنے سر پر آڑی ترچھی پگڑیاں باندھے، منشی جان کے کمرے میں داخل ہوئے اور چاندنی پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ گئے۔

"مزاج تو اچھے ہیں سرکار!" رنگ علی نے کہا۔

ان تینوں میں سے کسی نے اس کی مزاج پرسی کی رسید نہ دی۔

کڑاکے جاڑوں کے دن تھے۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رات خاصی جا چکی تھی۔ ایک مدت تک خاموشی رہی۔ جس کے دوران میں تینوں آدمی تیز تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتے رہے۔ اس کمرے سے ملا ہوا ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ جو خواب گاہ کا کام دیتا تھا۔ انھوں نے اپنے کیچڑ بھرے چپل وہیں اتارے تھے۔ جس کی وجہ سے ابھی چاندنی پر دھبے ہی دھبے پڑ گئے تھے۔

"جبار خاں۔" ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔ "ذرا اس سے پوچھو تمہارا رنڈی لوگ کدھر ہے۔"

"تمہارا رنڈی لوگ کدھر ہے؟" جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"باہر گیا ہے۔" رنگ علی نے کہا۔ جس وقت وہ آئے تو یہ پان بنا رہا تھا۔

"باہر کدھر؟" جبار خاں نے پوچھا۔

"سنیما دیکھنے سنیما، بائیسکوپ۔" رنگ علی نے کہا۔

"کیا کہتا ہے؟" پہلے آدمی نے جبار خاں سے پوچھا۔

"کہتا ہے باہر گیا ہے بائیسکوپ کا تماشہ دیکھنے۔"

"تو تماشہ دیکھنے جاتا ہے!" پہلے آدمی نے کہا۔

"بائی جی تو جاتی بھی نہیں تھیں۔" رنگ علی بولا۔ "وہ تو چشتی صاحب زبردستی لے گئے۔"

"یہ کہتا ہے؟" پہلے آدمی نے جبار خاں سے پوچھا۔

"کہتا ہے چشتی صاحب زبردستی لے گیا۔"

"تو چشتی کے ساتھ جاتا ہے!" پہلے آدمی نے کہا۔ وہ ڈیل ڈول میں اپنے دونوں ساتھیوں سے کم تھا۔ مگر اس کے خدوخال دونوں سے زیادہ درشت تھے۔ گلے میں سیاہ دھاریوں والے سرخ گلوبند کے دو بل دے کر سرے چغے کے اندر کر رکھے تھے۔ اس کے دانت پیلے پیلے تھے۔ چوڑا دہانہ، بائیں رخسار پر آنکھ سے ذرا نیچے ایک گہرے زخم کا نشان تھا۔

"تو رنڈی منڈی کوئی نہیں تو اتنا زور دیتی کس واسطے کیا؟" اس نے رنگ علی سے پوچھا۔ جب وہ بات کرتا تو اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو قطرے کے ادھ بیچ میں آدھا بند کر لیتا۔

رنگ علی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"بولو۔" جبار خاں نے کہا۔ "ہم تم سے کیا کہتا ہے؟" اس کا رنگ سانولا تھا۔ عمر میں وہ اپنے دونوں ساتھیوں سے کافی بڑا تھا۔ اس کے اوپر کے ایک دانت پر پلاٹینم کا خول چڑھا تھا۔ جو کافی گھس چکا تھا۔ اور ہڈی نظر آنے لگی تھی۔

رنگ علی اب بھی خاموش رہا۔

"ہم اتنا سیڑھی کس واسطے چڑھ کے آیا؟" تیسرے آدمی نے پوچھا۔ اپنے دونوں ساتھیوں کی طرح اس نے بھی گلے میں گلوبند لپیٹ رکھا تھا۔ اس کی پیشانی تنگ تھی اور ناک پر ایک بڑا سا مسا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی اس طرح نظر آتی تھی جیسے لہو کی چھینٹ پڑ گئی ہو۔ ان میں سے کسی کی داڑھی بھی بالشت بھر سے کم کی منڈی ہوئی نہیں تھی۔

رنگ علی بے وقوفوں کی طرح ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔

"تو تمہارا منہ میں زبان نہیں ہے؟" تیسرے آدمی نے کہا۔ پھر وہ پہلے آدمی کی طرف متوجہ

ہوا۔ "صحبت خاں اس کا منہ میں زبان نہیں ہے!"

"سرکار کیا عرض کروں۔" رنگ علی نے کہا۔ "بائی جی تو جاتی بھی نہیں وہ——"

"جبار خاں۔" صحبت خاں نے کہا۔ "اس سے پوچھو کب آئے گا؟"

"تمہارا رنڈی لوگ کب آئے گا؟" جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"شو ساڑھے بارہ بجے ختم ہوتا ہے سرکار۔ بس کوئی گھنٹے پون گھنٹے تک آ جائے گا۔"

"کیا کہتا ہے!" صحبت خاں نے جبار خاں سے پوچھا۔

"کہتا ہے تین پاؤ گھنٹے میں آ جائے گا۔"

"چشتی صاحب کئی دنوں سے سر ہو رہے تھے۔" رنگ علی بولا۔ "بائی جی ہر بار نہیں نہیں کر دیتیں۔ آج تو بہت ہی سر ہوئے کہنے لگے فلم ایک نمبر ہے۔ بڑی منتوں سے تھیں راضی کرائی تین قسمیں دینے لگے——"

عین اس وقت سیڑھیوں میں کچھ آہٹ ہوئی، تینوں آدمی چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"جبار خاں۔" صحبت خاں نے کہا۔ "اس پودشت کو کہو چپ ہو جاؤ۔"

"چپ ہو جاؤ۔"

کچھ لمحے خاموشی میں گزرے۔ پھر حسین بخش دھسے کی بکل مارے پا کیشوری کی دھن گنگناتا دہلیز پر نمودار ہوا اور ان تینوں کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔ پھر جوتی اتار کر کمرے میں داخل ہوا۔ اور ان سے ذرا ہٹ کر چاندنی کے ایک سرے پر جہاں سارنگی غلاف کی ہوئی رکھی تھی۔ بیٹھ گیا۔

"سلام سرکار۔" حسین بخش نے کہا۔

"یہ کون ہے؟" صحبت خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"یہ حسین بخش ہیں۔"

"کیا کرتا ہے؟"

"یہ سازندے ہیں۔"

"سازندے کیا!"

"سارنگی بجاتے ہیں۔ سارنگی جو ساز ہے۔"

"تو تو ساز بدو کیوں نہیں کہتا۔"

''ہاں ہاں وہی۔''

''اور تم خود کیا کرتا ہے؟'' جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

''میں طبلہ بجاتا ہوں۔'' رنگ علی نے کہا۔

''خو تو تم بھی سازندہ ہے؟''

''جی ہاں۔''

لمحہ بھر خاموشی رہی۔

''جبار خاں۔'' صحبت خاں نے جبار خاں سے کہا۔ ''پوچھو ادھر کون کون رہتا ہے؟''

''بائی جی۔ ہم دو استاد اور ایک نوکر بس۔'' رنگ علی نے جواب دیا۔

''خو نوکر کدھر ہے؟'' صحبت خاں نے پوچھا۔

''بائی جی کے ساتھ گیا ہے۔'' رنگ علی نے جواب دیا۔

''ہوں۔ ہوں۔''

باہر بوندیاں کسی قدر تیزی سے پڑنے لگی تھیں۔ نیچے سڑک پر سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد تانگے کے گھوڑے کی ٹاپ جس میں گھنٹیوں کے سر بھی شامل ہوتے سنائی دے جاتی۔ گیلی سڑک پر گھوڑے کا سم پڑتا تو بڑی پاٹ دار آواز نکلتی۔

''تم نے بولا نکی جان تین پاؤ گھنٹے میں آئے گا؟'' صحبت خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

حسین بخش بیزار ہوا بیٹھا تھا۔ اس نے جواب دینا چاہا:

''کیا پتہ——''

''تم مت بکو۔'' صحبت خاں نے درشتی سے کہا۔ پھر وہ رنگ علی کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تمہارا بائی تین پاؤ گھنٹے میں آ جائے گا؟''

''آ تو جانا چاہئے۔'' رنگ علی نے کہا۔

''چاہئے ہم نہیں جانتا۔'' صحبت نے کہا۔ ''ہاں کہو یا نہ۔''

''دیکھئے سرکار۔'' رنگ علی نے کہا۔ ''تماشہ ساڑھے بارہ بجے ختم ہوتا ہے اور اس وقت ہوئے ہیں گیارہ بج کر بیس منٹ۔ اگر بائی جی سیدھی گھر کو آئیں——''

''اگر مگر ہم نہیں جانتا۔'' صحبت خاں نے کہا۔ ''صاف بولو۔''

''آخر بات کیا ہے خان صاحب؟'' حسین بخش سے چپ نہ رہا گیا۔ ''کچھ ہمیں بھی تو پتہ

چلے۔''

اس کے جواب میں تیسرے آدمی نے یکبارگی آگے بڑھ کر زور کا ایک مکا اس کے منہ پر مارا۔ اس ناگہانی ضرب پر حسین بخش کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ آنسو اس کی آنکھوں میں جھلکنے لگے۔ اس نے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر تک گم سم بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر دہلیز کی طرف جانے لگا۔ جہاں اس کا جوتا پڑا تھا۔

''کدھر رے۔'' جبار خاں نے کہا۔ ''ٹھہرو کدھر جاتا ہے؟''

حسین بخش نے ایک پاؤں جوتی میں ڈال لیا تھا۔ وہ ٹھہر گیا۔

''ادھر دیکھو۔'' جبار خاں نے ڈپٹ کر کہا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کمانی دار چاقو تھا۔ جس کا پھل آٹھ انچ سے کم لمبا نہ تھا۔ بجلی کی روشنی میں اس سے شعاعیں سی نکل رہی تھیں۔ ''اگر تم نیچے جانے کی کوشش کرے گا تو ہم تمہارا پیٹ چاک کر دے گا۔ سن لیا۔ دروازے میں کنڈی لگاؤ اور ادھر ہمارے پاس آ کر بیٹھو۔''

حسین بخش لمحہ بھر کھڑا رہا۔ پھر اس نے جوتی سے پاؤں نکال لیا اور دروازے میں کنڈی لگا کے اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

''شاباش۔ شاباش۔'' صحبت خاں نے کہا۔ پھر وہ تیسرے آدمی سے کہنے لگا۔ ''گلباز خاں یار۔ تم نے تان سین کے بیٹے کو ناراض کر دیا۔ اب وہ ہم کو گانا نہیں سنائے گا۔''

''ہم اس کو منائے گا۔'' گلباز خاں نے کہا۔ ''ہم اس کے گدگدی کرے گا۔ تان سین کا بیٹا ہنسے گا۔ تان سین کا بیٹا پھر قوالی سنائے گا۔''

''جبار خاں۔'' صحبت خاں نے کہا۔ ''اس سے بولو ہم گانا سننے نہیں آیا۔''

''پھر کیسے آنا ہوا سرکار؟'' رنگ علی نے پوچھا۔

''کیا کہتا ہے؟'' صحبت خاں نے جبار خاں سے پوچھا۔

''پوچھتا ہے ہم کیوں آیا؟'' جبار خاں نے کہا۔

''خو پوچھتا ہے ہم کیوں آیا؟'' صحبت خاں نے کہا۔ ''اس سے پوچھو ہم کیوں آیا۔''

''خو تم بتاؤ ہم کیوں آیا؟'' جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

رنگ علی مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

''کیا کہتا ہے؟'' صحبت خاں نے جبار خاں سے پوچھا۔

''کچھ نہیں کہتا۔'' جبار خاں نے کہا۔

''کچھ نہیں کہتا؟''

''مسکراتا ہے۔''

''مسکراتا ہے؟'' صحبت خاں نے رنگ علی سے کہا۔ ''خوتم مسکراتا ہے! مسخری کرتا ہے!''

''خان صاحب بھی کمال کرتے ہیں۔'' رنگ علی نے کہا۔ ''میری مجال ہے کہ میں آپ سے مسخری کروں؟''

''خوتم اچھا آدمی ہے۔'' صحبت خاں نے کہا۔

''تان سین کا بیٹا اچھا آدمی نہیں ہے۔'' گلباز خاں نے کہا۔ ''وہ روتا ہے۔ تان سین کا بیٹا روتا ہے۔''

کلاک میں گھر گھر ہوئی۔ اور اس نے ٹن ٹن کر کے بارہ بجانا شروع کیا۔ حسین بخش سے سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ کلاک سے ذرا ہٹ کر دیوار پر ایک بڑا سا رنگ دار فوٹو تھا۔ جس میں چوتھائی صدی پہلے کی کوئی ادھیڑ عمر کی گانے والی، گلے میں اشرفیوں کا ہار ڈالے طنبورا چھیڑ رہی تھی۔ ناک پر بڑی سی لونگ تھی۔ اور سیدھی مانگ نکال کر جوڑا باندھ رکھا تھا۔

''خوب دیکھو۔'' صحبت خاں نے رنگ علی سے کہا۔ ''ادھر قلیان ملیان بھی ہے؟''

''قلیان تو نہیں حقہ ہے سرکار۔'' رنگ علی نے کہا۔

''ہم حقہ نہیں پیئے گا۔''

''پان پیش کروں؟''

''ہم پان نہیں کھاتا۔''

''سگرٹ؟''

''سگریٹ! خیر چرس کا سگریٹ کا مضائقہ نہیں ہے۔''

''چرس تو یہاں کوئی بھی نہیں پیتا سرکار!'' رنگ علی نے کہا۔

''رنڈی منڈی نہیں۔ قلیان ملیان نہیں۔ چرس نہیں۔ یہ تمہارا کیسا طوائف کا مکان ہے؟!'' گلباز خاں نے کہا۔

''اچھا روغن کدو ہے؟'' صحبت خاں نے پوچھا۔

''روغن کدو تو نہیں۔'' رنگ علی نے کہا۔ ''آنولے کا تیل ہوگا۔''

''خیر وہی لاؤ۔'' صحبت خاں نے کہا۔

رنگ علی ایک الماری کے پاس گیا۔ جس کے دونوں پٹوں کے چوکھٹوں میں دو لمبے لمبے آئینے جڑے ہوئے تھے۔ اور الماری کھول کر تیل کی بوتل لے آیا۔

''دیکھو۔ تم بہت اچھا آدمی ہے۔'' صحبت خاں نے کہا۔ ''تھوڑا تیل ہمارے سر پر ملو۔ پھر ہم تم کو بتائے گا ہم کس واسطے آیا۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی پگڑی اتار دی۔ معلوم ہوتا تھا پگڑی بہت دیر سے اس کے سر پر تھی۔ کیونکہ کلاہ نے اس کی پیشانی پر گہرا نشان ڈال دیا تھا۔ اس کے سر پر بال صرف کنارے کنارے تھے۔ بیچ میں چاند سی نکل رہی تھی۔ جیسے انگور آیا ہوا پھوڑا۔

رنگ علی اس کی پیٹھ کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑا سا تیل ہتھیلی پر ڈالا۔ اور سر پر ملنے لگا۔

''شاباش، شاباش۔'' صحبت خاں نے کہا۔ ''اب ہم تم کو بتاتا ہے کہ ہم کیوں آیا۔'' مگر وہ کہتے کہتے رک گیا اور گلباز خاں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

''گلباز خاں۔ خوتم بتاؤ یار۔ ہم تیل ملواتا ہے۔''

''ہم بتائے گا۔'' گلباز خاں نے کہا۔ ''مگر پہلے تان سین کا بیٹا ہمارا ٹانگ دبائے۔''

''تان سین کا بیٹا۔'' صحبت خاں نے کہا۔ ''گلباز خاں کا ٹانگ دباؤ۔''

حسین بخش بدستور سر جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ ضبط کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ ان کی طرف نہ دیکھے۔

''تان سین کا بیٹا ہمارا ٹانگ نہیں دباتا!'' گلباز خاں نے جیسے فریاد کرتے ہوئے کہا۔

''اس کے ایک دھپ لگاؤ۔'' صحبت خاں نے کہا۔

''ہم دھپ نہیں لگائے گا۔'' گلباز خاں نے کہا۔ ''ہم اس کا کان مروڑے گا۔ تان سین کا بیٹا اپنا کان ادھر کرو۔'' اس نے حسین بخش سے کہا۔

''حضور معاف کر دیجئے۔'' رنگ علی نے لجاجت سے کہا۔ پھر وہ حسین بخش سے مخاطب ہوا۔ ''بھائی حسین بخش ضد نہ کرو۔ اٹھو بیٹھو اور خان صاحب کی ٹانگ دبا دو۔ اٹھو اٹھو بچے نہ بنو۔ موقع محل دیکھا کرو۔''

حسین بخش سخت لاچاری کے ساتھ اٹھا اور گلباز خاں کے پاس بیٹھ کر اس کی ٹانگ دبانے لگا۔ آنسو ابھی اس کی آنکھوں میں خشک نہیں ہونے پائے تھے۔

''ہاہ۔'' گلباز خاں نے حسین بخش کی پیٹھ پر زور سے تھپکی دے کر کہا۔ ''تان سین کا بیٹا اب اچھا

ہو گیا۔ اب ہم بتائے گا ہم کیوں آیا۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔

"تمہارا ننھی جان ہے نا؟" گلباز خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"ہاں سرکار۔" رنگ علی نے کہا۔

"اس کا نام ننھی جان ہے نا؟" گلباز خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"ہاں سرکار۔" رنگ علی نے کہا۔

"تو بس ہم اس کا ناک کاٹنے آیا ہے!" گلباز نے کہا۔

"اس بچاری کا قصور؟" رنگ علی نے پوچھا۔ مالش کرتے کرتے اس کے ہاتھ تھم گئے تھے۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور آواز گلے میں اٹک اٹک گئی تھی۔

"قصور مصور کچھ نہیں۔" صحبت خاں نے کہا۔ "تم اپنا کام کرو۔"

"پھر کیا بات ہے سرکار؟" رنگ علی نے گلباز خاں سے پوچھا۔

"ہم نے سنا اس کا ناک بہت لمبا ہے۔" گلباز خاں نے کہا۔ "اچھا نہیں لگتا۔ چھوٹا ہو جانے سے خوش رو ہو جائے گا۔"

"خدا کے واسطے خان صاحب۔" رنگ علی نے گڑگڑا کر کہا۔ "ایسا غضب نہ کیجیے گا۔ وہ بچاری تو بہت شریف ہے۔"

"جبھی تو ہم اس کو خوش رو بنائے گا۔" گلباز خاں نے کہا۔

"ہم بہت کو خوش رو بنا چکا ہے۔" جبار خاں نے کہا۔

گھڑی میں بارہ بج کر ۲۵ منٹ ہوئے تھے۔ کہ سیڑھیوں میں کئی قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ تینوں آدمیوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

رنگ علی صحبت خاں کے قدموں میں گر پڑا۔

"رسول کے واسطے خان صاحب" اس نے بسورتے ہوئے کہا۔ "ہم پر رحم کیجیے۔ ہم بہت ہی مسکین لوگ ہیں۔"

دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ گلباز خاں نے رنگ علی کی کلائی مضبوطی سے پکڑ کر اسے اٹھایا اور دروازے کے پاس لے گیا۔ پھر اسے دروازے کے سامنے کھڑا کر کے خود اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

"پوچھو کون ہے؟" گلباز خاں نے رنگ علی کے کان میں کہا۔

"کون ہے؟" رنگ علی نے پوچھا۔

"دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو۔" کئی آوازیں سنائی دیں۔

"نام پوچھو۔" گلباز خاں نے رنگ علی کے کان میں کہا۔

"ارے بھئی میں ہوں سلیم اللہ۔" دروازے کے اس طرف سے آواز آئی۔ "جلدی کھولو دروازہ۔"

"پوچھو آپ کے ساتھ کون ہے۔" گلباز خاں نے رنگ علی کے کان میں کہا۔

"اچھا شیخ صاحب ہیں!" رنگ علی نے کہا۔ "آپ کے ساتھ اور کون لوگ ہیں شیخ صاحب؟"

"میرے دوست ہیں بھئی۔" دروازے کے اس طرف سے آواز آئی۔ "آخر تم دروازہ کیوں نہیں کھولتے؟"

رنگ علی نے پلٹ کر گلباز خاں کی طرف دیکھا۔ جس نے سر ہلا کر نفی کا اشارہ کیا۔

"شیخ صاحب معاف کیجیے گا۔" رنگ علی نے کہا۔ "اس وقت دروازہ نہیں کھل سکتا۔ بائی جی مجرے گئی ہیں صبح کو آئیں گی۔ اس وقت خان صاحب وزیر خاں کے ہاں سے ہو کے آئی ہوئی ہیں۔ ان کی وجہ سے دروازہ نہیں کھل سکتا۔ آپ کو زحمت تو ہوئی مگر مجبوری ہے۔ آپ کل تشریف لائیے گا۔"

اس پر سیڑھیوں میں کچھ دیر کھسر پھسر ہوئی۔ پھر اترتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ جو دھیرے دھیرے مدھم ہوتی ہوتی گم ہو گئیں۔

"شاباش۔" صحبت خاں نے گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم بہت عقلمند آدمی ہے۔"

"عقل مند اس نے بنایا۔" گلباز خاں نے چاقو دکھاتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ رنگ ذرا بھی چوں کرتا تو ہم اس کا نوک اس کی پیٹھ میں اتار دیتا۔"

ایک بج گیا۔ مگر ننھی جان نہیں آئی۔ تینوں آدمیوں نے جمائیاں لینی شروع کر دیں۔ جبار خاں نے چغے کی جیب میں سے نسوار کی ڈبیا نکالی۔ جس میں سے چٹکی چٹکی تینوں نے لی۔

سوا بجے صحبت خاں نے رنگ علی کو گلے سے پکڑ لیا۔

"او خنزیر کے بچے سچ بتا۔" صحبت خاں نے پوچھا۔ "وہ تماشے گیا ہے یا اور جگہ گیا ہے؟"

"قسم ہے پنجتن پاک کی خان صاحب۔" رنگ علی نے اپنا گلا چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تماشے ہی گیا ہے۔"

"پھر وہ آیا کیوں نہیں؟" صحبت خاں نے پوچھا۔

"اللہ جانے کیوں نہیں آیا۔" رنگ علی نے کہا۔ پھر وہ لمحہ بھر خاموش رہ کر بولا۔ "میں جانتوں چشتی صاحب اس کو اپنی کوٹھی لے گئے ہوں گے۔ اب تو وہ صبح ہی کو آئے گا۔"

"تم جھوٹ کہتا ہے۔" گلباز خاں نے کہا۔

"نہیں میں سچ کہتا ہوں۔" رنگ علی نے کہا۔

"ہم نہیں مانتا۔" گلباز خاں نے کہا۔

"آپ یہیں رہیے پھر جھوٹ سچ معلوم ہو جائے گا۔" رنگ علی نے کہا۔

"پہلے بھی کبھی ایسا ہوا؟" صحبت خاں نے پوچھا۔

"کئی بار۔" رنگ علی نے کہا۔

ڈیڑھ بجے تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جمائیاں لیتے لیتے ان کے جبڑے تھک گئے تھے۔ اور آنکھوں اور ناک سے پانی بہنے لگا تھا۔ باہر بوندیاں تھم گئی تھیں۔ تینوں میں آنکھوں آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے پھر وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"اچھا ہم جاتا ہے۔" صحبت خاں نے کہا۔

جس وقت وہ دہلیز کے پاس پہنچے تو صحبت خاں نے رنگ علی سے کہا:

"خدا تمہارا ننھی جان کا قسمت بہت اچھا ہے۔ اچھا سلام۔"

"تان سین کے بیٹے کو بھی سلام۔" گلباز خاں نے کہا اور وہ سیڑھیوں سے اتر گئے۔

چند لمحے خاموشی رہی۔

"یا خدا یہ کیا مصیبت ہے!" رنگ علی نے کہا۔

"ایسے کام کی ایسی تیسی۔" حسین بخش نے کہا۔ "لعنت ہے ایسی کمائی پر۔ میں تو کل ہی یہاں سے نکل دوں گا۔ کسی فلم کمپنی یا ریڈیو میں نوکری کر لوں گا۔ اور جو نوکری نہ ملی تو ٹیوشن کروں گا۔ بھیک مانگ لوں گا۔ مگر اس کوٹھے کا نام نہیں لوں گا۔"

رنگ علی نے کوئی جواب نہ دیا۔

ٹھیک دو بجے مکان کے نیچے ایک موٹر آ کے رکی۔ اور پھر موٹر کا دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز آئی۔ ذرا سی دیر میں ننھی جان ٹھمک ٹھمک کرتی سیڑھیاں چڑھتی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے تحسین تھا۔ جس نے ایک بقچہ اٹھا رکھا تھا۔

ننھی جان نے ساری کے اوپر لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ جس کا کالر اور کف لومڑی کی کھال کے تھے۔ سرخ ساری کی مناسبت سے پاؤں میں سرخ سینڈل تھے۔ آدھے سر اور کانوں کو ایک سفید باریک جالی کے سکارف سے ڈھک رکھا تھا۔ جس میں سے صرف کانوں کی لوئیں نظر آتی تھیں۔ ان لوؤں میں روپہلی ٹوپس دو ننھے ننھے پورے چاندوں کی طرح دمک رہے تھے۔ ان کے رخساروں پر غازہ سرخ پھول کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم اور لباس سے خوشبوئیں چھوٹ رہی تھیں۔ اس کی عمر پچیس چھبیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ چال ڈھال سے وہ ایک الھڑ حسینہ معلوم ہوتی تھی۔ آنکھوں سے مسکرانے والی۔ گہرے گہرے سانس لینے والی۔

رنگ علی اور حسین بخش کی نظریں سب سے پہلے بے ساختہ اس کی ناک پر پڑیں۔ جس میں سرخ نگینے والی ایک کیل چمک رہی تھی۔

"شکر ہے آپ خیریت سے گھر پہنچیں۔" رنگ علی نے کہا۔

"سینما کے بعد مجھے چشتی زبردستی ہوٹل لے گیا۔" ننھی جان نے کہا۔

"بہت اچھا ہوا۔" رنگ علی نے کہا۔

"تم لوگ اتنے پریشان کیوں ہو؟" ننھی جان نے پوچھا۔

"بائی جی۔" حسین بخش نے کہا۔ "مجھے تو آپ چھٹی ہی دے دیجیے۔"

"آخر ہوا کیا؟"

"آپ گھر پر ہوتیں تو قیامت ہی آجاتی۔" رنگ علی نے کہا۔

"کچھ کہو تو آخر ہوا کیا؟"

"آپ کے پیچھے تین پٹھان آئے تھے۔" رنگ علی نے کہا۔ "بڑے وحشی سے۔ ان کے پاس لمبے لمبے چاقو تھے۔ ہمیں مارا پیٹا۔ گالیاں دیں۔ بات بات پر چاقو نکال لیتے تھے۔ کہتے تھے ——"

"کیا کہتے تھے؟" ننھی جان نے پوچھا۔

"کہتے تھے ان کے منہ میں خاک۔ ہم ننھی جان کا ناک کاٹنے آیا ہے۔"

لمحہ بھر کے لیے ننھی جان کے چہرے کی رنگت کی ایسی کیفیت ہوئی۔ جیسے کوئی بلب فیوز ہوتے ہوتے دوبارہ روشن ہو جائے۔ پھر اس نے نگاہیں اپنی انگلیوں کے سرخ رنگے ہوئے ناخنوں پر گاڑ دیں۔

"میں نے کہا بھی۔" رنگ علی نے کہا۔ "بائی جی رات کو واپس نہیں آئیں گی۔ پھر بھی ڈیڑھ

بے تک بچے کا نام نہیں لیا۔"

"میرے منہ پر اس زور کا تھپڑ مارا کہ دو دانت ہل گئے۔" حسین بخش نے بسورتے ہوئے کہا۔

ننھی جان نے کچھ جواب نہ دیا۔

"آخر اب کیا ہوگا؟" رنگ علی نے پوچھا۔

"جانے کیا ہوگا!" ننھی جان نے کہا۔

"تھانہ میں رپٹ نہ لکھوا دیں؟"

"کچھ فائدہ نہیں۔ الٹی بدنامی ہوگی۔ پھر پولیس والوں کے ناز منت کے۔"

"کہیں اور نہ چل دیں؟"

"کہاں؟"

"کسی اور شہر۔"

"کچھ فائدہ نہیں۔ سب جگہ ایسا ہی حال ہے۔"

"آخر پھر کیا کریں؟"

"کیا ہو سکتا ہے؟"

"کچھ نہیں ہو سکتا؟"

"کچھ نہیں ہو سکتا!"

پل بھر خاموشی رہی۔ اس کے بعد ننھی جان نے انگڑائی لی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تھکی تھکی سی اداس مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"خلیفہ جی۔" اس نے رنگ علی سے کہا۔ "اس وقت تو تم لوگ آرام کرو۔ صبح دیکھا جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

پانچ منٹ کے بعد سب کواڑ بند کر دیے گئے تھے۔ اور روشنی گل کر دی گئی تھی۔ دونوں استاد اور جمن فرش پر پاس پاس بستر بچھا کے لیٹ گئے تھے۔

"یہ پٹھان ضرور کسی کے سکھائے ہوئے تھے۔" رنگ علی نے حسین بخش سے کہا۔

"مگر کس کے؟" حسین بخش نے کہا۔

لمحہ بھر خاموشی رہی۔

"ہو نہ ہو یہ چکر والے حاجی کی کارستانی ہے۔" رنگ علی نے کہا۔ "وہ بڈھا نکاح کے لئے بائی

جی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔"

"ہوں۔" حسین بخش نے نحیف آواز میں جواب دیا۔

پل بھر کو پھر خاموشی رہی۔

"یا شاید یہ نواب صاحب کی بدمعاشی ہے۔" رنگ علی نے کہا۔ "اس کو یہ چڑ تھی کہ کنور صاحب کیوں آتے ہیں۔"

"ہوں۔" حسین بخش نے پہلے سے بھی نحیف آواز میں جواب دیا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔

"پھر خیال آتا ہے۔" رنگ علی نے کہا۔ "کہیں یہ اس فیض آباد کے کنگلے تعلقہ دار کی شرارت نہ ہو۔ جس کو بائی جی نے بے عزت کر کے مکان سے اتار دیا تھا۔"

حسین بخش نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے منہ دستے کے اندر کر لیا تھا۔ اور لمبے لمبے سانس، جو ابھی خراٹے نہیں بنے تھے، لینے شروع کر دیے تھے۔ مگر رنگ علی کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی:

"میں جانوں یہ راؤ صاحب کا کیا دھرا ہے۔ وہ کالا مارواڑی جو بائی جی کو بنارس لے جانا چاہتا تھا........"

۱۹۳۵ء

چکر

سیٹھ چھاگل کا منیم چیلا رام صبح سے دوپہر کے بارہ بجے تک کوٹھی میں بہی کھاتے اور لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتا۔ اس کے بعد وہ رقمیں اگاہنے چلا جاتا۔ جون کی ایک دوپہر کو وہ اپنا کپڑے کا تھیلا لئے، جس میں وہ کاغذات وغیرہ رکھا کرتا تھا سیٹھ کے کمرے کے سامنے سے گذرا۔ سیٹھ اس وقت گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ انھوں نے چق کے اندر سے چلا کر کہا:

"اے منیم جی! دیکھنا مال گودام جانا نہ بھول جانا۔ اور بنک میں روپیہ بھی سب جمع ہو جائے۔ اور ہاں وہ رجسٹریاں بھی تو ضروری ہیں......... نسخہ اور کتابوں کی فہرست تو تم نے رکھ ہی لی ہوگی؟"

چیلا رام نے کہا: "جی ہاں۔" اور وہ روانہ ہو گیا۔

اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ ہاتھ پیر ابھی مضبوط تھے۔ معلوم ہوتا تھا، جوانی میں صحت بہت اچھی ہوگی۔ اس کا لباس گرمی سردی ہر موسم میں قریب قریب ایک ہی وضع کا تھا۔ کھدر کا کرتا۔ موٹی ململ کی دھوتی۔ چار خانے کے کپڑے کا کوٹ سر پر سیاہ کرتی ٹوپی۔ پاؤں میں نری کا جوتا۔ چونکہ اسے دن بھر چلتے پھرتے رہنا پڑتا تھا اس لئے یہ جوتا بوٹ چپل وغیرہ کی نسبت زیادہ پائدار ثابت ہوا تھا۔ اس جوتے نے شروع شروع میں اس کے پیروں کو بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ مگر جب اس نے اس کے ٹخنوں اور پیروں کی انگلیوں پر سیاہ سخت سخت گٹے ڈال دیئے۔ تو تکلیف رفع ہو گئی۔

علاوہ ازیں ایک پرانا چھاتا جس کی موٹھ ہاتھی دانت کی اور فیشن اصل ہی ہوئی تھی اس کے لباس کا جزو بن گیا تھا۔ یہ چھاتا دراصل سیٹھ چھاگل کے بڑے لڑکے کا تھا، جس نے بہت دن ہوئے اسے ردی کر کے پھینک دیا تھا۔ سیٹھ کی نظر پڑ گئی۔ اپنے ہاں اس کا کوئی مصرف نہ دیکھ کر انھوں نے اپنے منیم کو دے دیا۔ مگر چیلا رام کو اس چھاتے کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ پہلے تو شاید سخت گرمی کے دنوں میں اسے بار بار دور دور کے کاموں پر بھیجتے ہوئے سیٹھ کو کچھ جھجک محسوس ہوتی ہوگی۔ مگر چھاتے کے دان کے بعد اب ان کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں رہ گیا تھا۔

اس وقت سورج آسمان کے ٹھیک بیچ میں پہنچ گیا تھا۔ دیواروں کا سایہ گھٹتے گھٹتے اس قدر مختصر ہو گیا تھا کہ صرف ایک لکیر سی دکھائی دیتی تھی، جو بیچ بیچ میں ٹوٹتی ہوئی سڑک کے کنارے دور تک چلی گئی تھی۔ دھوپ کی تیزی اور شدت کا یہ حال تھا کہ آنکھیں خود بخود بند ہوئی جاتی تھیں۔ بند ہونے پر بھی پپوٹوں کے اندر سے اپنے اردگرد ایک سرخ سرخ اندھیرا سا گھومتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ گو چیلا رام نے چھاتا تان رکھا تھا۔ مگر دھوپ چھاتے کے بوسیدہ کپڑے میں سے چھن چھن کر اس کے چہرے کی طرف یوں لپک رہی تھی جیسے کسی سرمائی کا گرم سانس۔

چیلا رام چھاتے کو نیچا کر کے اپنے سر اور سینے کو لو کے تھپیڑوں سے بچاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کوٹھی سے کوئی دو سو قدم آگے نکل کر اس نے تھیلے کو چھاتے کی موٹھ میں لٹکا لیا۔ اور کوٹ کی جیب میں سے بیڑیوں کا بنڈل اور دیا سلائی کی ڈبیا نکالی۔ اور بیڑی سلگا کر سوچنے لگا کہ آج کے مختلف کاموں کو کس ترتیب سے انجام دوں کہ کم سے کم چلنا پڑے۔

اس روز اسے چھ اسامیوں سے رقمیں وصول کرنی تھیں۔ ان میں سے دو کے گھر تو زیادہ دور نہیں تھے۔ البتہ باقی چار شہر کے چار مختلف سروں پر رہتی تھیں۔ جب تک ان اشخاص سے روپیہ وصول نہ ہو جائے وہ بنک نہیں جا سکتا تھا اور بنک تین بجے کے بعد لین دین بند کر دیتا تھا۔ پھر بعض ضروری رجسٹریاں تھیں۔ جن کے متعلق سیٹھ نے تاکید کر رکھی تھی کہ انھیں آج ہی ڈاک میں ڈال دیا جائے۔ چونکہ ڈاک خانوں میں عموماً بھیڑ رہا کرتی ہے اس لئے کم سے کم ایک گھنٹہ اس کے لئے چاہئے تھا۔ پھر اسے ریل کے مال گودام میں جانا تھا۔ گھنٹے سوا گھنٹے کا یہ کام بھی تھا۔ علاوہ ازیں سیٹھانی کے لئے نسخہ بھی بنوانا تھا۔ اور سیٹھ کے چھوٹے لڑکے کے لئے جس نے پچھلی جماعت پاس کر لی تھی، کتابیں خریدنی تھیں۔

بھلا ہو چیلا رام کے نری کے جوتے کا۔ اس کے بیڑیوں کے بنڈل کا۔ اور ان پان کی گلوریوں کا

جنہیں کمیٹی نے بازاروں میں اور بعض نیک دل دکانداروں نے اپنی اپنی دکان کے پاس لگوا رکھا تھا۔
کہ اس نے چھ بجتے بجتے سب کام نمٹا لئے وہ سارے دارالسلطنت میں اس طرح گھوم گیا، جس طرح کوئی دور دراز ملک کا رہنے والا سیاح تھوڑے سے وقت میں کسی مشہور تاریخی شہر کے ایک ایک بازار کو دیکھنا اور ایک ایک سڑک پر سے گزرنا اپنے پر فرض کر لیتا ہے۔ جب اسے زیادہ ستانے لگتی تو وہ دھیان بٹانے کے لئے بیڑی سلگا لیتا۔ جب بیڑی کے دھوئیں سے حلق سوکھ جاتا تو پیاؤ سے پانی پی لیتا۔ جب جوتے میں گرد بھر جاتی، یا دھوپ اٹھتا تو کسی سایے والی جگہ میں کھڑے ہو کر جوتا جھاڑ لیتا۔ اور اگر کوئی سرکاری نل قریب ہی ہوتا تو جوتا اتار کر پاؤں بھگو لیتا۔ جس طرح بعض دفعہ گاڑی بان گاڑی کے پہیوں کے گرم ہو جانے پر پانی ڈال کر انہیں ٹھنڈا کر لیتے ہیں۔

جب وہ کوٹھی سے نکلا تھا تو اسے آج کے کام پہاڑ سے دکھائی دیتے تھے۔ مگر اب اسے خود حیرانی ہو رہی تھی کہ اس نے یہ سارے کام کس طرح انجام دے لئے اور پھر یہ کام سیٹھ کے حسب منشا خوش اسلوبی سے ہو گئے تھے۔ البتہ ایک آسامی نے اسے دیر تک ٹھہرائے رکھا تھا۔ اور پھر رقم بھی نہیں دی تھی۔ اسی طرح نسخے بنوانے کے لئے بھی اسے کافی دیر کھڑا رہنا پڑا تھا۔ کیونکہ جس ڈسپنسری سے سیٹھ چھنا مل کا حساب تھا اس کا کمپونڈر چیلا رام کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اور اس کا نسخہ عموماً سب سے آخر میں بنایا کرتا تھا۔ ہاں ڈاک خانے میں اسے اندازے سے بہت کم ٹھہرنا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے ڈاک خانہ چنا ہی ایسا تھا، جس کے آس پاس آبادی نسبتاً کم تھی، اور بہت سے لوگ اس کے وجود تک سے ناواقف تھے۔ مال گودام میں بھی اس کی جلد ہی خلاصی ہو گئی۔ کیونکہ بلٹیاں ابھی نہیں آئی تھیں۔

جس وقت وہ سیٹھ کی کوٹھی کے قریب پہنچا۔ دھوپ میں وہ پہلے جیسی حدت تو نہیں رہی تھی۔ البتہ سڑکوں پر چھڑکاؤ کی وجہ سے ابخرات اٹھ رہے تھے، جس سے سخت حبس ہو گیا تھا۔ دور ہی سے اسے سیٹھ کے کمرے سے ہنسی قہقہے کی آوازیں آتی ہوئی سنائی دیں۔ اور وہ دروازے کے باہر چق کے پاس پہنچ کر ٹھہر گیا۔ وہ ان آوازوں کو خوب پہچانتا تھا۔ ان میں ایک تو سیٹھ بانکے بہاری تھے، جو سیٹھ چھنا مل کے پڑوس میں ان ہی کی طرح مگر ذرا چھوٹے پیمانے پر ساہوکارہ کرتے تھے۔ اور سیٹھ کے دور کے رشتہ دار بھی ہوتے تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ ہر روز چھ بجتے ہی اپنا کاروبار بند کر دیتے، اور سیٹھ چھنا مل سے خوش گپیاں کرنے آ موجود ہوتے۔ ان کے ساتھ عموماً ان کا ایک ٹھیکیدار دوست بھی آیا کرتا۔ یہ شخص بڑا لطیفہ گو اور چرب زبان تھا۔ اور اپنی ان ہی خوبیوں کے باعث بڑے بڑے حکام تک اس کی رسائی تھی۔

علاوہ ازیں سیٹھ چھنا مل کا بہنوئی جو ایک بے پروا اور آوارہ مزاج آدمی تھا اور جو دیوالیہ ہو چکا تھا۔ اور اب سیٹھ کے ٹکڑوں پر پڑا ہوا تھا۔ بڑے شوق سے ان خوش گپیوں میں حصہ لیا کرتا۔ خود سیٹھ جی بھی ان کے دلدادہ تھے۔ کیونکہ دن بھر اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے یا سوتے رہنے سے وہ اکتا جاتے تھے۔ چنانچہ اس وقت کی یہ مختصر سی محفل گویا ان کے لئے تفریح کا سامان مہیا کر دیتی تھی۔

چیلا رام دو تین مرتبہ دروازے کے باہر کھڑے کھانسا۔ مگر سیٹھ جی اپنے دوستوں کے ساتھ باتوں میں ایسے مشغول تھے کہ انہوں نے آواز دی۔

اس وقت سیٹھ بانکے بہاری کا ٹھیکیدار دوست تناسخ کے مسئلے پر گفتگو کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:
"ہنسی مذاق کو چھوڑ کر آپ ذرا اس مسئلے پر بھی تو غور کیجئے۔ آج کل جس کو سنو یہی کہہ رہا ہے۔ کہ اس کل جگ کے زمانے میں پاپ بہت بڑھ گیا ہے۔ اور اب دنیا میں صرف مہان پاپی ہی بستے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو دنیا کی آبادی روز بروز کم ہوتی جانی چاہئے تھی۔ کیونکہ جب کوئی مہان پاپی مر جاتا ہے۔ تو آواگون کی رو سے وہ دوبارہ انسان کے روپ میں جنم نہیں لیتا۔ بلکہ انسان سے گھٹیا درجے یعنی پشو پنکشی کی جون دھارن کرتا ہے، اور اس طرح آج دنیا میں روز بروز انسان کم اور پشو پنکشی زیادہ ہونے چاہئے تھے۔ مگر یہاں معاملہ الٹا ہے سیٹھ جی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ آج کل جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ پاپ نہیں مہان پن ہے۔ اور تبھی تو ہم بار بار انسان کا روپ ——"

اچانک ٹھیکیدار کی نظر دروازے پر پڑی۔ اور وہ بات کرتے کرتے رک گیا اور پھر سب کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ چیلا رام سے زیادہ دیر تک دروازے کے باہر کھڑا نہ رہا جا سکا تھا۔ اور وہ ایک اضطراری حرکت کے ساتھ چق اٹھا کر اندر داخل ہو گیا تھا۔

اس وقت اس کی حالت بہت ابتر ہو رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اور صورت سے عجب ہولناک پن سا ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کی کڑی بڑی مونچھیں، داڑھی اور بھنویں گرد سے اٹی ہوئی تھیں۔ اور آنکھیں ایسی سرخ ہو رہی تھیں گویا دکھنے آئی ہوں۔ دن بھر دھوپ اور لو کے تھپیڑے کھا کھا کر اس کے چہرے کی رنگت ایسی سیاہی مائل سرخ ہو گئی تھی، جیسے مرگھٹ کے اس مردے کی جس کے چہرے کے پاس لکڑیوں کی آنچ پہلے پہل پہنچنی شروع ہوئی ہو۔

اس کی کرتی ٹوپی کا کنارہ بھیگا ہوا تھا۔ اور اس کی بغلوں سے اس قدر پسینہ بہ رہا تھا کہ کوٹ کی آستینیں چھاتی سے لے کر کہنیوں تک تر تھیں۔ علاوہ ازیں اس کی دھوتی پر جا بجا کیچڑ کی چھینٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ اس وقت اس قدر بے جان معلوم ہوتا تھا کہ ہر لحظہ یہ گمان ہوتا تھا کہ اب گرا کہ اب گرا۔

یہ دیکھ کر کہ اس کے آنے سے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے اور سب لوگ اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ مگر پھر اس نے آگے بڑھ کر تھیلا فرش پر رکھ دیا۔ اور اس میں سے کتابیں۔ سیتلا پانی کا نسخہ۔ دوا کی شیشی۔ رجسٹری اور بنک کی رسیدیں اور دوسرے کاغذات وغیرہ نکال نکال کر سیٹھ کے سامنے رکھنے لگا۔ وہ بلٹیوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ سیٹھ نے ہاتھ سے اشارہ کر کے اسے روک دیا۔ اور کسی قدر ملائمت سے کہا:

"منیم جی! اس وقت تو تم گھر جاؤ۔ صبح دیکھا جائے گا۔"

چیلا رام کا گھر سیٹھ کی کوٹھی سے کوئی دو میل کے فاصلے پر تھا۔ جس وقت وہ گرتا پڑتا گھر پہنچا، خاصی شام ہو چکی تھی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے دھوتی کے سوا سب کپڑے اتار ڈالے اور مکان کے باہر احاطے میں نکل آیا۔ اس کے دروازے کے پاس دیوار کے سہارے ایک کھٹیا کھڑی تھی۔ اس نے کچھ نہیں دیکھا کہ یہ کس کی ہے۔ جھٹ وہیں بچھا اس پر بے سدھ ہو کر گر پڑا۔

شاید اس کی بیمار بیوی نے جو چولھے کے پاس بیٹھی رسوئی بنا رہی تھی، اس سے کچھ کہا تھا۔ مگر اسے کچھ معلوم نہیں ہوا کہ کیا کہا گیا۔ اس کی چھوٹی لڑکی آ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔ شاید اس نے اسے درشتی سے پرے ہٹا دیا تھا۔ یا شاید وہ خود ہی سہم کر پرے ہٹ گئی تھی۔

چند منٹ تک وہ آنکھیں بند کیے کھٹیا پر بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اس کے حواس بجا ہونے شروع ہوئے۔ اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنے جسم کے مختلف عضوں خصوصاً پنڈلیوں اور کمر میں اینٹھن اور میٹھا میٹھا سا درد محسوس ہونے لگا۔ اور وہ آہستہ آہستہ کراہنے لگا۔ وہ کبھی اس کروٹ لیٹتا۔ اور کبھی اس کروٹ۔ کبھی ٹانگوں کو اکڑا کر سخت کر لیتا۔ اور پھر آہستہ سے انھیں چھوڑ دیتا۔ کبھی شانوں کو زور سے سکیڑ کر سر کو پیچھے ڈال دیتا۔ کبھی پنڈلیوں کو رانوں سے ملا کر بھینچ لیتا۔ کبھی ہاتھوں کو اندر کی طرف موڑتا۔ کبھی پیروں کے پنجوں کو پھیلا کر سیدھا کرتا۔ اور ان حرکات سے جب کبھی اس کا کوئی جوڑ خود بخود چٹخ اٹھتا تو اسے بہت آرام محسوس ہوتا۔

یوں لوٹنے پوٹنے سے اس کی طبیعت اور بھی سنبھل گئی۔ اور اسے نیند آ گئی۔ مگر وہ زیادہ دیر نہیں سویا تھا کہ اپنے سرہانے کچھ شور سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اس کا ہمسایہ رلدو دن بھر تانگا چلانے کے بعد واپس آ چکا تھا۔ تانگے میں سے گھوڑے کو کھول لیا گیا تھا۔ اور زین اور ساز اتار کر صرف ایک رسی اس کے گلے میں ڈال دی گئی تھی، جسے رلدو نے پکڑ رکھا تھا۔ اور ایک ہاتھ سے کپڑے کی ایک گدی زور زور سے اس کی کمر اور پچھلی ٹانگوں پر رگڑ رہا تھا۔ معلوم ہوتا

تھا۔ اس کام میں اسے کافی زور لگ رہا ہے۔ کیونکہ ہر رگڑ کے ساتھ اس کے منہ سے بے ساختہ "ہوں" نکل جاتی تھی۔ خود رلدو کے ہاتھ میں ایک کپڑا تھا۔ جس سے وہ گھوڑے کی گردن، ٹانگوں اور پیٹ پر سے پسینہ پونچھتا جاتا تھا۔

رسی کا جو حصہ گھوڑے کے گلے میں پڑا ہوا تھا۔ اس میں پیتل کے گول گول چھوٹے چھوٹے گھنگھرو بندھے ہوئے تھے۔ گھوڑا بار بار پھنکارتا۔ اپنا سر بے چینی سے اوپر کو جھٹکتا۔ اور ہر بار گھنگھرو اندھیرے میں چاندی کی سی چمک دکھاتے ہوئے زور سے بج اٹھتے۔ گھوڑا رہ رہ کر اپنی اگلی ٹانگوں کے سم بھی زمین پر مار رہا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ بھڑک کر زور زور سے ہنہنانے اور دولتیاں بھی جھاڑنے لگتا۔ ایسے موقع پر رلدو اسے پچکارتا اور کہتا۔ "بس بس، میرے بیٹے۔ میرے لعل۔"

چیلا رام کچھ دیر تک دلچسپی سے یہ ماجرا دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے کروٹ بدل لی اور آنکھیں بند کر لیں۔

اس کی بیوی نے کوٹھڑی میں سے پکار کر کہا: "بھوجن کر لو۔"

چیلا رام نے کچھ جواب نہ دیا۔ آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی بیوی نے آ کر دروازے میں کھڑے ہو کر کہا:

"بھوجن کبھی کا تیار ہو چکا ہے۔ اب اندر آ جاؤ نا!"

چیلا رام اب بھی خاموش رہا۔

وہ کیا سوچ رہا تھا؟ کیا وہ آواگون کے مسئلے پر غور کر رہا تھا؟ کیا وہ یہ چاہ رہا تھا کہ اب کے جب وہ مر جائے تو اس کا جنم گھوڑے کی جون میں ہو......

۱۹۴۵ء

اندھیرے میں

"مجھے چھوڑ دو — مجھے چھوڑ دو...... اب میں ایک پل بھی یہاں نہیں رہوں گا۔"

بڈھے نے اپنے کمزور اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوجوان کی قمیص کا دامن اور بھی مضبوطی سے تھام لیا۔ اور بڑی لجاجت سے کہا:

"بس اب غصہ تھوک بھی ڈالو بیٹے۔ کہہ جو دیا اب کبھی نہیں پیوں گا۔ لو میں توبہ کرتا ہوں۔"

"اونہہ توبہ!" نوجوان نے تنگ کر کہا۔ "اس دن بھی تو توبہ کی تھی۔ اور پھر اس دن انہیں نہیں۔ یہ اب تم سے چھٹ نہیں سکتی۔ تم نے سوچا ہوگا۔ میرا بیٹا جلسے میں گیا ہے۔ وہ رات کو کہیں بارہ بجے آئے گا۔ بس میدان خالی دیکھا۔ اور وہی پرانی وحشت لگ گئی...... کیا تم چاہتے ہو کہ اپنی ماں کی طرح میں بھی کڑھ کڑھ کر مر جاؤں۔"

مارے رقت کے نوجوان کا گلا بھر آیا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں ایک آنسو نکل کر اس کی آنکھ سے بہہ نکلا۔ اور اس کی چھوٹی سی خوب صورت سیاہ ڈاڑھی میں الجھ کر رہ گیا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا:

"مجھے جانے دو......"

"کیسے جانے دوں بیٹے تمہارے سوا اس دنیا میں میرا —"

بڈھا کہیں تک کہنے پایا تھا کہ اسے زور کی کھانسی اٹھی۔ کھوں کھوں کھوں کھوں کھوں کھوں۔

نوجوان کی قمیص کا دامن خود بخود اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چھاتی کو پکڑ لیا۔ کھانستے کھانستے اس کی آنکھیں باہر نکل پڑیں۔ گردن کی رگیں پھول کر رسی کی طرح ہو گئیں۔ آخر دو تین منٹ کے بعد کھانسی ٹھہر گئی۔ مگر اب اس میں بات کرنے کی سکت نہ تھی۔ بے دم ہو کر چارپائی پر گر پڑا۔ نوجوان اس کی گرفت سے آزاد ہو چکا تھا۔ اور چاہتا تو کبھی کا جا سکتا تھا۔ مگر نہ تو وہ کوٹھری سے باہر نکلا اور نہ باپ کی چارپائی ہی کے پاس گیا۔

کوٹھری میں پہلے ہی شراب کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اس پر اس کھانسی نے بڈھے کے منہ سے پے در پے شراب میں بسا ہوا سانس خارج کر کے اس فضا کو اور بھی آلودہ کر دیا تھا۔ نوجوان اس کی بھبک کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں جب بڈھے کے حواس ذرا بجا ہوئے تو وہ چارپائی سے اٹھا۔ اور نوجوان کے پاس آ کر ملامت آمیز لہجے میں کہنے لگا:

"میرا...... میرا یہ حال۔ اور تم مجھے چھوڑ جانا چاہتے ہو!"

نوجوان لمحہ بھر گردن نیچی کئے خاموش کھڑا رہا۔ اور پھر بولا:

"میں تمہارے ہی بھلے کے لئے کہتا ہوں۔ شراب نے تمہارے جگر کو چھلنی کر ڈالا ہے۔ ڈاکٹر کہہ چکا ہے کہ اب اس کا ایک قطرہ بھی تمہارے لئے زہر ہے۔ مگر تم ہو کہ...... بس نہ میں یہاں رہوں گا۔ اور نہ تمہاری یہ حالت دیکھوں گا۔" جس وقت نوجوان یہ کہہ رہا تھا تو اس کے لہجے میں وہ پہلا سا جوش نہیں رہا تھا۔ بلکہ اس کی جگہ ایک تاسف نے لے لی تھی۔

باپ نے خطا کارانہ نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اور پھر نظریں جھکا لیں۔ کچھ دیر خاموش رہا۔ جیسے دل ہی دل میں کوئی اہم فیصلہ کر رہا ہے۔ پھر بولا:

"آج میں سچے دل سے وعدہ کرتا ہوں۔ کہ اسے اب کبھی منہ نہیں لگاؤں گا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اس سے اس درجہ نفرت کرنے لگو گے۔ صرف ایک موقع اور دو۔ اب کے پیوں گا تو تمہیں اختیار ہوگا جہاں جی چاہے چلے جانا۔"

دونوں چند لمحے تک خاموش رہے۔

"اچھا ایک بار اور سہی۔" بالآخر نوجوان نے سکوت کو توڑا۔ "مگر تمہیں وہ بوتل میرے حوالے کر دینی ہوگی۔ جو میرے اچانک آ جانے پر تم نے چھپا لی تھی۔"

"برخوردار۔" بڈھے نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم اسے لے کر کیا کرو گے۔"

میں کسی اپنے دوست کے ہاتھ بیچ ڈالوں گا۔ تمہاری تنخواہ میں سے آنا آنہ دو دو آنے بچا کر میں نے چار روپے جمع کیے تھے۔ جس کی یہ کمبخت بوتل خرید لی۔ میں نے اس میں سے صرف دو ایک پیگ ہی پیے ہیں۔ تین نہ سہی دو ڈھائی روپے تو کہیں نہیں گئے۔ جو اس تنگدستی میں ہمارے کام آ سکیں گے۔"

"نہیں نہیں۔" نوجوان نے جلدی سے کہا۔ "اس کا گھر میں رہنا ٹھیک نہیں۔ لاؤ مجھے دے دو۔"

اس پر بڈھے نے ایک بے تکا قہقہہ لگایا۔ بیٹے کی اس دخل اندازی سے اس کے پینے کا سارا مزا کرکرا ہو گیا تھا۔ مگر اب بیٹے کو فکرمند ہوتے دیکھ کر اس کی طبعی خوش باشی اور زندہ دلی لوٹ آئی تھی۔

"میری جان۔" اس نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں اسے منہ نہیں لگاؤں گا۔ اگر پیوں تو جو چور کی سزا سو میری سزا۔ میں صبح ہوتے ہی اسے خلیفہ کے پاس چلتا کروں گا۔ وہ دو روپے تو وہ واپس کر ہی دے گا...... میری بات مانو میں اسے بالکل منہ نہیں لگاؤں گا......"

زبان سے تو وہ یہ کہہ رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں سے ایک پیاس ایک ترساوٹ ظاہر ہو رہی تھی۔

"نہیں نہیں۔" اس کے بیٹے نے یکبارگی درشت لہجے میں کہا۔ "میں اسے گھر میں نہیں رہنے دوں گا۔ اگر تم مجھے رکھنا چاہتے ہو تو اسے میرے حوالے کر دو۔" پھر باپ کو کچھ پس و پیش کرتے دیکھ کر بولا "سنو اگر تمہیں اس کے بیچنے ہی کا خیال ہے تو یہ کام میں بھی کر سکتا ہوں۔"

اور اس نے باپ کو بتایا۔ کہ اس کے دفتر کا ایک چپراسی نوکری چھوڑ کر آج کل ایک صاحب کا بیرا بنا ہوا ہے۔ اس کی معرفت یقیناً اسے بیچا جا سکے گا۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ اسے ضائع نہیں کرے گا۔ اور اگر وہ اسے بیچ نہ سکا تو واپس لے آئے گا۔ اور پھر اس کے باپ کو اختیار ہو گا۔ کہ وہ جس کے ہاتھ چاہے اسے بیچ ڈالے۔

بیٹے کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر باپ نے زیادہ ٹال مٹول کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور بڑی حسرت کے ساتھ صندوق کے پیچھے سے بوتل نکال کر اسے دے دی۔ یہ سنگترے کا ٹھرا تھا۔ اس کا باپ اس میں سے ابھی آٹھواں حصہ بھی نہیں پینے پایا تھا۔ نوجوان نے اس کے ارغوانی رنگ پر نفرت بھری نگاہ ڈالی۔ پھر اسے ہاتھ میں تھام کمبل کی بغل میں چھپا لیا۔ اور کوٹھری سے نکل آیا۔ صحن میں سے گزر رہا تھا کہ باپ کی آواز سنائی دی:

"دیکھنا میرے بیٹے ضائع نہ کر دینا۔ تم نے وعدہ کیا ہے۔ دو تین روپوں میں آج کل سینکڑوں کام......" وہ اب اتنی دور نکل گیا تھا۔ کہ باپ کے باقی الفاظ نہ سن سکا۔

یہ جنوری کے وسط کی ایک سرد رات تھی۔ نو بج چکے تھے، بازاروں کی چہل پہل کم ہو گئی تھی۔

بہت سے دکاندار دکانیں بڑھا چکے تھے۔ نوجوان کچھ سوچے سمجھے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک راہ گیروں سے وہ بچ بچ کے گزر رہا تھا۔ اپنے موقع پر اس نے اضطراری طور پر بازوؤں کو سکیڑ کر گردن کو جھکا کر کمبل میں چھپی ہوئی بوتل کو اس طرح بچا لیا۔ جس طرح کوئی روگی اپنے جسم کے کسی پکے ہوئے پھوڑے کو ٹھیس لگنے سے بچاتا ہے۔

نوجوان اپنی دھن میں نہ معلوم جانے کن کن بازاروں اور گلی کوچوں کو طے کر چکا تھا۔ مگر ابھی تک وہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ اسے جانا کہاں ہے۔ آخر جب اس نے اپنے کو چاوڑی بازار میں پایا تو وہ ٹھٹک کر رہ گیا...... شاید اس کے دماغ کے کسی گوشے میں یہ خیال تھا کہ اگر اس جنس کے خریدار مل سکتے تو بازار حسن ہی میں مل سکتے ہیں۔ اور اس کے قدم آپ سے آپ اسے اس طرف لے آئے تھے۔ مگر کیا وہ سچ مچ اس چیز کو بیچنے کے ارادے سے نکلا تھا؟

اس خطرناک چیز کا جو شاید اس کے باپ کا آخری جام ثابت ہوتی۔ گھر میں رہنا اسے کسی صورت منظور نہ تھا۔ اور وہ جوش میں بھرا ہوا، کچھ سوچے سمجھے بغیر باپ کی ہر بات ماننے کو تیار تھا۔ بشرطیکہ وہ بوتل اس کے حوالے کر دے۔ سودا کرنا تو ایک طرف۔ اگر کوئی اس سے یہ کہتا: "میاں صاحبزادے میں جانتا ہوں کہ تم بہت متقی و پرہیزگار ہو۔ اور یہ جو نیک کام تم نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ اس کا تمہیں قربانی اور شہادت کا سارا اجر ملے گا...... تم نے اپنے کمبل میں جو شراب کی بوتل چھپا رکھی ہے۔ اور جس میں سے تھوڑی سی خرچ بھی ہو چکی ہے۔ لاؤ پورے دام میں میرے ہاتھ بیچ ڈالو۔ کیونکہ ٹھیکہ بند ہو چکا ہے۔" پھر بھی شاید وہ راضی نہ ہوتا۔

وہ تیزی سے اس بازار سے گزر گیا۔ اور چوک میں پہنچا۔ جہاں سے نئی دلی کو راستہ جاتا تھا۔ چوک میں پل بھر کے لئے رک کر سوچنے لگا۔ اب کدھر جاؤں کہ یکایک ایک آواز نے اسے چونکا دیا

"آداب عرض مولانا۔ کہو بھئی یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ منا گھر سے نہیں گئے؟"

نوجوان کا دل یکلخت زور سے دھڑک اٹھا۔ اور وہ لڑکھڑائی ہوئی آواز میں بولا

"والد صاحب...... وہ یکبارگی علیل ہو گئے۔ اچھا ابھی کل دفتر میں ملیں گے۔ مجھے ایک ضروری کام سے نئی دلی جانا ہے۔"

یہ کہتے ہی اس کے قدم نئی دلی کی طرف اٹھ گئے۔ اگر اس کے دفتر کے اس ساتھی کو شک بھی پڑ جاتا کہ جس کو اس نے "مولانا" کہہ کر خطاب کیا۔ وہ اس وقت اپنے کمبل کے نیچے کیا چھپائے لئے جا رہا ہے تو...... اس ملاقات سے اسے صورت حال کی نزاکت کا اچانک احساس ہو گیا۔ نئی دلی کا نام محض

دوست کو ٹالنے کے لئے اس کی زبان سے نکل گیا تھا۔ مگر اب وہ سچ مچ وہیں جا رہا تھا۔ اور ٹھیک بھی۔ وہاں ایسی اچانک ملاقاتوں کا امکان تو کم ہوگا۔ اور پھر وہاں وہ کناٹ پلیس کے کسی ایک الگ تھلگ گوشے میں بیٹھ کر اپنی حالت پر غور کر سکے گا۔

کوئی گیارہ کا عمل ہوگا۔ کہ وہ کناٹ پلیس کے پارک میں پہنچا۔ مسلسل دو گھنٹے چلتے رہنے سے تھک گیا تھا۔ ہاتھ دکھنے لگے تھے۔ جن میں وہ بھاری بھاری بوتل کو اٹھاتا لایا تھا۔ ایک درخت کی نیم تاریکی میں ایک خالی بنچ دیکھ کر اس پر بیٹھ گیا۔ بوتل بنچ پر رکھ دی اور ہاتھوں کی انگلیاں چٹخانے لگا۔

اس وقت شدت کا جاڑا پڑنے لگا تھا۔ جس میں باغ کی سیل نے اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اس نے اپنے جسم کو اچھی طرح کمبل میں لپیٹ لیا۔ دل میں اب پہلا سا جوش اور قصہ نہیں رہا تھا۔ بلکہ اپنی اس مہم پر رہ رہ کے ہنسی آ رہی تھی۔ بھلا وہ اور شراب کا سودا! یہ خیال ہی مضحکہ انگیز تھا۔ یہ سچ تھا کہ اس کے دفتر کے ایک چپراسی نے کسی صاحب کی نوکری کر لی تھی مگر اسے بچا ایک طرف۔ وہ تو اس کے مالک کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ اور پھر اگر کسی لطیفۂ غیبی سے وہ بیرا مل بھی جاتا تو کیا اس کے سامنے اس چیز کا نام لینے کی بھی اسے جرأت ہوتی......

اسے بنچ پر بیٹھے آدھ گھنٹے سے زیادہ ہو گیا۔ مگر بوتل کو ٹھکانے لگانے کی کوئی ترکیب اس کے ذہن میں نہ آئی۔ اس وقت کناٹ پلیس خاصا اجاڑ معلوم ہوتا تھا۔ البتہ بعض سینما گھروں اور بڑے بڑے انگریزی ہوٹلوں کی روشنیاں دور سے جگمگاتی ہوئی ابھی تک نظر آ رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ روشنیاں بھی گل ہونے لگیں۔ ساتھ ہی ٹاؤن ہال کے گھنٹے نے بارہ بجانے شروع کئے۔

اس نے سوچا۔ اس بوتل کو گھر لے چلوں۔ اور چپکے سے اپنے صندوق میں بند کر دوں۔ دو چار دن میں جب والد کے دماغ سے اس کا خیال نکل جائے گا تو اسے ضائع کر دوں گا۔ دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر کے وہ اٹھنے ہی کو تھا کہ اتنے میں اسے کچھ فاصلے پر دو سائے سے دکھائی دیئے جو لان میں سے گذرتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔ نوجوان نہ جانے کس جذبے کے ماتحت وہیں بیٹھا رہا۔ جب وہ قریب آئے تو اس نے دیکھا کہ ان میں ایک مرد ہے اور ایک عورت۔ دونوں نے اوور کوٹ پہن رکھے تھے۔ مرد سر سے ننگا تھا اور عورت نے سر پر رومال باندھ رکھا تھا۔ چاندنی میں عورت کا چہرہ موتی کی طرح دمک رہا تھا۔ دونوں کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور مرد نے عورت کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے جسم سے بھینچ رکھا تھا۔ وہ آ کر دوسری بنچ پر بیٹھ گئے۔ جو درخت کے تنے کے اس طرف تھی۔ مرد بار بار عورت کے رخسار و پیشانی پر بوسے دیئے جا رہا تھا۔ نوجوان کچھ گھبرا سا گیا۔ مگر وہ لوگ اپنی دھن

میں ایسے مست تھے کہ نہ تو انہوں نے نوجوان کو دیکھا۔ اور نہ یہ معلوم ہی ہونے پایا کہ بنچ کے دوسری طرف کوئی اور بھی بیٹھا ہے۔

نوجوان ان کی باتیں بخوبی سن سکتا تھا۔

"میری جان" مرد کہہ رہا تھا۔ "تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ آج کی رات میری زندگی میں کس درجہ مسرت کی رات ہے۔"

"کیسی عجیب بات!" عورت کے لہجے میں تعجب اور تاسف ملا جلا تھا۔ "اب سے چار گھنٹے پہلے ہم ایک دوسرے کو جانتے بھی نہ تھے۔ اور اب......"

"آہ! یہ نہ کہو۔ یہ نہ کہو۔" مرد کراہا۔ "جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے—میں ہمیشہ تخیل کے جھلملاتے افق پر تمہیں دیکھا کرتا تھا۔ تم اپنے درخشاں چہرے کے ساتھ ایک چاند کی طرح ابھرتیں اور میری تیرہ و تار زندگی جگمگا اٹھتی۔ تم میرے لئے کبھی اجنبی نہ تھیں۔ میں روز و شب تمہاری تمنا کرتا تھا۔ مجھے کامل یقین تھا۔ کہ ایک نہ ایک دن تمہیں پالوں گا۔ اور میرا جذبہ اس قدر شدید ہوگا کہ تم اسے رد نہ کر سکو گی۔

آج جب میں نے تمہیں کافی ہاؤس کے ایک الگ تھلگ گوشے میں کافی پیتے دیکھا تو فوراً پہچان لیا۔ میں نے دل میں کہا۔ بے شک یہی ہے میری روح۔ جس کے لئے میرا جسم اتنے عرصے سے بھٹکتا پھرتا تھا۔ اور میں بے جھجک تمہارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ تم حیرانی سے میرا منہ تکنے لگیں۔ میں نے تم سے اجازت بھی طلب نہ کی۔ اور تمہارے پاس بیٹھ گیا۔ بڑی دیر تک ہم مبہوت ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے۔ پھر میں نے آہستہ سے تمہاری کلائی تھام لی۔ اور تم میرے ساتھ کافی ہاؤس سے اٹھ آئیں......... ارے تم رو رہی ہو!" اور یہ کہتے کہتے مرد نے عورت کی گردن پر بوسوں کی بوچھار کر دی۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ جس کے دوران میں عورت کی سسکیاں سنائی دیتی رہیں۔

"میں نہیں کہہ سکتی۔" آخر عورت نے سسکیوں پر قابو پا کر کہنا شروع کیا۔ "میں کیوں تمہارے ساتھ اٹھ کر چلی آئی۔ مجھ پر کچھ سحر سا طاری ہو گیا تھا۔ میں ہوش کھو بیٹھی تھی۔ میں خود بھی نہیں جانتی کہ کیا کر رہی ہوں۔ میں نے یہ بھی تو نہ سوچا کہ تم میرے متعلق کیا خیال کرو گے۔ شاید تم مجھے بھی ان آوارہ عورتوں میں سے سمجھتے ہو گے جو شکار کرنے نکلتی ہیں۔ لیکن مجھے پروا نہیں۔ تم جو چاہو مجھے سمجھو۔ یقینی امر ہے کہ ہم پھر کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ میں اس اجنبی شہر میں آج ہی آئی ہوں

اور شاید کل ہی چلی جاؤں۔"

جس وقت عورت یہ کہہ رہی تھی تو نوجوان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی نغمہ اور [illegible] سن رہا ہے۔ جب وہ خاموش ہوئی تو نوجوان چونک سا اٹھا۔ عورت کی سریلی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"آہ! ایسے نہ کہو۔ یہ نہ کہو۔" ادھر مرد کہتا جاتا تھا اور ساتھ ساتھ عورت کی ایک ایک انگلی کو پوروں کو ناخنوں کو بھی چومتا جاتا تھا۔ "آؤ ہم اپنے تئیں بھول جائیں۔ میری زندگی خوابیدہ تھی۔ تم ایک سہانے خواب کی طرح آ گئیں اور وہ خواب حقیقت بن گیا......ایں تم کانپ رہی ہو؟ سردی لگ رہی ہے......؟ اے کاش کہیں سے ادھر وہسکی مل سکتی۔ صرف چند گھونٹ تمہیں گرما دیتے......"

وہسکی کا نام سن کر نوجوان اچھل پڑا۔ ان کی باتوں نے اس پر ایک نشہ سا طاری کر دیا تھا۔ وہ اپنی پریشانیوں کو بھول گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے محبت کے الفاظ کو لغت کے باہر دیکھا۔ اور اس کے معنی فوراً اس کی سمجھ میں آ گئے۔ وہ اب تک ان باتوں سے بے خبر تھا۔ ایک قیدی کی سی زندگی گذار رہا تھا۔ جس میں کسی قسم کی رنگینی یا مسرت کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کی اس راز و نیاز کی باتوں نے اسے ایسا لبھا لیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔ اور سانس تیز تیز چلنے لگا تھا۔ آج پہلی مرتبہ اسے یہ احساس ہوا کہ دفتر میں صبح سے شام تک لہو پانی ایک کرنے اور گھر میں باپ سے لڑنے جھگڑنے کے علاوہ بھی زندگی کے کچھ مقصد ہیں۔ اور اس کے دل میں یکبارگی عجیب عجیب ولولوں نے جنہیں وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ کیا ہیں، ایک ہیجان برپا کر دیا۔

"میری روح۔ میری راحت۔" مرد کہے جا رہا تھا۔ "تمہارے دانت بج رہے ہیں۔ افسوس سب ہوٹل بند ہو چکے ہیں......"

نوجوان نے دل میں کہا۔ اگر میں ان لوگوں کے پاس جاؤں۔ اور بغیر ایک لفظ کہے۔ بوتل ان کے حوالے کر کے چلا آؤں تو کیسا رہے۔ وہسکی نہ سہی شراب تو ہے۔ اور وہ لوگ کس قدر تامل کے بعد ضرور اسے قبول کر لیں گے......مگر اسے جرأت نہ ہوئی۔

"میری جان مجھ سے چمٹ جاؤ۔ یوں سردی نہیں لگے گی۔" اور مرد نے عورت کو خود سے چمٹا لیا۔

"بس اب مجھے جانا چاہئے۔ میری دوست جس کے ہاں میں ٹھہری ہوں پریشان ہو گی۔ میں صرف آدھ گھنٹے کے لئے گھر سے نکلی تھی۔ مگر اب پانچ گھنٹے ہو گئے ہیں۔ اف سردی واقعی بہت

بڑھ گئی ہے......"

اس عورت کی آواز کی نغمگی نے نوجوان کو بہت رلایا۔ اور وہ ان لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے جھوٹ موٹ کھانسا۔ مگر وہ لوگ اپنی اپنی دھن میں کچھ ایسے کھوئے ہوئے تھے کہ انہوں نے سنا تک نہیں۔ نوجوان نے دل کو مضبوط کیا اور ارادہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو بوتل ان کے پاس لے جایا جائے۔ اور اس مسرت کی قیمت کے طور پر جو اسے ان کی باتیں سن سن کر حاصل ہوئی تھی۔ یہ بوتل ان کی نذر کر دے۔ اس نے بوتل سنبھالی ہی تھی کہ عین اسی وقت وہ دونوں بنچ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کی طرف دیکھے بغیر جس طرف سے آئے تھے جھومتے جھامتے پھر اسی سمت چل دیئے۔

نوجوان ان کے جانے کے بعد دس منٹ تک بالکل گم سم بیٹھا رہا۔ اس موقع کے ہاتھ سے نکل جانے کا اسے زیادہ افسوس نہ ہوا کیونکہ اب ایک اس سے بھی زیادہ اہم معاملہ اس کے درپیش تھا۔ اس تھوڑے سے وقت میں اس نے اپنی روح کو اس کے اصلی روپ میں دیکھ لیا تھا۔ اس روح کو جسے مذہبی، اخلاقی اور سماجی فرائض کی طنابوں نے کس رکھا تھا۔ یہ طنابیں تھوڑی دیر کے لئے ڈھیلی ہوئی تھیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی گھٹی ہوئی نڈھال روح سسکتی ہوئی زمین پر آ رہی تھی......

اس نے اپنے ماضی پر غور کرنا شروع کیا۔ اسے اب سے پانچ برس پہلے کا زمانہ یاد آیا۔ جب وہ اسکول میں پڑھا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ کتنا خوش تھا۔ علم کو ایک انمول نعمت سمجھ کر اس طرح جذب کر رہا تھا۔ جس طرح ریت پانی کو جذب کر لیتی ہے۔ سب استاد اس کے علمی شوق اور اس کی غور و فکر کی عادت کے معترف تھے۔ اور کہا کرتے اگر مطالعہ جاری رکھا تو ایک دن بڑا مفکر بن جائے گا۔ مگر اس کے انٹرنس پاس کرنے کی دیر تھی کہ وہ آزادی وہ علمی ولولے خواب و خیال ہو گئے۔ اس کے باپ کو عیاشیوں اور بے اعتدالیوں نے قبل از وقت ضعیف کر دیا تھا۔ اور وہ وقت آ پہنچا تھا کہ اسے روزی کمانے کے لئے باپ کی جگہ لینی پڑی۔

تلاش معاش کی تگ و دو میں اسے کیسے کیسے سنگ دل انسانوں سے دو چار ہونا پڑا تھا۔ کئی کئی دفتروں سے ناکام اور بے عزت ہو کر نکلنا پڑا تھا۔ ذلت کے بے شمار دن۔ فکر اور پریشانی کی بے شمار راتیں گذارنے کے بعد آخر ایک نیم سرکاری دفتر میں اسے سر چھپانے کو جگہ مل گئی تھی۔ جہاں وہ صبح سے شام تک گدھے کی طرح کام کرتا تھا۔ مگر جیسا اسے گدھے سے آدھی اجرت بھی نہیں ملتی تھی۔ اور پھر یہ اس کا زہد ہی تھا جس نے اس کی زندگی کو اور بھی خشک اور بے رنگ بنا دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس نے یہ پارسائی کی زندگی کیوں اختیار کی۔ اس کے باپ دادا میں کوئی شخص متقی و پرہیزگار نہیں

ہوا تھا۔ اسے اپنی زندگی میں کوئی ایسا نیک سیرت رفیق یا رہنما بھی نہ ملا تھا۔ جس کی پاک زندگی اس پر اپنا پرتو ڈالتی۔ اس نے کچھ ایسی دینی کتابیں بھی نہ پڑھی تھیں۔ جس کی پاک زندگی اس پر اپنا پرتو ڈالتی۔ اس نے کچھ ایسی دینی کتابیں بھی نہ پڑھی تھیں۔ جو اس کے خیالات کو مذہبی رنگ میں رنگ دیتیں۔ اس کے باوجود وہ پاکباز تھا اور حتی المقدور دینی فرائض ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرتا تھا۔ آخر پھر وہ ایسا کیوں تھا؟ اس کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ اس نے بچپن میں اپنے باپ کے شغل لہو و لعب، بے خواری و سیہ کاری کے ایسے گھناؤنے منظر دیکھے تھے کہ اس کے ننھے سے معصوم دل میں ہمیشہ کے لئے ان چیزوں کی دہشت بیٹھ گئی تھی۔ اور اسے اپنے بچاؤ کی صرف ایک ہی صورت نظر آتی تھی — مذہب:

نوجوان نے سوچنا شروع کیا۔ "اگر شراب کی یہ بوتل ان لوگوں کو مل جاتی۔ تو وہ کس قدر خوش ہو جاتے۔ اور زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے پاس رہ سکتے۔ عورت کی آواز میں کتنا سوز تھا۔ اسے واقعی سردی لگ رہی تھی۔ مرد نے کہا تھا کہ صرف چند گھونٹ اسے گرما سکتے ہیں......کیا شراب سے سردی دور ہو جاتی ہے۔" کمبل سرک گیا تھا۔ اس نے بگل مار کر اپنے جسم کو پھر کمبل میں اچھی طرح لپیٹ لیا۔

اچانک نوجوان کے ذہن میں ایک پرانا سوال تازہ ہو گیا۔ جو اسے کئی بار پریشان کر چکا تھا۔ وہ یہ کہ آخر اس شراب میں کیا جادو ہے۔ کہ جو ایک بار اس کو منہ لگا لیتا ہے۔ اسی کا غلام بن جاتا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب اسے برا کہتے ہیں۔ بڑے بڑے حکما اور دانا اس کی مضرتوں پر ضخیم کتابیں لکھ چکے ہیں۔ مگر اس کے باوجود کروڑوں انسان ہر روز اسے پیتے ہیں شاہ و گدا، بوڑھے اور جوان، عورت اور مرد۔

مزدور دن بھر کڑی محنت جھیلتا ہے۔ اور شام کو مزدوری کے چھ آنے میں سے چار آنے اس کی نذر کر دیتا ہے۔ بعض فقیروں کو دیکھا کہ دن بھر ہزاروں صلواتیں اور جھڑکیاں سن کر انہوں نے تھوڑے سے پیسے جمع کئے اور رات کو بھوکے رہ کر سب کے سب شراب میں اڑا دیئے۔

آخر یہ کیا چیز ہے۔ جس کو دنیا برا جانتی ہے۔ مگر چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ آرٹ، ادب اور فنون لطیفہ کوئی بھی اس کے اثر سے خالی نہیں۔ ہر ملک اور ہر زمانے کے شعرا کے دواوین اس کی مدح سرائیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ گو ان کی زبانیں مختلف ہیں مگر ان سب کی روح میں اسی کی گونج ہے۔ اگر ان کے کلام میں سے شراب و ساقی، ساغر و مینا کا ذکر نکال دیا جائے تو ساری دنیا کی شاعری کا خاتمہ

ہو جائے۔ اس کی تعریف میں بھی لطف ہے اور مذمت میں بھی۔ اور تو اور دینی کتابوں تک میں اس کا جا بجا ذکر موجود ہے۔

اور — اور پھر یہ خود فطرت ہر آن اس کے پینے کی ترغیب نہیں دیتی؟ آخر نہیں تو لالہ کے پھول اس وضع کے کیوں بنائے کہ وہ مے کی گلابیاں معلوم ہوں؟ پھلوں میں رس کیوں پیدا کیا؟ نرگس میں کیف آور نکہت کیوں بھر دی؟ بلبل کا نغمہ مستی بھرا کیوں ہے؟

یہ پہاڑوں کی برفیلی چوٹیاں۔ یہ نیلی نیلی سی چھٹکی چاندنی۔ یہ طلوع و غروب آفتاب کے نظارے آخر یہ سب چیزیں کیوں پیدا کی گئیں۔ جنہیں دیکھ کر اسی قسم کا سرور حاصل ہوتا ہے جیسا نشہ پی کر؟

......اور پھر اس کے باپ کو دیکھو۔ دنیا میں سب سے زیادہ جس چیز سے اسے الفت ہے۔ وہ یہی اس کا بیٹا ہے۔ مگر یہ شراب اسے اس سے بھی برگشتہ کئے دیتی ہے۔ ہر چند اس کا جگر خراب ہو چکا ہے۔ اور اس کا ایک ایک قطرہ اس کے لئے سم قاتل ہے۔ پھر بھی وہ اس کے لئے مضطرب ہے۔ گویا اس کے مقابلے میں جان کی کچھ اصل حقیقت نہیں۔ کیا واقعی اس میں کوئی ایسی لذت یا کیف ہوتی ہے۔ جس کا حصول انسان کی زندگی بھی نہیں دے سکتی......

یکا یک ہوا کا ایک تند و تیز جھونکا آیا۔ اور نوجوان کا جسم کپکپا اٹھا۔ اس وقت آس پاس کوئی شخص نظر نہ آتا تھا۔ بس وہ تھا اور ایک نکھرا ہوا چاند جو کنٹ کی رفیع الشان عمارتوں پر خنک چاندنی ڈال رہا تھا۔ ہوا جسم کے ننگے حصوں پر تند چھریوں کی طرح پڑ رہی تھی۔ درختوں کے پتے آپس میں اس طرح بج رہے تھے۔ جیسے کسی سردی سے کانپتے ہوئے آدمی کے دانت۔ پل بھر کے لئے دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کے ساتھ کسی تانگے والے کے گانے کی آواز آئی۔ اور پھر رفتہ رفتہ تحلیل ہو گئی۔

چاند کی کچھ کرنیں درخت کی ٹہنیوں میں سے چھن چھن کر بنچ پر پڑ رہی تھیں۔ ان کی روشنی میں نوجوان نے بوتل کی طرف دیکھا تو اسے اس سرخ سرخ شے میں سے ایک لپٹ سی اٹھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ جس طرح انگیٹھی کے دہکتے ہوئے کوئلوں سے نکلتی ہے۔

کیا اس خطرناک چیز کو جوں کا توں گھر لے جانا ہوگا؟ کیا اسے ٹھکانے لگانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے؟

رات کے کوئی ڈھائی بجے ہوں گے۔ کہ نوجوان لڑکھڑاتا ہوا اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا۔

اور بے تحاشا کواڑ کھٹکھٹانے لگا۔ باپ انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ آواز سنتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''کون؟''

''میں ـــ'' ایک بھدی سی آواز میں جو انسان سے زیادہ حیوان کی آواز سے ملتی جلتی تھی۔ نوجوان نے جواب دیا۔

دروازہ کھلا تو باپ کی نظر بیٹے کے خالی ہاتھوں پر پڑی۔

''بیچ آئے؟''

''اونہہ۔'' اور نوجوان نے ایک بے تکا قہقہہ لگایا۔

''کیا ہوئی پھر؟''

''بیدی...........بے...........بے...........بے''

بڈھے کا منہ کھلے کا کھلا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

۱۹۳۹ء

سمجھوتہ

پہلے پہل جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی بھاگ گئی تو وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ شادی کا پہلا ہی سال اور اتنی ان ہونی سی بات! کسی طرح یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مگر جب بار بار اس کے کمرے میں جا کر اس کی چیزوں کو گم پایا۔ یہاں تک کہ اس کا بچپن کا فوٹو جس میں وہ ایک کبوتر کو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں تھامے مسکرا رہی تھی۔ اس کی سنگھار میز پر سے غائب تھا۔ تو شک کی کوئی وجہ باقی نہ رہی۔

کئی دن تک وہ گم سم رہا۔ نہ کہیں گیا۔ نہ نوکروں پر یہ بات ظاہر ہونے دی۔ نہ کسی رشتہ دار یا دوست سے اس کا ذکر کیا۔ مگر رفتہ رفتہ جب بدنامی کا خوف دل سے نکل گیا۔ اور ادھر اس کے لوٹ آنے کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔ تو اس نے ٹھنڈے دل سے اس واقعہ پر غور کرنا شروع کیا۔ ایک خیال بار بار اسے کچوکے دینے لگا:

''میں نے اس عورت کو سچے دل سے چاہا۔ ہر طرح اس کے ناز اٹھائے۔ اس کی وہ کون سی خواہش تھی جسے میں نے پورا نہ کیا۔ اور اس کا اس نے یہ صلہ دیا کہ ایک دن چپکے سے، بغیر کوئی وجہ بتائے، بغیر ایک پیغام تک چھوڑے بھاگ گئی۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے آنے والے برسوں کی تنہائیوں کا تصور کیا۔ اور اس کی روح کپکپا کر

رہ گئی۔

وہ نو عمری ہی سے ان تنہائیوں سے واقف ہو چکا تھا۔ غریب ماں باپ کا بیٹا تھا۔ جو اپنی حیثیت کے مطابق معمولی سا لکھا پڑھا کر سدھار گئے تھے۔ غربت اور بے کسی کے زمانے میں اسے کسی سے ملنے جلنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور اس نے تنہائی ہی میں امان لی۔ شباب کا بیشتر زمانہ فکر معاش کی جدوجہد کی نذر ہو گیا۔ آخر جب اس کے دن پھرے۔ اور وہ بھی کوئی چیز سمجھا جانے لگا۔ تو وہ اپنی گوشہ نشینی کی زندگی کا اس قدر عادی ہو چکا تھا۔ کہ کسی قیمت اسے چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے رشتہ دار جو اس کی حالت کے سدھرتے ہی آپ سے آپ پیدا ہو گئے تھے۔ اس کی تنہائی میں مزاحم ہونے شروع ہوئے۔

"بھئی تو کیا عمر بھر کنوارے ہی رہو گے۔" وہ آئے دن آ کر اس سے کہا کرتے: "تم مانو چاہے نہ مانو۔ ہم تو چاند سی دلہن لا کے ہی رہیں گے۔"

ایک بزرگ جو رشتہ میں دور کے ماموں ہوتے تھے، کہتے:

"میاں دور کیوں جاؤ۔ اپنے خاندان ہی میں جو ماشاء اللہ ایک سے ایک حسین و جمیل لڑکی موجود ہے۔"

ہر بار اس کا انکار پہلے سے کمزور ہوتا گیا۔ اور آخر ایک دن برادری ہی کی ایک قبول صورت تعلیم یافتہ لڑکی کے ساتھ اس کی شادی کر دی گئی۔

طالب علمی کے زمانے میں اس کے ساتھی اکثر تعطیلات میں تین تین چار چار کی ٹولیاں بنا کر "تفریح" کی تلاش میں آس پاس کے قصبوں اور گاؤں میں نکل جایا کرتے۔ وہ ان سے دور ہی دور رہتا اور دل ہی دل میں ان سے نفرت کیا کرتا۔ مگر اب عورت اور اس کی ہم جلیسی کی لذتوں سے واقف ہو کر اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا۔ کہ وہ اب تک کیسی رائگاں اور بے معنی زندگی گزارتا رہا تھا۔

شادی کے بعد اس کی شوہرانہ فرض شناسی ضرب المثل بن گئی تھی۔ بیوی کی محبت نے اس پر ایسا قابو پا لیا کہ وہ باقی ہر چیز سے بے نیاز ہو گیا۔ وہ بیوی سے الگ کسی پارٹی یا دعوت میں شریک نہ ہوتا۔ نہ تنہا کسی سے ملتا جلتا۔ بیوی سے جدا رہنا اس پر ایسا شاق گزرتا کہ دفتر میں وقت کاٹنا دوبھر ہو جاتا۔ بار بار گھڑی پر نظر پڑتی۔ کہ کب وقت پورا ہو تو گھر کی راہ لے۔

دفتر سے آتے وقت کبھی راستے میں بچپن کا کوئی بے تکلف رنگین مزاج دوست مل جاتا۔ اور اسے اپنے ساتھ کسی محفل نشاط میں لے جانا چاہتا۔ تو بڑی سرد مہری سے جواب دیتا:

"نا صاحب۔ مجھے تو معاف ہی رکھئے۔ میرا یہ وقت میری بیوی کا ہے۔ جو دن بھر میری آس لگائے گھر میں تنہا بیٹھی رہی ہے۔" کبھی کہتا: "میں کسی ایسی محفل میں شامل نہیں ہو سکتا۔ جس میں میری بیوی نہ جا سکتی ہو۔"

"اور یہ سب اس بے وفا عورت کے لئے۔" اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنے سر کو تھامتے ہوئے کہا۔ "جس کی محبت محض ایک فریب تھی۔"

یکلخت اس کے دل میں اپنی بیوی کے خلاف اس قدر نفرت اور غصہ بھر گیا۔ کہ اس کا سانس تیزی سے چلنے لگا۔ خیال ہی خیال میں اس نے دیکھا۔ کہ اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں میں اپنی بیوی کا گلا دبا رکھا ہے۔ اس کی دہشت زدہ آنکھیں رحم اور خلوص کی ملتجی ہیں۔ مگر اس بے وفا عورت کے لئے اس کے دل میں کوئی رحم نہیں۔ وہ اس کا گلا دبا رہا ہے۔ زور سے اور زور سے یہاں تک کہ اس کا سرخ و سفید کتابی چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اور اس کی بڑی بڑی حسین آنکھیں خون کے دو گھناؤنے لوتھڑے بن کر باہر نکل آئیں...... اور اس نے اس کے بے جان جسم کو زمین پر پٹخ دیا۔

لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے۔ انتقام کا یہ تند و تیز جذبہ یہ جنونی خروش دھیما پڑتا اور ایک استہزا کی شکل اختیار کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اسے اپنا عشق، ایثار، خلوص، بیوی کی بے وفائی اور اس پر اپنا غیظ و غضب یہ سب باتیں مضحکہ خیز معلوم ہونے لگیں۔ اور ایک دن اسے اپنی حالت پر خود ہی ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا:

"میں بھی کیسا بے وقوف ہوں۔ کہ ایک عورت کو اس قدر اہمیت دیتا رہا۔ عورت کے معاملے پر سنجیدگی سے غور کرنا ہی حماقت ہے۔ اس کی مثال بالکل بچے کی سی ہے۔ جب تک اسے کھلونوں سے بہلایا جا سکتا ہے۔ بہلانا چاہئے۔ مگر جب وہ ستانے اور رونا اور مچلنا شروع کر دے۔ تو بہتر یہی ہے کہ اسے کسی دوسرے کے سپرد کر دیا جائے۔ رہا عشق اور وفا کا معاملہ تو یہ سراسر ڈھکوسلا ہے۔"

ایک دن وہ دفتر سے واپس آ رہا تھا تو بچپن کا وہی رنگین مزاج دوست جو اسے عیش و نشاط کی ترغیبیں دیا کرتا تھا۔ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ قصد کیا کہ کترا کے نکل جائے۔ مگر دوست کی نظر پڑ چکی تھی۔ ناچار رکنا پڑا۔ دوست کو اس کی بیوی کے بھاگ جانے کا علم نہ تھا۔ حسب عادت مسکرا کر کہنے لگا۔

"آج تو بھائی جان چاہے جو کہیں میں تمہیں ساتھ لئے بغیر نہ چھوڑوں گا۔"

وہ خاصی دیر تک خاموش کھڑا اس کا منہ تکتا رہا۔ پھر ایک لطیف سی مسکراہٹ نے اس کی سنجیدگی

کو توڑ دیا اور وہ کہہ اٹھا:

"اچھا چلو۔ کہاں چلنا ہے؟"

دوست چونک کر رہ گیا۔

جب تک رات کا اندھیرا اچھی طرح نہ پھیل گیا، دونوں وقت گذارنے کے لئے ادھر ادھر گھومتے رہے۔ اس کے بعد دوست اسے لے کر ایک حسن فروش کے کوٹھے پر پہنچا۔ زندگی میں اس قسم کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ کچھ خوف، کچھ جھجک، کچھ ندامت، کچھ یہ خلش دل میں تھی۔ کہ جو زندگی ابھی تک اس قسم کی آلودگیوں سے پاک وصاف تھی۔ اب اس پر سیاہ کاری کے داغ دھبے پڑ جائیں گے۔ اور یہ محض اس بے وفا عورت کی بدولت —— مگر یہ جی کی الجھن زیادہ دیر نہ رہی۔ شراب کا دور چلتا تھا۔ کہ یکلخت سارے حجاب جیسے اٹھ سے گئے۔ ہنس ہنس کر گانے والی کو داد دیتے اور فقرے کسنے لگا۔ اور گھنٹے ہی بھر میں پورا تماش بین بن گیا۔

اس کے بعد اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ پہلے پہل اسے اس کوچے میں جانے کے لئے دوستوں کی رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ مگر چند ہی روز بعد دوست اسے اپنی راہ میں حائل ہوتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ چنانچہ وہ اکیلا ہی شب گردی کے لئے نکلنے لگا۔ پہلے گھوم پھر کر ساری منڈی کا جائزہ لیتا، مال کو پرکھتا اور پھر اپنا پسند کیا ہوا مال ایک شوقین مزاج رئیس زادے کی طرح منہ مانگی قیمت پر خرید لیتا۔ رفتہ رفتہ اسے عیش پرستی کا ایسا چسکا پڑ گیا۔ کہ دفتر سے اٹھ کر شاذ ہی کبھی گھر پہنچتا۔ آج اس کوٹھے پر ہے تو کل اس بالاخانے پر۔ جھوٹی محبتیں جتاتا اور خود بھی جھوٹی محبتوں سے لطف اٹھاتا۔ اگلے روز یہ باتیں خواب کی طرح معلوم ہوتیں۔ نئی رات آتی۔ تو نئے سرے سے حسن و عشق کی دنیا بسانے کی دھن پھر سوار ہو جاتی۔ اس نے اپنا یہ اصول بنا لیا تھا۔ کہ عورت سے تعلق محض وقتی اور کاروباری ہونا چاہئے۔ اور دوسرے سودوں کی طرح اس میں بھی ہر طرح کا دروغ جائز ہے۔

اسے دفتر سے جو مشاہرہ ملتا تھا۔ وہ اتنا تھا۔ کہ اس میں ایک کنبہ دار شخص آسودگی اور عزت کے ساتھ بسر کر سکے۔ مگر نہ اتنا کہ اس میں کسی مستقل اندھا دھند فضول خرچی کی گنجائش ہو۔ شادی سے پہلے جب اس کے اخراجات برائے نام تھے۔ اس نے اچھی خاصی پونجی جمع کر لی تھی۔ شادی کے بعد بیوی کے لئے گراں قدر تحائف خریدنے پر بھی اس رقم میں کچھ زیادہ کمی نہ ہوئی تھی۔ مگر اب جبکہ روز روز بڑی بڑی رقموں کے چیک کاٹے جانے لگے۔ تو چند ہی ہفتوں میں دیوالہ نکلتا ہوا نظر آنے لگا۔ کچھ تو اس ڈر سے کہ کہیں بالکل ہی مفلس نہ ہو جائے اور پھر اس کوچے میں جانے کے لئے ترسے۔ اور کچھ مسلسل

راتوں کے جاگنے سے صحت کے گر جانے کے باعث اس کی اوباشیوں میں جلد ہی کمی ہو گئی۔ یعنی جہاں پہلے مہینے میں مشکل سے دو چار ناغے ہوتے تھے۔ وہاں اب ہفتے میں تین تین چار چار ناغے ہونے لگے۔

ایک دن صبح کو جب وہ دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ تو کسی نے آہستہ سے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

"کون؟"

کوئی جواب نہ پا کر اٹھا۔ دروازہ کھولا اور ٹھٹک کر رہ گیا —— اس کی مفرور بیوی سوالیوں کا سا حال بنائے سر جھکائے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے کپڑے میلے چکٹ ہو رہے تھے۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ چہرہ زرد اور آنکھوں میں گڑھے پڑے۔ اسے اس حال میں دیکھ کر معاً اسے ایسا گمان ہوا۔ جیسے کوئی کتیا کیچڑ میں دوسرے کتوں کے ساتھ لوٹ لگا کے آئی ہو۔

وہ کچھ دیر تو خاموش کھڑی رہی۔ پھر اچانک اس کے قدموں میں گر پڑی۔ اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس نے اپنی ٹانگوں کو چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ چپ چاپ کھڑا رہا۔

"مجھے بخش دو۔ مجھے بخش دو۔" اس کی بیوی نے سسکیاں لے لے کے کہنا شروع کیا۔ "میں جانتی ہوں اب تم مجھ سے سخت نفرت کرتے ہو گے۔ میری صورت دیکھنے کے بھی روادار نہ ہو گے۔ مگر میں تم سے محبت نہیں، بخشش۔ نہ اس کی توقع کر سکتی ہوں۔ آہ! میں اس لائق ہی نہیں ہوں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ مجھ پر رحم کرو۔ مجھے صرف اپنے گھر میں پناہ دو۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی۔ آہ! میں اندھی ہو گئی تھی۔ مجھے بخش دو۔ مجھے بخش دو۔ مجھ سے سخت فریب کیا گیا......"

اس کے خلاف غیظ وغضب کی جو آگ شروع شروع میں اس کے دل میں بھڑکی تھی۔ کچھ تو وقت نے اور کچھ اس کے نئے مشاغل نے اسے ٹھنڈا کر دیا تھا۔ اور اگر کچھ رہا سہا غصہ تھا بھی تو وہ اب اس کی یہ زبوں حالت دیکھ کر جاتا رہا تھا۔ اسے اس کی حالت پر رحم نہیں آیا۔ بلکہ کراہت ہی محسوس ہوئی۔

جب سے وہ بھاگی تھی۔ اس کے دل میں رہ رہ کے یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔ کہ وہ کون سا خوش نصیب تھا جس کی محبت پر اسے بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ ممکن ہے وہ اس کے دوستوں میں سے کوئی ہو یا ممکن ہے کوئی اجنبی ہو۔ مگر اب اسے اس حال میں دیکھ کر اس کے دل میں اس قسم کا کوئی تجسس پیدا نہیں ہوا۔ وہ اس سارے معاملے سے اس قدر بیزار ہو گیا تھا۔ کہ چاہتا تھا جلد سے جلد اس عورت سے

اپنا پیچھا چھڑا لے۔

وہ کہے جا رہی تھی:

"تمہاری شرافت اور نیک دلی پر پورا یقین ہے کہ تم مجھے گھر سے نہیں نکالو گے۔ دنیا میں اس گھر کے سوا میرا کہیں ٹھکانہ نہیں۔ اس گھر سے نکل کر میں نے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ تم بے شک مجھ سے نوکرانیوں کا سا برتاؤ کرنا۔ آ دا میں اسی قابل ہوں۔"

"اس قدر زور سے نہ چلاؤ۔ نوکر سن رہے ہوں گے۔"

دفتر جانے میں دیر ہو رہی تھی۔ اس نے اصرار کے ساتھ مگر بغیر کسی درشتی کے اپنے پاؤں چھڑا لئے۔ ٹوپی ہاتھ میں تھامی اور گھر سے نکل گیا۔

دفتر میں۔ رہ رہ کے بیوی کی یہ حالت زار اس کی نظروں میں پھرتی رہی۔ اسے تعجب ہو رہا تھا۔ کہ کیا یہ وہی حُسن الحور حسینہ تھی۔ جس کا وہ چھ مہینے پہلے شیدائی تھا۔ کیا یہ وہی نازنین تھی۔ جسے خوشبوؤں سے عشق تھا۔ جو اپنے جسم پر گرد کا ایک ذرہ بھی نہ سہ سکتی تھی۔ اور جس کے ساتھ باغ کی کسی روش پر ٹہلتے ہوئے اس کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا تھا۔

"اگر وہ میرے ہاں رہنے ہی پر مصر ہے۔" اس نے دل میں کہا۔ "تو یوں ہی سہی۔ میں اتنا کم ظرف نہیں ہوں۔ کہ اسے روٹی کپڑے سے بھی جواب دے دوں۔ مگر یہ بات یقینی ہے۔ کہ میں اس سے اب کوئی سروکار نہیں رکھوں گا۔ گمان غالب یہی ہے۔ کہ وہ میری بے اعتنائیوں سے گڑھ گڑھ کر یا ضمیر کی ملامتیں سہہ کر جلد ہی پھر بھاگ جائے گی۔"

اس کی بیوی کو واپس آئے دو ہفتے گذر چکے تھے۔ اس عرصے میں نہ تو اس نے اس کی طرف نظر بھر کے دیکھا تھا اور نہ کوئی بات ہی کی تھی۔ جیسے وہ گھر میں تھی ہی نہیں۔ ادھر اس کی بیوی بھی اس کے سامنے آنے سے کتراتی رہی تھی۔ البتہ اس کی موجودگی مختلف صورتوں میں اپنی یاد دلاتی رہی۔

جب وہ سو کر اٹھتا۔ تو اس کی نظر اپنے سرہانے کے پاس تپائی رکھے ہوئے گلدان پر پڑتی۔ جس میں تازہ اور خوب صورت پھول سلیقے اور ہنرمندی سے سجے ہوتے۔ ابھی وہ بستر پر لیٹا اخبار ہی پڑھ رہا ہوتا۔ کہ نوکر چائے لے کر آ جاتا۔ توسٹ نفاست سے کٹے اور سکے ہوئے۔ خوش ذائقہ چائے جیسی شادی کے ابتدائی دنوں میں اسے ملا کرتی تھی۔ وہ غسل خانے سے نکل کر ڈریسنگ روم میں جاتا۔ تو اسے نیا جوڑا کیل کانٹے سے لیس ملتا۔ قمیص یا سوٹ کی مناسبت سے نکٹائی اور رومال۔ کفوں

میں اسٹڈ لگے ہوئے۔ بوٹ پر پالش کیا ہوا۔ دوپہر کو چپراسی گھر سے کھانا لے کر جاتا۔ تو اس کی من بھاتی سبزیاں ایسی مزے کی پکی ہوتیں۔ کہ زبان چٹخارے لیتی رہ جاتی۔

ایسے موقعوں پر اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ نمودار ہوتی۔ اور وہ دل میں کہتا:

"یہ ساری خاطر داریاں مجھے دوبارہ رام کرنے کے لئے کی جا رہی ہیں۔ لیکن بندہ اب ان چکموں میں نہیں آنے کا۔"

وہ اکثر سرِ شام گھر سے نکل جاتا۔ اور رات کے ایک دو بجے سے پہلے شاذ ہی لوٹتا۔ کبھی ساری رات ہی غائب رہتا۔ مگر اس سے کوئی باز پرس نہ کی جاتی۔ نہ اس کی آسائشوں میں کوئی کمی آنے پاتی۔

دھیرے دھیرے اسی طرح تین مہینے گذر گئے۔

ایک دن برسات میں جب ابر چھایا ہوا تھا۔ اور ٹھنڈی متوالی ہوا کیں چل رہی تھیں۔ اس نے دفتر میں ایک بڑی رقم کا چیک کاٹ کر چپراسی کو دیا۔ اور بیتابی کے ساتھ وقت کے گذرنے کا انتظار کرنے لگا۔ پچھلے آٹھ دنوں میں وہ کسی رات بھی گھر سے باہر نہیں گیا تھا۔ کچھ تو دفتر میں شام کو دیر تک بیٹھا رہنا پڑا تھا۔ کچھ تکان، کچھ سستی، کچھ اپنے ہی دل نہ چاہا تھا۔ مگر آج ارادہ تھا کہ ان سب دنوں کی کسر ایک ہی بار نکال دے۔

تھوڑی دیر میں چپراسی خالی ہاتھ لوٹ آیا۔ اس کا چیک لوٹا دیا گیا تھا۔ کیونکہ اس کے حساب میں چند روپے اور آنے پائی کے سوا کچھ نہیں بچا تھا۔

وہ اس انجام سے بے خبر نہیں تھا۔ مگر اس کا تو اسے گمان بھی نہ تھا کہ یہ دن اس قدر جلد آ جائے گا۔ اس نے سوچا کہیں سے قرض لینا چاہئے۔ چنانچہ جھجکتے جھجکتے ٹیلیفون پر دو ایک بے تکلف دوستوں سے اپنی غرض بیان کی۔ مگر مہینہ ختم ہونے کو تھا۔ ان دنوں اتنا روپیہ کس کے پاس ہوتا!

اچانک اسے یاد آیا۔ کہ اس کے بکس میں ایک سونے کی انگوٹھی پڑی ہے۔ جس میں ایک بیش قیمت نگینہ جڑا ہوا ہے۔ یہ انگوٹھی اس کی بیوی نے اچھے خاصے داموں میں اس کے لئے لی تھی۔ اب اس عورت سے اس کا کوئی رشتہ ہی ٹوٹ چکا ہے۔ تو پھر وہ اس کی یادگار کو اپنے پاس کیوں رکھے؟

شوق کی آگ جو چند لمحے پہلے دھیمی پڑ گئی تھی۔ یکلخت پھر سلگ اٹھی۔ اس نے سوچا۔ مجھے انگوٹھی لے کر شام سے پہلے پہلے جوہریوں کے ہاں پہنچ جانا چاہئے۔

تیسرے پہر جس وقت وہ بکس سے انگوٹھی نکال کر گھر کے صحن میں سے گذر رہا تھا۔ تو ایک خاتون خشخشی ساری میں ملبوس فضاؤں کو مہکاتی ہوئی اچانک اس کے پاس سے گذر گئی۔ خاتون نے اس

کی طرف نہیں دیکھا۔ مگر اس نے اس کی ایک جھلک دیکھ لی۔ جو ہر چند بہت مختصر تھی۔ مگر اس کو مبہوت کر دینے کے لئے کافی تھی۔

یہ خاتون اس کی وہی منظورِ نظر بیوی تھی۔ جس کے متعلق تین مہینے پہلے اسے گمان ہوا تھا۔ کہ قبر میں سے نکل کے آئی ہے۔ دونوں وقت عمدہ عمدہ غذائیں کھانے، بڑھیا بڑھیا صابن، کریم اور غازے استعمال کرنے سے اس کا رنگ روپ پھر نکل آیا تھا۔ گال پھر بھرے بھرے سے ہو گئے تھے۔ اور آنکھیں زندگی کے نور سے چمکنے لگی تھیں۔ اس کے حسن وشباب کا وہی عالم تھا۔ جس کی جھلک اس نے شادی کی پہلی رات دیکھی تھی۔ فرق تھا تو صرف اس قدر کہ پہلے اس کے چہرے پر معصومیت برستی تھی۔ مگر اب اس کی جگہ ایک لطیف متانت، ایک دلآویز پشیمانی جھلکنے لگی تھی۔

ابھی دن ہی تھا کہ وہ شہر کے اس حصے میں پہنچ گیا۔ جہاں جوہریوں کی دکانیں تھیں۔ اس وقت وہاں لین دین کا بازار خوب گرم تھا۔ کوئی دکان ایسی نہ تھی۔ جس میں گاہکوں کا جمگھٹ نہ ہو۔ اسے پہلے کبھی کوئی چیز بیچنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ دکاندار کے پاس جانے ہی سے ہچکچا رہا تھا۔ یہ بھیڑ دیکھی۔ تو اور بھی گھبرا گیا۔ اتنے آدمیوں کی موجودگی میں بھلا انگوٹھی کی بات چیت کیسے کی جا سکتی ہے۔ وہ لوگ نہ جانے کیا خیال کریں گے۔

وہ کوئی گھنٹے بھر تک اس بازار میں گھومتا رہا۔ اگر کسی دکان سے دو ایک خریدار چلے جاتے۔ تو وہ چار نئے آجاتے۔ اور بھیڑ جوں کی توں رہتی۔ آخر ایک جوہری کی دکان میں اسے نسبتاً کم آدمی دکھائی دیئے۔ اور وہ ہمت کر کے اس میں گھس گیا۔

"فرمائیے آپ کیا چاہتے ہیں؟" جوہری نے پوچھا۔

"میں —— میں ذرا بندے دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس نے ماتھے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

ذرا سی دیر میں جوہری نے بندوں کے ڈبوں کے ڈھیر لگا دیئے۔

"اس جوڑی کی کیا قیمت ہے؟" آخر اس نے ایک جوڑی کو پسند کرتے ہوئے پوچھا۔

"چھپن روپے!"

"بس یہ ٹھیک ہے۔ لیکن معاف کیجئے۔ میں روپیہ ساتھ لانا بھول گیا۔ آپ انہیں علاحدہ رکھ دیجئے۔ میں کل لے جاؤں گا۔"

"کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔" جوہری نے بندوں کے ڈبوں کو سمیٹتے ہوئے سرد مہری سے

کہا۔

دکان سے نکل کر اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔

اس وقت اچھی خاصی رات ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا۔ آج تو اس پروگرام کو منسوخ ہی کر دینا چاہئے۔ کل میں کسی ملازم کو انگوٹھی دے کر بھیجوں گا۔ یا ممکن ہے کل اس کی نوبت ہی نہ آئے۔ اور کہیں سے روپے کا انتظام ہو جائے۔

ہر چند اسے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تھی۔ اور وہ چلتے چلتے تھک بھی گیا تھا۔ مگر وہ افسردہ خاطر نہیں تھا۔ بلکہ اس کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی چونچال تھی۔ یہاں سے بازارِ حسن قریب ہی تھا۔ گھر لوٹتے وقت جی میں آئی۔ کہ لگے ہاتھوں اس کوچے کی سیر بھی کرتے چلیں۔ پاس سے نہیں تو دور ہی سے ذرا رنگ ڈھنگ دیکھا کیں۔

وہ بازار حسبِ معمول آج بھی خوب جگمگا رہا تھا۔ بیسوائیں بڑے ٹھسے سے اپنے اپنے بالا خانے کے برآمدے میں ٹہل رہی تھیں۔ اور لوگ تھے کہ پروانوں کی طرح روشنیوں کی طرف امڈے پڑتے تھے۔ بعض کمروں کے دریچوں سے ہلکی ہلکی نیلی سبز روشنی نکل رہی تھی۔ بعض گھروں سے شور وغل اور قہقہے جن کے بیچ بیچ میں سارنگی کے تار ہلکے سے جھنجھنا اٹھتے تھے۔

وہ سڑک پر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا۔ ایک ایک مکان کے سامنے سے گزرتا اور مکان والی کا جائزہ لیتا ہوا جا رہا تھا۔ ان میں سے بعض بیسواؤں کو وہ جانتا تھا۔ اور بعض کے ہاں اس کا آنا جانا بھی تھا۔ مگر آج نہ جانے کیا بات تھی۔ کہ اس کے قدم بار بار تیز تیز اٹھنے لگتے تھے۔

جب وہ اس بازار کے ختم پر پہنچا۔ تو اچانک اسے اپنی بیوی کی یاد آئی۔ اور اس کی دلکش ساری کا نقش آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ ذہن غیر ارادی طور پر اس کا ان عورتوں سے موازنہ کرنے لگا۔

اب تک اس نے جتنی عورتیں دیکھی تھیں۔ ان کی کیفیت ناٹک کی سینریوں کی سی تھی۔ کہ انہیں جتنی زیادہ دور سے دیکھا جائے۔ وہ اتنی ہی زیادہ دلفریب معلوم ہوتی ہیں۔ مگر اس کے برعکس اس کی بیوی کا حسن بعد وقرب کی تفریق سے بے نیاز تھا۔ نہ ان کے خد و خال میں اس کی سی دلکشی تھی۔ نہ عادات واطوار میں وہ نفاست جو ایک متمدن اور تعلیم یافتہ خاتون میں پائی جاتی ہے۔ پھر ان میں سے بعض کو تو سنگھار کرنا بھی نہ آتا تھا۔ کسی نے چہرے پر پوڈر لیپ رکھا تھا۔ تو کسی نے ترچھی مانگ نکال رکھی تھی۔ بالوں میں درجنوں ہیئر پنیں اور کلپ لگے ہوئے تھے۔ جیسے کسی کل میں بہت سے پرزے لگے ہوں۔ یہ سچ تھا کہ بعض صورتیں اچھی بھی تھیں۔ مگر نہ تو انہیں لباس کا کوئی سلیقہ تھا۔ اور نہ انہوں

نے رنگوں کے انتخاب میں کوئی توازن ملحوظ رکھا تھا۔ بس بھڑک ہی بھڑک تھی یا رنگوں کی نمائش۔ بعض تو بالکل گنواروں کی طرح زیوروں سے لدی پھندی تھیں۔ سادگی جو آرائش کی جان ہے۔ اس سے وہ کوسوں دور تھیں۔

وہ گھر کی طرف چلا تو بیوی کی تصویر بدستور اس کے ذہن میں قائم تھی۔ خیال ہی خیال میں شادی کا ابتدائی زمانہ اس کی نظروں میں پھرنے لگا۔ وہ بھی کیسا وقت تھا۔ جب متاہل زندگی کی مسرتیں پہلی مرتبہ اس پر عیاں ہوئی تھیں۔ اور اس کی روح انتہائے لذت سے کانپ اٹھی تھی۔ وہ راتوں کی طویل گھڑیوں کا آنکھوں ہی آنکھوں میں گذار دینا۔ وہ عیش و سرخوشی کے دن۔ وہ کیف و مستی کی راتیں۔ پھر لطف یہ کہ یہ بے حساب عنایات قریب قریب بن مانگی تھیں......

جوں جوں گھر قریب آتا گیا۔ اس کے قدم آپ سے آپ تیز سے تیز تر ہوتے چلے گئے۔ آخر جب وہ گھر کے سامنے پہنچا، تو ایک استہزا آمیز تبسم اس کے ہونٹوں پر جھلکنے لگا۔ اس نے اپنے دل میں کہا:

''یہ سچ سہی کہ میری بیوی باعصمت نہیں۔ لیکن آخر وہ عورتیں بھی کون سی عفیفہ ہیں جن کے پیچھے میں قلاش ہو گیا۔ اور جن سے ملنے کے لئے میں آج بھی تڑپ رہا ہوں۔''

وہ اوپر کی منزل میں تن تنہا کھلے آسمان کے نیچے چھپر کھٹ پر خوشبوؤں میں بسی ہوئی کچھ سو رہی کچھ جاگ رہی تھی۔ کہ اچانک کھڑکا سن کر چونک اٹھی۔ کان آہٹ پر لگا دیئے۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی سیڑھیوں پر دبے دبے قدم دھرتا اس کے پاس آ رہا ہو۔

۱۹۴۳ء

سیاہ و سفید

بی۔ اے۔ وی۔ مڈل اسکول کی استانی میمونہ بیگم آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ سوچ رہی تھی۔ کہ پچھلے کئی برس میں اپنی قلیل تنخواہوں سے وہ دو ڈھائی سو روپے بچا کر جو روپیہ جمع کر لیا ہے۔ اس کا کون سا زیور بنواؤں۔ کہ یکایک اسے اپنی بائیں پیشانی کے قریب ایک لٹ میں ایک سفید بال نظر آیا۔ اور اس کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

اس نے جلدی سے آئینے کی مدد سے اس بال کو لٹ سے الگ کر لیا۔ اور کھینچ کر نکال ڈالا۔ اسے یاد نہیں، کہ اب تک وہ ایسے کتنے سفید بال یوں ہی کھینچ کھینچ کر نکال چکی تھی۔ البتہ اس احساس نے کہ وہ روز بروز بوڑھی ہوتی جا رہی ہے۔ پہلے سے زیادہ شدت سے اس کی روح کو جھنجھوڑ دیا۔

اس کا باپ ایک غریب مدرس تھا۔ جس نے مرنے سے پہلے اپنی بے ماں کی بیٹیوں کو گھر ہی پر پڑھا لکھا کر اس قابل کر دیا تھا۔ کہ اگر ضرورت پڑے تو وہ نوشت و خواند کے ذریعے پیٹ پال سکیں۔ بڑی بچی ساجدہ تو خیر نہایت قبول صورت تھی۔ زیادہ تکلیف نہ اٹھانی پڑی۔ اس کے باپ کے ایک دور کے رشتہ دار نے جو دارالسلطنت دہلی کے ایک دفتر میں عہدہ دار تھا۔ کچھ تو رشتہ داری کے خیال سے، کچھ نیکی کا کام سمجھ کر اور کچھ یہ کہ اس نے لڑکی کی خوش جمالی کی تعریف سن رکھی تھی۔ اپنے بیٹے کی شادی اس سے کر دی۔ بڑی بچی کی طرف سے مطمئن ہو کے بوڑھے مدرس کو چھوٹی بچی کی فکر ہوئی۔ مگر

اس کی شادی کا بندوبست ہونے سے پہلے ہی وہ چل بسا۔ غنیمت یہ ہوا کہ مرنے سے تھوڑے ہی دن پہلے اس کی پرانی خدمات اور اثر و رسوخ کے طفیل میمونہ کو پینتیس روپے ماہوار پر لاہور کے قریب ایک قصبے کے زنانہ اسکول میں استانی کی جگہ مل گئی۔

باپ کے مرنے کے بعد میمونہ اسی اسکول کے بورڈنگ ہاؤس اٹھ آئی۔ وہ دن بھر اسکول میں لڑکیوں کو پڑھاتی۔ اور جب چھٹی ہوتی۔ تو بورڈنگ ہاؤس میں آ جاتی۔ شروع شروع میں اسے یہ کام مشکل بھی معلوم ہوا۔ اور دلچسپ بھی۔ مگر دو ہی سال میں وہ اس سے بیزار ہو گئی۔ دن بھر ناسمجھ اور چنچل لڑکیوں کے ساتھ مغز مارنے کے سوا اور اس میں رکھا ہی کیا تھا۔

کبھی کبھی شام کو وہ دوسری استانیوں کے ساتھ اسکول سے باہر چہل قدمی کرنے بھی جاتی۔ مگر اس سے اسے کوئی لطف حاصل نہ ہوتا۔ بھلا قصبے میں اس کی دلچسپی کی کیا چیز ہو سکتی تھی۔ مرد اکھڑ اور ان پڑھ۔ عورتیں میلی کچیلی اور زبان دراز۔ سڑکیں ٹوٹی اور گرد آلود۔ اور مکان مٹی کے بنے ہوئے بے ڈھنگے بے ڈھنگے۔ بعض دفعہ کسی امیر زمیندار کی لڑکی کی ماں اسے اور دوسری استانیوں کو کھانے پر بلا لیتی۔ یا کبھی کبھار دو چار استانیاں مل کر کپڑے وغیرہ خریدنے شہر چلی جاتیں۔ اس کے سوا اس کے لئے بندی خانے سے نکلنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی اس بے رنگ زندگی سے سخت دل برداشتہ ہو جاتی۔ مگر پھر سوچتی ابھی عمر پڑی ہے۔ کیا پتہ کوئی بہتری کی صورت نکل آئے……… اسی طرح دس سال بیت گئے تھے۔

صبح کے واقعے نے میمونہ کے دماغ کو دن بھر پریشان رکھا۔ اسکول میں وہ لڑکیوں کو بات بات پہ جھڑکتی رہی۔ کئی لفظوں کے معنی بھی وہ ٹھیک طور پر نہ سمجھا سکی۔ بورڈنگ ہاؤس میں آ کر بھی اس کا جی کسی کام میں نہ لگا۔ وہ سر شام ہی سے آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ اور اپنی حالت پر غور کرنے لگی۔ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجہ پر پہنچی۔ کہ اس کی جوانی کے ڈھلنے کی وجہ ہے کہ اسے اپنی زندگی سے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی تفریح کا کوئی سامان نہیں۔ اسے کسی سے انس نہیں، لگاؤ نہیں۔ دن بھر وہ تھی اور لڑکیوں کا شور۔ جس سے وہ سخت نفرت کرتی تھی۔ کیونکہ اس سے اکثر اس کے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔

بڑے دن کی چھٹیوں سے کوئی آٹھ روز پہلے اسے ساجدہ کا خط ملا۔ یہ خط کئی سال کے بعد آیا تھا۔ اور وہ نہیں جانتی تھی۔ کہ اس کی بہن آجکل کہاں ہے۔ ساجدہ نے لکھا تھا۔ کہ اس کے میاں کا تبادلہ دلی ہو گیا ہے۔ وہ نئی دلی کے ایک سرکاری کوارٹر میں رہتے ہیں۔ اس نے دلی کی قدیم و جدید

عمارتوں، سیر گاہوں، نئی دلی کے کھیل تماشوں، پرفضا پارکوں، سرکاری عمارتوں، دکانوں اور ہوٹلوں کی چہل پہل اور دوسری دلچسپیوں کا حال ایسی خوبی سے لکھا تھا۔ کہ ناول کا سا سماں باندھ دیا تھا۔ آخر میں لکھا تھا "کیوں نہ تم کرسمس کی چھٹیوں میں آ کر مجھ سے مل جاؤ۔ اور ہمارے شہروں کی رانی، ہندوستان کی راجدھانی دلی کی سیر بھی کر جاؤ۔"

میمونہ کا دل بلیوں اچھلنے لگا کیا عجب وہاں سے وہ تفریح و خوشی میسر آ جائے۔ جس کی آرزو وہ عرصے سے دل میں دبائے ہوئے تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس سفر سے اس کی زندگی میں کوئی اچھا سا کوئی خوشگوار تغیر پیدا ہو جائے……

گھڑی بھر میں اس نے دلی جانے کا ارادہ کر لیا۔ سفر کے خرچ کے لئے اس کے پاس روپیہ موجود تھا ہی۔ نہ کسی رشتہ دار سے اجازت لینے کی ضرورت تھی۔ نہ کوئی پابندی اسی دن ساجدہ کو لکھ بھیجا۔ کہ فلاں تاریخ فلاں گاڑی سے روانہ ہو جاؤں گی۔

چلنے سے ایک روز پہلے اس نے شہر جا کر کئی چیزیں خریدیں۔ رومال، جرابیں، ریشمی مفلر، اونچی ایڑی کا بوٹ۔ جڑاؤ کلپ جس پر تتلی بنی ہوئی تھی۔ نیل پالش، لپ اسٹک وغیرہ علاوہ ازیں اس نے بہن کے لئے ملتان کے بنے ہوئے چاندی کے بندوں کی ایک جوڑی بھی خریدی۔ ۲۳ دسمبر کی شام کو اس نے اپنا سوٹ کیس، اٹیچی کیس اور بستر تانگے میں رکھوایا۔ اسکول کے بوڑھے چوکیدار کو ساتھ لیا۔ کہ اسٹیشن تک پہنچا آئے۔ اور وہ روانہ ہو گئی۔

وہ گاڑی کے چلنے سے کافی پہلے آ گئی تھی۔ اس لئے اسے زنانہ درجہ میں حسب منشا کھڑکی کے پاس جگہ مل گئی۔ وہ اکیلی تھی۔ اور یہ اس کا پہلا ریل کا سفر تھا۔ اس پر بھی اس کے چہرے پر گھبراہٹ یا پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔ اسے اس سفر سے انوکھی سی خوشی ہو رہی تھی۔ جیسی بچوں کو ہوتی ہے۔

جب تک گاڑی روانہ نہ ہوئی۔ وہ کھڑکی سے برابر پلیٹ فارم کی سیر دیکھتی رہی۔ مسافروں کا گٹھڑیاں اٹھائے بھاگتا دوڑتا، عورتوں کا پیچھے پیچھے گھسٹتے آنا، قلیوں کی لڑائیاں، پلیٹ فارم کے ٹل پر مسافروں کا ٹھٹھ، خوانچے والوں کی صدائیں، متحرک دکانیں، ریلوے پولیس کا سب سے الگ تھلگ اپنی بے فکری کی شان سے پھرنا گویا کوٹھی کے برآمدے میں ٹہل رہے ہیں۔ اور ان سب کے پس منظر میں انجن کا دردہ کے بھانت بھانت کی آوازیں نکالتے رہنا یہ سارا سماں میمونہ کے لئے انتہائی دلچسپی لئے ہوئے تھا۔ علاوہ ازیں ایک ادھیڑ عمر کا ٹھنگنے قد کا موٹا سا گارڈ جس کی آنکھیں کوئلے کے ریزے پڑنے کی وجہ سے قدرتی طور پر سرخ ہو گئی تھیں اور بیچ لے سوجے ہوئے تھے، سیاہ وردی پہنے، کالر کے پن لگاتا ہوا، جھومتے

اڑاتا ایک چھوٹے سے انجن کی طرح بار بار اس کے ڈبے کے سامنے سے گزر جاتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے سیدھا میمونہ کی کھڑکی کا رخ کیا۔ مگر وہ رکا نہیں۔ بس اسے گھورتا ہوا پاس سے نکل گیا۔ میمونہ اس کی یہ حرکات دیکھ دیکھ کر عجب طفلانہ شوخی سے مسکراتی رہی۔

گاڑی چلتے چلتے وہ ڈبا عورتوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ راستے میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ سوائے اس کے کہ اس کے ڈبے میں تین چار لڑکیاں بہت شوخ تھیں۔ جنھوں نے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک خوب اودھم مچائے رکھا اور پھر تھک کر سو گئیں۔

اگلے روز وہ نئی دہلی میں اپنی بہن کے ہاں مقیم تھی۔ ساجدہ کی شادی کے بعد ان دونوں بہنوں کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ مگر اسے ساجدہ کی تیزیٔ گفتار کا کمال کہیے۔ کہ اس نے دو ہی گھنٹوں میں اپنی بہن کو پچھلے بارہ برس کے واقعات سے ضروری اور غیر ضروری تفاصیل کے ساتھ واقف کر دیا تھا۔ اس کے تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ بڑی لڑکی کی عمر دس برس تھی۔ منجھلی کی سات برس اور چھوٹی بچی ابھی دودھ پیتی تھی۔ لڑکوں میں ایک کی عمر نو برس کی تھی۔ وہ چوتھی میں پڑھتا تھا۔ اور چھوٹا بیٹا چار سال کا تھا۔ اس نے شرماتے ہوئے بتایا۔ کہ چند ہفتوں میں وہ پھر ماں بننے والی ہے۔

اس کے بعد اس نے ہر ایک بچے کی پیدائش، اس موقع کے درد و کرب، ہسپتال کی نرسوں کی زیادتی وغیرہ کا حال سنایا۔ ہر ایک بچے کی عادتیں، خصلتیں، ذہانت، شرارتیں، بیماریاں، جس جس شہر میں اس کے صاحب کو ملازمت کے سلسلے میں رہنا پڑا تھا۔ وہاں کی خصوصیتوں اور صاحب کی دفتری مصروفیتوں کا حال سنایا۔ آخر میں اس نے اداس لہجہ میں روپے کی قلت اور اپنی تنگ دستی کا ذکر کیا۔ اس کا میاں سو روپے پاتا تھا۔ جو نئی دہلی کی رہائش، کھیل تماشوں، بچوں کی تعلیم وغیرہ کے اخراجات میں ہفتہ ہی بھر میں اٹھ جاتے تھے۔ اور باقی سارا مہینہ حساب پر کٹتا تھا۔ اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا:

''فکر نہ کرو۔ انھوں نے کسی دوست کو روپے قرض دے رکھے ہیں۔ جو آج ہی کل میں ملنے والے ہیں۔ بس روپے ملتے ہی ہم ٹیکسی لیں گے۔ اور تمھیں دلی کی سیر کرائیں گے۔''

جب دو دن گزر گئے۔ اور ساجدہ کا میاں اپنے دوست سے روپے وصول کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ تو میمونہ نے بہن کے روکنے کے باوجود اپنے خرچ سے ٹیکسی منگوائی۔ اور اس میں دونوں بہنیں، میمونہ کا بہنوئی اور پانچوں بچے لد کے دلی کے قابل دید مقامات دیکھنے گئے۔ مگر بچوں کے غل غپاڑے اور ان کی دیکھ بھال میں میمونہ کو سیر کا کچھ لطف نہ آیا۔ اور وہ نہایت بد دل ہو کر واپس آئی۔

اگلے روز شام کو اسے اداس دیکھ کر ساجدہ نے اپنے صاحب سے کہا:

''تم جانتے ہو میں تو پیدل چل نہیں سکتی۔ تم جا کے ذرا میمونہ کو کناٹ پلیس کی سیر تو کرا لاؤ۔''

اس نے بادل نخواستہ حامی بھر لی۔ وہ چھتیس سینتیس برس کا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ ایک بے چین روح۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ہر وقت ایک تشنگی اور وحشت سی جھلکتی رہتی تھی۔ وہ خاصا خوش شکل تھا۔ مگر اپنی ناداری کی وجہ سے اپنی سالی کے سامنے کچھ جھینپا جھینپا سا رہتا تھا۔ ایک دو دفعہ اس نے تنہائی میں اپنی بیوی کو ملامت بھی کی تھی۔ کہ ایسی تنگ دستی کی حالت میں تم نے اسے بلوایا ہی کیوں۔ جس وقت وہ روانہ ہونے لگے۔ تو ساجدہ نے احتیاط کے طور پر اپنی بڑی بچی قمر النسا کو بھی ان کے ہمراہ کر دیا۔

سردی خاصی پڑنے لگی تھی۔ میمونہ نے ساڑی کے اوپر اوور کوٹ پہن لیا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ چہل قدمی کرتے ہوئے کناٹ پلیس پہنچ گئے۔ یہاں کی رفیع الشان عمارتیں، [illegible] سجی بنی مخلوق۔ دکانوں کی سج دھج اور ان کی جھلملاتی ہوئی رنگا رنگ روشنیاں۔ مشرقی اور مغربی آرٹ کے نمونے۔ سینما گھروں کی گہما گہمی۔ ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں بلند ہونے والے قہقہے۔ برآمدوں میں کہیں اجالا کہیں اندھیرا اور کہیں نور اور سایہ باہم گتھے ہوئے۔ اور سب سے بڑھ کر بیویوں کے خوش پوش نوجوانوں اور تنگ [illegible] ساڑیوں والی لڑکیوں کے جھرمٹ۔ جدھر سے یہ جھرمٹ گزر جاتے۔ فضا جوانی کے نشے سے مہک اٹھتی۔ میمونہ ان سب چیزوں کو ایک محویت کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ دلی آنے پر اب تک اسے جو کوفت ہوئی تھی۔ اس کا خیال ایک دم دل سے نکل گیا تھا۔ لڑکیوں کو اس طرح مردوں کے بغیر آزادانہ دلیری سے پھرتے دیکھ کر اسے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی۔

کچھ دیر ادھر ادھر گھما پھرا کر اس کا بہنوئی اسے ایک جگمگاتے ہوئے قہوہ خانے میں لے گیا۔ جس کی بڑی صفت یہ تھی۔ کہ وہاں چیزوں کے دام بہت کم لیے جاتے تھے۔ یہ قہوہ خانہ اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے مزین تھا۔ اور اتنا فراخ کہ پچاس ساٹھ آدمی بیک وقت اس میں آ سکیں۔ جس وقت وہ اپنی سالی اور بچی کو لے کر اندر پہنچا۔ تو یہ قہوہ خانہ گاہکوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ایک میز کو خالی ہوتے دیکھ کر وہ لپک کر اس کی طرف بڑھا۔ اور اس پر قبضہ جما دیا۔

تھوڑی دیر میں قہوہ آ گیا۔ میمونہ نے اس کی چسکیاں لینا اور اپنے ارد گرد دیکھنا شروع کیا۔ ہندوستانی، اینگلو انڈین اور یورپین مرد و زن بڑے اطمینان سے مزے مزے سے قہوہ پی رہے اور خوش گپیاں کر رہے تھے۔ وہ جوں جوں انھیں دیکھتی گئی۔ اس کی دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ جب وہ قہوہ پی چکے۔ تو اس کا بہنوئی ایک دوست کو ٹیلی فون کرنے کے بہانے کاؤنٹر کے پاس گیا۔ اور پیچھے سے

ہال بھی ادا کر آیا۔ چونکہ انہیں گھر سے نکلے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس لئے یہاں سے نکل کر انہوں نے سیدھا گھر کا رخ کیا۔

جب وہ گھر پہنچے۔ تو ساجدہ نے بہن سے پوچھا:

''کیوں پسند آیا کناٹ پلیس؟''

''ہاں۔'' میمونہ نے اپنے جوتوں کو دباتے ہوئے کہا۔ ''بہت دلچسپ مقام ہے۔''

دوسرے دن شام کو ساجدہ کے میاں کو کوئی کام تھا۔ اور وہ سر شام ہی سے گھر سے نکل گیا۔ ادھر میمونہ بناؤ سنگھار کر کے اور نئی ساری پہن کے تیار ہو گئی۔ ساجدہ نے پوچھا۔

''کہاں کی تیاری ہے؟''

''ذرا گھومنے جاؤں گی۔''

''اکیلی؟''

''اور کیا اکیلی کو کوئی پکڑ لے گا؟''

قبل اس کے کہ ساجدہ آپا پھر اپنی بڑی بچی یا بیٹے کو ہمراہ لے جانے کی ہدایت کرتی۔ وہ کوارٹر سے باہر تھی۔

کناٹ پلیس پہنچ کر اس نے پارک کا رخ کیا۔ جس کے بیچوں بیچ ایک گول چبوترے پر پولیس کا بینڈ بج رہا تھا۔ اور سینکڑوں مرد عورتیں اور بچے اس کے گرد جمع تھے۔ تھوڑی دیر وہاں کی چہل پہل دیکھنے کے بعد جب وہ دکانوں کی طرف لوٹ رہی تھی۔ تو اس نے محسوس کیا۔ جیسے کوئی شخص اس کے بالکل پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ تو یہ ایک پچیس چھبیس سال کا نوجوان تھا۔ جس نے سبز فلیٹ ہیٹ اور خاکی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ لمبا قد۔ گورا چٹا رنگ۔ پتلی پتلی ترشی ہوئی مونچھیں۔ لمبی لمبی قلمیں۔ آنکھوں سے علم کا نور اور چال سے شائستگی ٹپکتی تھی۔ وہ نوجوان تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے پاس سے گذر گیا۔ مگر تھوڑی ہی دور چل کے اس نے ایک دم اپنی رفتار سست کر دی۔ اور اب کے میمونہ کو اس کے پاس سے گذرنا پڑا۔

اب وہ اس چوراہے میں پہنچ گئی تھی۔ جہاں سے دکانوں کی قطاریں داہنے بائیں ایک دائرے کی صورت میں گئی تھیں۔ میمونہ ایک قطار کی طرف زیادہ روشنی دیکھ کر چل دی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا۔ تو وہ نوجوان بھی اسی سمت آتا دکھائی دیا۔ اب کے اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں میمونہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ نوجوان کچھ دور تک تو اس کے پیچھے پیچھے رہا۔ اور پھر تیزی

سے اس کے پاس سے گذر گیا۔ اب کے اس نے اپنی نظریں میمونہ کے چہرے پر گاڑ دی تھیں۔ چند قدم چل کر وہ ایک بک سٹال پر ٹھہر گیا۔ اور اخباروں کی سرخیاں پڑھنے لگا۔ میمونہ کو پھر اس کے پاس سے گذرنا پڑا۔

یہ ماجرا کئی بار پیش آیا۔ کبھی تو وہ نوجوان اس کے آگے آگے چلنے لگتا۔ اور کبھی میمونہ کو اس کے آگے آگے چلنا پڑتا۔ اس نے سوچا۔ ذرا دیکھوں تو یہ نوجوان سچ مچ میرا پیچھا کر رہا ہے۔ یا یہ میرا وہم ہی وہم ہے۔

وہ ایک چینی آرٹ کی دکان میں داخل ہو گئی۔ اور وقت گذارنے کے لئے چینیوں کی بنائی ہوئی تصویریں، کھلونے، ظروف اور کپڑے وغیرہ دیکھنے لگی۔ پانچ منٹ کے بعد جب وہ دکان سے نکلی۔ تو وہ نوجوان ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ کہ اس نوجوان نے ہیٹ کے کنارے کو چھو کر سر کی ایک خفیف سی جنبش کے ساتھ سلام کیا۔

یہ حرکت اس سے ایسی غیر متوقع طور پر سرزد ہوئی تھی۔ کہ میمونہ بے ساختہ مسکرا دی۔ اس کے بعد اس نے کناٹ پلیس کے دو تین چکر اور لگائے اور پھر گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس دوران میں وہ نوجوان بدستور اس کا پیچھا کرتا رہا۔ جب اس کے بہنوئی کا کوارٹر چند قدم کے فاصلے پر رہ گیا۔ تو اس نے ایک دم پلٹ کر نوجوان کی طرف دیکھا۔ اور ایک انداز شوخی سے بھاگ کر کوارٹر میں چلی گئی۔

ساجدہ اس کی راہ تک رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بولی:

''شکر ہے تم آ گئیں۔ مجھے بڑا فکر ہو رہا تھا۔ کہو کہاں کہاں گھوم آئیں؟''

''یہیں کناٹ پلیس تک گئی تھی۔''

''عورت ذات۔ پھر تنہا۔ پھر ناواقف۔ فکر کی بات ہی تھی....... تم ہنس کیوں رہی ہو؟''

''نہیں تو۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس رات اس نے خوشی خوشی سب کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ وہ دیر تک بچوں سے باتیں کرتی رہی۔ آج بچے اسے بڑے ہی دلچسپ معلوم ہونے لگے تھے۔ اس نے چھوٹی بچی کو گود میں لیا۔ پیار کیا۔ پھر آہستہ آہستہ اسے ہوا میں اچھالنے لگی۔ کمرہ قلقاریوں سے گونج اٹھا۔

اگلے روز سہ پہر ہی سے اس نے بناؤ سنگھار شروع کر دیا۔ اپنی سب سے بڑھیا ساری نکالی۔ جو اس کی ایک امیر شاگرد کی ماں نے اپنی بیٹی کے پاس ہونے کی خوشی میں اسے تحفے میں دی تھی۔

کوارٹر سے نکل کر وہ سیدھی اس سیلون میں پہنچی۔ جہاں بجلی کے ذریعے بالوں میں لہریں پیدا کی

جاتی تھیں۔ یہ انگریزی دکان اس نے کل کے گشت میں دیکھ لی تھی۔ جب اس کے گھنے بالوں میں لہریں پڑ چکیں اور تازہ ترین مغربی فیشن کے مطابق ان کی آرائش ہو چکی۔ تو وہ آئینے میں پہلے پہل اپنی صورت پہچان نہ سکی۔ وہ زیادہ سے زیادہ تیس برس کی معلوم ہوتی تھی۔ اصلی عمر سے آٹھ برس کم۔ اس کے پیچھے اس سیلون کی بوڑھی مشاطہ جو ایک فرانسیسی خاتون تھی۔ اسے ایسی شفقت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی، جیسے ماں اپنی دلہن بنی بیٹی کو سنگھار کے بعد دیکھتی ہے۔

شام کے جھٹپٹے میں میمونہ اپنی خوشی کو دبائے جھجکتی ہوئی سیلون سے نکلی اور کناٹ پلیس کے پارک کی طرف ہولی۔ وہ کوئی گھنٹہ بھر تک پارک کے مختلف حصوں میں پھرتی رہی۔ پھر اس نے دکانوں کا گشت لگانا شروع کیا۔ مگر وہ کل والا نوجوان اسے کہیں نظر نہ آیا۔ وہ اس قہوہ خانے کے پاس پہنچی۔ جہاں وہ پہلے روز اپنے بہنوئی کے ساتھ گئی تھی۔ قہوہ خانہ آج بھی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اسے اندر جاتے کچھ جھجک سی معلوم ہوئی۔ مگر اس نے دل کو مضبوط کیا۔ اور کسی کی طرف دیکھے بغیر اندر جا کر ایک خالی میز کے پاس بیٹھ گئی۔ اور ملازم سے قہوہ منگوایا۔

رفتہ رفتہ اس نے کنکھیوں سے اپنے آس پاس کے لوگوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ہر طرف چھوٹی چھوٹی محفلیں منعقد تھیں۔ کہیں اہم ملکی معاملات پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ تو کہیں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی۔ ایک کونے میں دو بنگالی لڑکیاں جن کی چوٹیوں کے سروں میں سرخ سرخ ربن بندھے ہوئے تھے۔ سر سے سر جوڑ کر چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی دوسری میز پر ایک نوجوان بظاہر اخبار میں منہمک معلوم ہوتا تھا۔ مگر دراصل وہ ان لڑکیوں کو گھور رہا تھا۔ یہ سب کچھ تھا۔ مگر وہ سبز فلیٹ ہیٹ اور فاختئی رنگ کے سوٹ والا نوجوان کہیں نہ تھا۔

آدھ گھنٹے کے بعد وہ قہوہ خانے سے نکل آئی۔ اس وقت خاصی رات ہو چکی تھی۔ ٹھنڈی اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس نے مفلر کو اپنے گلے کے گرد لپیٹ کر اور کوٹ کے بٹن بند کر لئے۔ اور پھر دکانوں کی طرف چل دی۔

جیسے ہی وہ چوراہے کے پاس پہنچی۔ اس نے دیکھا۔ کہ ایک سڑک کے درمیان جہاں موٹریں وغیرہ ٹھہرائی جاتی ہیں۔ ایک سیاہ سیلون کار کھڑی ہے۔ اس میں دو تین نوجوان انگریزی سوٹ پہنے بیٹھے ہیں۔ اور دو تین باہر کھڑے ان سے باتیں کر رہے ہیں۔ جب وہ ذرا قریب پہنچی۔ تو اسی جتھے میں اسے وہ کل والا نوجوان نظر آ گیا۔ آج اس نے چیسٹر پہن رکھا تھا۔ اور سر سے ننگا تھا۔ وہ موٹر کے دروازے کے پاس کھڑا اپنے ساتھیوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ جسے وہ سر جوڑے غور سے سن رہے تھے۔

جیسے ہی اس نوجوان کی نظر میمونہ پر پڑی۔ وہ ٹھٹھرا سا گیا۔ اور اپنے ایک ساتھی کو جو چشمہ لگائے پاس ہی کھڑا تھا۔ کہنی سے ٹہوکے دینے لگا۔ یکبارگی سب کے چہرے اشتیاق سے چمک اٹھے۔ مگر بظاہر انہوں نے میمونہ کی طرف توجہ نہ کی۔ اور ایک بے پروائی کا سا انداز اختیار کئے آپس ہی میں باتیں کرتے رہے۔

میمونہ نے ان کی یہ سب حرکات بھانپ لی تھیں۔ اس کا چہرہ دمکنے لگا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ اور وہ من ہی من میں حقارت سے کہہ اٹھی:

"کوئی بات تھی!"

اب وہ ذرا دور نکل گئی۔ تو وہ نوجوان اپنے ساتھیوں سے جدا ہوا۔ اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا دکانوں کی قطار کے اس سرے کی طرف چل دیا۔ جس طرف میمونہ جا رہی تھی۔ سرے پر پہنچ کر وہ ٹھہر گیا۔ اور جیب سے سگرٹ نکال سلگانے لگا۔

میمونہ نے اسے دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ آج اس کا انداز کل سے بالکل جدا ہوا تھا۔ کل وہ بہت خودرو اور اداس معلوم ہوتا تھا۔ مگر آج اس کی آنکھوں میں شوخی اور بے باکی تھی۔ میمونہ گذشتہ شب اپنے کمرے کے سامنے لیٹ کر اس کی طرف دیکھنا، مسکرانا اور بھاگ جانا اسے دلیر بنانے کے لئے کافی تھا۔ اور پھر آج کا یہ سنگھار بالوں میں یہ لہریں۔ زلفوں میں یہ پیچ و خم……

میمونہ کو آج اس نوجوان کے چہرے میں کوئی خاص بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ایسا ہی تھا۔ جیسے اس کے اور منچلے ساتھیوں کے چہرے جن پر ایک جنسی عیاری، ہوس کاری، بازاری پن اور بے وقوفی برس رہی تھی۔ وہ حیران تھی کہ کل وہ اسے کیوں بھا گیا تھا۔

اسے یقین تھا کہ جب وہ اس کے پاس سے گذرے گی۔ تو وہ ضرور کوئی حرکت کرے گا۔ یا کچھ نہیں تو کوئی فقرہ ہی کسے گا۔ مگر اس نے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ جب اس کے اور نوجوان کے درمیان کوئی بیس قدم کا فاصلہ رہ گیا۔ تو وہ ایک دکان کے شوکیس میں جھوٹے موٹے لیسوں اور فیتوں کے نمونے دیکھنے ٹھہر گئی۔ اور پل بھر کے بعد وہ جس طرف سے آئی تھی اسی طرف لوٹ گئی۔ چند ہی قدم چلی تھی۔ کہ اسے سامنے سے سڑک پر وہی سیاہ سیلون کار آتی دکھائی دی۔ اس میں اس وقت چار آدمی سوار تھے۔ انہوں نے ایسی نظروں سے اسے گھورا۔ کہ وہ ایک دم گھبرا گئی۔ بلاشبہ یہ کار دھیمی رفتار سے ساتھ ساتھ سڑک پر اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

طرح طرح کے وحشت ناک خیال اس کے دل میں آنے لگے۔ جو اسے سہمائے دیتے تھے۔

وہ رہ رہ کے اپنی نکّی کی حرکتوں پر اپنے کو ملامت کر رہی تھی۔ پردیس کا معاملہ تھا۔ عزت کا خدا ہی نگہبان تھا۔

سامنے سے ایک انگریز انسپکٹر کو موٹر سائیکل پر آتے دیکھ کر اس کی ڈھارس بندھی۔ اس نے دل کو مضبوط کیا۔ اور یہ سوچ کر تسلی دی۔ کہ جب تک میں خود موقع نہ دوں گی۔ ان کتوں کی مجال نہیں کہ میرے قریب بھی پھٹکنے پائیں۔

جب تک وہ دکانوں کے آگے کے لمبے محراب دار برآمدے میں گذرتی رہی نوجوان نے بہتیری کوشش کی۔ کہ کسی طرح وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرے۔ وہ اس کے کبھی آگے آگے کبھی پیچھے پیچھے کبھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ مگر میمونہ نے ایک بار بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ ایک جگہ کونے میں دو بڑے بڑے گول ستونوں کے درمیان ایک تنگ موڑ تھا۔ جس میں سے ایک وقت میں صرف دو ایک آدمی ہی گذر سکتے تھے۔ جب وہ ان ستونوں میں سے گذرنے لگی۔ تو دیکھا کہ نوجوان اس کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ اس وقت اتفاق سے اور کوئی آدمی آس پاس نہیں تھا۔ میمونہ لمحہ بھر کے لئے رک گئی۔ اور منتظر رہی۔ کہ وہ ہٹے تو گذر دوں۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اس پر یکبارگی وہی کیفیت طاری ہو گئی۔ جیسی اسکول میں کسی ضدی اور سرکش دیہاتی لڑکی کی ہٹ دھرمی پر ہو جایا کرتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے انتہائی غیظ برسنے لگا اور اس نے حقارت سے تحکمانہ لہجے میں کہا:

"ہٹو راستہ چھوڑو۔۔۔ بے وقوف آدمی۔"

وہ نوجوان دبک کر ایک طرف ہو گیا۔

اس وقت آٹھ بج چکے تھے۔ اور وہ کناٹ پلیس کے چکر سے نکل کر اس بڑی سڑک پر پہنچ گئی تھی۔ جو سیدھی اس کے ہوٹل کے کوارٹر کو جاتی تھی۔ ادھر شکار کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر اس نوجوان نے زیادہ سرگرمی سے اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب آس پاس کوئی نہ ہوتا۔ تو وہ زور زور سے آہیں بھرنے لگتا۔ دو ایک دفعہ اس نے عاشقانہ اشعار بھی گنگنائے۔ مگر میمونہ نے رسید تک نہ دی۔ اس پر وہ کھلم کھلا اسے بازاری خطابوں سے پکارنے لگا۔ میمونہ نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

جب وہ ایک چوک میں سے گذر رہی تھی۔ تو وہی سیاہ رنگ موٹر فرّاٹے بھرتی ہوئی بالکل اس کے قریب سے ہو کے نکل گئی۔ اگر وہ جلدی سے ایک طرف نہ ہٹ جاتی۔ تو عجب نہ تھا کہ اس کی ٹانگ موٹر کے پہیے کے نیچے آ جاتی۔ ادھر وہ ہٹی۔ ادھر موٹر میں سے آواز آئی:

"او وہ ویری سوری!"

میمونہ نے اب سنبھل کر اور سڑک کے بالکل کنارے ہو کر پھر تیز رفتار سے چلنا شروع کر دیا تھی۔ ادھر وہ نوجوان بھی اس کے ساتھ ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا عاشقانہ فقرے کستا اور آہیں بھرتا چلا آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ موٹر چکر کاٹ کر پھر اس کے پاس سے گذری۔ اب کے اس کے کان کے پاس اس زور کا ہارن بجا۔ کہ وہ ڈر کر اچھل پڑی۔ موٹر میں سے آواز آئی:

"یہاں کب تک چلئے گا۔ موٹر میں تشریف لے آئیے نا سرکار!"

میمونہ کا کوارٹر اب صرف دو ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ جوں جوں اس کا گھر قریب آتا جاتا تھا۔ نوجوان کی آہ و فغاں میں زیادہ سے زیادہ جوش و خروش پیدا ہوتا جاتا تھا۔ میمونہ نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ اور بھی تیز۔ یہاں تک کہ وہ قریب قریب دوڑنے لگی۔ اس کے پیچھے لگاتار ایک شور سنائی دیتا رہا۔ مگر اس نے بالکل دھیان نہ دیا۔ نہ پلٹ کر دیکھا۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنی رفتار میں کمی نہ آنے دی۔ آخرکار وہ اپنے کوارٹر میں آ پہنچی۔

ساجدہ نے اسے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے دیکھا تو پوچھا:

"تم گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ دم کیوں چڑھا ہوا ہے؟"

"نہیں تو۔" میمونہ نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ اور اپنے جسم کو ایک آرام کرسی پر گرا دیا۔

اس رات خاصی دیر تک وہ موٹر اس کے کوارٹر کے سامنے ہارن بجاتا رہا۔ مگر میمونہ نے اپنی کسی حرکت سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا۔ کہ اس کا اس سے کوئی تعلق ہے۔

۳۱ دسمبر کی شام کو وہ دہلی کے اسٹیشن پر ریل کے زنانہ درجے میں بیٹھی واپس جا رہی تھی۔ اس کے منی بیگ میں صرف چند روپے اور کچھ ریزگاری رہ گئی تھی۔ سو روپے کے یوں بیکار بے مصرف اٹھ جانے پر اس کا دل بھر بھر آتا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اس کا کوئی زیور بنا لیتی۔ جو آڑے وقت میں اس کے کام بھی آتا......

وہ کھڑکی سے لگی بیٹھی ہر چیز کو بڑی بے تعلقی سے دیکھ رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ پانچ برس اور بوڑھی ہو گئی ہو۔

۱۹۳۰ء

آنندی

بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھرکم رکن جو ملک و قوم کے سچے خیر خواہ اور دردمند سمجھے جاتے تھے نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے۔

"......اور پھر حضرات آپ یہ بھی خیال فرمائیے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چارو ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفاء کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ، نیم عریاں بیسواؤں کے بناؤ سنگار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غازوں، لونڈروں، زرق برق ساریوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پرمسرت گھر، ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔"

"......اور صاحبان پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمائیے کہ نونہالانِ قوم جو درس گاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی عمدہ تربیتوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں۔ اور قیاس چاہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا ان ہی کے سر بندھے گا، انھیں بھی صبح و شام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں جو ہر وقت بارہ ابھرن سولہ سنگھار کئے ہر راہرو پر بے تحاشا نگاہ و مژہ کے تیر و سناں برساتی اور اسے دعوتِ حسن پرستی دیتی ہیں۔ کیا انھیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے ناتجربہ کار، جوانی کے نشے میں سرشار، سود و زیاں سے بے پروا نونہالانِ قوم اپنے جذبات و خیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! کیا ان کا حسنِ زاہد فریب ہمارے نونہالانِ قوم کو جادۂ مستقیم سے بھٹکا کر ان کے دل میں گناہ کی پراسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی، ایک اضطراب، ایک ہیجان برپا نہ کر دیتا ہوگا......"

اس موقع پر ایک رکنِ بلدیہ جو کسی زمانے میں مدرس رہ چکے تھے اور اعداد و شمار سے خاص شغف رکھتے تھے بول اٹھے:

"صاحبان واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبہ کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔"

ایک رکن نے جو چشمہ لگائے تھے اور ایک ہفتہ وار اخبار کے مدیرِ اعزازی تھے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "حضرات ہمارے شہر سے روز بروز غیرت، شرافت، مردانگی، نکوکاری و پرہیزگاری اٹھتی جا رہی ہے۔ اور اس کے بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بدمعاشی، چوری اور جعل سازی کا دور دورہ ہوتا جا رہا ہے۔ منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ قتل و غارت، خودکشی اور دیوالہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا سبب محض ان زنانِ بازاری کا ناپاک وجود ہے کیونکہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر ہوش و خرد کھو بیٹھتے ہیں۔ اور ان کی بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز طریقے سے زر حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سعی و کوشش میں جامۂ انسانیت سے باہر ہو جاتے اور نہایت قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ جانِ عزیز ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اور یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں۔"

ایک پنشن یافتہ معمر رکن جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے۔ اور دنیا کا سرد و گرم دیکھ چکے تھے اور اب کشمکشِ حیات سے تھک کر باقی ماندہ عمر ستانے اور اپنے اہل و عیال کو اپنے سائے میں

پہنچتا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے۔ تقریر کرنے اٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی تھی اور لہجہ فریاد کا انداز لئے ہوئے تھا۔ بولے "صاحبان رات رات بھر ان لوگوں کے طبلے کی تھاپ۔ ان کی گلےبازیاں، ان کے عشاق کی دھینگا مشتی، گالی گلوچ، شور و غل، ہا ہا ہو ہو سن سن کر آس پاس کے رہنے والے شرفاء کے کان پک گئے ہیں۔ ضیق میں جان آگئی ہے۔ رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود۔ علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو بُرا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر صاحب اولاد خود کر سکتا ہے.........''

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی۔ اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ سب اراکین بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی۔ کیونکہ بدقسمتی سے ان کا قدیمی مکان اس بازار حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رکن بلدیہ نے جو پرانی تہذیب کے علم بردار تھے۔ اور آثار قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے تقریر کرتے ہوئے کہا:

''حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں۔ جب وہ اس بازار سے گذرتے اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجئے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔''

اب صدر بلدیہ تقریر کرنے اٹھے۔ گو قد ٹھگنا اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے۔ مگر سر بڑا تھا۔ جس کی وجہ سے بردبار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لہجہ میں حد درجہ متانت تھی۔ بولے۔ ''حضرات! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں۔ کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب و تمدن کے لئے باعث صد عار ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑ دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟''

ایک صاحب بول اٹھے۔ ''یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟''

اس پر ایک طویل فرمائشی قہقہہ پڑا۔ اور ہال کی ماتمی فضا میں یکبارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحب صدر بولے۔ ''حضرات یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انہیں اپنے گھروں میں نہ گھسنے دیں گے۔ اور مفلس اور ادنیٰ

طبقہ کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لئے ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی۔''

اس پر ایک صاحب بولے۔ ''بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں۔''

صدر نے کہا۔ ''صاحبان! یہ بھی آسان کام نہیں۔ ان کی تعداد دس بیس نہیں سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکانات ہیں۔''

یہ مسئلہ کوئی مہینے بھر تک بلدیہ کے زیر بحث رہا۔ اور بالآخر تمام اراکین کی اتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہئے اور انہیں رہنے کے لئے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہئے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں تک بھگتیں مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی اور وہ ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گاہک پیدا کئے جاتے رہے۔ بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے ہی مکانوں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ تاکہ اس عرصے میں وہ نئے علاقہ میں مکان وغیرہ بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی اور اس سے آگے کوس بھر کا کچا راستہ تھا۔ کسی زمانے میں وہاں کوئی بستی ہوگی۔ مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے اور دن دہاڑے اُلو بولتا تھا۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ مگر کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے۔ یا یوں ہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے تو نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہر خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روز روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دل بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں۔ اور اپنے دولت مند چاہنے والوں

کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے بادلِ ناخواستہ اس علاقے میں بسنے پر آمادہ ہوئی تھیں۔ اور باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھدروں میں جا چھپیں گی۔ یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ کہیں اور نکل جائیں گی۔

یہ چودہ بیسوائیں اچھی خاصی مالدار تھیں۔ اس پر شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے ان کے دام انھیں اچھے وصول ہو گئے تھے۔ اور اس علاقے میں زمین کی قیمت برائے نام تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے عالی شان مکان بنوانے کی ٹھان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی۔ منتخب کی گئی۔ زمین کے قطعے صاف کرائے اور چابکدست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

دن بھر اینٹ۔ مٹی۔ چونا۔ شہتیر۔ گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان لاریوں، چھکڑوں، خچروں، گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا۔ اور منشی حساب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انھیں گنواتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ میر عمارت معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے ڈپٹتے مزدور ادھر ادھر دوڑتے پھرتے۔ مزدورنیوں کو چلا چلا کر پکارتے۔ اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور، ایک ہنگامہ رہتا اور سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دور سے آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی دھیمی آوازیں سنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے۔ اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا جو بند پڑا تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر ستانے کی غرض سے اور کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گزاری کے خیال سے سب سے پہلے اسی کی مرمت کی۔ چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا اس لئے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہو گئی۔

دن کو بارہ بجے جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی۔ دو ڈھائی سو راج مزدور، میر عمارت، منشی اور ان بیسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامور تھے اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی اس بستی کی خبر سن کر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک خوردسال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ، بیڑی، چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا۔ اور کنوئیں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا پیسے کے دو دو شکر کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کر لے آیا۔ اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر "لے لو خربوزے، شہد سے میٹھے خربوزے" کی صدا لگانے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا۔ گھر سے سری پائے پکا، دیگچی میں رکھ، خوانچے میں لگا، تھوڑی سی روٹیاں، مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے آ موجود ہوا۔ اور اس بستی کے کارکنوں کو جنگل میں گھر کی ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت میر عمارت، معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنوئیں سے پانی نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا۔ پھر ایک کو امام بنایا جاتا۔ اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں کے ایک ملا کے کان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے۔ وہ دوسرے ہی دن علی الصباح ایک سبز جزدان میں قرآن شریف، پنج سورہ، رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ آ موجود ہوا۔ اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھائے آ جاتا۔ اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس زمین پر چولھا بنا کباب، کلیجی، دل اور گردے سیخوں پر چڑھا بستی والوں کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو ساتھ لے مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لئے پھونس کا ایک چھپر ڈال تنور گرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نائی پھٹی پرانی کسبت گلے میں ڈالے جوتی کی ٹھوکروں سے راستے کے روڑوں کو ٹھکراتا ادھر ادھر گشت کرتا دیکھنے میں آ جاتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے۔ کبھی کبھی دن دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آ جاتیں۔ اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آ جاتیں۔ اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے

برابر شور مچاتی رہتیں اور انھیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے اوباش بیکار مباش کچھ کیا کر کے مصداق شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سن گن لینے آ جاتے۔ اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے ذرا ہٹ کر ان کے گرد اگرد چکر لگاتے رہتے۔ فقرے کستے بے تکے قہقہے لگاتے عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کباڑی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں تھوڑے ہی دن پہلے ہو کا عالم تھا اب ہر طرف گہما گہمی اور چہل پہل نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں اس علاقے کی ویرانی سے ان بیسواؤں کو یہاں آ کر رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی اور اب وہ ہر مرتبہ خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکیدیں کر جاتی تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن صبح کو بستی کے راج مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ اور ایک سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا تڑنگا مست فقیر لنگوٹ باندھے چار ابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے ارد گرد پھر رہا اور کنکر پتھر اٹھا اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک گھڑا لے کر کنوئیں پر آیا، اور پانی بھر بھر کر مزار پر لے جانے اور اسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنوئیں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے۔ وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا، "جانتے ہو وہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا! میرے باپ دادا ان کے مجاور تھے۔" اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کرامتیں بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائنتی چراغ روشن کر دیے۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے اللہ ہو کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

چھ مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے۔ سات ایک طرف اور سات دوسری طرف۔ بیچ میں چوڑی چکلی سڑک تھی۔ ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دکانیں تھیں۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ وسیع برآمدہ تھا۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لیے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھی۔ جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگ

مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدے کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لیے تھا۔ اس میں سنگ مرمر کے نازک نازک ستون بنائے گئے تھے۔ دیواروں پر خوش نما پچی کاری کی گئی تھی۔ فرش سبز چمک دار پتھر کا بنایا گیا تھا۔ جب سنگ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرش زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں۔

بدھ کا شبھ دن اس بستی میں آنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی۔ بستی کے کھلے میدان میں زمین کو صاف کرا کر شامیانے نصب کر دیے گئے۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبو تین تین کوس سے فقیروں اور کتوں کو کھینچ لائی۔ دوپہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس جہاں لنگر تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کروایا اور دھلوایا گیا۔ اور اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی۔ اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا۔ گاؤ تکیے لگا دیے گئے۔ پان دان۔ پیک دان، پنچیاں اور گلاب پاش رکھ دیے گئے۔ اور راگ رنگ کی محفل جمائی گئی۔ دور دور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا۔ جو ان کی سہیلیاں یا برادری کی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آئے جن کے لیے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کے رخ چقیں ڈال دی گئیں۔ بے شمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ ان بیسواؤں کے تندرست سیاہ فام سازندے زربفت اور کمخواب کی شیروانیاں پہنے عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے ادھر ادھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پر سے بھی باریک ساریوں میں ملبوس، غازوں اور خوشبوؤں میں بسی ہوئی نازنینیں اٹکھیلیوں سے چلتیں۔ رات بھر رقص و سرود کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی تو یہ بیسوائیں ساز و سامان کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہوئیں۔ جھاڑ، فانوس، ظروف بلوری، قد آدم آئینے، نواڑی پلنگ، تصویریں اور قطعات سنہری چوکھٹوں میں جڑے ہوئے لائے گئے اور قرینے سے کمروں میں لگائے گئے۔ اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کمل کانٹے سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصہ

استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لیتے، غزلیں یاد کرتے، دھنیں بٹھاتے، سبق پڑھتے، تختی لکھتے، سینے پروتے، کاڑھتے، گراموفون سنتے استادوں سے تاش اور کیرم کھیلتے شطرنج کھیلتیں، نوک جھونک سے جی بہلاتے یا سوتے میں گزارتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں۔ جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال نکال کر لب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے بعد وہ بناؤ سنگار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا، مکان گیسوں کی روشنی سے جگمگا اٹھتے جو جا بجا سنگِ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائے گئے تھے۔ اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو پھول پتیوں کی وضع کے کاٹ کر جڑے گئے تھے۔ ان کی قوسِ قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دور سے جھل مل جھل مل کرتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ بیسوائیں بناؤ سنگار کئے برآمدوں میں ٹہلتیں، آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں۔ ہنستی کھلکھلاتیں، جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے۔ اور یہ چھالیا کترتی رہتیں۔ جب رات ذرا بھیگ جاتی تو ان کے ملنے والے نوکروں میں شراب کی بوتلیں اور پھل پھلاری لئے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔ اس بستی میں ان کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگتی۔ نغمہ و سرود۔ ساز کے سر۔ رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگھروؤں کی آواز قلقلِ مینا میں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ دکانوں کے کرایہ دار پیدا ہو گئے جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دکاندار آیا وہ وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پر کرنے کے لئے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگرٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھا لائے اور اسے ممبر کے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں رنگ دار پانی بھر دیا گیا تاکہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں۔ بڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگرٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی ہوئی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی۔ بعض ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں بھی پرانے فلمی رسالوں سے نکال کر لئی سے دیواروں پر چپکا دیں۔ دکان کا اصل مال دو تین قسم کے سگرٹ کے تین تین چار چار پیکٹوں بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں، دیا سلائی کی نصف درجن ڈبیوں، پانوں کی ایک ڈھولی، پینے کے تمباکو کی تین چار

ٹکیوں اور موم بتی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا، تیسری میں حلوائی اور شیر فروش، چوتھی میں قصائی، پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں ایک کنجڑا آ بسے۔ کنجڑا آس پاس کے دیہات سے سستے داموں چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا۔ اور یہاں خاصے منافع پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا۔ چونکہ دکان خاصی کھلی تھی۔ ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار، گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا۔ اور شام کو انہیں چنگیر میں ڈال کر ایک ایک مکان پر لے جاتا۔ اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ ایک ایک دو دو گھڑی بیٹھ کے سازندوں سے گپ شپ بھی ہانک لیتا۔ اور حقے کے دم بھی لگا آتا۔ جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی............ اس کی موجودگی ہی میں کوٹھے پر چڑھ آتی۔ اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھنٹوں اٹھنے کا نام نہ لیتا۔ مزے سے گانے پر سر دھنتا اور بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا۔ جس دن رات زیادہ گزر جاتی اور کوئی یار نہ رہتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دکان میں ایک بیسوا کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے۔ سینے کی ایک مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آ گیا۔ اور اپنے ساتھ ایک رنگریز کو بھی لیتا آیا۔ اس کی دکان کے باہر الگنی پر لٹکے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے ہرے دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجیے بساطی نے جس کی دکان شہر میں چلتی نہ تھی، بلکہ اسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا شہر کو خیرباد کہہ کر اس بستی کا رخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اور اس کے طرح طرح کے لونڈر، قسم قسم کے پاؤڈر، صابن، کنگھیاں، بٹن، سوئی، دھاگا، لیس، فیتے، خوشبودار تیل، رومال، منجن وغیرہ کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکاندار، کوئی بزاز، کوئی پنساری، کوئی نیچہ بند، کوئی نانبائی مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھتے ہوئے کرایے سے گھبرا کر اس بستی میں آ پناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور گلیوں اور دواخانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لے شہر سے اٹھ آئے۔ اور

اس بستی میں ایک دکان کرائے پر لی لے۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں، شربت کی بوتلوں اور مربے، چٹنی اچار کے مرتبانوں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طب اکبر، قرابادین قادری اور دوسری طبی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں میں جو جگہ خالی بچی، وہاں انھوں نے اپنے خاص الخاص مجربات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پر چپکا کر آویزاں کر دیے۔ ہر روز صبح کو ٹسواؤں کے ملازم گلاس لے لے کر آ موجود ہوتے اور شربت بزوری، شربت بنفشہ، شربت انار اور ایسے ہی اور فرحت بخش، روح افزا شربت و عرق، خمیرہ گاؤ زبان اور تقویت پہنچانے والے مربے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں بچ رہی تھیں ان میں ٹسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چار پائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں تاش چوسر اور شطرنج کھیلتے، بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھوٹتے، بٹیروں کی پالیاں کراتے، تیتروں سے سبحان تیری قدرت کی رٹ لگواتے اور گھڑا بجا بجا کر گاتے۔

ایک ٹسوا کے سازندے نے ایک دکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا اس میں لا بٹھایا۔ دکان کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں، ستار، طنبورے، دلربا وغیرہ ٹانگ دیے گئے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام کو وہ اپنی دکان میں ستار بجاتا جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دکاندار اپنی دکانوں سے اٹھ اٹھ کر آ جاتے اور دیر تک بت بنے ستار سنتے رہتے۔ اس ستار نواز کا ایک شاگرد تھا۔ جو ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا غرض اس ستار نواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملا جی، جب تک تو یہ بستی زیر تعمیر رہی رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے۔ مگر اب جبکہ انھیں دونوں وقت مرغن کھانا با فراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض ٹسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں آنے لگے جس سے ملا جی کو روپے پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجے کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھے ہوئے کرائے اور اپنی بے مائیگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے اس بستی کا رخ کیا۔ اور ان ٹسواؤں کے مکانوں

سے کچھ فاصلے پر میدان میں تنبو کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دیے۔ اس کے ایکٹر اداکاری کے فن سے محض نابلد تھے۔ ان کے ڈریس پھٹے پرانے تھے جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشے بھی بہت پرانے اور دقیانوسی دکھاتے تھے۔ مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔ شہر کے مزدوری پیشہ لوگ، کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غربا جو دن بھر کی کڑی محنت مشقت کی کسر شور و غل، مسخروں اور ادنیٰ عیاشیوں سے نکالنا چاہتے تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے ہنستے بولتے، بانسریاں اور الغوزے بجاتے، راہ چلتوں پر آوازیں کستے، گالی گلوچ کرتے، شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازار حسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا تھیٹر کا ایک مسخرہ تنبو کے باہر ایک اسٹول پر کھڑا کبھی کولہا ہلاتا، کبھی منہ چڑاتا، کبھی آنکھیں مٹکاتا۔ عجیب عجیب حیا سوز حرکتیں کرتا جنھیں دیکھ کر یہ لوگ زور زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہوئے۔ چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے۔ "آؤ کوئی نئی بستی کو۔" شہر سے پانچ کوس تک جو پکی سڑک جاتی تھی اس پر پہنچ کر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کے لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے۔ منہ سے ہارن بجاتے۔ اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دوڑ میں غریب گھوڑوں کا برا حال ہو جاتا۔ اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم دام پر سواریاں بٹھا، طرارے بھرتے اور گھنگرو بجاتے اس بستی کو جانے لگے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبا ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے، جوق جوق اس پراسرار بازار کی سیر دیکھنے آتے۔ جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انھیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ ٹسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے پر تیار نہ ہوئی تھیں۔ اب اس کی دن دونی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے تو جھٹ زمینیں خرید ان ٹسواؤں کے ساتھ ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دیے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اٹھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا

ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں۔ اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکاندار آ بسے جو عیال دار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہو گئی تھی۔ مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لئے درخواست بھیجی گئی جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاک خانہ بھی کھول دیا گیا۔ ایک بڑے میاں ڈاک خانے کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے، کارڈ اور قلم دوات رکھ بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا۔ جس میں سوڈا واٹر کی بوتلوں، چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا۔ اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہئے۔

تھیٹریکل کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی۔ اس پر شہر کے ایک سینما کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی میں بھی ایک سینما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا۔ تاکہ تماشائی اگر بائیسکوپ شروع ہونے سے پہلے آ جائیں۔ تو آرام سے باغیچے میں بیٹھ سکیں ان کے ساتھ بستی کے لوگ یوں ہی ستانے یا سیر دیکھنے کی غرض سے آ آ کر بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصی سیر گاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سقے کٹورا بجاتے اس باغیچے میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کی تیل کی مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے کاندھے پر میلا کچیلا تولیہ ڈالے دل پسند دل بہار مالش کی صدا لگاتے اور سر کے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

سینما کے مالک نے سینما ہال کی عمارت کی بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں تو ہوٹل کھل گیا۔ جس میں رات کو قیام کرنے کے لئے کمرے بھی مل سکتے تھے۔ اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا، ایک فوٹوگرافر، ایک سائیکل کی مرمت والا، ایک لانڈری والا، دو پنواڑی، ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دواخانہ کے آ رہے۔ ہوتے ہوتے پاس ہی ایک دکان میں کلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ فوٹوگرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک

گھڑی ساز نے آ ڈیرا جمایا اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پرزوں میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد بستی میں نل، روشنی اور صفائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے سرخ جھنڈیاں، جریبیں اور اونچ نیچ دیکھنے والے آلے لے لے کر آ پہنچے۔ اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چلنے لگا ......

اس واقعہ کو بیس برس گزر چکے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھرا پرا شہر بن گئی ہے۔ جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن بھی ہے اور ٹاؤن ہال بھی۔ کچہری بھی اور جیل خانہ بھی۔ آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج، دو ہائی اسکول، ایک لڑکوں کے لئے، ایک لڑکیوں کے لئے اور آٹھ پرائمری اسکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سینما ہیں اور چار بنک، جن میں سے دو دنیا کے بڑے بڑے بنکوں کی شاخیں ہیں۔

شہر سے دو روزانہ، تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی، دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی، ایک صنعتی، ایک طبی، ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں بیس مسجدیں، پندرہ مندر اور دھرم سالے، چھ یتیم خانے، پانچ اناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں ایک صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے "حسن آباد" کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا۔ مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی۔ یعنی بجائے "حسن آباد" کے "حسن آباد" کہلانے لگا۔ مگر یہ نام چل نہ سکا کیونکہ عوام حسن اور حسن میں کچھ امتیاز نہ کرتے۔ آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا۔ جس سے یہ بستی آج سے سینکڑوں برس قبل اجڑنے سے پہلے موسوم تھی۔ اور وہ نام ہے "آنندی"۔

یوں تو سارا شہر بھرا پرا، صاف ستھرا اور خوش نما ہے۔ مگر سب سے خوبصورت سب سے بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے جس میں زنانِ بازاری رہتی ہیں۔

آنندی کے بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کا

وجودِ انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں۔ "معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیرِ اثر اس ناپاک طبقے کو ہمارے اس قدیمی اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دے دی گئی......"

اس مرتبہ عورتوں کے رہنے کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا۔

۱۹۴۰ء

جاڑے کی چاندنی

(۱۹۶۰)

اوور کوٹ

جنوری کی ایک شام کو ایک خوش پوش نوجوان ڈیوس روڈ سے گزر کر مال روڈ پر پہنچا اور چیرنگ کراس کا رخ کر کے خراماں خراماں پٹڑی پر چلنے لگا۔ یہ نوجوان اپنی تراش خراش سے خاصا فیشن ایبل معلوم ہوتا تھا۔ لمبی لمبی قلمیں، چمکتے ہوئے بال، باریک باریک مونچھیں گویا سرمے کی سلائی سے بنائی گئی ہوں۔ بادامی رنگ کا گرم اوورکوٹ پہنے ہوئے جس کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا، سر پر سبز فلیٹ ہیٹ ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھی ہوئی، سفید سلک کا گلوبند گلے کے گرد لپٹا ہوا، ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں، دوسرے میں بید کی ایک چھوٹی چھڑی پکڑے ہوئے جسے کبھی کبھی وہ مزے میں آ کے گھمانے لگتا تھا۔

یہ ہفتے کی شام تھی۔ بھرپور جاڑے کا زمانہ۔ سرد اور تند ہوا کسی تیز دھار کی طرح جسم پر آ کے لگتی تھی۔ مگر اس نوجوان پر اس کا کچھ اثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اور لوگ تو خود کو گرم کرنے کے لیے تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے مگر اسے اس کی ضرورت نہ تھی۔ جیسے اس کڑکڑاتے جاڑے میں اسے ٹہلنے میں بڑا مزہ آ رہا ہو۔

اس کی چال ڈھال سے ایسا بانکپن ٹپکتا تھا کہ تانگے والے دور ہی سے دیکھ کے سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کی طرف لپکتے۔ مگر وہ چھڑی کے اشارے سے نہیں کر دیتا۔ ایک خالی ٹیکسی بھی

اسے دیکھ کر رکی مگر اس نے "نو تھینک یو" کہہ کر اسے ٹال دیا۔

جیسے جیسے وہ مال کے زیادہ بارونق حصے کی طرف پہنچتا جاتا تھا۔ اس کی چونچالی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ منہ سے سیٹی بجا کر رقص کی ایک انگریزی دھن نکالنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پاؤں بھی تھرکتے ہوئے اٹھنے لگے۔ ایک دفعہ جب آس پاس کوئی نہیں تھا تو یکبارگی کچھ ایسا جوش آیا کہ اس نے دوڑ کر جھوٹ موٹ بال دینے کی کوشش کی۔ گویا کرکٹ کا کھیل ہو رہا ہو۔

راستے میں وہ سڑک آئی جو لارنس گارڈن کی طرف جاتی تھی۔ مگر اس وقت شام کے دھندلکے اور سخت کہرے میں اس باغ پر کچھ ایسی اداسی برس رہی تھی کہ اس نے ادھر کا رخ نہ کیا اور سیدھا چیرنگ کراس کی طرف چلتا رہا۔

ملکہ کے بت کے قریب پہنچ کر اس کی حرکات و سکنات میں کسی قدر متانت پیدا ہو گئی۔ اس نے اپنا رومال نکالا جسے جیب میں رکھنے کے بجائے اس نے کوٹ کی بائیں آستین میں اڑس رکھا تھا اور ہلکے ہلکے چہرے پر پھیرا۔ تاکہ کچھ گرد جم گئی ہو تو اتر جائے۔ بت کے آس پاس لان کے ایک گوشے میں کچھ انگریز بچے ایک بڑی سی گیند سے کھیل رہے تھے وہ رک گیا۔ اور بڑی دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھنے لگا۔ بچے کچھ دیر تو اس کی نظروں سے بے پروا کھیل میں مصروف رہے۔ مگر جب وہ تکے ہی چلا گیا تو وہ رفتہ رفتہ شرمانے سے لگے اور پھر اچانک گیند سنبھال ہنستے ہوئے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ گھاس کے اس ٹکڑے ہی سے چلے گئے۔

نوجوان کی نظر سیمنٹ کی ایک خالی بنچ پر پڑی اور وہ اس پر آ کے بیٹھ گیا۔ اس وقت شام کے اندھیرے کے ساتھ ساتھ سردی اور بھی بڑھتی جا رہی تھی اس کی یہ شدت ناخوشگوار نہ تھی۔ بلکہ لذت پرستی کی ترغیب دیتی تھی۔ شہر کے عیش پسند طبقے کا تو کہنا ہی کیا وہ تو اس بہانے کچھ زیادہ ہی کھل کھیلتا ہے تنہائی میں بسر کرنے والے بھی اس سے ورغلائے جاتے ہیں اور وہ اپنے کونوں کھدروں سے نکل محفلوں اور مجمعوں میں جانے کی سوچنے لگتے ہیں تاکہ جسموں کے قرب سے گرمی حاصل ہو۔ حصول لذت کی یہی جستجو لوگوں کو مال پر کھینچ لائی تھی۔ اور وہ حسب توفیق ریستورانوں، کافی ہاؤسوں، رقص گاہوں، سنیماؤں اور تفریح کے دوسرے مقاموں پر محظوظ ہو رہے تھے۔

مال روڈ پر موٹروں، تانگوں اور بائیسکلوں کا تانتا بندھا ہوا تو تھا ہی پٹڑی پر چلنے والوں کی بھی کثرت تھی۔ علاوہ ازیں سڑک کی دو رویہ دکانوں میں خرید و فروخت کا بازار بھی گرم تھا۔ جن کم نصیبوں کو نہ تفریح طبع کی استطاعت تھی نہ خرید و فروخت کی وہ دور ہی سے کھڑے کھڑے ان تفریح گاہوں اور

دکانوں کی رنگا رنگ روشنیوں سے جی بہلا رہے تھے۔

نوجوان سمنٹ کی بنچ پر بیٹھا اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے زن و مرد کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر ان کے چہروں سے کہیں زیادہ ان کے لباس پر پڑتی تھی۔ ان میں ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ تھے۔ بڑے بڑے تاجر، سرکاری افسر، لیڈر، فنکار، کالجوں کے طلبا اور طالبات، نرسیں، اخباروں کے نمائندے، دفتروں کے بابو۔ زیادہ تر لوگ اوورکوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ہر قسم کے اوورکوٹ قراقلی کے بیش قیمت اوورکوٹ سے لے کر خاکی پٹی کے پرانے فوجی اوورکوٹ تک جسے نیلام میں خریدا گیا تھا۔

نوجوان کا اپنا اوورکوٹ تھا تو خاصا پرانا مگر اس کا کپڑا خوب بڑھیا تھا۔ پھر وہ سلا ہوا بھی کسی ماہر درزی کا تھا۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بہت دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ کالر خوب جما ہوا تھا باہوں کی کریزیں بڑی نمایاں، سلوٹ کہیں نام کو نہیں۔ بٹن سینگ کے بڑے بڑے چمکتے ہوئے۔ نوجوان اس میں بہت مگن معلوم ہوتا تھا۔

ایک لڑکا پان بیڑی سگرٹ کا صندوقچہ گلے میں ڈالے سامنے سے گزرا تو نوجوان نے آواز دی۔

"پان والا"

"جناب؟"

"دس کا چینج ہے؟"

"ہے تو نہیں۔ لا دوں گا۔ کیا لیں گے آپ؟"

"نوٹ لے کے بھاگ گیا تو؟"

"اجی واہ۔ کوئی چور اچکا ہوں جو بھاگ جاؤں گا۔ اعتبار نہ ہو تو میرے ساتھ چلیے۔ لیں گے کیا آپ؟"

"نہیں نہیں ہم خود چینج لائے گا۔ لو یہ اکنی نکل آئی۔ ایک سگرٹ دے دو اور چلے جاؤ۔"

لڑکے کے جانے کے بعد مزے مزے سے سگرٹ کے کش لگانے لگا۔ وہ ویسے ہی بہت خوش نظر آتا تھا سگرٹ کے دھوئیں نے اس پر سرور کی کیفیت طاری کر دی۔

ایک چھوٹی سی سفید رنگ کی بلی سردی میں ٹھٹھری ہوئی بنچ کے نیچے اس کے قدموں کے پاس آکر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ اس نے پچکارا تو اچھل کر بنچ پر آ چڑھی۔ اس نے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا:

"پور لٹل سول!"

اس کے بعد وہ بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور سڑک کو پار کر کے اس طرف چلا جدھر سینما کی رنگ برنگی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ تماشا شروع ہو چکا تھا۔ سینما کے برآمدے میں بھیڑ نہ تھی۔ صرف چند لوگ تھے جو آنے والی فلموں کی تصویروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہ تصویریں چھوٹے بڑے کئی بورڈوں پر چسپاں تھیں۔ ان میں کہانی کے چیدہ چیدہ مناظر دکھائے گئے تھے۔

تین نوجوان اینگلو انڈین لڑکیاں ان تصویروں کو ذوق و شوق سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک خاص شان استغنا کے ساتھ مگر صنف نازک کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے۔ وہ بھی ان کے ساتھ ساتھ مگر مناسب فاصلے سے ان تصویروں کو دیکھتا رہا۔ لڑکیاں آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتی جاتی تھیں اور فلم پر رائے زنی بھی۔ اتنے میں ایک لڑکی نے جو اپنی ساتھ والیوں سے زیادہ حسین بھی تھی اور شوخ بھی دوسری لڑکی کے کان میں کچھ کہا۔ جسے سن کر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور پھر وہ تینوں ہنستی ہوئی باہر نکل گئیں۔ نوجوان نے اس کا کچھ اثر قبول نہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ خود بھی سینما کی عمارت سے باہر نکل گیا۔

اب سات بج چکے تھے اور وہ مال کی پٹری پر پھر پہلے کی طرح مٹر گشت کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس ایک ریستوران میں آرکسٹرا بج رہا تھا۔ اندر سے کہیں زیادہ باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ان میں زیادہ تر موٹروں کے ڈرائیور، کوچوان، پھل بیچنے والے جو اپنا مال بیچ کے خالی ٹوکرے لیے کھڑے تھے۔ کچھ راہ گیر جو چلتے چلتے ٹھہر گئے تھے۔ کچھ مزدوری پیشہ لوگ تھے اور کچھ گداگر۔ یہ اندر والوں سے کہیں زیادہ گانے کے رسیا معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ غل غپاڑہ نہیں مچا رہے تھے بلکہ خاموشی سے نغمہ سن رہے تھے حالانکہ دھن اور ساز اجنبی تھے۔ نوجوان پل بھر کے لیے رکا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دور چل کے اسے انگریزی موسیقی کی ایک بڑی سی دکان نظر آئی اور وہ بلا تکلف اندر چلا گیا۔ ہر طرف شیشے کی الماریوں میں طرح طرح کے انگریزی ساز رکھے ہوئے تھے۔ ایک لمبی میز پر مغربی موسیقی کی دو ورقی کتابیں چنی تھیں۔ یہ نئے چلتر گانے تھے۔ سرورق خوبصورت رنگدار مگر دھنیں گھٹیا۔ ایک اچٹتی ہوئی نظر ان پر ڈالی پھر وہاں سے ہٹ آیا اور سازوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک ہسپانوی گٹار پر جو ایک کھونٹی سے ٹنگی ہوئی تھی ناقدانہ نظر ڈالی اور اس کے ساتھ قیمت کا جو ٹکٹ لٹک رہا تھا اسے پڑھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک بڑا جرمن پیانو رکھا ہوا تھا۔ اس کا کور اٹھا کے انگلیوں سے بعض پردوں کو ٹٹولا اور پھر کور بند کر دیا۔

پیانوں کی آواز سن کر دکان کا ایک کارندہ اس کی طرف بڑھا۔

"گڈ ایوننگ سر۔ کوئی خدمت؟"

"نہیں شکریہ۔ ہاں گراموفون ریکارڈوں کی فہرست دے دو اس مہینے کی۔"

فہرست لے کے اوور کوٹ کی جیب میں ڈالی۔ دکان سے باہر نکل آیا اور پھر چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں ایک چھوٹا سا بک اسٹال آیا۔ نوجوان یہاں بھی رکا کئی تازہ رسالوں کے ورق الٹے۔ رسالہ جہاں سے اٹھاتا بڑی احتیاط سے وہیں رکھ دیتا۔ اور آگے بڑھا تو قالینوں کی ایک دکان نے اس کی توجہ کو جذب کیا۔ مالک دکان نے جو ایک لمبا سا چغہ پہنے اور سر پر کلاہ رکھے تھا گرمجوشی سے اس کی آؤ بھگت کی۔

"ذرا یہ ایرانی قالین دیکھنا چاہتا ہوں۔ اتاریئے نہیں یہیں دیکھ لوں گا۔ کیا قیمت ہے اس کی؟"

"چودہ سو تیس روپے۔"

نوجوان نے اپنی بھنوؤں کو سکیڑا جس کا مطلب تھا "اوہو اتنی!"

دکاندار نے کہا "آپ پسند کر لیجئے ہم جتنی بھی رعایت کر سکتے ہیں کر دیں گے۔"

"شکریہ لیکن اس وقت تو میں صرف ایک نظر دیکھنے آیا ہوں۔"

"شوق سے دیکھئے آپ ہی کی دکان ہے۔"

وہ تین منٹ کے بعد اس دکان سے بھی نکل آیا۔ اس کے اوور کوٹ کے کاج میں شرتی رنگ کے گلاب کا جو ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا تھا وہ اس وقت کاج سے کچھ زیادہ باہر نکل آیا تھا۔ جب وہ اس کو ٹھیک کر رہا تھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف اور پراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے پھر اپنی مٹرگشت شروع کر دی۔

اب وہ ہائی کورٹ کی عمارتوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اتنا کچھ چل لینے کے بعد بھی اس کی فطری چونچالی میں کچھ فرق نہیں آیا تھا۔ نہ تکان محسوس ہوئی تھی نہ اکتاہٹ۔ یہاں سڑک پر چلنے والوں کی ٹولیاں کچھ چھٹ سی گئی تھیں اور ان میں کافی فصل رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بید کی چھڑی کو ایک انگلی پر گھمانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی اور چھڑی زمین پر گر پڑی۔ "او سوری" کہہ کر زمین پر جھکا اور چھڑی کو اٹھا لیا۔

اس اثنا میں ایک نوجوان جوڑا جو اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا اس کے پاس سے گزر کر آگے نکل آیا۔ لڑکا دراز قامت تھا اور سیاہ کوڈرائے کی پتلون اور زپ والی چمڑے کی جیکٹ پہنے تھا اور لڑکی

سفید ساٹن کی گھیر دار شلوار اور سبز رنگ کا کوٹ۔ وہ بھاری بھرکم سی تھی۔ اس کے بالوں میں ایک لمبا سا سیاہ چٹلا گندھا ہوا تھا جو اس کی کمر سے بھی نیچا تھا۔ لڑکی کے چلنے سے اس کے چٹلے کا پھندنا اچھلتا کودتا پے در پے اس کے فربہ جسم سے ٹکراتا تھا۔ نوجوان کے لئے جو اب ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا یہ نظارہ خاصا جاذب نظر تھا۔ وہ جوڑا کچھ دیر تک تو خاموش چلتا رہا۔ اس کے بعد لڑکے نے کچھ کہا جس کے جواب میں لڑکی اچانک چمک کر بولی:

"ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔"

"سنو میرا کہنا مانو" لڑکے نے نصیحت کے انداز میں کہا "ڈاکٹر میرا دوست ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔"

"نہیں نہیں نہیں۔"

"میں کہتا ہوں تمہیں ذرا تکلیف نہ ہوگی۔"

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔

"تمہارے ماں باپ کو کتنا رنج ہوگا۔ ذرا ان کی عزت کا بھی تو خیال کرو۔"

"چپ رہو ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

نوجوان نے شام سے اب تک اپنی مٹرگشت کے دوران میں جتنی انسانی شکلیں دیکھی تھیں ان میں سے کسی نے بھی اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کیا تھا۔ فی الحقیقت ان میں کوئی جاذبیت تھی ہی نہیں۔ یا پھر وہ اپنے حال میں ایسا مست تھا کہ کسی دوسرے سے اسے سروکار ہی نہ تھا۔ مگر اس دلچسپ جوڑے نے جس میں کسی افسانے کے کرداروں کی سی ادا تھی جیسے یکبارگی اس کے دل کو موہ لیا تھا اور اسے حد درجہ مشتاق بنا دیا کہ وہ ان کی اور بھی باتیں سنے اور ہو سکے تو قریب سے ان کی شکلیں بھی دیکھ لے۔

اس وقت وہ تینوں بڑے ڈاک خانے کے چوراہے کے پاس پہنچ گئے تھے۔ لڑکا اور لڑکی پل بھر کو رکے اور پھر سڑک پار کر کے میکلوڈ روڈ پر چل پڑے۔ نوجوان مال روڈ پر ہی ٹھہرا رہا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ فی الفور ان کے پیچھے گیا تو ممکن ہے انہیں شبہ ہو جائے کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اس لئے اسے کچھ لمحے رک جانا چاہئے۔

جب وہ لوگ کوئی سو گز آگے نکل گئے تو اس نے لپک کر ان کا پیچھا کرنا چاہا۔ مگر ابھی اس نے آدھی ہی سڑک پار کی ہوگی کہ اینٹوں سے بھری ہوئی ایک لاری پیچھے سے بگولے کی طرح آئی اور اسے

نکلتی ہوئی میکلوڈ روڈ کی طرف نکل گئی۔ لاری کے ڈرائیور نے نوجوان کی چیخ سن کر پل بھر کے لئے گاڑی کی رفتار کم کی۔ پھر وہ سمجھ گیا کہ کوئی لاری کی لپیٹ میں آ گیا۔ اور وہ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لاری کو لے بھاگا۔ دو تین راہ گیر جو اس حادثے کو دیکھ رہے تھے شور مچانے لگے۔ نمبر دیکھو نمبر دیکھو۔ مگر لاری ہوا ہو چکی تھی۔

اتنے میں کئی اور لوگ جمع ہو گئے۔ ٹریفک کا انسپکٹر جو موٹر سائیکل پر جا رہا تھا رک گیا۔ نوجوان کی دونوں ٹانگیں بالکل کچل گئی تھیں۔ بہت سا خون نکل چکا تھا اور وہ سسک رہا تھا۔

فوراً ایک کار کو روکا گیا۔ اور اسے جیسے تیسے اس میں ڈال کے بڑے ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔ جس وقت وہ ہسپتال پہنچا تو اس میں ابھی رمق بھر جان باقی تھی۔

اس ہسپتال کے شعبہ حادثات میں اسسٹنٹ سرجن مسٹر خان اور دو نوعمر نرسیں مس شہناز اور مس گل ڈیوٹی پر تھیں۔ جس وقت اسے سٹریچر پر ڈال کے آپریشن روم میں لے جایا جا رہا تھا تو ان نرسوں کی نظر اس پر پڑی۔ اس کا بادامی رنگ کا اوور کوٹ ابھی تک اس کے جسم پر تھا۔ اور سفید سلک کا مفلر گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے کپڑوں پر جا بجا خون کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ کسی نے از راہ دردمندی اس کی سبز فلیٹ ہیٹ اٹھا کے اس کے سینے پر رکھ دی تھی تاکہ کوئی اڑا نہ لے جائے۔

شہناز نے گل سے کہا:

”کسی بھلے گھر کا معلوم ہوتا ہے بے چارہ۔“

گل دبی آواز میں بولی:

”خوب بن ٹھن کے نکلا تھا بے چارہ ہفتے کی شام منانے۔“

”ڈرائیور پکڑا گیا یا نہیں؟“

”نہیں بھاگ گیا۔“

”کتنے افسوس کی بات ہے۔“

آپریشن روم میں اسسٹنٹ سرجن اور نرسیں چہروں پر جراحی کے نقاب چڑھائے جنہوں نے ان کی آنکھوں سے نیچے کا سارا حصہ چھپا رکھا تھا اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ اسے سنگ مرمر کی میز پر لٹا دیا گیا۔ اس نے سر میں جو تیز خوشبودار تیل ڈال رکھا تھا اس کی کچھ کچھ مہک ابھی تک باقی تھی۔ پٹیاں ابھی تک جمی ہوئی تھیں۔ حادثے سے اس کی دونوں ٹانگیں تو ٹوٹ چکی تھیں مگر سر کی مانگ نہیں بگڑنے پائی تھی۔

اب اس کے کپڑے اتارے جا رہے تھے۔ سب سے پہلے سفید سلک کا گلوبند اس کے گلے سے اتارا گیا۔ اچانک نرس شہناز اور نرس گل نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ چہرے جو دلی کیفیت کا آئینہ ہوتے ہیں، جراحی کے نقاب تلے چھپے ہوئے تھے اور زبانیں بند۔

نوجوان کے گلوبند کے نیچے نکٹائی اور کالر کیا سرے سے قمیص ہی نہیں تھی۔ اوور کوٹ اتارا گیا تو نیچے سے ایک بہت بوسیدہ اونی سویٹر نکلا۔ جس میں جا بجا بڑے بڑے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں سے سویٹر سے بھی زیادہ بوسیدہ اور میلا کچیلا ایک بنیان نظر آ رہا تھا۔ نوجوان سلک کے گلوبند کو کچھ اس ڈھب سے گلے پر لپیٹے رکھتا تھا کہ اس کا سارا سینہ چھپا رہتا تھا۔ اس کے جسم پر میل کی تہیں بھی خوب چڑھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کم سے کم پچھلے دو مہینے سے نہیں نہایا۔ البتہ گردن خوب صاف تھی اور اس پر ہلکا ہلکا پاؤڈر لگا ہوا تھا۔ سویٹر اور بنیان کے بعد پتلون کی باری آئی اور شہناز اور گل کی نظریں پھر بیک وقت اٹھیں۔

پتلون کو پیٹی کے بجائے ایک پرانی دھجی سے جو شاید کبھی نکٹائی ہو گی خوب کس کے باندھا گیا تھا۔ بٹن اور بکسوے غائب تھے۔ دونوں گھٹنوں پر سے کپڑا مسک گیا تھا اور کئی جگہ کھونچیں لگی تھیں۔ مگر چونکہ یہ حصے اوور کوٹ کے نیچے رہتے تھے اس لئے لوگوں کی ان پر نظر نہیں پڑتی تھی۔

اب بوٹ اور جرابوں کی باری آئی اور ایک مرتبہ پھر مس شہناز اور مس گل کی آنکھیں چار ہوئیں۔ بوٹ تو پرانے ہونے کے باوجود خوب چمک رہے تھے۔ مگر ایک پاؤں کی جراب دوسرے پاؤں کی جراب سے بالکل مختلف تھی۔ پھر دونوں جرابیں پھٹی ہوئی بھی تھیں۔ اس قدر کہ ان میں سے نوجوان کی میلی میلی ایڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

بلا شبہ اس وقت تک وہ دم توڑ چکا تھا۔ اس کا جسم سنگ مرمر کی میز پر بے جان پڑا تھا۔ اس کا چہرہ جو پہلے چھت کی سمت تھا۔ کپڑے اتارنے میں دیوار کی طرف مڑ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جسم اور اس کے ساتھ روح کی اس برہنگی نے اسے خجل کر دیا ہے اور وہ اپنے ہم جنسوں سے آنکھیں چرا رہا ہے۔

اس کے اوور کوٹ کی مختلف جیبوں سے جو چیزیں برآمد ہوئیں، وہ یہ تھیں:

ایک چھوٹی سی سیاہ کنگھی، ایک رومال، ساڑھے چھ آنے، ایک بجھا ہوا آدھا سگریٹ، ایک چھوٹی سی ڈائری جس میں لوگوں کے نام اور پتے لکھے تھے، نئے گراموفون ریکارڈوں کی ایک ماہانہ فہرست اور کچھ اشتہار جو مٹر گشت کے دوران میں اشتہار بانٹنے والوں نے اس کے ہاتھ میں تھما دیے

تھے۔ اور اس نے انھیں اوور کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔

افسوس کہ اس کی بیوی کی چھتری جو ہنگامے کے دوران میں کہیں کھو گئی تھی اس فہرست میں شامل نہ تھی۔

اس کی بیوی

وہ دونوں تیسری منزل کے ایک کمرے میں تھے۔ یہ چھوٹا سا کمرہ اپنی ہلکی نیلی روشنی کے ساتھ باہر سے یوں دکھائی دیتا گویا ٹرین کا کوئی ٹھنڈا ڈبہ ہے۔ جس طرح ریلوے والے گرمی کے موسم میں ''فردوس کیبن'' یا ''خواب کیبن'' وغیرہ شاعرانہ نام رکھ کر بعض خاص گاڑیوں میں جوڑ دیتے ہیں۔

بارشوں کا زمانہ قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ مکانوں میں بسنے والی مخلوق نے پسینے، بدبو اور گھٹن سے نجات پائی تھی۔ فضا میں خصوصاً رات کے وقت خنکی ہونے لگی تھی۔ ہاں جب کوئی بڑا سا کالے رنگ کا پتنگا اپنی تیز بھنبھناہٹ کے ساتھ اندھا دھند کسی برقی قمقمے کے چکر کاٹنے لگتا تو ظاہر ہو جاتا کہ برکھا رت ابھی گئی نہیں۔

''تم بھی ٹھیک اسی طرح سیدھی مانگ نکالا کرتی'' نوجوان نے کہا۔ ''مگر کبھی کبھی وہ گدی تک لے جاتی۔۔۔۔۔۔ یہ طریقہ اس نے ایک بنگالن سے سیکھا تھا۔''

نسرین چپ رہی۔ نظریں قریشی سنگھار میز کے آئینے پر جمائے جس میں اسے اپنا دھندلا دھندلا نیلگوں عکس دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بالوں میں کنگھی کرتی رہی جیسا کہ سونے سے پہلے بعض عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔

نوجوان اس کے پاس ہی چاندنی پر کہنیوں کے بل اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ یوں لیٹنے سے اس کی

سفید سلک کی قمیص اور خاکی زین کی پتلون میں جا بجا سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ اس نے چند لمحے جواب کا انتظار کیا اور پھر کہنا شروع کیا۔۔۔۔۔ "کبھی کبھی وہ اپنے دہنے کان کے پاس سے اپنے سنہرے بالوں کی ایک لٹ نکال کر اسے لام (ل) سا بنا لیا کرتی۔ جو اس کے سرخ و سفید بھرے گال پر بہت بھلی لگتی۔۔۔۔"

نسرین کے چہرے پر خفیف سی اضمحلال کی کیفیت پیدا ہوئی۔ مگر زبان سے اب بھی اس نے کچھ نہ کہا۔ وہ سوچ رہی تھی یہ کیسا مرد ہے۔ جس کے پاس بات کرنے کو بیوی کے سوا اور کوئی موضوع ہی نہیں۔ وہ دو گھنٹے سے برابر اسی عورت کا ذکر کرتے جا رہا تھا۔ جو اب اس دنیا میں موجود نہ تھی۔ ان دو گھنٹوں میں وہ اس نوجوان کی حیاتِ زندگی کے تمام اہم واقعات اور اس کی مرحوم بیوی کی بہت سی عادتوں اور خصلتوں سے واقف ہو چکی تھی۔ یہ کہ اسے شادی سے پہلے ہی اپنی بیوی سے عشق تھا۔ یہ کہ لڑکی کا باپ ان کی شادی کے خلاف تھا مگر ماموں اور چچا حق میں تھے۔ یہ کہ وہ لمبے قد کی تھی۔ اسے گانا سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ ہنستی تو اس کے بائیں گال میں گڑھا پڑ جاتا۔ اسے حنا کا عطر بہت مرغوب تھا۔۔۔ وہ کروشیے سے موزے بہت اچھے بنا لیا کرتی۔۔۔

شروع شروع میں نسرین کو اس ذکر سے کچھ یونہی سی دلچسپی ہوئی تھی جیسا کہ ابتدا میں عموماً ایک عورت کو دوسری عورت کے ذکر سے ہوا کرتی ہے۔ مگر جلد ہی وہ اس سے بیزار ہو گئی تھی اور آخر جب اس کی جمائیاں اور انگڑائیاں بھی اس موضوع سے اس کا پیچھا نہ چھڑا سکیں تو زچ ہو کر اس نے چپ سادھ لی تھی۔

وہ اب چوٹی کر کے جوڑا باندھ چکی تھی اور ان پنوں اور کلپوں کو جن سے وہ اپنے بالوں کی آرائش میں مدد لیا کرتی۔ فرش سے اٹھا اٹھا کر سنگھار میز کے خانے میں ڈال رہی تھی۔ اس اثنا میں نوجوان کی نظریں اس کی گوری گوری انگلیوں کی خفیف ترین حرکات کا بھی تعاقب کرتی رہی تھیں۔

دو منٹ خاموشی میں گزر گئے۔

کئی دن ہوئے اس نوجوان نے نسرین کو دیکھا تھا اسے دیکھتے ہی اسے اپنی مرحوم بیوی کی یاد بے طرح ستانے لگی تھی اور وہ اس سے ملنے کی تدبیریں کرنے لگا تھا اور آخر جب اس نے اس قدر روپیہ جمع کر لیا کہ وہ راتوں کے لئے اس عورت کو خرید سکے تو اس نے سیدھا اس کے گھر کا رخ کیا۔

"میری بیوی۔۔۔۔"

"تو گویا بہت محبت تھی آپ کو بیگم صاحبہ سے۔" یکا یک نسرین نے بات کاٹ کر کہا۔ جب

ایک آدمی بولے ہی چلا جائے تو دوسرا کب تک چپ رہ سکتا ہے۔

"بے حد" بے ساختہ نوجوان کے منہ سے نکلا۔ وہ اس کے طنز کو نہیں سمجھ سکا تھا۔

"مگر صاحب آپ کی باتیں بھی عجیب ہیں۔" ایک انتقامی جذبہ اس میں بیدار ہو رہا تھا۔ "سمجھ میں نہیں آتا وہ کیسی محبت تھی جو اس کے مرنے کے تین ہی مہینے بعد تو چھو ہو گئی، اور اب۔۔۔۔"

وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔ شاید اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ نوجوان اس کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر گم سم رہا۔ پھر اس نے اپنی صاف اور روشن آنکھیں اٹھا کر جن میں گھبراہٹ یا گنہگارانہ ندامت کی کوئی علامت نہ تھی، نسرین کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر وہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا کہ شاید لیٹے رہنے سے وہ اپنی مدافعت پورے طور پر نہ کر سکے۔ اس کے ہونٹ ہلے پھر لرزے مگر زبان کچھ نہ کہہ سکی۔

چند لمحوں تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد نسرین انگڑائی لیتی ہوئی اور بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل گئی۔

کوئی پاؤ گھنٹے بعد وہ واپس آئی۔ زیور وغیرہ اس نے اتار دیئے تھے۔۔۔ اور شب خوابی کے لئے ایک سادہ سی اجلی دھوتی باندھ لی تھی۔ وہ اس قدر آہستہ سے داخل ہوئی کہ نوجوان نے اس کے قدموں کی چاپ تک نہیں سنی۔ وہ چاندنی پر پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کی عمر چوبیس پچیس برس سے کم نہ ہوگی۔ مگر اس وقت برقی لیمپ کی مدھم نیلی روشنی میں وہ اپنی چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھوں، گھنے ابروؤں اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کالج کی کسی ابتدائی جماعت کا طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سامنے چاندنی پر مسہری کے پائے کے برابر ایک سیاہ پتنگا چت پڑا تھا۔ جو شاید برقی قمقمے سے ٹکرا کر نیچے آ رہا تھا۔ پتنگا اپنی ننھی ننھی بال سی ٹانگیں ہوا میں ہلا ہلا کر اور سر کو فرش پر رگڑ رگڑ کر سیدھا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر جہاں اسے ذرا کامیابی ہوتی، نوجوان ایک بجھی ہوئی دیا سلائی کے سرے سے پھر اسے اوندھا کر دیتا۔

جب نسرین بالکل اس کے سر پر آ کھڑی ہوئی تو وہ چونک پڑا۔

"اوہ آپ ہیں" اور اس نے کچھ شرمندہ سا ہو کر پتنگے کو دیا سلائی سے پرے اچھال دیا۔

"بیگم صاحب کے مرنے کا رنج تو بہت ہوا ہوگا آپ کو؟" یہ سوال کر کے وہ خود حیران رہ گئی۔

نوجوان نے لمحہ بھر تامل کیا اور پھر سنجیدہ لہجے میں کہنا شروع کیا:

"نہیں۔ شروع شروع میں کچھ ایسا غم نہیں ہوا تھا۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایسا ہو گیا ہے۔ مگر

میں زیادہ دیر اس قریب میں نہ رہ سکے۔ میں بیمار پڑ گیا۔ مہینہ بھر چارپائی پر پڑا رہا۔ جب میری حالت بہت خراب ہو جاتی تو امی جان اور ذرہ بڑی سی میری چھوٹی بہن کا نام ہے میرے سرہانے آ کر کھڑی ہو جاتی اور ایسی چپ چپ سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتیں کہ میں جلدی سے آنکھیں بند کر لیتا اور سوچتا کہ مر رہا ہوں۔۔۔۔۔ اس کے بعد میں رفتہ رفتہ تندرست ہوتا گیا۔

اس کے لہجے نے نسرین کو متاثر کیا۔

دو تین لمحے پھر دونوں چپ رہے۔

''آپ نے کہا تھا'' اچانک نسرین کے لہجے میں شوخی جھلکنے لگی۔ ''میری شکل بیگم صاحب سے ملتی جلتی ہے۔ بھلا کیا چیز ملتی ہے؟''

نوجوان نے پل بھر غور کیا۔

''سب سے زیادہ تمہاری آنکھیں مجھی سے ملتی ہیں۔'' یہ کہتے وقت اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ مگر لہجے سے ابھی افسردگی کا اثر دور نہیں ہوا تھا۔ ''ویسی ہی سیاہ اور گہری۔ دوسرے تیسرے ٹھوڑی ویسی ہی پتلی اور تیسرے ٹھہر پر۔۔۔۔''

''چلیے جانے دیجیے بس۔''

''تمہارے بال، تمہاری گردن۔۔۔۔''

نوجوان کی فطری جو ہچکی تیزی سے بحال ہو رہی تھی اور نسرین خود کو روکے ہوئے تھی کہ اس سلسلے میں کوئی اور سوال نہ کر بیٹھے۔

آدھ گھنٹے بعد روشنی گل کر دی گئی تھی۔ اور وہ دونوں کھڑکی کے پاس پلنگ پر دراز ہو گئے تھے۔ نوجوان جو رات کو جلد ہی سو جانے کا عادی تھا زیادہ دیر تک نہ جاگا۔ مگر نسرین آنکھیں کھولے دیر تک کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتی رہی۔

یہ قمری مہینے کی آخری تاریخوں کی ایک رات تھی۔ آسمان صاف مگر تاریک تاریک سا تھا ستارے اس قدر تیزی سے چمک رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا زمین کے قریب سرک آئے ہیں۔ نسرین ستاروں کو ہمیشہ دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی۔ سب سے پہلے جب وہ ستاروں سے آشنا ہوئی تھی۔ اس کی عمر چار برس کی تھی۔ ماں مر چکی تھی مگر باپ زندہ تھا۔ اس نے باپ کے ساتھ ریل گاڑی میں ایک لمبا سفر کیا تھا۔ آدھی رات کو وہ دونوں ایک چھوٹے سے دیہاتی اسٹیشن پر اترے تھے۔ اسی اسٹیشن پر لالٹین کی مدھم روشنی میں ایک موٹے تنگ دھڑنگ فقیر نے اسے ایسی لال لال ڈراونی آنکھوں سے گھورا تھا

کہ اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ اور وہ بے اختیار باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔ کچھ دیر دونوں اسٹیشن ہی پر ٹھہرے رہے مگر سواری نہ ملی۔ آخر باپ نے اسے گود میں لے لیا۔ گٹھری بغل میں ماری اور اندھیرے گھپ میں پیدل چلنا شروع کر دیا۔

یہ سفر بھی بہت لمبا تھا مگر اس کی سہمی ہوئی نظروں نے جلد ہی ستاروں کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ ان کو دیکھ کر اس کا ڈر کم ہونے لگا تھا۔ یہاں تک کہ وہ باپ کے کندھے سے لگ کر سو گئی۔ آنکھ کھلی تو خود کو ایک اجنبی عورت کے گھر پایا۔ وہ کئی دن تک روتی بلکتی رہی۔ مگر باپ کی صورت دیکھنا اسے پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔۔۔۔

صبح کو نسرین کی آنکھ کھلی تو سورج خاصا نکل آیا تھا۔ اٹھتے ہی سب سے پہلے اسے جو احساس ہوا یہ تھا کہ نوجوان اس کے بستر پر موجود نہیں۔ اس نے سوچا غسل خانے میں ہوگا کھلے کھلے بستر پر کروٹیں بدلنے لگی۔

جب پاؤ گھنٹہ گزر گیا اور نوجوان کہیں نظر نہ آیا تو اسے الجھن ہونے لگی جمن جھاڑو لئے کمرے میں آیا تو اس سے پوچھا۔

''وہ رات والے بابو کہاں ہیں؟''

''چلے گئے''

''چلے گئے؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

جی ہاں تڑکے صبح، ہم سب سو رہے تھے۔ دروازہ بھی تو کھلا ہی چھوڑ گئے۔''

''ویسے تو سب خیریت ہے نا؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

''جی سب خیریت ہے'' جمن اس کا مطلب فوراً سمجھ گیا۔ ''میں نے اٹھتے ہی سب دیکھ بھال لیا تھا۔''

اپنے شبہے کے گھٹیا پن پر اسے شرم آ گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحہ اس خیال نے اس پر تسلط جما لیا کہ وہ نوجوان چلا کیوں گیا۔ اس نے سوچا بات اسے میرا طعنہ برا لگا وہ بڑا حساس تھا۔ اوپر اوپر سے ہنستا بولتا رہا صبح ہوتے ہی چل دیا۔

منہ ہاتھ دھو کر نیچے پھوپھی کے پاس جانے کو تھی کہ اچانک کسی کے جلد جلد سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی تو جوان گیا نہیں تھا۔ وہ رومال میں کچھ باندھے لئے آ رہا تھا۔

''معاف کرنا'' اس نے اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

''میں تمہیں بتائے بغیر ہی چلا گیا۔ میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ یہ لو'' یہ کہہ کر اس نے رومال نسرین کے ہاتھ میں دے دیا۔

''کیا ہے؟'' نسرین نے پوچھا۔

''گوشت ترکاری'' یہ کہہ کر وہ مسکرانے لگا، جیسے اس نے کوئی شرارت کی ہو۔

''گوشت ترکاری؟ کس نے کہا تھا لانے کو؟''

''کہا کسی نے نہیں۔ بات یوں ہے جب بیگم زندہ تھیں میں یوں ہی منہ اندھیرے سے جگائے بغیر گھر سے نکل جاتا۔ ہوا خوری کی ہوا خوری ہو جاتی اور گھر کا سودا بھی لے آتا۔ انہیں نوکر رکھنے کی توفیق نہیں تھی۔ بس یوں ہی ٹل ہانت کے کام کیا کرتے۔ وہ گھر کا اور میں باہر کا۔۔۔۔ دراصل بات یہ ہے کہ گوشت کیمہ وا اور تازہ ہے تو سستا ہوتا ہے اور اچھا بھی۔ اور گرد اور سستے ہیں۔ نوکر کا باپ بھی ایسا گوشت نہیں لا سکتا۔ اور پھر ذرا یہ پالک تو دیکھو، آج ہی شہر میں آئی ہے۔ پھر پیاز بھی ہے ہری مرچیں بھی اور ادرک بھی اور دھنیا بھی۔''

نوجوان داڑھی بھی منڈوا آیا تھا۔ تھوڑا سا صابن اس کے کانوں کی لوؤں پر ابھی تک لگا رہ گیا تھا۔ نسرین کا جی چاہا کہ وہ دوپٹے کے دامن سے صابن کو پونچھ دے۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔

''آپ نے ناحق تکلیف کی۔'' نسرین نے کہا ''خیر اب لے آئے تو میں ثمن کو بلاتی ہوں۔''

''نہیں۔ نہیں اسے مت بلاؤ۔''

''کیوں؟''

''میں کھانا خود پکاؤں گا۔ جب بیگم زندہ تھیں تو کبھی کبھی میں ہنڈیا پکایا کرتا۔ وہ سامنے مونڈھے پر بیٹھی مجھے بتاتی رہتیں۔۔۔۔''

''ہمارا ثمن بھی بہت ہوشیار ہے'' نسرین نے کہا ''ایسا کھانا پکاتا ہے کہ زبان چٹخارے لیتی رہ جاتی ہے۔''

''نہیں صاحب'' نوجوان نے قطعی فیصلہ کرتے ہوئے کہا ''بیگم یہ پالک ایک خاص ترکیب سے پکایا کرتی تھیں۔ وہ ترکیب یا تو وہ جانتی تھیں یا میں جانتا ہوں۔۔۔۔ مہربانی کر کے آپ انگیٹھی کو نیچے اور چولہا منگوا دیجئے۔''

نسرین نے اس سلسلے میں کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش سیڑھیوں سے اتر گئی۔

''او بیٹا'' نسرین کی پھوپھی نے اسے دیکھ کر اگالدان میں پیک تھوکتے ہوئے کہا ''میں ابھی

ابھی ثمن سے کہہ رہی تھی کہ تمہارا اور اس کا ناشتہ اوپر لے جائے۔''

''میں ناشتہ نہیں کروں گی، اس کے لئے اوپر بھیج دو۔''

''تم چپ کیوں ہو؟''

''نہیں تو۔۔۔۔!''

''شکل سے تو بڑا کم زبان معلوم ہوتا ہے۔''

نسرین نے کچھ جواب نہ دیا۔

''کیا کر رہا ہے، اس وقت؟'' پھوپھی نے پوچھا

''ہنڈیا کا سودا خرید کر لایا ہے خود ہی پکانے بیٹھا ہے۔''

نسرین کی پھوپھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''سچ!''

''ہاں ہاں''

''بڑا ہی سیدھا سادہ ہے۔''

''خبطی ہے پورا، رات بھر اپنی مری ہوئی بیوی کی باتیں کر کے دماغ چاٹ گیا۔۔۔۔ ثمن کو اس کے پاس بھیج دیجیے ہاتھ بٹاتا رہے گا۔ میں ذرا نوبہار کے ہاں جاتی ہوں۔''

نسرین کا خیال تھا کہ وہ کم سے کم ایک گھنٹہ نوبہار کے ہاں ضرور ٹھہرے گی مگر پاؤ گھنٹہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ اٹھ آئی۔ سیدھی اوپر کی منزل میں پہنچی۔ دیکھا کہ کمرے کے باہر دالان میں انگیٹھی دہک رہی ہے اور نوجوان اس کے پاس ہی ایک چھوٹی دری پر آلتی پالتی مارے بیٹھا پیاز کتر رہا ہے آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں پانی بہہ رہا ہے۔ اس سے ذرا ہٹ کے ثمن بیٹھا بڑے مزے سے یہ تماشا دیکھ رہا ہے۔

''ثمن'' نسرین نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ ''تم بیٹھے منہ کیا تک رہے ہو۔ صاحب سے پیاز لے کر کیوں نہیں کترتے؟''

''میں تو کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں'' ثمن نے منہ بنا کر کہا۔ ''پر صاحب مانتے ہی نہیں۔ مجھ سے آگ جلانے کو کہا میں نے آگ جلا دی۔''

''اچھا تم نیچے جاؤ۔''

جب ثمن چلا گیا تو نسرین نے کہا:

"حضرت یہ اس عمر میں ہنڈ کلھیا پکانے کی کیا سوجھی ہے۔ لائیے پیاز مجھے دیجیے اور جا کر آنکھوں پہ چھینٹے دیجیے۔" اور اس نے ہاتھ بڑھا کر نوجوان کی گود سے پیاز کی رکابی خود ہی اٹھا لی۔ نوجوان نے مزاحمت نہ کی۔

دو گھنٹے کے بعد جب وہ دونوں دسترخوان پر کھانا کھانے بیٹھے تو نوجوان نے کہا:

"معاف کرنا، میری وجہ سے تم کو اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔ بات یہ ہے کہ امی۔۔۔۔"

"باتیں چھوڑیے اور کھانا کھائیے۔"

"واہ کیا مزے کا کھانا پکایا ہے" نوجوان نے پہلا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "امی کے ہاتھ کا مزہ یاد آ گیا۔"

"چلیے زیادہ بنائیے نہیں۔ چپاتیاں تو دیکھئے کیسی ٹیڑھی بینگی ہیں۔"

"چپاتیاں امی کو بھی پکانی نہیں آتی تھیں اور میں زیادہ تر تنور ہی سے روٹیاں منگوا لیا کرتا تھا۔"

"مجھے تنور کی روٹی زہر لگتی ہے۔"

"کبھی کبھی ہم کوئی سستا سا خانساماں بھی رکھ لیا کرتے۔ مگر وہ چند روز سے زیادہ نہ ٹکتا۔ پہلے پہلے تو اچھے گھر کی لو میں رہتا اور پھر کھسک جاتا۔"

کھانے سے فارغ ہو کر دونوں کمرے میں فرش پر بیٹھے۔

"آپ نے کہا تھا" نسرین نے کہا "آج کل آپ کسی دوست کے ہاں رہتے ہیں۔"

"ہاں ابّا کے مرنے کے بعد میں نے امی جان اور زہرہ کو تو گاؤں بھیج دیا تھا۔ اور خود ایک دوست کے ہاں اٹھ آیا تھا۔ یہ دوست بھی میری طرح اکیلا ہی ہے۔ ہم دونوں مکان کے کرائے، کھانے پینے کے خرچ اور نوکر کی تنخواہ میں ساجھی ہیں۔"

"اور آدھی تنخواہ آپ امی جان کو بھیج دیتے ہیں؟"

"ہاں۔ مگر وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے کچھ نہ کچھ لوٹاتی ہی رہتی ہیں۔ کبھی گرم پتلون سلوانے کے لئے کبھی نیا کوٹ خریدنے کے لئے۔"

نسرین نے محسوس کیا کہ اس کی ماں اسے بہت چاہتی ہوگی۔

"اپنی ہمشیرہ کی کیا عمر بتائی تھی آپ نے؟"

"دس برس۔ بڑی پیاری بچی ہے۔"

"اسکول جاتی ہے؟"

"نہیں، گھر میں مولوی صاحب سے پڑھتی ہے۔ سینا پرونا اسے دادی سکھاتی ہے۔ اس نے ایک بکری پالی ہے۔ دودھ سی سفید۔ ایک بھی کالا بال نہیں۔ زہرہ اس کی بڑی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کھیت سے بوٹ توڑ لاتی ہے اپنے ہاتھ سے کھلاتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے پاس ہی چھوٹی سی ندی بہتی ہے۔ وہ اسے وہاں پانی پلانے لے جاتی ہے۔ ایک دن کیا ہوا کہ وہ بکری پانی پی رہی تھی کہ ایک بڑا سا کتا آیا وہ جو زور سے بھونکا تو بکری ڈر کر ندی میں گر پڑی۔ پانی کا بہاؤ تیز تھا۔ وہ اس کے ساتھ بہہ چلی اس پر زہرہ نے چیخ چیخ کر برا حال کر لیا۔ اتفاق سے ایک کسان ادھر سے گذر رہا تھا۔ شور سن کر دوڑا ہوا آیا بڑی مشکل سے بکری کو نکالا تب زہرہ کی جان میں جان آئی۔۔۔۔"

نسرین یہ سادہ سا بے رنگ واقعہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔

اب نوجوان پر کچھ غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ وہ گاؤ تکیے کے سہارے لیٹ گیا رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ سو گیا۔

نسرین اٹھی۔ الماری کے خانے سے سفید ململ کا دوپٹہ اور گوٹا نکالا اور نوجوان کے قریب ہی فرش پر بیٹھ کر دوپٹہ میں گوٹا ٹانکنے لگی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اس کا جی اکتا گیا اور وہ بھی پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔

تیسرے پہر ایک رکشا منگوایا گیا اور وہ دونوں بازار جانے کی تیاری کرنے لگے۔ نوجوان نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اسے کوئی تحفہ خرید کر دینا چاہتا ہے۔ اس نے بغیر کسی شرم و حجاب کے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ نسرین بیس روپے تک کی جو چیز چاہے خرید سکتی ہے اس سے زیادہ کی اسے توفیق نہیں۔

"یہ سچ ہے" اس نے کہا "کہ اتنے کم داموں کی کوئی چیز تمہارے لائق نہیں ہو سکتی۔ مگر میرا جی چاہتا ہے کہ میری کوئی چیز خواہ وہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو تمہارے پاس بطور یادگار رہے۔"

اور وہ اس کے ساتھ چلنے پر رضامند ہو گئی تھی۔ پھوپھی کو اجازت دینے میں تامل ہوا تھا۔ مگر ایک تو نسرین خود جانے پر مصر تھی۔ دوسرے نوجوان کے چہرے سے ایسی معصومیت برس رہی تھی کہ کسی برے ارادے کا گمان تک نہ ہوتا تھا اور وہ خاموش رہ گئی۔

اور اب نسرین نیلے رنگ کا برقعہ اوڑھے نوجوان کے پہلو میں رکشا میں بیٹھی تھی۔ شہر کی کھلی سڑکوں پر ہزاروں عورتوں، مردوں کے بیچ ہوتے ہوئے ہجوم میں یہ جوڑا بھی تھا۔ اسے دیکھ کر کسی کو یہ سوچنے تک کی پروا نہ تھی کہ ان کا رشتہ زن و شوہر کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

وہ رکشا سے اتر کر کئی بازاروں میں سے گزرے۔ کئی دکانوں میں گئے۔ جب وہ سڑک پر چلتی تو وہ اس کے آگے پیچھے راستہ صاف کرتا جاتا۔ آنے جانے والی گاڑیوں موٹروں اور ہجوم کی دھکا پیل سے بچاتا یوں اپنی حفاظت میں لے جاتا گویا وہ کوئی بہت مقدس چیز ہے۔ جس کا دامن تک کسی سے چھو جانا اسے گوارا نہیں۔ جب وہ کسی دکان میں داخل ہوتے تو اس کی فرمائش کی چیزیں دکاندار سے منگوا منگوا کر ایسی تکریم سے پیش کرتا کہ دیکھنے والے یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکتے کہ یہ کوئی نیا جوڑا ہے۔ اور یہ کہ شوہر بیوی سے کمال عشق رکھتا ہے۔

نسرین نے بڑی قیمت کی کوئی ایک چیز نہیں خریدی بلکہ روزمرہ کے استعمال کی کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدیں۔ جن میں سے بعض کی واقعی اسے ضرورت تھی، مثلاً ایک تو چٹلا خریدا۔ ایک رنگین ازار بند کچھ چھوٹی بڑی سوئیاں، دو تین مختلف رنگوں کے تاگے کی ریلیں۔ کچھ کروشیا کی سلائیاں، ایک فریم، دو تین مختلف غازے اور بس۔ ان سب چیزوں پر آٹھ روپے سے کچھ ہی خرچ ہوئے۔ ہر ایک چیز خریدنے کے بعد وہ بڑی ادا کے ساتھ پوچھتی "باقی کیا بچا؟"

واپسی پر نوجوان اسے ایک ریستوران میں لے گیا اور ٹھنڈی اور گرم کئی قسم کی چیزیں منگوائیں اور نسرین کو اپنی مرضی کے خلاف کئی چیزیں کھانی پڑیں۔

جس وقت وہ گھر پہنچے اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ نسرین کی پھوپھی بڑے اضطراب سے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ جب وہ صحیح سلامت گھر پہنچ گئے تو اس کی جان میں جان آئی۔

شمن سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ کھانا نہیں کھائیں گے۔ چنانچہ شام سے اوپر کی سیڑھیوں کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ نسرین نے پچھلی رات کی طرح پھر کمرے کی ہلکی نیلی روشنی میں کنگھی کرنی شروع کی۔ نوجوان پھر اس کے پاس ہی چاندنی پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ پھر نوجوان نے کہا:

"نسرین میں نے تمہیں اس کی بہت سی باتیں بتائیں مگر ایک بات نہیں بتائی۔"

نوجوان نے یہ بات ایسے لہجے میں کہی تھی کہ نسرین بے ساختہ کہہ اٹھی:

"وہ کیا؟"

نوجوان کچھ لمحے خاموش رہا اور پھر بولا:

"وہ یہ کہ وہ۔۔۔۔ باوفا نہیں تھی۔"

"کیا مطلب؟" نسرین نے اور بھی متعجب ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ۔۔۔۔ کہ وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔"

"جھوٹ ہے۔"

"نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"اس کا کوئی ثبوت بھی تھا؟"

"مجھے ثبوت مل گیا تھا۔"

"وہ کیا؟"

نوجوان لمحہ بھر کے لیے خاموش رہا۔ پھر بولا:

"اس کے مرنے پر میں نے غلطی سے اس کے نام کا ایک خط کھول لیا تھا۔"

یہ کہتے کہتے نوجوان ایک دم سخت افسردہ ہو گیا اور اس نے گردن جھکا لی۔

"اور تم پھر بھی اسے چاہتے رہے؟"

"ہاں۔۔۔۔" بھرائی ہوئی آواز میں نوجوان کے منہ سے نکلا۔ "اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔"

کئی لمحے خاموشی رہی جسے توڑنے کی کسی میں خواہش پیدا نہ ہوئی۔

"کیا وہ جانتی تھی کہ تم اس کے اس راز سے واقف ہو؟" بالآخر نسرین نے اس سے پوچھا۔

"نہیں میں نے آخری دم تک اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس کی موت سے چند منٹ پہلے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سخت نزع میں ہے اور مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر میں اس سے آنکھ نہ ملاتا تھا البتہ دلداری اور تسلی کے کلمے برابر میرے منہ سے نکلتے رہے۔ یہاں تک کہ اس نے آخری ہچکی لی اور رخصت ہو گئی۔"

کچھ لمحے پھر خاموشی رہی جس کو خود نوجوان ہی نے توڑا:

"آخر اس پر یہ ظاہر کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا!"

اس رات پچھلی شب کی بہ نسبت جلد ہی روشنی گل کر دی گئی۔ نوجوان پھر جلد ہی سو گیا۔ مگر نسرین برابر ستاروں کو جھلملاتے دیکھتی رہی۔

پچھلے پہر اچانک نوجوان نے سوتے میں ہچکی لی اور پھر تیز تیز سانس لینے شروع کر دیے۔ نسرین نے سر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا، کچھ دیر سوچتی رہی پھر جس طرح کوئی بچہ سوتے سوتے ڈر جائے تو ماں اسے چھاتی سے چمٹا لیتی ہے۔ نسرین نے بھی اسی طرح اس کا سر اپنے بازوؤں میں لے کر اسے اپنے آغوش میں کھینچ لیا۔

بھنور

اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جن کے لئے صوم وصلوٰۃ کا پابند ہونا ہی کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اپنے مذہبی ولولوں کی تسکین کے لئے اس سے کہیں سوا چاہتے ہیں۔ ان کی تمنا ہوتی ہے کہ جس نور سے ان کا سینہ روشن ہے اس کی کرن دوسروں تک بھی پہنچے۔ وہ گمراہوں کی ہدایت کے لئے خطرناک مہموں پر بھی جانے سے نہیں گھبراتے۔ انہیں نہ جان کا خوف ہوتا ہے نہ جگ ہنسائی کا۔ بلکہ وہ اس کام کو فریضہ سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔

حاجی شفاعت احمد خاں ایسے ہی دینداروں میں سے تھے۔ پچاس کے لگ بھگ سن۔ بھاری بھرکم جسم مگر خوب گٹھا ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوانی میں کبھی کسرت سے شوق رہا ہوگا۔ سرخ و سفید رنگ چوڑا چہرہ، گز بھر کی داڑھی مگر خوب بھری ہوئی۔ آنکھیں بڑی بڑی شربتی رنگ کی جن میں ہر وقت سرخی جھلکتی رہتی۔ چہرے پر ایک جلالی کیفیت۔ لباس ان کا عموماً یہ ہوتا۔ خاکی رنگ کی شلوار، خاکی رنگ کی قمیص، چارخانے کپڑے کا کوٹ، پاؤں میں نری کا جوتا جو ہمیشہ گرد سے اٹا رہتا۔ سر پر سفید صافہ کلاہ پر بندھا ہوا، ہاتھ میں موٹے بید کی چھڑی۔ غرض لباس اور شکل وصورت سے وہ اچھے خاصے مرد مجاہد معلوم ہوتے تھے۔

حاجی صاحب صبح کو شہر کے ایک سرے سے جو گشت شروع کرتے تو شام ہوتے ہوتے پورے

شہر کو جیسے کھنگال ڈالتے۔ ان کے جاننے والوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ قدم قدم پر علیک سلیک ہوتی رہتی۔ کبھی پاؤ پاؤ گھنٹے سڑک کے کنارے ہی تلقین و ہدایت کا سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی کوئی جان پہچان والا کسی ضرورت سے ساتھ لے جاتا مگر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ پھر گشت میں مصروف دکھائی دینے لگتے۔

وہ اپنی دین داری اور بزرگی کی وجہ سے بڑے ہر دل عزیز تھے۔ یہاں تک کہ شہر کے حکام بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ کبھی محلے کا کوئی آوارہ مزاج لڑکا جوا کھیلنے یا کسی اور فعل شنیع کے الزام میں پکڑا جاتا۔ تو اس کا باپ حاجی صاحب ہی کی پناہ لیتا۔

"حضور۔ اس نالائق کے ہاتھوں سخت عاجز آ گیا ہوں۔ میں نے تو کبھی کا عاق کر دیا ہوتا۔ مگر اس کی بدنصیب ماں کچھ کرنے نہیں دیتی۔ جب سے سنا ہے کہ حوالات میں بند ہے سر پیٹ پیٹ کر برا حال کر لیا ہے۔۔۔۔"

اور حاجی صاحب کی سفارش پر تھانے دار معمولی تنبیہ کے بعد لڑکے کو رہا کر دیتا۔

ان کے رسوخ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کسی زمانے میں وہ خود بھی شہر کے اہلکاروں میں سے تھے۔ شروع ہی سے وہ نیک دل اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے۔ سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ہر مہینے تھوڑی تھوڑی رقم پس انداز کر کے ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا جب انہیں نوکری کرتے بیس برس ہو گئے تو حج کا شوق ہوا۔ اس فریضے سے فراغت پا کر بخوشی وطن لوٹے تھے کہ اچانک ایک المناک حادثہ ان پر گزرا۔ ان کا اکلوتا بیٹا جس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی ہیضے کا شکار ہو کر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر چل بسا اور پھر اس کے دو ہی دن بعد اس کی ماں بھی جسے بیٹے کی تیمارداری میں چھوت لگ گئی تھی اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس واقعہ کا ان کے دل پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ انہوں نے علائق دنیوی سے منہ پھیر لیا۔ اور باقی عمر ہدایت اور تبلیغ کے لئے وقف کر دی۔

اسی زمانے میں ان کے سر میں یہ دھن سمائی کہ رنڈیوں کی اصلاح کی جائے۔ بھلا قحبہ خانوں سے بڑھ کر معصیت کے اڈے اور کون سے ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کا دستور تھا کہ ہر جمعرات کی شام وہ قرآن مجید سبز جزدان میں رکھ سینے سے لگا رنڈیوں کے بازار کا رخ کرتے اور انہیں گناہوں سے توبہ کرنے اور نیک راہ پر چلنے کی ہدایت کرتے۔ رفتہ رفتہ ان عورتوں کے گھروں میں ان کی آمد و رفت ایک معمول بن گئی۔ ان کی صورت دیکھتے ہی گانا بجانا بند کر دیا جاتا اور ان کے پند و نصائح کو خاموشی سے سنا جاتا۔ اس کے بعد گھر کی کوئی بڑی بوڑھی نائکہ ایسے لہجے میں جو ہوتا تو نرم مگر طنز سے خالی نہ ہوتا کہتی:

"حضرت اپنے شوق سے تو ہم یہ گناہ کرتے نہیں۔ یہ دو روز کا دھندا ہے۔ اس کو بھی تو بھرا ہے آپ ہماری گزر بسر کا انتظام کر دیجئے ہم آج ہی اس پیشے کو چھوڑے دیتے ہیں۔ مگر انتظام معقول ہونا چاہئے۔ ماما گیری تو ہم کرنے سے رہے۔" اور یوں انہیں اچھی طرح ٹال دیا جاتا۔

مگر کبھی کبھی ان گھروں میں حاجی صاحب کی تحقیر بھی خوب ہوتی اور انہیں گناہ اور بے حیائی کے ایسے ایسے منظر دیکھنے پڑتے کہ شرم سے نظریں جھکانی پڑتیں۔ ایک دفعہ ایک کوٹھے پر کسی ضیافت کا اہتمام تھا۔ بدقسمتی سے حاجی صاحب وہاں پہنچ گئے۔ ان کو دیکھنا تھا کہ ایک قحبہ نے جس کے منہ سے شراب کے نشے میں رال ٹپک رہی تھی۔ لپک کر ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور ان کی داڑھی کے پے در پے بوسے لینے شروع کر دیئے۔ پھر وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولی:

"اے میرے مجازی خدا مجھے اپنے ساتھ لے چل۔ میں تیرے پاؤں دابوں گی۔ تیرے سر میں تیل ڈالوں گی۔ تیری داڑھی میں کنگھی کروں گی۔۔۔۔"

اور جتنی لڑکیاں اور ان کے آشنا اس کوٹھے پر جمع تھے، یہ منظر دیکھ کر مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئے۔

ایسے موقعوں پر وہ پیغمبروں اور ولیوں کے قصے یاد کرتے کہ کیسی کیسی ذلتیں اور ایذائیں انہیں راہ حق میں اٹھانی پڑی ہیں، اور اس طرح اپنے دل کو تقویت دے کر وہ پہلے سے زیادہ مستعدی کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتے۔

رفتہ رفتہ وہ اس محلے میں خاصے بدنام ہو گئے۔ بعض دفعہ آوارہ لڑکوں اور اوباش لفنگوں کی ٹولی ان کے پیچھے ہو لیتی۔ یہ لوگ بالا خانوں میں بیٹھی ہوئی بیسواؤں کی طرف ہاتھوں سے طرح طرح کے اشارے کرتے فحش آوازے کستے اور حاجی صاحب کو اپنا لیڈر بنا کر مضحکہ خیز نعرے لگاتے۔ ان کی باتوں سے اکثر لوگ حاجی صاحب کو مجذوب یا سودائی سمجھنے لگے تھے۔ وہ اس کی توجیہ بھی کرتے کہ اکلوتے جوان بیٹے کی موت سے ان کے دماغ میں خلل آ گیا ہے۔

ایک دن حاجی صاحب کے پاس ایک شخص خبر لایا کہ بازار میں دو نئی رنڈیاں آئی ہیں۔ ایک کا نام گل ہے اور دوسری کا بہار۔ دونوں بہنیں ہیں۔ ایک ناچتی ہے دوسری گاتی ہے۔ دونوں اپنے اپنے فن میں ماہر ہیں۔ حسن بھی دونوں کا قیامت کا ہے۔ چند ہی روز میں سارے شہر میں ان کا چرچا ہو گیا ہے۔ لوگ پروانوں کی طرح گر رہے ہیں۔ سنا ہے بنک کا ایک ملازم ان کو رام کرنے کے لئے بنک سے بہت سا روپیہ اڑا لایا مگر پولیس واقع پر ان بیسواؤں کے گھر پہنچ گئی اور اس شخص کو نوٹوں کی گڈیوں

سمیت پکڑ لیا گیا۔ ایک نواب زادے نے جو قلاش ہو گیا تھا اپنی محرومی پر ان کے مکان کی سیڑھیوں میں پستول سے خودکشی کر لی۔ غرض وہ وہ ہنگامے ہوئے کہ ایک مدت سے سننے میں نہیں آئے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ دوسری زہرہ اور مشتری ہیں جن کے سحر حسن سے انسان تو کیا فرشتے بھی محفوظ نہیں۔

حاجی صاحب نے مصلحتاً کچھ دنوں سے اس بازار میں جانا چھوڑ رکھا تھا مگر اس نئے فتنہ کا حال سنا تو فوراً ان کے دل میں ایک نیا جوش پیدا ہوا۔ انہوں نے دل میں کہا کہ ان عورتوں کو جلد سے جلد راہ راست پر لانا چاہئے۔ ورنہ خدا معلوم یہ کتنے گھروں کو تباہ اور کتنے لوگوں کے ایمان کو غارت کر دیں گی۔

انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی۔ قرآن شریف سینے سے لگایا اور پتہ پوچھتے پوچھتے گل اور بہار کے بالا خانے پر پہنچ گئے۔ وہ دونوں رات بھر جاگنے کے بعد صبح کو جو سوئی تھیں تو اب سہ پہر کے قریب جا کر بیدار ہوئی تھیں۔ اتفاق سے اس وقت ایک بوڑھی خادمہ کے سوا گھر میں کوئی اور نہ تھا۔ انہوں نے اپنے سامنے سرخ سرخ آنکھوں والے ایک مجذوب پٹھان کو جو دیکھا تو ڈر کے مارے ان کی گھگھی بندھ گئی۔

حاجی صاحب چند لمحوں تک حیرت سے ان کے حسن و جمال کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ پر شفقت لہجے میں ان سے مخاطب ہوئے:

"میری بچیو مجھ سے ڈرو نہیں۔ میں کسی بری نیت سے نہیں آیا ہوں۔ میں تو تمہیں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ تمہاری عیش و عشرت کی یہ زندگی ایک دھوکا ہے۔ اور یہ دھوکا صرف اسی وقت تک قائم ہے جب تک تمہارے گالوں میں خون کی یہ چند بوندیں ہیں۔ ان کی تر و تازگی آخر کب تک باقی رہے گی پانچ سال، سات سال، حد سے حد دس سال۔ اس کے بعد تم ایک قابل نفرت چیز بن جاؤ گی۔ اپنے عشاق کی نظروں ہی میں نہیں، اپنے عزیز ترین رشتہ داروں کی نظروں میں بھی۔ یہاں تک کہ تمہاری اولاد کو بھی تم سے گھن آئے گی۔ اس لئے کہ تمہارا وجود ان کے لئے انتہائی شرمندگی کا باعث ہوگا۔

"میری بچیو۔ ذرا غور کرو۔ تمہاری زندگی کیسی ہنگاموں سے بھری ہوئی ہے دن رات تمہارے چاہنے والوں کی دھینگا مشتی۔ قدم قدم پر جان کا خوف۔ ہر وقت پولیس کا دھڑکا۔ عدالت میں پیشیاں یہ جینا بھی کوئی جینا ہے۔ میری بچیو۔ تمہاری جگہ یہ بالا خانہ نہیں ہے۔ بلکہ کسی شریف گھر کی چار دیواری ہے جہاں تم ملکہ بن کر رہو۔ جہاں تمہارا شوہر نگہبان اور محافظ ہو۔ تمہارے ناز اٹھائے اور

تمہارے پسینے کی جگہ خون بہائے۔ اور جیتی تمہاری اولاد کے لئے تمہارے قدموں کے نیچے جنت ہو۔" یہ کہتے کہتے حاجی صاحب کی آواز رقت سے بھر آئی اور وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔

دونوں بہنوں پر سے خوف و ہراس تو دور ہو گیا تھا۔ مگر ان باتوں کو سن کر وہ گم سم ہو گئی تھیں۔ آخر بڑی بہن گل نے کہا:

"حضرت ہمارے ماں باپ نے ہمیں یہی پیشہ سکھایا ہے اس میں ہمارا کیا قصور!"

حاجی صاحب نے اس دن ان سے کچھ اور کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ انہوں نے ایک کاغذ کے پرزے پر اپنے گھر کا پتہ لکھ کر ان کو دیا اور یہ کہہ کر چلے آئے کہ مجھے اپنا باپ سمجھو اور جب کبھی کوئی مشکل پڑے یا میری ضرورت ہو تو اس پتہ پر مجھے خبر کر دو۔

اس واقعہ کو آٹھ روز بھی نہیں گذرنے پائے تھے کہ ایک دن صبح ہی صبح ایک تانگہ ان کے مکان کے سامنے آ کر رکا۔ اس میں ایک عورت بیٹھی تھی جس نے سیاہ برقع اوڑھ رکھا تھا۔ تانگے میں دو ایک ٹرنک اور کچھ چھوٹی چھوٹی پٹیاں بھی تھیں۔ حاجی صاحب اس عورت کو اپنے مکان میں لے گئے اور اس کا سامان اندر پہنچا دیا گیا۔

یہ بہار تھی جو سچ مچ تائب ہو کر آئی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کئی دن سے وہ روتی رہی ہے اور اب بھی اس کے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔

"جس دن آپ آئے تھے" اس نے حاجی صاحب کو بتایا "اسی دن سے ہم دونوں بہنوں میں جھگڑا شروع ہو گیا تھا کیوں کہ اب میں ایک پل بھر کے لئے بھی بازار میں بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر آج صبح میں اس سے علاحدہ ہو گئی ہوں۔"

اپنی اس کامیابی پر جو بازاری عورتوں کے اصلاحی کام کے سلسلے میں ان کی پہلی فتح تھی۔ حاجی صاحب کو اس قدر خوشی ہوئی کہ شاید بیٹے کے پیدا ہونے پر بھی نہ ہوتی۔ انہوں نے فوراً کپڑے بدلے۔ اور سودا سلف لینے بازار چلے گئے۔ ان کے پیچھے بہار نے جھاڑو دے کر صفائی کی۔ [illegible] سے بھرا تھا اس کو صاف کیا۔ باورچی خانے کے فرش کو دھویا پونچھا اور اپنے طور طریق سے ظاہر کر دیا کہ حسن و جمال، علم اور شستہ لب و لہجے کے ساتھ ساتھ وہ امور خانہ داری سے بھی ناواقف نہیں۔

چند ہی دنوں میں بہار نے جس کا نام اب حاجی صاحب نے بدل کر بلقیس بیگم رکھ دیا تھا اپنی خدمت گذاریوں سے ان کو یقین دلا دیا کہ وہ سچے دل سے توبہ کر کے آئی ہے اور اگر کوئی شریف قدردان مل گیا تو ساری زندگی اس کے ساتھ نباہ دے گی۔ حاجی صاحب کو اس سے سچ مچ ایسی الفت

ہوگی جیسی باپ کو بیٹی سے ہوتی ہے۔ ادھر بلقیس بھی ان کا دل سے احترام کرتی اور ان کے سامنے شریف گھرانوں کی لڑکیوں کی طرح ہمیشہ اپنی نظریں نیچی رکھتی۔ اب حاجی صاحب کو بلقیس کے لئے کسی اچھے رشتے کی فکر ہوئی۔ کیوں کہ وہ یہ خوب سمجھتے کہ لڑکی کا اصلی گھر اس کے شوہر ہی کا ہوتا ہے۔

سرکاری ملازمت کے دوران میں حاجی صاحب کا ایک رفیق کار رحمت علی ہوا کرتا تھا۔ وہ حاجی صاحب کی بڑی عزت کرتا تھا۔ یہ بھی اس سے بھائیوں کی طرح پیش آتے تھے۔ وہ تو مدت ہوئی مر چکا تھا۔ مگر اس کے لڑکے انور نے حال ہی میں انجینیری کا امتحان پاس کیا تھا۔ اور اسے ایک معقول سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔ انور حاجی صاحب کو تایا ابا کہا کرتا اور اکثر ان سے ملنے آیا کرتا تھا۔ ابھی چند روز ہوئے کہ وہ اپنی اس کامیابی کی اطلاع دینے آیا تھا۔ ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ بلقیس کے رشتے کے سلسلے میں ان کا خیال فوراً اس کی طرف گیا۔ وہ اس کے دفتر پہنچے اور اس کو شام کے کھانے پر بلایا۔ ادھر گھر آ کر انہوں نے بلقیس سے کہا:

"بیٹی! آج شام ایک مہمان آ رہا ہے۔ وہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کی نشانی ہے۔ تم یہ میلے کپڑے اتار کر کوئی اچھا سا لباس پہن لینا۔ وہ میرے بیٹوں کی طرح ہے۔ اس سے پردہ نہیں کرنا ہوگا۔"

شام کو انور کھانے پر آیا تو بلقیس کے حسن اس کی شائستگی اور حیا کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ حاجی صاحب نے اس کو بلقیس کی بپتا سنائی اور اس سے کوئی بات چھپا نہ رکھی۔ دوسرے دن وہ پھر آیا، پھر تیسرے دن، پھر دن میں دو دو مرتبہ آنے لگا اور آخر مہینہ بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

انور اور بلقیس کی خوب گذر ہونے لگی۔ وہ دونوں اکثر حاجی صاحب سے ملنے آیا کرتے۔ انور اپنی بیوی کو فریفتگی کی حد تک چاہتا تھا۔ ادھر بلقیس بھی دل و جان سے اس پر فدا تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ حاجی صاحب سے بھی ایسی الفت کرنے لگی تھی گویا وہ سچ مچ اس کے باپ ہیں۔ اور پھر یہی تو تھے جن کے طفیل وہ گمراہی کے گڑھے سے نکلی تھی۔

جب ایک سال گذر گیا تو انور کی تبدیلی کسی اور شہر ہو گئی۔ حاجی صاحب ان میاں بیوی کو اسٹیشن پر رخصت کرنے آئے تو جدائی کے خیال سے روتے روتے بلقیس کی ہچکی بندھ گئی۔ حاجی صاحب نے بڑی تسلیاں دے کر اسے رخصت کیا۔

وہ باقاعدگی سے ہر مہینے حاجی صاحب کو خط لکھتی جس میں اس کی اور انور کی خیریت اور گھر کے

حالات تفصیل سے لکھے ہوتے۔ اس کے ان خطوں میں ایک جملہ کی تو قع/ چاہت تھی۔ ان خطوں کا سلسلہ کوئی دو برس تک جاری رہا۔ اس کے بعد جو خطوط آئے ان کا لہجہ اچانک تبدیل ہو گیا۔ حاجی صاحب نے اس تبدیلی کو بلقیس کی بڑھتی ہوئی عمر کے تقاضے پر محمول کیا۔ آخر تیسرے سال ایک خط جسے پڑھ کر وہ ہکا بکا رہ گئے۔ لکھا تھا:

ابا جان السلام علیکم۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ خط پڑھ کر آپ کو صدمہ پہنچے گا۔ میں نے عرصے تک اس معاملے کو آپ سے چھپائے رکھا تا کہ آپ کو دکھ نہ ہو لیکن اب بات اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اس کا چھپانا ممکن نہیں۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ اس میں میرے شوہر انور کا کچھ قصور نہیں۔ اس کی تمام ذمہ داری ان کے رشتہ داروں پر ہے جو ہر روز آ آ کر ان کے کان بھرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو کسی نہ کسی طرح میری پچھلی زندگی کا حال معلوم ہو گیا ہے اور وہ مجھ سے سخت نفرت کرنے لگے ہیں اور برملا طعنے دیتے ہیں۔ چونکہ بدقسمتی سے اس عرصے میں میرے کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی جو شاید انور کو مجھ سے قریب تر کر دیتی۔ اس لئے یہ لوگ اب اس کوشش میں ہیں کہ انور میاں سے مجھے طلاق دلوا دیں۔ میں نے اس لڑکی کو بھی دیکھا ہے جس کو وہ ان کے پلے باندھنا چاہتے ہیں۔ اچھی شریف لڑکی ہے بے چاری صورت شکل کی بھی بری نہیں اب میری آپ سے التجا ہے کہ اس سے پہلے کہ یہ لوگ مجھے دھکے دے کر نکال دیں آپ خود آئیں اور مجھے طلاق دلوا کر لے جائیں۔

آپ کی بیٹی
بلقیس

اس خط کی عبارت نے حاجی صاحب کو سخت بے چین کر دیا۔ وہ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ صبح ہوئی تو وہ اسٹیشن پہنچے اور پہلی گاڑی سے اس شہر کو روانہ ہو گئے جہاں انور ملازم تھا۔ راستے بھر وہ غم اور غصے سے کھولتے رہے ان کا جی چاہتا کہ وہ جاتے ہی انور کا منہ نوچ لیں۔ راستے بھر وہ آیات قرآنی پڑھ پڑھ کر اپنا غصہ ٹھنڈا کرتے رہے۔

مصالحت کا سوال ہی نہیں تھا۔ کیونکہ جب دلوں میں فرق پڑ جائے تو زندگی کا لطف جاتا رہتا ہے۔ اب ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ انور سے حق مہر حاصل کریں اور وہ تمام جہیز، زیورات اور کپڑے بھی جو

انور نے اب تک بلقیس کو بنوا کر دیئے تھے۔

انور اور اس کے رشتہ داروں نے زیادہ مزاحمت نہ کی انور کو توقع نہ تھی کہ اس قدر جلد بلقیس سے اس کا پیچھا چھوٹ جائے گا اور اسے کسی قدر رنج بھی ہوا کیونکہ ابھی تک اس کے دل میں بلقیس کی کچھ کچھ محبت باقی تھی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ حاجی صاحب بلقیس کو ساتھ لے دو تانگوں میں اسباب لدا اسی رات اسٹیشن پہنچے اور دوسرے دن گھر آ گئے۔

بلقیس اب پھر حاجی صاحب کے پاس رہنے لگی۔ حاجی صاحب کو اب پھر اس کے رشتے کی فکر ہوئی اور ابھی تین مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ انہوں نے اس کے لئے ایک اور شوہر تلاش کر لیا۔ اب کے جو آدمی چنا گیا وہ انور کی طرح نہ تو کم عمر تھا نہ زیادہ تعلیم یافتہ اور نہ اس کا تعلق کسی اونچے گھرانے سے تھا۔ وہ میوے کا کاروبار کرتا تھا۔ آئے دن دساور سے میوے کی بھری ہوئی لاریاں اس کے یہاں آتی رہتی تھیں۔ شہر کے میوہ فروشوں میں اس کی بڑی ساکھ تھی۔

یہ میوہ فروش جس کا نام ربانی تھا رنڈوا تھا اور کسی نیک بیوہ سے عقد کرنا چاہتا تھا۔ حاجی صاحب نے حق مہر کے طور پر پانچ ہزار روپیہ نقد اور ایک مکان بلقیس کے نام لکھوانے کی شرط پیش کی جسے اس نے بلا حیل و حجت منظور کر لیا تھا۔ دراصل یہ میوہ فروش بہار کے پرانے گاہکوں میں سے تھا جب بہار بازار سے غائب ہوئی تھی تو وہ سخت پریشان ہوا تھا۔ پھر کچھ دن بعد جب اس نے سنا کہ حاجی صاحب نے اسے کسی انجینئر سے بیاہ دیا ہے تو وہ ایک آہ سرد بھر کے رہ گیا۔ اب جو اسے اس طلاق کا حال معلوم ہوا تو اس کے دل میں پھر بہار کی آرزو تازہ ہو گئی اور اس نے جلد ہی منت خوشامد سے حاجی صاحب کو اس رشتے پر آمادہ کر لیا۔ مگر حاجی صاحب نے جب تک پورا حق مہر وصول نہ کر لیا میوہ فروش کو بلقیس کی شکل تک نہ دیکھنے دی۔

بلقیس نے ایک اطاعت مند بیٹی کی طرح حاجی صاحب کے تجویز کئے ہوئے رشتے کو صبر شکر سے قبول کر لیا اور دونوں کی خاصی گزر ہونے لگی یہاں تک کہ ایک سال ہنسی خوشی میں گزر گیا۔ مگر یہ میوہ فروش طبعاً عیاش واقع ہوا تھا۔ شادی کے بعد کچھ عرصہ تو وہ اس سے بڑی عزت کے ساتھ پیش آتا رہا۔ مگر جلد ہی اس کے رویے میں تبدیلی آ گئی۔ اور وہ اس سے ایسا سلوک کرنے لگا گویا وہ اس کی داشتہ ہو۔ وہ مصر تھا کہ بلقیس رات رات بھر اس کے ساتھ جاگے اور شراب نوشی میں شریک ہو۔ پھر وہ اس کا بھی متمنی تھا کہ آئے دن دوستوں کی دعوتیں ہوں اور بلقیس ساقی گری کی خدمت انجام دے اور وہ دوستوں سے یہ کہہ سکے:

"یہی تو وہ محل بے بہا ہے جس کی ایک جھلک دیکھنے کو دنیا ترستی تھی۔ اور اب میں تنہا اس کی قسمت کا مالک ہوں۔"

مگر بلقیس نے اس کی ان خواہشوں کو سختی کے ساتھ رد کر دیا۔ وہ اس کے دوستوں کی قباحتوں اور ان کی مے خواری سے تو تعرض نہ کرتی مگر خود کبھی ان کے سامنے نہ آتی۔

رفتہ رفتہ میوہ فروش کا دل گھر سے اچاٹ رہنے لگا اور یہ محفلیں اب اوروں کے یہاں منعقد ہونے لگیں۔ میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ رہنے لگے۔ کئی مرتبہ گالی گلوچ تک نوبت پہنچی۔ آخر ایک دن میوہ فروش نے شراب کے نشے میں بلقیس کو اس قدر پیٹا کہ وہ کئی دن تک بستر سے نہ اٹھ سکی۔

حاجی صاحب کو میاں بیوی کی ناچاقی کا علم تھا۔ مگر جب انہیں اس مار پیٹ کی خبر ہوئی تو ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ وہ اسی وقت میوہ فروش کے گھر پہنچے اور بلقیس کو اپنے ہمراہ لے آئے۔ میوہ فروش نے معافی مانگی منت سماجت کی مگر حاجی صاحب پر کچھ اثر نہ ہوا۔ انہوں نے کہا:

"اگر تم نے فوراً طلاق نہ دی تو میں تمہارے خلاف چارہ جوئی کروں گا۔"

میوہ فروش حاجی صاحب کے اثر و رسوخ کو بخوبی جانتا تھا۔ مقدمہ بازی سے خائف ہو کر چار و ناچار طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا۔

اب کے بلقیس سال بھر تک حاجی صاحب کے گھر پر رہی۔ جب کبھی حاجی صاحب اس کے رشتے کا سوال اٹھاتے تو وہ ٹال کر کہتی

"ابا جان۔ آپ کو میری کیوں فکر رہتی ہے۔ میں آپ پر بھاری ہوں کیا۔"

مگر ایک دور اندیش باپ کی طرح حاجی صاحب نہیں چاہتے تھے کہ بلقیس زیادہ عرصے گھر میں بیٹھی رہے۔ علاوہ ازیں اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اپنے اصلاحی کام میں ناکام رہے۔ ان کا منصوبہ ناقابل عمل ثابت ہوا۔ مگر ایک مرتبہ فتح حاصل کر کے اب وہ کسی طرح اس شکست کے لئے تیار نہ تھے چنانچہ انہیں پھر اس کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اور بلقیس کچھ تو حاجی صاحب کے اصرار سے اور کچھ اپنے مستقبل کے خیال سے تیسری مرتبہ پھر شادی پر رضامند ہو گئی۔

اب کے حاجی صاحب نے شوہر کے انتخاب میں انتہائی حزم و احتیاط سے کام لیا اور مہینوں اس کے مزاج اور چال چلن کے بارے میں تحقیق کرتے رہے۔

یہ ایک نوعمر شخص تھا جو کسی دفتر میں معمولی کلرک تھا۔ حد درجہ کم سخن، بھولا بھالا۔ ناک نقشہ بھی اچھا تھا۔ البتہ ہاتھ پاؤں کا ذرا دبلا تھا۔ سارا دفتر اس کی سادگی مزاج اور اطاعت گزاری کا معترف

تھا۔ ایسے داماد کو پا کر حاجی صاحب پورے طور پر مطمئن ہو گئے۔ ادھر بلقیس نے بھی خوشی خوشی اسے قبول کر لیا۔ البتہ اس بات کی ذرا خلش تھی کہ وہ عمر میں اس سے پانچ سال بڑی تھی۔

اس دفعہ حاجی صاحب نے اونچے خاندان اور روپے پیسے کا لالچ نہیں کیا تھا۔ بلکہ مصلحتاً غریب شوہر چنا تھا اور پھر روپے کی ضرورت بھی کیا تھی کیونکہ پچھلے مہروں کی رقمیں، گھر کا سامان، زیور، کپڑا لتا پہلے ہی وافر تھا۔ اس کلرک کا نام منیر تھا۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ کم عمری ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ کچھ دور کے رشتہ دار تھے مگر وہ اس کے خرچ کا بوجھ اٹھانے کو تیار نہ تھے اور اس نے یتیم خانے میں پرورش پائی تھی۔

بلقیس اور منیر خوش حالی اور فارغ البالی سے زندگی بسر کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ محبت کے بندھنوں نے ایک دوسرے کو جکڑ لیا۔ بلقیس کو ایسا محسوس ہوا کہ جو خوشی اور بے فکری کے بعد اس سے چھن گئی تھی وہ اسے پھر مل گئی ہے۔ ادھر منیر بھی آٹھوں پہر اسی کا دم بھرتا تھا۔ وہ ایسا صالح نوجوان تھا کہ کسی قسم کا نشہ یا بری لت اس کو نہ تھی۔ دفتر سے چھٹی ملتے ہی سیدھا گھر کا رخ کرتا اور پھر بیوی کی قربت میں ایسا کھو جاتا کہ دوسرے دن دفتر جانے کے وقت ہی گھر سے نکلتا۔

دن پر دن گزرتے گئے، ہفتے، مہینے اور پھر سال۔ دونوں کی محبت بڑھتی ہی چلی گئی۔ اب حاجی صاحب بھی بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ تبلیغ اور ہدایت کا وہ پہلا سا جوش و خروش ان میں نہیں رہا تھا۔ گھر سے کم ہی باہر نکلتے مگر ان کو اطمینان تھا کہ بالآخر ان کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔

اس طرح پانچ سال گزر گئے۔ اس دوران میں منیر کو نوکری کے سلسلے میں کئی جگہ تبدیل ہو کر جانا پڑا۔ مگر وہ جہاں کہیں بھی جاتے بلقیس حاجی صاحب کو اپنی خیر و عافیت کی اطلاع دیتی رہتی۔

ایک دن حاجی صاحب کو ایک خط ملا جسے پڑھ کر اچانک ایک مرتبہ پھر دنیا ان کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ بات یہ تھی کہ منیر کی صحت پچھلے سال سے دھیرے دھیرے گرنی شروع ہو گئی تھی۔ منیر کا ہر وقت گھر میں پڑے رہنا، کھیل تفریح میں حصہ نہ لینا اس کی تندرستی کے لئے ضرر رساں ثابت ہوا۔ اسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا اور کبھی کبھی کھانسی بھی اٹھنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ یہ ابتدائی دق کے آثار ہیں اور انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ دفتر سے طویل رخصت لے لی جائے اور اسے کسی صحت افزا پہاڑی مقام پر رکھا جائے۔ خط کی آخری سطور یہ تھیں:

لیکن میرے پیارے ابا جان آپ اس خبر سے زیادہ پریشان نہ ہوں
ڈاکٹر نے کہا ہے کہ منیر میاں سال بھر باقاعدہ علاج کرانے سے تندرست ہو

جائیں گے۔ میں خود ان کی تیمارداری کروں گی اور جس صحت افزا مقام پر وہ
رہیں گے میں ان کے ساتھ رہوں گی۔ شفا تو اللہ نے چاہا انہیں ضرور ہو
جائے گی۔ مگر اس میں تین چار سو روپیہ ماہوار اٹھے گا۔ ہو اس کی آپ فکر نہ
کریں۔ وہ جو میرے نام کا مکان ہے اسے فروخت کر دیں۔ آخر جائداد اسی
وقت کی ضرورتوں ہی کے لئے تو ہوتی ہے۔ جان ہے تو جہان ہے۔ امید ہے
کہ آپ ان تمام باتوں کا جواب مفصل لکھیں گے یا خود تشریف لائیں گے۔

آپ کے دیدار کی طالب

بلقیس

اس خط کو پڑھ کر حاجی صاحب گم سم رہ گئے۔ اچانک دل میں ایسا خوف محسوس ہوا گویا ان کا آخری وقت آ پہنچا ہو۔۔۔۔ دو دن تک وہ گھر سے باہر نہ نکلے۔ تیسرے دن جب ذرا طبیعت سنبھلی تو وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے اٹھے اور جائداد کی فروخت کے سلسلے میں کسی دلال کی تلاش میں نکلے۔ قدم گھر سے باہر رکھا ہی تھا کہ ایک تانگا ان کے دروازے کے سامنے آ کر رکا۔ اس میں ایک برقعہ پوش خاتون بیٹھی تھی ساتھ کچھ سامان تھا۔ دو تین ٹرنک، ایک اٹیچی کیس۔

حاجی صاحب ٹھہر گئے۔ ان کی صورت دیکھ کر اس خاتون نے چہرے سے نقاب الٹ دی۔ اس کا سن پینتیس برس سے کسی طرح کم نہ ہوگا۔ مگر اس کے حسن میں ابھی تک غضب کی شادابی تھی۔

"میں بہار کی بہن گل ہوں۔" اس نے بڑی لجاجت سے کہنا شروع کیا۔ "دس سال ہوئے جیسے حضور نے میری بہن کو دین اور آخرت کی راہ دکھائی تھی ویسے ہی مجھ پر بھی کرم کی نظر ہو جائے۔۔۔۔۔۔"

باجے والا

یہ علاقہ سرکاری کاغذوں میں تو محض "گورنمنٹ کوارٹرز جی ۱۵۵-۲" کہلاتا تھا مگر یہاں کے ساکنوں نے بڑی جدوجہد کے بعد ایک خوش نام بھی سرکار سے منظور کرا لیا تھا اور وہ تھا "گلستاں کالونی۔" یہ لوگ خود تو اپنے خطوں کی پیشانی پر خوش خطی سے "گلستاں کالونی" لکھتے ہی تھے۔ رشتہ داروں اور دوستوں کو تاکید تھی کہ وہ بھی خط لکھتے یہی پتہ تحریر کریں۔ پھر بھی کبھی کبھی کوئی تانگے والا شرارت یا انجان پن سے اس علاقے کو "بابو کالونی" کے نام سے پکار کر چلتا تو اس کی جہالت پر یہ لوگ جھنجھلا کر ہی رہ جاتے۔

"گلستاں کالونی" میں صرف ان ہی سرکاری ملازموں کو کوارٹر دیے جاتے تھے جن کی تنخواہ ڈھائی سو سے ساڑھے چار سو تک ہوتی۔ اس گریڈ میں عموماً دفتروں کے سپرنٹنڈنٹ، اسسٹنٹ انچارج، اکاؤنٹنٹ، آڈیٹر، سینیئر اسٹینوگرافر، اوورسیئر اور اسی قبیل کے دوسرے ملازمین آتے تھے۔ تھے تو یہ بھی کلرک ہی مگر ذرا اونچی قسم کے۔ جیسے کلرکی کو دو آتشہ یا سہ آتشہ کر دیا گیا ہو۔ ان کی حالت عام کلرکوں سے کہیں بہتر تھی اور وہ اپنی نسبتاً آسودہ حالی اور اپنے منصب کے باعث اپنے ہم پیشوں میں خاصی عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

اس علاقے کا نقشہ کچھ اس قسم کا تھا کہ کوئی نصف میل کے پھیلاؤ میں چار پانچ سڑکیں تھوڑے

تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ترتیب وار ایک دوسرے کے متوازی چلتی تھیں۔ اور چار پانچ سڑکیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر شمالاً جنوباً ان کو کاٹتی تھیں۔ سب کوارٹر یک منزلہ اور ایک ہی وضع کے تھے۔ دیکھنے میں ذرا بڑے آگے کھلا سا باغیچہ۔ اس کے بعد دو تین سیڑھیاں، پھر برآمدہ، برآمدے کے ساتھ ملے ہوئے دو کمرے، پیچھے صحن، باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ۔ یہ کوارٹر ایک دوسرے کے عین سامنے تھے۔ بیچ میں صرف بیس فٹ کی سڑک تھی۔ چنانچہ اگر گھر والی اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے حجاب کی زیادہ قائل نہ ہوتی یا اپنے بچوں اور بزرگوں کی وجہ سے ذرا بھی غفلت برتتی تو اس کے سامنے والی ہمسائی بڑے مزے سے اس کے ہر قسم کے احوال و افعال کا مشاہدہ کر سکتی تھی۔

گلستان کالونی کسی ایک فرقے کے لئے مخصوص نہ تھی بلکہ اس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب ہی رہتے تھے۔ پھر زبانیں بھی یہاں بھانت بھانت کی بولی جاتی تھیں۔ جن میں اردو، انگریزی، بنگالی، مدراسی اور پنجابی کو زیادہ دخل تھا۔ البتہ ایک بات اس کالونی کے سب رہنے والوں میں مشترک تھی اور وہ تھی آرٹ اور فنون لطیفہ کی سرپرستی۔ ریڈیو سے تو کوئی گھر خالی ہی نہ تھا۔ چنانچہ دن کو بارہ بجے جب فرمائشی پروگرام چل رہا ہوتا۔ ایسے میں اگر کوئی یہاں آتا تو وہ ایک ہی فلمی گانا بغیر تسلسل ٹوٹے گھوم پھر کر سن سکتا تھا۔ اس کالونی کے باشندے متمدن سمجھے جانے کے بہت متمنی تھے۔ تنگی ترشی میں گزارا کرتے۔ مگر ظاہری ٹھاٹھ میں فرق نہ آنے دیتے۔ ہر گھر میں صبح کو پابندی کے ساتھ ڈبل روٹی، مکھن اور اخبار آتا۔ اخبار کا صاحب خانہ بے چینی سے منتظر رہتا۔ جب باری باری اور سب لوگ دیکھ چکتے تو آخر میں گھر کے بڑے بوڑھے کوارٹر کے باہر کرسی یا مونڈھا ڈال بیٹھ جاتے اور اخبار کو عینک کے قریب لا لا کر گھنٹوں اس کے مطالعے میں غرق رہتے۔

یوں تو اس کالونی میں مصوری اور بت تراشی کا بھی خاصا چرچا تھا۔ مگر لوگ سب سے زیادہ گانے بجانے کے رسیا تھے۔ ریڈیو پر موسیقی کے پروگرام تو ذوق و شوق سے سنے ہی جاتے تھے۔ کبھی کبھی ان کوارٹروں میں میوزک پارٹیاں بھی منعقد ہوتیں جن میں شہر کے مشہور مشہور گانے والوں کو بلوایا جاتا۔ اس طرح ایک تو موسیقی کی سرپرستی ہوتی۔ دوسرے مقامی جوہروں کو ان کا کمال فن دیکھنے اور سیکھنے کا موقع ملتا۔ کئی گھروں میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے میوزک ماسٹر رکھے گئے تھے۔ صبح کو جیسے ہی مرد ناشتے سے فارغ ہو کر دفتروں کی راہ لیتے۔ ان کے گھروں سے گھنگروؤں کی جھنک کے ساتھ ساتھ بوڑھے تھنک کی گمبھیر آواز "تا تھئی تھئی۔ تا تھئی تھئی" سنائی دینے لگتی۔

اس علاقے کی چہل پہل خاص طور پر شام کو دیکھنے کے قابل ہوتی جب مرد دفتروں سے آ چکے

ہوتے اور برآمدے میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے یا کسی مہمان کی تواضع میں مصروف نظر آتے جس کی پرانی، عموماً کالے رنگ کی، چھوٹی موٹر گھر کے دروازے کے عین سامنے کھڑی ہوتی یا جب یہاں کی نوخیز لڑکیاں اور جوان عورتیں نئے نئے سنگار کئے نئی نئی تراش کے لباس پہنے اس نواح کی سڑکوں پر جھرمٹوں کی صورت مصروف خرام ہوتیں۔ ایسے میں اگر کوئی ناواقف آدمی ادھر آ نکلتا تو وہ ان لڑکیوں کو تکتا کا تکتا ہی رہ جاتا۔

گلستان کالونی کی ان سرگرمیوں کو عام طور پر استحسان کی نظروں سے دیکھا جاتا اور خود وہاں کے باشندے بھی اپنی روشن خیالی اور آزادہ روی پر مسرور معلوم ہوتے تھے۔ البتہ اس علاقے کا ایک طبقہ ایسا تھا جس کو کالونی والوں کی ان تمدنی ترقیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ وہ چپکے چپکے ان باتوں پر سخت تنقید کرتا تھا۔ یہ اس علاقے کے وہ بڑے بوڑھے تھے جو نوکری اور ہر قسم کے کام کاج سے سبکدوش ہو کر اپنا آخری وقت اپنے بیٹوں کی کمائی کے سہارے گزار رہے تھے۔ گھر کے معاملات میں ان کا کوئی دخل نہیں رہا تھا۔ اگر وہ کوئی بات معاشرے کی اس نئی روش کی برائی میں کہتے تو گھر کے سب چھوٹے بڑے اسے دقیانوسی کہہ کر مذاق میں اڑا دیتے اور ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہتا کہ جب تک گھر پر رہیں اپنی آنکھیں اور کان بند رکھیں اور کھانے پینے یا اخبار پڑھنے کے علاوہ کسی کام سے سروکار نہ رکھیں۔

گھر پر تو ان بڈھوں کا بس نہ چلتا۔ البتہ ہر روز تیسرے پہر وہ کالونی کے ایک چوک میں بڑی شان سے اپنی منڈلی جمایا کرتے۔ گرمیوں میں اس جگہ چھڑکاؤ کر کے آٹھ دس مونڈھے بچھا دیئے جاتے۔ جن پر یہ بڑے بوڑھے بیٹھ کر دو تین گھنٹے خوب خوب دل کی بھڑاس نکالتے۔ زمانے کی نئی روشنی کے خلاف، عورتوں کی بڑھتی ہوئی آزادی کے خلاف، اپنے بیٹوں کی بے راہ روی کے خلاف، بے پردگی کے خلاف، فنون لطیفہ کی آڑ میں جن بے حیائیوں کو روا رکھا جاتا ہے ان کے خلاف، زن و مرد کے بے محابا اختلاط کے خلاف، ناچ گانے اور خصوصاً فلمی گانوں کے خلاف۔ لطف یہ کہ جب اس طرح وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے گھر پہنچتے تو ان میں سے کسی کی پیاری پوتی جس کی عمر سات سال ہوتی اپنے ماں باپ اور ان کے احباب کی پر شفقت اور پر تحسین نظروں کے سامنے کولہے مٹکا مٹکا کر گا رہی ہوتی "ناچو ناچو پیارے من کے مور" اور یہ بڑے میاں چپکے سے اپنے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیتے۔

گلستان کالونی کی چہل پہل میں اضافہ کرنے میں ایک اور ہستی کا بھی بڑا دخل تھا اور یہ تھا بابے

والا۔ باجے والا تئیس بائیس برس کا ایک نوجوان تھا۔ گندمی رنگ، ناک نقشہ برا نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ کس صوبے کا رہنے والا ہے۔ وہ خود کو بمبئی کا باشندہ بتاتا تھا مگر اس کے شین قاف کی درستی کہہ رہی تھی کہ اس کا تعلق ملک کے جنوبی حصے سے نہیں۔ ہاں شمالی حصے سے ہے۔ اپنی وضع قطع اور لباس سے وہ سرکس کے مسخروں سے ملتا جلتا تھا۔ کبھی سیاہ ٹیل کوٹ اور سیاہ ٹاپ ہیٹ۔ کبھی شب خوابی کا رنگ دار دھاری دار کرتہ پاجامہ اور سر پر پھندنوں کی لٹکتی ہوئی انگریزی ٹوپی۔ کبھی بنگالی فلم ایکٹروں کے تتبع میں تہمد کا لمبا کرتا اور لہراتی ہوئی دھوتی۔ کبھی شکاریوں کی طرح برجس ڈالے ہوئے۔ کبھی کبھی ٹاپ ہیٹ کی جگہ سرخ ترکی ٹوپی لے لیتی۔ چہرے پر ایکٹروں کی طرح گاڑھا گاڑھا میک اپ کیا ہوتا۔ آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پر لپ اسٹک۔ اس کے ساتھ باریک باریک مونچھیں۔ وہ جو لباس بھی پہنتا ایسا بے تکا ہوتا کہ دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ جاتی۔ اس نے اپنی سائیکل کا حلیہ بھی بگاڑ رکھا تھا اور اس کے ہینڈل اور مڈگارڈوں پر رنگدار کاغذ کی بنی ہوئی جھنڈیاں لگا رکھی تھیں جو ہوا سے آپ ہی آپ پھڑکتی رہتیں۔ گلے میں ایک چھوٹا سا بکس ڈال رکھا تھا جس میں طرح طرح کی ٹافیاں، چوسنے والی گولیاں، رنگ برنگی مچھلیاں اور میٹھی سونف کی پڑیاں ہوتیں۔ علاوہ ازیں وہ فلمی ایکٹروں کے فوٹو اور فلمی گانوں کی کتابیں بھی بیچا کرتا تھا۔ ایک ہاتھ ہینڈل پر، دوسرے ہاتھ میں ایک بڑا سا کالے رنگ کا بھونپو۔ اس کو منہ سے لگا کر جس وقت وہ "باجے والا باجے والا" کی آواز لگاتا تو گھروں میں بجلی سی دوڑ جاتی۔ بچے پیسوں کے لیے مچلنا شروع کر دیتے اور وہ تیر کی طرح باہر اس کے پاس پہنچ جاتے۔

"باجے والا" کے الفاظ وہ اس طرح کھینچ کھینچ کر ادا کرتا کہ وہ ایک نغمے کی طرح معلوم ہوتے جس میں کئی اتار چڑھے سر لگتے۔ اس کا یہ گانا اس کی آمد کا اعلان ہوتا۔

دل کا نیک تھا۔ بچوں کو ان کے دام سے کچھ زیادہ ہی مٹھائیاں دے دیا کرتا۔ کبھی کسی بچے کے پاس پیسہ نہ ہوتا تو مفت ہی ایک آدھ چوسنے والی گولی دے دیتا۔ وہ "باجے والا" کی اس پکار کے علاوہ اور بھی بہت سے گانے گایا کرتا۔ یہ فلموں کے چلتے گانے ہوتے۔ جن میں پریم اور برہ کی [illegible] اور چٹکلے ڈال کر ایسے پرسوز طریقے پر ہوتا کہ انھیں سن کر بالاخانے کو جھانکنے والی لڑکیوں کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ اور وہ اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کو آنہ یا اکنی دے کر میٹھی سونف منگوایا کرتیں۔

اس کی آواز ایسی مدھر تھی کہ جب وہ کوئی فلمی گانا گاتا تو لوگ اس کے مسخرے پن کو بھول کر گانے پر جھوم جھوم اٹھتے۔ اس کی یہ آواز اس کے کاروبار کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ عورتوں کو گھورنا یا ان پر آوازے کسنا اس کی عادت نہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ آواز لگانے کے پردے میں بہت کچھ

کہہ جاتی۔

وہ اس کالونی میں ہفتے میں ایک آدھ بار ہی آیا کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے آتے ہی بچے بڑے جوش و خروش سے اس کے خیر مقدم کے لیے دوڑتے۔ بچے جس قدر اس سے خوش تھے۔ ان کے ماں باپ اتنا ہی اس سے بیزار۔ کیونکہ اس کے آنے پر انھیں بچوں کی ضد پوری کرنی پڑتی تھی۔ خواہ جیب میں پیسہ ہو یا نہ ہو اور ان بڑے بوڑھوں کی ناراضگی کا تو پوچھنا ہی کیا۔ انھیں اس کے مسخروں کے سے لباس اور عاشقانہ گیتوں سے سخت چڑ تھی۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق ان گانوں سے شرفا کی بہو بیٹیوں کا اخلاق بگڑتا تھا۔ اگر ان بڈھوں کا بس چلتا تو وہ اسے پولیس کے حوالے کر کے حوالات میں بند کرا دیتے مگر جب تک اس سے کوئی مجرمانہ حرکت سرزد نہ ہو ایسا ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان بڑے بوڑھوں کو گھر کی طرح اس معاملے میں بھی صبر ہی سے کام لینا پڑتا تھا۔

آخر ایک دن ایسا آیا جب ان کے صبر کا پیمانہ سچ مچ لبریز ہو گیا۔ اور ادھر وہ لوگ بھی جو عورتوں کی آزادی کے بڑے حامی تھے سوچ میں پڑ گئے کہ کہیں ہم ہی تو غلطی پر نہیں ہیں۔

ہوا یہ کہ اس کالونی میں ایک بنگالی بابو رہتا تھا۔ بڑا خوش خلق اور شریف طبع۔ کالونی میں اس کا بڑا مان تھا۔ وہ کسی دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھا۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ میرا اور سیتا۔ میرا کی عمر تیرہ برس اور سیتا کی چودہ برس۔ وہ کاٹھیاواڑ کے ایک کتھک سے ناچ سیکھا کرتی تھیں۔ اس کتھک کی عمر کوئی تیس پینتیس سال کی تھی۔ حد درجہ کا چرب زبان۔ اس جواں عمری ہی میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا تھا۔ ایک دن دوپہر کو وہ کسی تماشے کے پاس لے کر آیا اور ان لڑکیوں کو تماشہ دیکھنے پر اکسایا۔ بنگالی بابو دفتر میں تھا۔ لڑکیوں نے ماں سے اصرار کر کے اجازت لے لی۔ اس کے بعد وہ دونوں لڑکیاں اور کاٹھیاواڑی کتھک ایسے غائب ہوئے کہ نہ جانے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

بعض لوگ کہتے کہ دونوں انھیں ایکٹرس بننے کے شوق میں بمبئی بھاگ گئیں۔ بعض کہتے نہیں اسی شہر کے ایک سیٹھ کے قبضے میں ہیں جس نے انھیں تالوں میں بند کر رکھا ہے۔ یہ کتھک بھی اسی سیٹھ کا سکھایا پڑھایا تھا غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ تھانے میں رپٹ لکھوا دی گئی تھی۔ مگر ابھی تک کسی کا کھوج نہیں ملا تھا۔

جس دن یہ واقعہ پیش آیا کالونی میں ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ کالونی والوں کے چہرے اتر سے گئے جیسے کوئی موت واقع ہو گئی ہو۔ ریڈیو پر فلمی گانے سنے بند کر دیے گئے۔ اور ایک سوگ کا سا سماں بندھ گیا۔ کالونی کے ایک کائستھ کی بیٹی ایک ستاریے سے ستار سیکھا کرتی تھی۔ کائستھ نے اسی دن اسے

برطرف کر دیا۔ یہ واقعہ تھا تو بہت افسوس ناک مگر ان بڈھے بوڑھوں کے حق میں تائید غیبی ثابت ہوا۔ کالونی میں یک لخت ان کا وقار بڑھ گیا۔ یہ بڈھے جو پہلے سر ڈالے سائے کی طرح چپکے سے گلی کوچوں سے گذر جاتے تھے اب انہیں راستوں پر کھنکارتے زور زور سے لاٹھی ٹیکتے سر اٹھا کر چلنے لگے۔ وہ اپنے بیٹوں کو کھری کھری سناتے اور اس نئی تہذیب کی خوب خوب دھجیاں اڑاتے۔ برسوں سے اس کے خلاف دلوں میں جو نفرت کا طوفان امنڈ رہا تھا وہ ایک دم پھوٹ پڑا۔ اب ان کے خود سر بیٹوں کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ خاموشی سے سنتے رہیں اور سر جھکالیں۔

جس دن یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اس دن سے بڈھوں کی اس منڈلی میں بڑا جوش و خروش نظر آنے لگا تھا۔ یہ لوگ بلند آواز سے اس پر حاشیہ آرائی کرتے اور چہلوں کے پھلجھڑیاں چھوڑتے۔ ان کے لئے یہ ماجرا روز کا ایک مستقل موضوع بن گیا تھا۔

"ویدجی" مونڈھے پر بیٹھے ہوئے ایک بڑے میاں نے اپنے ساتھ والے بڈھے سے خطاب کیا۔ "اگر ایسا ہی ایک واقعہ اور ہو جائے تو میں مسلمان لڑکیوں کی طرح اپنی پوتیوں کو برقع پہنانا شروع کر دوں۔"

اس پر منڈلی میں ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

"پنڈت جی بھی کمال کرتے ہیں۔" ایک سفید ریش مقطع صورت بزرگ گویا ہوئے۔ "عفت کوئی برقع ہی میں تھوڑی ہے۔ یہ تو دل میں ہونی چاہئے۔"

"سچ کہتے ہو خان صاحب۔" ایک اور پیر مرد نے تائید کی اور خان صاحب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ان بزرگ کا شکریہ ادا کیا۔ خان صاحب کی بہو پردہ نہیں کرتی تھی اور جوان بیٹیاں بھی بے نقاب ہی کالج جاتی تھیں۔

منڈلی میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک "بھیے والا" کی آواز سنائی دی۔ کالونی کی اس اداس اور سوگ بھری خاموشی میں یہ آواز ایسی معلوم ہوئی جیسے قبرستان میں کوئی بدمست شرابی آ گھسے اور ہنکارنا شروع کر دے۔

بڈھوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر بخشی جی، جو تھے تو ساٹھ کے پیٹے میں مگر جوانوں کا سا دم خم رکھتے تھے مونڈھے سے اٹھے اور بھیے والا کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

"کیا بیچتے ہو تم؟" بخشی جی نے غصہ بھری آواز میں پوچھا۔

بھیے والا متعجب سا ہو کر مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

"میں پوچھتا ہوں کیا بیچتے ہو تم؟" بخشی جی نے پہلے سے زیادہ غصے میں کہا۔

"ٹافی۔ چوسنے والی گولیاں۔ چیونگم۔ جنتی سونف۔" بھیے والا نے بدستور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"لاؤ۔ دکھاؤ۔"

اس نے بائیسکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کر دیا اور گلے میں پڑا ہوا بکس کھول کر سب چیزوں کا ایک ایک نمونہ دکھانے لگا۔

"بے ایمان کہیں کا" بخشی جی اچانک ہی برس پڑے "یہ ٹافی تو گڑ کی ہے بچوں کو ٹھگنے کے لئے یہ چار سو بیس!"

بھیے والا کچھ پریشان سا نظر آیا مگر مسکراتے ہوئے ادب سے بولا:

"حضور اول تو یہ درست نہیں کہ یہ ٹافی گڑ کی ہے۔ دوسرے یہ چیزیں میں خود تھوڑا ہی بناتا ہوں۔ یہ تو کمپنی کا مال ہے۔ میں تو بنا بنایا مال لاتا ہوں۔"

اس اثنا میں تین چار بوڑھے اور منڈلی سے اٹھ کر بھیے والا کے پاس پہنچ گئے اور اس کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔

"کیا ٹرٹر لگائی ہے۔" یہ کہتے ہی گپتا جی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ زور کا ایک چانٹا بھیے والے کے منہ پر جڑ دیا۔ "ایک تو چوری اوپر سے کمپنی کا رعب جماتا ہے لے اور لے۔"

گپتا جی پہل کر چکے تھے۔ پھر کیا تھا۔ چاروں طرف سے بھیے والا پر بے بھاؤ کی پڑنے لگیں۔ ادھر اس کا یہ حال کہ ہر تھپڑ یا چانٹے پر وہ پہلے سے زیادہ ہکا بکا ہو کر اپنے مارنے والے کا منہ تکنے لگتا۔

اس کی ٹاپ ہیٹ اچھل کر زمین پر آ رہی تھی۔ اس کے گالوں پر انگلیوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ گالوں اور ہونٹوں کی سرخی میں کاجل کی سیاہی مل گئی تھی اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ ایک بزرگ نے اس کے نیلے کوٹ کی نیلی ٹائی نوچ ڈالی تھی۔ اس کا سنہری بیلوں والا بکس کھل گیا تھا۔ اور ٹافیاں، چاکلیٹ، ربڑ کے چھلے، جنتی سونف کی پڑیاں زمین پر آ رہی تھیں۔ فلمی ایکٹروں کی تصویریں، گانوں کی کتابیں، فلمی پریوں کی داستانیں زمین پر بکھری پڑی تھیں۔

"حرام زادہ۔ سور کا بچہ بڑا ایکٹر بنا پھرتا ہے۔ بد معاش...... جا اب تو چھوڑ دیا۔ پھر کبھی ادھر

بج نہ سکے۔" اور بڑے بوڑھوں نے تھوڑی تھک کر اس کا پیچھا چھوڑ دیا۔ اور ہانپتے ہوئے آ کر پھر اپنی منڈلی میں آ بیٹھے۔

باجے والا مظلومی کی تصویر بنا ریگ زمین پر بیٹھا مٹھائیاں، تصویریں اور کتابیں اٹھاتا اور جھاڑ جھاڑ کر اپنے بکس میں رکھتا رہا۔ کبھی کبھی وہ ان لونڈوں پر بھی ایک نظر ڈال لیتا۔ تھوڑی دیر میں سب اٹھا کے میں مٹھائیوں کا بکس ڈالا۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس طرف گیا جہاں سائیکل کھڑی تھی۔ پھر سائیکل پر بیٹھ خاموشی سے اس نواح سے رخصت ہو گیا۔

اس مار پیٹ سے اس کا جسم درد کرتا تھا۔ اسے بے عزتی کا بھی بہت قلق تھا مگر اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ کس جرم کی پاداش میں یہ سزا دی گئی ہے۔

اس کے بعد گلستان کالونی میں باجے والا کی آواز پھر کبھی نہ سنائی دی۔

سایہ

دن بھر جیسے جیسے سائے گھٹتے بڑھتے اور زاویے بدلتے رہتے، جمعان کی دکان بھی جگہیں بدلتی رہتی۔ صبح کو سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ اپنا ٹھیلہ وکیل صاحب کے مکان کے سامنے سڑک کے اس کنارے لا کھڑا کرتا۔ اس طرف کوئی عمارت نہ تھی۔ زمین جھول کی طرح تھی اور تھوڑی سی ڈھلوان کے بعد ایک میدان آتا تھا۔ جس میں پیپل کا ایک پرانا پیڑ تھا۔ جب سورج وکیل صاحب کے چومنزلے مکان کے پیچھے سے ابھرتا اور دھوپ دھیرے دھیرے پیپل کی چوٹی سے اترنی شروع ہوتی اور کوئی دو ڈھائی گھنٹے میں مکان کا احاطہ کرتی، ڈھلوان پر چڑھتی ہوئی سڑک کے کنارے تک پہنچ جاتی تو وہ اپنا ٹھیلہ سڑک کے اس کنارے وکیل صاحب کے مکان کے زینے کے ساتھ ملا کر کھڑا کر دیتا۔ اور یوں اس اونچے مکان کا سایہ دو تین گھنٹے تک اسے دھوپ سے بچائے رکھتا۔

لیکن جب سورج عین سر پر آ جاتا۔ اور سایہ مختصر ہوتے ہوتے ایک لکیر سی بن کے رہ جاتا۔ تو اسے ناچار اپنا ٹھیلہ ڈھلوان پر سے دھکیل کر میدان میں پیپل تلے لے جانا پڑتا۔ جہاں وہ دو تین بجے تک ڈیرا جمائے رہتا۔ اس کے بعد سورج ڈھلنا شروع ہوتا تو پیپل کے سائے کے ساتھ ساتھ اس کی دکان بھی آگے سرکنی شروع ہو جاتی۔ یہاں تک کہ شام ہوتے ہوتے وہ پھر وکیل صاحب کے مکان کے سامنے سڑک کے اسی کنارے پر پہنچ جاتا جہاں زمین جھول کی طرح تھی اور جہاں اس نے

ہی اس نواح میں ٹھیلہ کھڑا کیا تھا۔ خاص طور پر گرمیوں میں اس کی دکان یوں ہی شام تک خاصی بارونق رہتی تھی۔

وکیل صاحب کا مکان بھان کو دھوپ ہی سے پناہ نہ دیتا تھا بلکہ اس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ بھی تھا۔ وکیل صاحب ایک وسیع کنبے کے سرپرست تھے۔ ان کا شمار شہر کے مشہور رئیسوں میں ہوتا تھا۔ بڑے با اخلاق، ملنسار اور مہمان نواز۔ جب تک گھر پر رہتے، ملنے والوں کا تانتا لگا رہتا۔ کچہری جاتے تو پیچھے بیگم صاحبہ ان کی ہر عزیزی کو برقرار رکھتیں۔ ان کی اپنی ملنے والیاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ اس پر وکیل صاحب کے موکلوں کی بیویوں کی مدارات کرنا بھی ان کے فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ بھان کے ٹھیلے سے سوڈا لیمن کی بوتلوں، برف، پان، سگریٹ وغیرہ کی مانگ بندھی رہتی۔

یہ علاقہ شہر کے سرے پر تھا۔ جہاں شہر کی حد ختم ہو جاتی اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا اس جگہ مکان خال خال ہی تھے اور کوئی دکان قریب نہ تھی۔ بھلا وہ ایک گھر ان کے آسرے کوئی ایک مستقل دکان کا متحمل ہو سکتا۔ رہا بھان اس کی بات دوسری تھی۔ اول تو اس کے ٹھیلے کا خرچ ہی کیا تھا۔ کرایہ دینا نہ تھا، بجلی پانی کا بل۔ پھر دنیا میں کوئی رشتہ دار تھا نہ عزیز۔ گھر تھا نہ در۔ اس کی ضروریاتِ زندگی اس قدر مختصر تھیں کہ صرف وکیل صاحب کے مکان کی آمدنی ہی سے پوری ہو جاتی تھیں۔ اور وہ شہر کے چوکوں کے ٹھیلے والوں اور دوسرے دکان داروں کی باہمی چشمکوں سے الگ تھلگ اس سنسان مگر عافیت کی جگہ میں خوش تھا۔

وکیل صاحب نے جب نئی نئی وکالت شروع کی تھی تو انھیں مجبوراً شہر کے ایک بارونق بازار میں رہنا پڑا تھا۔ چھوٹا سا مکان، کرایہ حد سے بڑھا ہوا۔ مگر رفتہ رفتہ جب کام چل نکلا اور لوگ ان کو جاننے لگے تو انھوں نے اس نواح میں ایک معقول سی زمین سستے داموں خرید لی۔ یہ زمین ایک عرصے تک یوں ہی پڑی رہی۔ رفتہ رفتہ جب انھوں نے تعمیر کے لئے روپیہ جمع کر لیا اور اپنے حسبِ منشا مکان بنوا لیا تو وہ اپنے وسیع کنبے کو لے کر اس میں اٹھ آئے۔ ان کے دم قدم سے تھوڑے ہی دنوں میں اس علاقے میں زندگی کے آثار نظر آنے شروع ہو گئے۔ دور دور سے تانگے والے ان کے موکلوں کو لے کر یہاں پہنچنے لگے۔ چونکہ وکیل صاحب خود بھی تانگے ہی میں بیٹھ کر کچہری جایا کرتے تھے۔ اس لئے دو ایک تانگے صبح شام ان کے مکان کے آس پاس کھڑے نظر آنے لگے۔ کبھی کبھی کوئی موٹر بھی تھوڑی دیر کے لئے ان کے مکان کے پھاٹک پر رک کر اس نواح کی رونق بڑھا جاتی۔

وکیل صاحب کے گھر کے علاوہ بھان کی آمدنی کا ذریعہ یوں تو وہ اکا دکا راہ گیر بھی تھے جو شہر سے دیہات یا دیہات سے شہر جاتے ہوئے اس سے دو ایک پیسے کی چیزیں، گزک، ریوڑیاں یا بھنے

ہوئے چنے خریدنے ٹھہر جاتے۔ مگر ان سے بافت کم اور کوفت زیادہ ہوتی۔ خصوصاً اس وقت جب دیہاتنیں سر اور ٹھوڑی پر دوپٹے کے بل دیئے، ناک اور منہ چھپائے اپنی بھدی جوتیاں گھسیٹ گھسیٹ کر چلتیں تو سڑک پر گرد و غبار کا ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوتا اور بھان کو سوڈے کی بوتلوں سے گرد دور کرنے کے لئے پانی کا ایک اور چھینٹا دینا پڑتا۔

ان راہ گیروں سے کہیں زیادہ اس کی بکری تانگے والوں سے ہوتی تھی جو یوں تو کمر کے نیچے سے پھٹا ہوا خاکی پاجامہ پہنے ہوتے مگر قینچی سے کم درجے کا سگریٹ پینا ان کی طبع کو پسند نہ تھا اور جب پیاس لگتی تو پانی کے بجائے برف میں لگے ہوئے لیمن کے ادھے سے ان کی تسکین ہوتی تھی۔

کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ جب بھان دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں لاوارث سانڈوں، کتوں، ننگ دھڑنگ لڑکوں کے ساتھ پیپل کے سائے تلے پناہ لے رہا ہوتا اور گرمی سے بے نیاز اسٹول پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتا تو ایسے میں کوئی دیہاتی برات دولہا دلہن سمیت، پسینے میں شرابور، گلے ماتھے اور کلائیوں پر سستے ریشمی کپڑوں کا رنگ لگا ہوا، پیاس سے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی اس پیپل تلے سستانے اور پڑاؤ کرنے پر مجبور ہو جاتی اور بھان کی کئی دنوں کی کسر ایک دن میں نکل جاتی۔

بھان کو اس علاقے میں ٹھیلہ لگاتے پانچ برس ہو چکے تھے۔ یہی ایک ایسا کام تھا جو اس نے ایک جگہ جم کر اتنے عرصے تک کیا تھا۔ ورنہ اس کی ساری عمر گھومنے پھرنے میں گذر گئی تھی۔ ابھی وہ دس برس کا بھی نہ ہوا تھا کہ فکرِ معاش نے اسے گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے بچپن اور جوانی میں بیسیوں دھندے کئے تھے۔ آج اس شہر میں تو کل اس شہر میں۔ کبھی کسی گھر میں اوپر کے کام پر ملازم ہے تو کبھی کسی دفتر میں چپراسی ہے۔ کبھی ریلوے شاپ میں تو کبھی چھاپے خانے میں۔ کچھ عرصہ فوج میں بھی رہا۔ جب تک ہاتھ پاؤں میں سکت رہی آزاد مزدوری کو ہر کام پر ترجیح دی۔ مگر جب جوانی گذر گئی اور بڑھاپے کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے تو طبیعت محنت مشقت سے خود بخود بھاگنے لگی۔ آخر اس نے اتنی رقم جمع کر لی کہ ایک ٹھیلہ خرید لے۔ پہلے پہل اس نے پھل اور سبزیاں ٹھیلے پر رکھ کر شہر کا چکر لگانا شروع کیا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں اس کام سے بددل ہو گیا۔ اول تو منڈی کے بھاؤ کو سمجھنا اور مول تول کرنا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ مال کو پرکھنے میں بہت جلد دھوکا کھا جاتا۔ پھر مال نہ بکے تو گل سڑ کر یا باسی ہو کر خراب ہو جاتا۔ اور پھر یہ کہ دوسرے ٹھیلے والوں سے خواہ مخواہ جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دن بھر پولیس والوں کی گھرکیاں اور جھڑکیاں سننی پڑتی تھیں۔ چنانچہ اس نے زیادہ منافع کے خیال کو چھوڑ کر پان سگریٹ کی دکان پر اکتفا کی اور شہر کا ایک

یہ الگ تھلگ کونہ تلاش کر لیا جہاں کسی قدر چین سے زندگی کے دن پورے کر سکے۔

ادھر وکیل صاحب یہ دیکھ کر کہ یہ دکان محض ان کے گھر کے آسرے پر ہی لگائی گئی ہے اس کی سرپرستی کرنا اپنا فرض سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ ماما اور نوکروں کو تاکید تھی کہ سب اسی سے سودا خریدیں اور اگر کچھ شکایت ہو یا چیزیں مہنگی معلوم ہوں تو ان کو اطلاع دیں۔ مگر بھجان کسی قسم کی شکایت کا موقع ہی نہ آنے دیتا۔ وہ نوکروں سے ہنسی مذاق کی باتیں کر کے اور ایک آدھ پان یا بیڑی مفت کھلا پلا کے ہمیشہ انہیں خوش رکھنے کی کوشش کیا کرتا۔

یوں بھی وہ ہنس مکھ اور خوش طبیعت کا تھا۔ لڑائی بھڑائی کی عادت نہ تھی۔ اس لئے سب سے خوب بنتی تھی۔ دکان لگانے کے ساتھ ہی اس نے ذرا سی داڑھی رکھ لی تھی۔ لیکن کترواتا رہتا تھا۔ کنگھی ذرا سی مونچھوں کی بنی ہوئی ترکی وضع کی ایک مخملی چمکتی ٹوپی ہر وقت سر پر رہا کرتی۔ چوخانہ تہمد باندھے کام کرتا۔ اس پر خاکی رنگ کا کوٹ۔ اپنی اس وضع سے وہ خاصا دین دار معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ صوم و صلوٰۃ سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔

ان پانچ برس میں جو اس نے وکیل صاحب کے مکان کے سامنے میں گزارے تھے وہ ان کے خاندان کے بہت سے حالات سے آگاہ ہو گیا تھا۔ اسے ایک ایک فرد کے عادات و اطوار کا علم تھا۔ یہاں تک کہ پردے میں رہنے والی عورتوں کا ناک نقشہ ان کی سیرت اور مزاج بھی اس سے چھپا نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیگم صاحبہ کے سارے بچے ایک ہی چھاتی کا دودھ پی کر پلے ہیں۔ کیونکہ دوسری چھاتی میں دودھ نہیں اترتا۔ وہ جانتا تھا کہ منجھلی صاحبزادی سب بہن بھائیوں سے زیادہ تحصیل ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وکیل صاحب کے والد ماجد میر صاحب بڑے قصاب تھے مگر بیٹے کے کہنے پر انہوں نے وہ پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ غرض کئی اور ایسی باتیں جن کا وکیل صاحب کے بہت سے ملنے والوں کو سان گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔

اسی طرح اسے مکان کے ایک ایک حصے اور اس کی آرائش کا حال بھی معلوم تھا۔ حالانکہ عمر تو گزر اس نے کبھی سیڑھیوں میں بھی قدم نہ رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کس کمرے میں کون رہتا ہے۔ وکیل صاحب کا دیوان خانہ کہاں ہے۔ بیگم صاحبہ ملنے والیوں سے کہاں ملاقات کرتی ہیں۔ بڑی صاحبزادیاں اور صاحبزادے رات کو کہاں سوتے ہیں۔ بادرچی خانہ کون سا ہے۔ وہ بڑا گھڑیال جس کا گھنٹہ رات کو پچھلے پہر کے سناٹے میں سنائی دیا کرتا ہے کس کمرے میں ہے۔ باورچی خانہ کس منزل پر ہے اور بوڑھے میر صاحب اوپر کس طرف رہتے ہیں۔

یہ باتیں اسے کچھ تو بچوں کے بھولے پن سے، کچھ نوکروں کی بے احتیاطی سے اور کچھ خود اپنی ٹوہ لگانے کی عادت سے معلوم ہوئی تھیں۔ لیکن انہیں معلوم کرنے میں کسی بری نیت کو دخل نہ تھا۔ بس اسے انسانی ہمدردی کہہ لیجئے یا دل بہلاوے کی ایک صورت۔ آخر زندگی میں کچھ لگاؤ تو ہونا ہی چاہئے تھا۔ ورنہ اس ویرانے میں ایک ایسے شخص کا جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو دن گزارنا اجیرن ہو جاتا۔

ان پانچ سال کے عرصے میں بھجان کے سامنے وکیل صاحب کے خاندان میں دو نئے رکنوں کا اضافہ ہوا تھا۔ ایک صاحبزادہ، ایک صاحبزادی۔ ان سے پہلے جو صاحبزادے گودوں میں رہتے تھے۔ وہ اب بہن کی انگلی پکڑے بھجان کی دکان سے اپنے لئے مٹھائی کی گولیاں لینے خود آنے لگے تھے۔ ان کے لئے ابھی پاجامہ پہننا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔

ان کمسن بھائیوں سے دو بڑے صاحبزادے علی الصباح سب سے پہلے مکان سے نکلتے۔ ایک کی عمر نو برس، دوسرے کی گیارہ برس۔ ایک ہی طرح کے کوٹ، ایک ہی طرح کی ٹوپیاں، ایک ہی طرح کے بستے۔ اسکول روانہ ہونے سے پہلے وہ بھجان سے دو دو پیسے کی چٹ پٹی دال مٹھرے کی پھانکیں خریدتے۔ بھجان سب سے پہلے ان ہی کی بوہنی کیا کرتا۔ جس دن انہیں آنے میں دیر ہو جاتی۔ وہ سمجھ جاتا کہ آج اسکول میں چھٹی ہے۔ وہ ان کے لئے بڑھیا سے بڑھیا مٹھرے کی پھانکیں اور دوسری انگریزی مٹھائیاں لایا کرتا۔ اور نفع کا خیال کئے بغیر ہمیشہ گنتی سے زیادہ دیا کرتا۔

کبھی کبھی وہ چھوٹے بھائی سے کہتا:

"افضل میاں اسکول سے دیر ہو گئی ہے نا، دیکھنا آج کیسے کان اینٹھیں گے ماسٹر صاحب!"

اور افضل میاں اس کے سانولے رنگ کو گھور کر کہتے:

"چپ رہو تم کالا آدمی۔ ہم تم سے بات کرنا نہیں مانگتا۔" اور وہ دونوں ہنستے ہوئے وہاں سے چل دیتے۔

ایک دن صبح کو بڑا بھائی آیا لیکن چھوٹا نہ آیا۔ جب اس نے پھانکیں خریدنے کے لئے جیب سے پیسے نکالے تو بھجان نے پوچھا:

"افضل میاں کہاں ہیں؟"

"وہ ماموں کے ساتھ گاؤں گیا ہے۔" لڑکے نے جواب دیا اور وہ اکیلا ہی اسکول روانہ ہو گیا۔

جب چار پانچ روز تک بھجان نے افضل کی صورت نہ دیکھی تو اسے بے چینی سی ہونے لگی۔ آخر چھٹے روز جب دونوں بھائی پہلے کی طرح اسکول جاتے ہوئے اس کی دکان پر آئے تو اسے ایسا محسوس

ہوا جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی۔

ان لڑکوں کے جانے کے کوئی گھنٹہ بھر بعد ایک خالی تانگہ مکان کے پیچھے آ کر رکتا۔ اور کوچوان گھنٹی بجاتا۔ بھان سمجھ جاتا کہ اب صاحبزادیوں کے اسکول جانے کی باری ہے۔ جب انہیں آنے میں کچھ دیر ہو جاتی تو کوچوان بے صبری سے پے در پے گھنٹی بجانا شروع کر دیتا۔ اس پر نچلی منزل کے بغل والے حصے میں سے بوڑھی ماما چق کو سرکا کر اپنا سر باہر نکالتی اور تانگے والے سے کہتی:

"ہم لوگ آتے ہیں، ابھی آتے ہیں۔"

یہ سن کر تانگے والا بڑبڑاتا ہوا تانگے سے اتر کر بھان کے ٹھیلے کے پاس جاتا اور اس سے قینچی کے دو سگرٹ خریدتا اور سونف میٹھی والا پان بنوا کر کھاتا۔ آخر وکیل صاحب کی تینوں بڑی صاحبزادیاں ماما کے ہمراہ سیڑھیوں سے اترتیں۔ بڑی کی عمر اٹھارہ، منجھلی کی سولہ اور چھوٹی کی تیرہ برس۔ تینوں کے مصری وضع کے برقعے، ایک کتھئی رنگ کا، ایک سیاہ رنگ کا اور ایک سلیٹی رنگ کا۔ تینوں کے پاؤں میں چپل۔ دو بڑی بہنیں تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتیں۔ اور چھوٹی بہن اور ماما اگلی سیٹ پر۔ اور تانگے والا ایک بڑی سی سفید چادر تانگے کے آگے پیچھے تان دیتا۔ ماما سیر بھر برف کا چورا کر کے تھرمس بوتل میں بھر لیتی۔ وہ اپنے لئے بھان سے ایک دو آنہ کا پان بھی بنواتی۔ جس میں وہ بہت سا کالا تمباکو ڈلوایا کرتی۔ کبھی کبھی منجھلی صاحبزادی کو بدہضمی کی شکایت ہوتی تو وہ سوڈے کا ایک ادھا ماما سے منگوا کر پیا کرتی اور تانگہ چل دیتا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد مختار اور شمشاد وکیل صاحب کے بڑے صاحبزادے موسم گرما کے ہلکے پھلکے کپڑے پہنے، اپنی اپنی سائیکل کندھے پر اٹھائے سیڑھیوں سے اترتے دکھائی دیتے۔ وہ سڑک کو پار کر کے بھان کے ٹھیلے کے پاس آ کھڑے ہوتے۔ بھان انہیں سلام کرتا جس کا وہ خندہ پیشانی سے جواب دیتے۔ مگر وہ دونوں ہر وقت کسی گرما گرم بحث میں الجھے رہتے کہ بھان باوجود کوشش کے ان سے کوئی بات نہ کر پاتا۔ پھر ان کی باتیں بھی عموماً ایسی ہوتیں کہ بھان کے کچھ بھی پلے نہ پڑتا۔ ان کے جوش و خروش، تیز لہجے اور آنکھوں کی چمک کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ وہ کسی بہت ہی دقیق مسئلے پر بحث کر رہے ہیں۔ گفتگو کا جتنا حصہ بھان کی سمجھ میں آتا وہ کچھ اس قسم کا ہوتا:

"بھئی تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے بھلا افلاطون ....."

"لیکن بھائی جان آپ بھی تو ذرا غور فرمائیے کہ ارسطو ....."

"بھئی میں کہتا ہوں کہ تم کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ مانا کہ ....."

"وہ تو صحیح ہے لیکن بھائی جان ان دلائل کی روشنی میں ....."

"یہ سراسر ہٹ ہے تمہاری شمی۔"

"بھائی جان لیکن پروفیسر صاحب ....."

"شمی ....."

"بھائی جان ....."

"شمی ....."

"بھائی جان ....."

غرض کالج کو جاتے۔ کالج سے آتے۔ ہاکی کھیلنے جاتے۔ ہاکی کھیل کر آتے، جب کبھی دونوں بھائی ساتھ ساتھ ہوتے یہ بحث یوں ہی جاری رہتی۔ کبھی کبھی وہ انگریزی میں بھی گفتگو کرنے لگتے۔ پھر تو ان کا جوش و خروش اور بھی بڑھ جاتا ایسے موقعوں پر بھان نیچی نظریں کر کے مسکرایا کرتا۔

مختار بائیس سال کا نوجوان تھا۔ صحت و توانائی کا مجسمہ۔ بھرا بھرا جسم۔ سرخ و سفید چہرہ، شربتی رنگ کی آنکھیں۔ بھورے گھنگھریالے بال۔ شمشاد اس سے دو سال چھوٹا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کا قد بڑے بھائی سے نکلتا ہوا تھا۔ ظاہری جمال میں وہ مختار کے برابر نہ تھا۔ البتہ اپنی آنکھوں کی غیر معمولی چمک سے وہ اس سے کہیں زیادہ ذہین معلوم ہوتا تھا اور بھان نے بارہا یہ محسوس کیا کہ مختار بحث میں اپنے بڑے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر خواہ مخواہ چھوٹے بھائی کو ڈانٹ ڈپٹ دیتا ہے اور یہ شمشاد کی سعادت مندی ہے کہ وہ ہمیشہ بڑے بھائی کا احترام ملحوظ رکھتا ہے۔

بھان ان کے لئے حسب معمول دو کرارے دیسی پان چن کر نکالتا اور ان پر چونا کم اور کتھا زیادہ لگا کے رچنے کے لئے رکھ دیتا۔ وہ اپنی بحث کے دوران میں اس سے جھاڑن مانگتے اور بائیسکلوں کو بھی جھاڑتے پونچھتے جاتے اور ساتھ ساتھ بحث بھی کرتے رہتے۔ کبھی کسی پہیے میں ہوا کم ہوتی۔ تو وہیں سے ملازم لڑکے شبیر کو آواز دے کر پمپ منگوایا جاتا۔ اور پہیے میں ہوا بھری جاتی۔ مگر اب بھی کیا مجال کہ بحث لحظہ بھر کے لئے بھی رکنے پائے۔ بھان پانوں کے علاوہ سگرٹ کی دو ڈبیوں میں قینچی کے پانچ پانچ سگرٹ پہلے ہی سے ڈال رکھتا اور وہ اپنا اپنا پان منہ میں رکھ سگرٹ سلگاتا، بائیسکلوں پر سوار ہو تیز تیز پیر مارتے ہوئے کالج روانہ ہو جاتے۔ مگر بحث بدستور جاری رہتی۔

کوئی دس بجے کے قریب ایک اور خالی تانگہ مکان کے پیچھے آ کر رکتا اور بھان کو معلوم ہو جاتا کہ وکیل صاحب کے کچہری جانے کا وقت ہو گیا۔ اس وقت اس کا ٹھیلہ وکیل صاحب کے مکان کی

دھجیوں کے برابر کھڑا ہوتا وہ پہلے ہی سے ایک اچھا سا پان چھانٹ کر لگا رکھتا۔ آخر سیڑھیوں میں بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دیتی اور وکیل صاحب سیاہ شیروانی پہنے، سر پر مشہدی پگڑی باندھے، چھڑی ٹیکتے ہوئے سیڑھیوں سے اترتے۔ ان کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ بھاری جسم کے آدمی تھے۔ مگر چاق چوبند۔ فرنچ کٹ تراش کی داڑھی جس میں اب کچھ دنوں سے سفید بال زیادہ نظر آنے لگے تھے۔ چہرے سے ذہانت اور بردباری ٹپکتی تھی۔ کثرت اولاد کی وجہ سے ہر ایک کو شفقت کی نظروں سے دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ سجان کے سلام کے جواب میں وہ اس سے ایک آدھ بات کر لینا خواہ وہ محض یہی کیوں نہ ہو، اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔

"کہو سجان آج کل خربوزے اچھے آ رہے ہیں۔"

"آپ ہی تو کھاتے ہیں سرکار۔"

"خوب کہتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ تانگے میں بیٹھ جاتے۔ اور سجان معمول کے مطابق پان، قینچی کی ایک ڈبیا، دیا سلائی کا بکس اور ایک کاغذ کے ٹکڑے پر تھوڑا سا چونا رکھ کر کہ وہ زیادہ چونا کھانے کے عادی تھے۔ تانگے کے پاس جا کر یہ چیزیں انہیں دے دیتا۔ کبھی کبھی ان کا منشی بھی فائلیں لئے ان کے ہمراہ ہوتا اور سجان کو اس کے لئے پان میں بہت سی سونف ڈالنی پڑتی۔

وہ وکیل صاحب اور ان کی بیگم کے بہت سے ملنے والوں کو بھی جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بدھ کے روز تیسرے پہر حاجی صاحب کے ہاں سے زنانہ سواریاں آیا کرتی ہیں۔ چنانچہ دیکھتے ہی ان کا تانگہ آنے کے وقت وہ اخروٹ، ریوڑیاں، چھوہارے وغیرہ کی تھیلیاں پہلے ہی سے بھر بھر کر نکال رکھتا۔ ان سواریوں کے ساتھ جو بچے آتے ان کی دل پسند مٹھائیوں کا بھی اسے پتہ تھا۔

اتوار کے روز معمولاً ڈاکٹر علیم الدین یا شیخ اللہ دیا کا والے کے خاندان آیا کرتے۔ مرزا اللہ رکھا وکیل صاحب کے دور کے قرابت داروں میں سے تھے اور ان ہی کی طرح کئی اور قریب کے رشتہ داروں میں جو کبھی کبھی ملنے آ جاتے۔ اور جن کو سجان اچھی طرح جانتا تھا۔ ایک تو بیگم صاحبہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ جس کی بزازی کی دکان تھی۔ جب کبھی وہ آتا کپڑے کا ایک آدھ تھان اس کی بغل میں ہوتا۔ یہ تھان کبھی تو وکیل صاحب کے ہاں ہی رہ جاتا اور کبھی وہ واپس اپنے ساتھ لے جاتا۔ اور دوسرے وکیل صاحب کے تایا جو بے حد ضعیف تھے اور اپنے بیٹے کے ساتھ شہر کے دوسرے سرے پر رہا کرتے تھے۔ جب کبھی یہ باپ بیٹے ملنے آتے تو دن بھر ان کے گھر ہی پر رہتے۔ اور رات کو بڑی دیر میں کھانا کھا کر جاتے۔

وہ مختار اور شمشاد کے بعض دوستوں کو بھی جانتا تھا جو ان سے ملنے آیا کرتے تھے۔ خصوصاً ریاض کو۔ شام کو جب وہ ہاکی کھیل کر واپس آتے تو اکثر ریاض بھی سائیکل پر ان کے ہمراہ ہوتا۔ وہ شمشاد کا ہم عمر اور کالج میں اس کا ہم سبق تھا۔ مختار سے اس کی زیادہ بے تکلفی نہ تھی۔ وہ چونکہ شمشاد کا بڑا بھائی تھا۔ اس لئے ریاض بھی اس کا ادب کیا کرتا تھا۔ ریاض ان دونوں بھائیوں سے قد میں چھوٹا تھا اور رنگت بھی ان جیسی سرخ و سفید نہ تھی۔ تاہم اس کی ملاحت میں ایک خاص بانکپن تھا۔ متبسم چہرہ زندگی کی مسرتوں سے بھرپور اور فکروں سے آزاد۔ شمشاد کو اس سے اور اس کو شمشاد سے گہری وابستگی تھی۔

سجان کے ٹھیلے کے قریب جو اس وقت وکیل صاحب کے مکان کے عین مقابل سڑک کے کنارے ہوتا۔ یہ تینوں نوجوان اپنی اپنی بائیسکل تھامے رخصت سے پہلے کچھ باتیں ضرور کرتے۔ جب کبھی ریاض ان بھائیوں کی بحث میں شامل ہو جاتا۔ پھر تو بحث طول ہی کھینچتی چلی جاتی۔ سجان سے بار بار پان اور سگرٹ لئے جاتے۔ ریاض بار بار خدا حافظ کہتا۔ مگر رخصت نہ ہونے پاتا۔ غرض گھنٹہ گھنٹہ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ یوں ہی باتوں میں گذر جاتا۔ اس دوران میں وکیل صاحب کے مکان کی دوسری منزل میں جہاں بڑی صاحبزادی کا کمرہ تھا۔ بار بار ایک رنگین سایہ چقوں کے پیچھے حرکت کرتا رہتا، جسے سجان کی کن انکھیوں کے سوا اور کوئی آنکھ نہ دیکھ سکتی۔

وکیل صاحب کے صاحبزادوں اور صاحبزادیوں سے رشتے کے سلسلے میں جو لوگ آیا کرتے سجان ان کو بھی خوب پہچانتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کی بکری ایک دم بڑھ جاتی اور گھر کے خادموں اور بوڑھی ماما کے ساتھ ساتھ وکیل صاحب کے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بھی دوڑ دوڑ کر سجان کی دکان پر سودا لینے آیا کرتے ان لوگوں کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد سجان ٹوہ لگاتا کہ کہیں بات پکی ہوئی یا نہیں۔ وہ شبیر سے ہنس کر کہتا:

"پانچوں گھی میں ہوں گی اور سر کڑاہی میں۔"

شبیر حیران ہو کر پوچھتا:

"کیا کہا تم نے؟"

"زیادہ بنو نہیں ہم سے سب خبر ہے ہمیں۔"

شبیر اب بھی لاعلمی ظاہر کرتا تو وہ سمجھ جاتا کہ اس کو واقعی خبر نہیں۔ اور پھر وہ ماما کی طرف رجوع کرتا جس سے اسے اکثر باتیں معلوم ہو جایا کرتی تھیں۔ بڑی بی وکیل صاحب کی سب سے پرانی ملازمہ تھیں۔ ان کے سارے بچے ان ہی کی گود میں پلے بڑھے تھے۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ نہ

کوئی رشتہ دار تھا ان بچوں سے انھیں دلی محبت تھی اور اس کی بنا پر وہ ان کے مستقبل کے بارے میں رائے زنی کرنا اپنا حق سمجھتی تھیں۔ چنانچہ محبت اور سادگی میں ان کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا۔

"نوج جوان لونڈوں میں رشتہ ہو گئے تو بس ایک آنکھ نہیں بھاتے۔" پھر ذرا تامل کرکے کہتیں: "ٹھہرو تو سہی۔ وہ دن بھی آجائے گا۔ چاندی جیسی بیٹیاں ہیں میری۔"

اور سبحان سمجھ جاتا کہ ان لوگوں سے بات کہیں ٹھہری۔ یوں ہی کسی موقع پر افضل میاں سے کہتیں:

"شہ بالا بنے گا میرا میاں۔ ہم کو بھی گھوڑی پر چڑھاؤ گے نا؟"

اگر اس قسم کی کوئی بات گھر میں ہوئی ہوتی تو افضل میاں شرما کر چل دیتے یا معلوم نہ ہوتا تو کہتے:

"چپ رہو تم کالا آدمی۔ ہم تم سے بات کرنا نہیں مانگتا۔"

ایک دن ایسے ہی موقع پر جب کچھ عورتیں آئی ہوئی تھیں، بڑی بی پان لینے آئیں ان کا سانس پھولا ہوا تھا۔ مگر وہ بہت خوش معلوم ہوتی تھیں۔ سبحان نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ پھوٹ پڑیں:

"کسی سے ذکر نہ کرنا کہیو بڑی صاحبزادی کی بات ٹھہر گئی۔"

"کب؟"

"ابھی ابھی"

"کون لوگ ہیں؟"

"شہر کے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ لڑکا بی۔ اے میں پڑھتا ہے۔ پر خبردار کسی سے ذکر نہ کرنا سمجھیو۔ سو دشمن ہیں، سو دوست۔ میں نے گھر کا آدمی سمجھ کے تم سے کہہ دیا ہے تم کسی سے نہ کہنا۔ بچوں سے تک نہیں نوکروں سے بھی نہیں......"

اس کے دو تین ہی دن بعد سبحان نے کئی اور ذریعوں سے بڑی بی کی بات کی تصدیق کرلی۔ محلے والوں میں میل جول بڑھنے لگا۔ عورتیں تو آتی جاتی ہی رہتی تھیں۔ ایک بار لڑکے کے والد ڈاکٹر صاحب بھی اپنی موٹر میں بیٹھ کے وکیل صاحب سے ملنے آئے اور دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے۔ دوسری مرتبہ ٹی پارٹی پر آئے۔ اس موقع پر ان کا بیٹا بھی ان کے ہمراہ تھا۔ وہ خاصا قبول صورت تھا۔ مگر کسی قدر لاغر معلوم ہوتا تھا۔ بڑی بی نے کہا "امتحان کی فکر ہے بچارے کو۔" سبحان کو اس کا نام بھی معلوم ہوگیا۔ صغیر احمد۔ قرار یہ پایا کہ جب لڑکا امتحان دے لیگا تو اس کی شادی کردی جائے گی۔

بڑی صاحبزادی کے جہیز کے لیے جلدی جلدی جوڑے برتن وغیرہ سامان تیار کرائے جارہے تھے سبحان ان کی پوری تفصیل جانتا تھا۔ اس دوران میں شمشاد میاں کے دوست ریاض بھی کئی مرتبہ ہاکی کے بعد ان دونوں بھائیوں کو ان کے گھر تک پہنچانے آئے اور سبحان نے دیکھا کہ دوسری منزل میں چقوں کے پیچھے وہ رنگین سایہ اب بھی حرکت کرتا ہے۔

اور ایک دن اچانک سبحان کے ذہن میں ایک بات آئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ صاحبزادی کو یہ رشتہ منظور نہ ہو! یہ بات اسے کسی نے نہیں بتائی تھی۔ اور بتاتا بھی تو کون۔ کیونکہ وکیل صاحب کے گھر کے کسی اور آدمی کو اس کا گمان تک نہ تھا۔ اس نے مختلف ذریعوں سے اس کے متعلق معلومات حاصل کرکے خود ہی یہ نتیجہ نکالا تھا۔ آخر اس نے بھی ایک عمر گزاری تھی۔ زمانے کا سرد و گرم دیکھا تھا۔ دو تین مرتبہ بڑی بی اور بچوں سے اسے معلوم ہوا تھا کہ صاحبزادی کی طبیعت ناساز ہے۔ ایک دن دیکھا کہ تانگے میں سوار ہوتے وقت وہ بڑی بے دلی سے قدم اٹھا رہی ہے۔ ایک دن وہ اپنی بہنوں کے ساتھ اسکول نہیں گئی۔ بلکہ دردِ سر کی وجہ سے گھر ہی میں رہی۔ مگر اسی شام کو جب مختار اور شمشاد کے ساتھ ریاض میاں سبحان کی دکان پر آئے اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے تو اس نے دوسری منزل میں چقوں کے پیچھے اس رنگین سائے کو پہلے سے بھی زیادہ بے چین دیکھا۔

ایسے معاملوں میں دل پر جو گزرتی ہے۔ سبحان اس سے بخوبی واقف تھا۔ مدت ہوئی جوانی میں وہ ایک پہاڑی مقام پر رکشا چلایا کرتا تھا تو اسے ایک عورت سے محبت ہوگئی تھی۔ دن بھر جو کچھ کماتا لاکر اس کے حوالے کردیتا۔ مگر اس عورت کے کچھ اور آشنا بھی تھے جن سے وہ چھپ چھپ کر ملا کرتی۔ ایک دن سبحان نے موقع پر جا لیا۔ چٹیا پکڑ کھینچتا ہوا اپنی کوٹھری میں لے آیا۔ اور شراب کے نشے میں کچھ زیادہ ہی مرمت کر ڈالی۔ صبح کو آنکھ کھلی تو کوٹھری خالی تھی اور باہر آنگن میں اس کا رکشا جلا پڑا تھا۔ سبحان مدتوں اس عورت کو ڈھونڈا کیا۔ مگر اس کی صورت پھر کبھی نظر نہ آئی۔ اور نہ اس کی یاد دل سے مٹی۔

شادی کی تیاریاں اب اور بھی زور شور سے ہونے لگی تھیں۔ وکیل صاحب کے گھر میں ہر وقت ایک شور و غل مچا رہتا۔ طرح طرح کی اجناس ٹھیلوں میں لد لد کے آرہی تھیں۔ قسم قسم کا فرنیچر، سنگھار میز، پلنگ، کرسیاں، تپائیاں، تانبے اور پیتل کے برتن جنھیں قلعی کرکے چاندی کا سا بنا دیا تھا۔ مہمانوں کی وہ ریل پیل تھی کہ سبحان کو دکانداری سے لمحہ بھر کی فرصت نہ ملتی تھی۔ مگر پھر بھی وہ خوش نہ تھا جوں جوں شادی کا دن قریب آتا جاتا اس کی افسردگی بڑھتی جاتی تھی اور اسے ایک نامعلوم ہول سا

ہونے لگا تھا۔ وکیل صاحب اس سے اور بھی زیادہ لطف و مہربانی سے پیش آنے لگے تھے۔ ایک دن وہ اس سے کہنے لگے:

"سبحان ہم تمہارے لئے بھی ایک جوڑا سلوا دیں گے۔ برات کے روز پہننا۔ دیکھنا انکار نہ کرنا۔ ہمسائے کا رشتہ عزیزوں سے کم نہیں ہوتا۔"

سبحان نے وکیل صاحب کے بچوں کو دعائیں دیں۔ مگر یہ مژدہ بھی اس کی افسردگی کو دور نہ کر سکا۔

ایک دن صبح ہی صبح سبحان نے ابھی ٹھیلہ سڑک کے کنارے لا کے کھڑا کیا ہی تھا کہ دیکھا شمشاد وکیل صاحب کے بنگلے سے جلد جلد سیڑھیوں سے اتر رہا ہے۔ اس نے صرف بنیان اور تہمد پہن رکھا تھا اور ابھی ڈاڑھی بھی نہیں مونڈی تھی۔

"کہئے شمشاد میاں صبح صبح کدھر کی تیاری ہے؟" سبحان نے پوچھا۔

"کہیں نہیں۔ ذرا ڈاکٹر کو بلانے جا رہا ہوں۔" شمشاد نے جواب دیا۔

"خیر تو ہے!" سبحان نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ہاں خیر ہی ہے" یہ کہہ کر شمشاد سائیکل پر چڑھ تیز تیز پیڈل مارتا ہوا چل دیا۔

سبحان کا ماتھا ٹھنکا اور وہ بے تابی کے ساتھ گھر کے اور لوگوں کی راہ دیکھنے لگا تاکہ معلوم کرے کون بیمار ہے۔ جب وکیل صاحب کے دونوں چھوٹے صاحبزادے اسکول جانے کے لئے گھر سے نکلے تو ان سے معلوم ہوا کہ رات بڑی باجی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد ایک موٹر وکیل صاحب کے مکان کے نیچے رکی اور ڈاکٹر ہاتھ میں بیگ لئے اوپر گیا۔ کوئی دس منٹ کے بعد وہ نیچے اترا تو سبحان اپنا ٹھیلہ چھوڑ اس کے پاس آ گیا۔ مگر اس سے کچھ پوچھنے کی اسے جرأت نہ ہو سکی اور وہ اور بھی زیادہ بے تابی کے ساتھ بڑی بی یا شمیم کا انتظار کرنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ تانگہ آیا جس میں بیٹھ کر لڑکیاں اسکول جایا کرتی تھیں۔ مگر بڑی بی نے اسے اوپر ہی سے "آج نہیں جائیں گے" کہہ کر لوٹا دیا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد شمیم برف لینے آیا تو اس سے معلوم ہوا کہ بڑی صاحبزادی کو سرسام ہو گیا ہے۔ مگر زیادہ فکر کی بات نہیں۔ ڈاکٹر دو گھنٹے بعد پھر آئے گا۔

دو گھنٹے بعد ڈاکٹر پھر آیا اور جب وہ جانے لگا تو سبحان پھر اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس کے لب ہلے مگر سوال کرنے کی اب کے بھی اسے جرأت نہ ہوئی۔ اس دفعہ بڑی بی برف لینے آئیں تو ان

سے معلوم ہوا کہ حالت میں کچھ فرق نہیں ہے۔ ڈاکٹر شام کو پھر آنے کو کہہ گیا ہے۔

اس روز وکیل صاحب کچہری نہیں گئے۔ تیسرے پہر لڑکی کا ہونے والا سسر جو خود بھی ڈاکٹر تھا اسے دیکھنے آیا اور ایک گھنٹہ تک اس کے پاس رہا۔ اور جو لوگ اس کی خبر کو آئے انہیں جلدی ہی رخصت کر دیا گیا۔ دن بھر مکان پر ایک مقبرے کی سی خاموشی طاری رہی۔

شمشاد اور مختار کالج سے جلد واپس آ گئے تھے۔ شام کو وہ ہاکی کھیلنے نہیں گئے۔ ریاض شمشاد سے ملنے آیا۔ سبحان کے ٹھیلے کے قریب جب شمشاد اس سے اپنی بہن کا حال بیان کر رہا تھا تو سبحان نے سنا کہ اس کے مرض میں ابھی افاقہ نہیں ہوا۔ دونوں ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اگر آج کی رات خیریت سے گذر گئی تو پھر کوئی اندیشہ نہیں۔

جس وقت وہ باتیں کر رہے تھے تو سبحان کی نظر دوسری منزل پر چقوں کی طرف اٹھ گئی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی مگر وہ سایہ نظر نہیں آیا۔

تھوڑی دیر میں ریاض رخصت ہو گیا۔

شمشاد نے گھر جاتے ہوئے سبحان سے کہا "برف اور لا رکھنا۔ شاید رات کو ضرورت پڑ جائے۔"

"فکر نہ کیجئے۔ میں نے من بھر برف پہلے ہی سے منگوا رکھی ہے۔"

سبحان رات کو عموماً نو بجے دکان بڑھایا کرتا تھا۔ مگر اس رات اس نے گیارہ بجے تک جاری رکھی۔ اس دوران میں وہ ملازموں سے برابر بی بی کی خیریت معلوم کرتا رہا۔ اس کی حالت اگر سدھری نہیں تھی تو زیادہ بری بھی نہیں ہونے پائی تھی۔

آدھی رات کے قریب وہ ٹھیلے کو بند کر کے حسب معمول اس کے قریب ہی سڑک کے کنارے چارپائی ڈال لیٹ رہا۔ مگر آنکھوں میں نیند غائب تھی۔ کان وکیل صاحب کے مکان کی طرف لگے ہوئے تھے۔ صبح کو تین بجے کے قریب جب وہ ذرا اونگھنے لگا تو اچانک ایک طرف سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور وکیل صاحب کے مکان کی سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ مگر گھر میں بدستور خاموشی تھی۔

اس نے پتھر مار کر کتے کو بھگا دیا۔

سرخ جلوس

یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب میں نے "نو بہار" کے چیف ایڈیٹر سے ایک معمولی سا اختلاف ہو جانے پر جوانی کے جوش میں استعفا دے دیا تھا۔ اور پھر رفتہ رفتہ فکرِ معاش نے مجھے "ستارۂ مشرق" میں ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا۔

"ستارۂ مشرق" کسی رسالے یا اخبار کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ہوٹل تھا جس میں زیادہ تر مغربی ممالک کے سیاح آ کر ٹھہرتے تھے۔ اس کا مالک بمبئی کا ایک سیٹھ تھا جس نے اس کا انتظام ایک انگریز منیجر کو سونپ رکھا تھا۔ میں ملازم تو ایک کلرک کی حیثیت سے ہوا تھا مگر میرا کام اور استعداد دیکھ کر سیٹھ نے جلد ہی مجھے ہوٹل کا اسسٹنٹ منیجر بنا دیا۔ میری ترقی کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ سیٹھ کو انگریز منیجر پر اعتماد نہیں تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کوئی سمجھدار ہندوستانی اس کے کام پر نظر رکھے۔

میرے ذمہ یہ خدمت تھی کہ میں ہوٹل میں ٹھہرنے والوں کا خیال رکھوں نیز غیر ملکوں سے جو لوگ ہندوستان کی سیاحت کے لئے آتے ہیں ان کو اس ملک کے بارے میں علمی و تاریخی معلومات بہم پہنچاؤں۔ یہ ہوٹل اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے غیر ملکی سیاحوں میں بہت مقبول تھا۔ کوئی دن نہ جاتا تھا کہ دس پانچ نئے مہمان بیرونی ممالک سے آ کر یہاں نہ ٹھہرتے ہوں۔ بعضوں پہلے سے ان کے لئے کمرے ریزرو کر لئے جاتے تھے۔ یہ ہوٹل بمبئی کے بڑے ہوٹلوں میں شمار ہوتا تھا۔ اور اس میں ایک

وقت میں دو ڈھائی سو مسافر بخوبی رہ سکتے تھے۔

ایک دفعہ امریکہ کی ایک خاتون ہمارے ہوٹل میں آ کر مقیم ہوئی۔ مس گلبرٹ اس کا نام تھا۔ وہ امریکہ کے ایک متمول تاجر کی بیٹی تھی۔ ممالک شرق اور بالخصوص ہندوستان کی سیاحت کا اسے بڑا شوق تھا۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ اور خاص کر یہاں کی ستیہ گرہ کی تحریک بھوک ہڑتال، جلسوں اور جلوسوں کو وہ بچشم خود دیکھنے کی بڑی تمنا رکھتی تھی۔ مگر بد قسمتی سے وہ ایسے وقت یہاں پہنچی کہ تحریک آزادی ختم ہو چکی تھی کیونکہ برطانیہ نے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر کے آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ اب یہاں نہ عدم تعاون کی تحریک باقی رہی تھی نہ ستیہ گرہ اور ہڑتالیں ہوتی تھیں نہ جلوس نکلتے تھے۔ بس یہ کیفیت تھی کہ انگریز تو اسباب باندھنے میں مصروف تھے اور اہل ملک ان کی جگہ سنبھالنے کے لئے پر پرزوں سے درست ہو رہے تھے۔

مس گلبرٹ سادہ طبیعت اور نیک دل تھی۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انسانی تفریق کی خواہ وہ رنگ اور نسل کی ہو یا روپیہ پیسہ کی، قائل نہیں ہے مگر انسان دوستی کا وسیع جذبہ اپنے دل میں لئے ہوئے ہے۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ لمبا قد، چوڑا چکلا چہرہ، انتہائی سادہ خدوخال، گالوں پر ہلکی ہلکی زردی گھلی ہوئی، سنہرے بال۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو خوبصورت تو نہیں ہوتیں مگر انہیں بدصورت بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان میں ایک خاص طرح کی جاذبیت پائی جاتی ہے۔

سہ پہر کو چائے کے وقت جب وہ "ستارۂ مشرق" کے وسیع اور خوش قطع لان میں چھوٹے چھوٹے یورپین خاندانوں اور بچوں کے غل غپاڑے سے الگ تھلگ اپنی میز پر اکیلی بیٹھی ہوتی تو مجھے اس پر ترس سا آیا کرتا۔ وہ ظاہرا آدمیوں سے متنفر نہیں تھی البتہ یہاں آ کے اسے جو مایوسی ہوئی تھی اس نے اسے مغموم بنا رکھا تھا۔ بھلا ایسی عورت کے پاس بیٹھ کر کون اپنا وقت ضائع کرتا۔ ہاں جب کبھی وہ میرے پاس کچھ دریافت کرنے آتی تو میں انتہائی توجہ سے اس کی بات سنتا اور خندہ پیشانی سے جواب دیتا اور چاہتا کہ وہ زیادہ وقت میرے پاس گذارے یوں بھی اس کے پاس جا کر پوچھ لیتا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔

میں بمبئی کی سیر گاہوں اور اہم قابل دید مقامات کا حال تفصیل سے بیان کرتا مگر وہ دھیان نہ دیتی۔ اسے یہاں کی تفریح گاہوں اور تاریخی مقامات سے دلچسپی نہ تھی۔ اس کے لئے وہ کئی مرتبہ یورپ کا چکر لگا چکی تھی۔ جو باتیں وہ مجھ سے پوچھتی ان کا جواب دینے سے میں کتراتا کیونکہ منیجر کی طرف سے ہمیں سخت تاکید تھی کہ ہم ملکی معاملات کے بارے میں مہمانوں سے کسی قسم کی گفتگو نہ کریں

ادھر تحریک آزادی کے ختم ہوتے ہی اخباروں کی ہنگامہ آرائی بھی ختم ہو گئی تھی۔ اب ان میں قتل، ڈاکہ زنی اور اغوا کی خبریں زیادہ چھپنے لگی تھیں جن کے پڑھنے سے دل پر افسردگی سی طاری ہوتی تھی۔

ایک دن وہ حسب معمول لان میں اکیلی بیٹھی بے دلی سے اخبارات کے ورق الٹ رہی تھی۔

یہ افسردہ سی ایک سہانی سہ پہر تھی۔ دھوپ نرم اور صحت آمیز تھی۔ بہار کا موسم تھا۔ مگر آج وہ پہلے سے بھی زیادہ افسردہ معلوم ہوتی تھی۔ میں اسی کے خیال میں کھویا ہوا تھا کہ اتنے میں میرا پرانا دوست ریاض میرے کمرے میں آ دھمکا۔ جس زمانے میں میں "نوبہار" کے عملہ ادارت کا ایک رکن تھا ریاض ہمارا چیف رپورٹر تھا۔ اخبار سے میرا تعلق ختم ہوتے ہی وہ بھی وہاں سے چلا گیا تھا اور کسی فلمی کمپنی سے منسلک ہو گیا تھا۔ وہ ان نوجوانوں میں سے تھا جو غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں اور ہر کام خواہ وہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو بڑی آسانی سے کر لیتے ہیں۔ فلم کے لئے کہانیاں اس نے لکھیں، موسیقی کی دھنیں اس نے بنائیں، گھوڑ دوڑ میں جواری کا کام اس نے کیا، کئی مشہور فلم ایکٹرسوں کے پرائیویٹ سیکرٹری کی خدمات اس نے انجام دیں۔

اس وقت اسے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ ہم ایک مدت کے بعد ملے تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آج کل وہ کیا کرتا تھا۔ نہ جانے میرے جی میں کیا آئی کہ میں نے مس گلبرٹ کا حال اسے بتا دیا اور کھڑکی میں سے دور ہی سے اس کی صورت بھی دکھا دی۔

"بری نہیں۔" وہ کہنے لگا۔ "اور یہ جو تم جلسے جلوسوں کی بات کہہ رہے ہو یہ کون "مشکل کام" ہے بھیا! جس ملک میں سگریٹ بیڑی کے جلوس نکل سکتے ہوں، بوٹ پالش کے جلوس نکل سکتے ہوں، فلموں، کشتیوں اور دنگلوں کے جلوس نکل سکتے ہوں وہاں سیاسی جلوس نکالنا کیا مشکل بات ہے۔ جلوس تو تماشائیوں سے بنتا ہے تماشائیوں سے۔ اصل جلوس والے تو پانچ فیصدی بھی نہیں ہوتے۔ بس ایسے لوازم جمع کر دو جو تماشائیوں کو اپنی طرف کھینچ لیں تو سو کا جلوس دس ہزار کا معلوم ہونے لگے گا۔"

کچھ دیر ہم دونوں خاموش رہے۔ سائے اب طویل ہونے شروع ہو گئے تھے فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ لان میں بیٹھے ہوئے لوگ اب اٹھنے شروع ہو گئے تھے۔ مس گلبرٹ نے اخبارات کو اٹھایا اور ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ ریاض نے کہا "سنو۔ اگر تم سو پچاس کا انتظام کر سکو تو میں تمہاری میم صاحب کی آرزو پوری کر سکتا ہوں۔"

میں نے کہا:

"اتنی رقم تو وہ چندے کے طور پر بھی دے سکتی ہے۔ وہ بہت امیر عورت ہے۔ امریکہ والوں کو تو تم

جانتے ہی ہو۔"

"تو بس اسی ہفتہ میں اس کا انتظام کروں گا۔ اچھی خاصی دل لگی رہے گی۔"

"لیکن ریاض" میں نے لمحہ بھر غور کر کے کہا "کسی شریف عورت کو یوں دھوکا دینا۔۔۔۔"

"دھوکا" اس نے میری بات کاٹ کر کہا:

"آج کل ہر چیز دھوکا ہے۔ خود زندگی ایک دھوکا ہے اور پھر تم خیال تو کرو کہ وہ اس ملک سے کس قدر مایوس ہو کر جائے گی۔ ہماری ذرا سی کوشش اسے بامراد بنا سکتی ہے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ معاملہ ایسا تھا کہ میری نوکری کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ مگر یہ تجویز میرے منچلے دوست کو بھا گئی تھی۔ وہ ہمیشہ نئے نئے تجربوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ اس نے مجھے زیادہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اور یہ کہتا ہوا کہ "تو بس پھر طے ہے۔" ایک دم کمرے سے چلا گیا۔

تیسرے دن اس نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا کہ سب معاملہ ٹھیک ہے میں چار بجے آؤں گا۔ تم میم صاحب کو تیار رکھنا اور ہاں میرا ان سے تعارف بھی کرا دینا پھر اگر تمہیں فرصت ہو تو تم بھی ساتھ چلے چلنا ورنہ میں خود ہی سنبھال لوں گا۔

لنچ کے وقت میں ڈرتے ڈرتے مس گلبرٹ کے پاس پہنچا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس سے کہا:

"آج ایک جلوس نکلنے والا ہے۔ اگر تمہیں دلچسپی ہو تو سہ پہر کو اسے دیکھنے چل سکتی ہو۔"

وہ سنتے ہی اچھل پڑی۔

"سچ" اس نے کہا "ضرور چلوں گی۔ مگر کہاں اور یہ کس کا جلوس ہے؟"

میں نے کہا:

"ٹھیک طور پر میں خود بھی نہیں جانتا مگر سہ پہر کو میرا ایک دوست آ رہا ہے اس جلوس کی تفصیل اس سے معلوم ہو جائے گی۔"

اس نے بڑی گرمجوشی سے میرا شکریہ ادا کیا اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

ریاض ٹھیک چار بجے ہوٹل میں پہنچ گیا۔ ہم پہلے ہی سے اس کے منتظر تھے۔ غائبانہ تعارف میں کرا ہی چکا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں اگر چاہتا تو کام کا بہانہ کر کے ہوٹل ہی میں رہ سکتا تھا۔ لیکن سچ پوچھئے تو میرے دل میں خود گدگدی ہو رہی تھی کہ دیکھوں میرا دوست کیا تماشا دکھانے والا ہے۔ میں نے منیجر سے دو گھنٹہ کی چھٹی لی اور پھر ہم تینوں ٹیکسی میں بیٹھ چلے

دیئے۔ ریاض نے ٹیکسی والے کو شہر کے ایک غیر معروف علاقے کی طرف چلنے کی ہدایت کر دی تھی۔

وہ مس گلبرٹ سے بہت بے تکلف ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی یہ کیفیت ہو گئی جیسے وہ گلبرٹ کو بہت پرانا جاننے والا ہو۔ اس نے کہا:

''یہ چند ملک کو آزادی مل چکی ہے مگر یہاں کا مزدور طبقہ ابھی اپنی حالت پر مطمئن نہیں ہے۔ کئی دن سے اس کے ایک فرقے میں اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا جو آج پھوٹ پڑا۔ یہ فرقہ سائیسوں کا ہے۔ ان کا کام تانگے چلانا اور گھوڑوں کی دیکھ بھال ہوتا ہے۔ چنانچہ آج اس فرقے کے لوگ اپنے اوپر کی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں۔ آج ان کا ایک بڑا جلوس نکل رہا ہے۔ میں نے اس جلوس کو دیکھنے کے لئے ایک فیصلے کی بالکنی میں انتظام کیا ہے۔''

مس گلبرٹ نے ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے ایک مرتبہ پھر گرم جوشی سے ہمارا شکریہ ادا کیا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد ریاض نے ٹیکسی کو ایک ایسے مقام پر ٹھہرایا جو خود میرے لئے بھی اجنبی تھا۔ ہم ایک اونچی عمارت کی پہلی منزل کے فلیٹوں میں سے ہوتے ہوئے ایک بالکنی میں پہنچے۔ اس میں تین کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ مس گلبرٹ اپنے ساتھ کیمرہ، دوربین، تھرمس کی دو بوتلیں اور کچھ سینڈوچ ایک ٹوکری میں رکھ کر لائی تھی۔

ریاض نے کہا ''جلوس کے آنے میں ابھی پانچ دس منٹ کی دیر ہے۔''

مس گلبرٹ بولی ''اچھی بات ہے ہم اتنے کافی پیتے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے ٹوکری میں سے تین چھوٹی چھوٹی پیالیاں نکالیں اور ایک تھرمس کا منہ کھول کر ان میں گرم گرم کافی انڈیلنے لگی۔

ابھی ہم نے کافی ختم نہیں کی تھی کہ ایک طرف سے نقاروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ریاض نے کہا ''لو جلوس آ گیا۔''

مس گلبرٹ نے جلدی سے اپنی دوربین سنبھالی اور اس طرف دیکھنے لگی جدھر ریاض نے اشارہ کیا تھا۔ ہم جس سڑک پر تھے وہ ایک طرف سے خم کھاتی ہوئی دوسری طرف مڑ جاتی تھی۔ میں خوب سمجھتا تھا کہ ریاض نے کس مصلحت سے اس مقام کو چنا ہے۔ ہماری نظر کے سامنے سڑک کا صرف سو سوا سو گز کا ٹکڑا تھا۔ چنانچہ نقاروں کی آواز سے یہ تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ جلوس بہت قریب آ گیا ہے۔ مگر موڑ کی وجہ سے جلوس کا اگلا حصہ ابھی ہماری نظروں سے پوشیدہ تھا۔

اس وقت مس گلبرٹ کا جوش و خروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے بے رنگ گالوں پر ہلکی

سرخی جھلکنے لگی تھی۔ اس نے دوربین اپنی آنکھوں سے نہیں ہٹائی تھی۔ اس سے اس کی بے تابی کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ آخر چند لمحوں کے بعد جلوس نے اپنی جھلک دکھائی۔ پہلے ایک اونٹ آیا جس کو بہت گہرے سرخ رنگ میں رنگا گیا تھا۔ اس کے دونوں طرف دو بڑے بڑے نقارے بندھے ہوئے تھے ان کا رنگ بھی سرخ تھا۔ اس پر دو لڑکے لال ہی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے زور زور سے نقاروں کو پیٹ رہے تھے۔ مس گلبرٹ نے جلدی سے دوربین ہٹا کر کیمرہ سنبھالا اور دو کا ایک سنیپ لیا۔ اونٹ کے پیچھے پانچ چھ خالی تانگیاں تھیں جن کے آگے گھوڑوں کے بجائے آدمی جتے ہوئے تھے ان کے پیچھے پیچھے ایک مست فقیر تھا جس کے تن پر سوائے لنگوٹی کے اور کوئی کپڑا نہ تھا اس نے منہ پر سیندور مل رکھا تھا پاؤں میں گھنگھرو تھے، ہاتھ میں ایک بڑا سا سونٹا جس کے سرے پر طرح طرح کے رنگین کپڑوں کی دھجیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ چک پھیری لے لے کر ناچ رہا تھا۔

ریاض نے مس گلبرٹ کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھ کر فوراً کہا:

''یہ ان سائیسوں کا روحانی پیشوا ہے اس نے عہد کر رکھا ہے کہ جب تک میرے فرقے کے لوگوں کے مطالبات پورے نہیں کئے جائیں گے میں اپنا ناچ جاری رکھوں گا۔''

جیسا کہ ہمیں توقع تھی اس عجیب و غریب جلوس کو دیکھنے کے لئے سچ مچ خلقت ٹوٹ پڑی تھی۔ آس پاس کے مکانوں میں کوئی کھڑکی کوئی دروازہ، کوئی بالکنی ایسی نہ تھی جو عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی نہ ہو۔ ادھر جلوس کے دونوں طرف تماشائیوں کا وہ ہجوم تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ تماشائی شاید سمجھ رہے ہیں کہ یہ کسی فلم کے لئے تیار کیا جا رہا ہے اور بمبئی ایسے شہر میں یہ کوئی نئی بات بھی نہ تھی۔

جلوس کے ساتھ سرخ رنگ کے کئی پرچم بھی تھے۔ کپڑوں پر مختلف رنگوں میں 'انقلاب زندہ باد' اور طرح طرح کے الفاظ اور جملے تحریر تھے جن میں سائیسوں کی برادری کو خواب غفلت سے بیدار کیا گیا تھا۔ اور دو چار سیٹھوں کو تنبیہ کی گئی تھی۔ ان ہی میں ایک پرچم پر یہ الفاظ بھی لکھے تھے۔

''سائیسی ظلم مردہ باد''

''آخر ان لوگوں کے مطالبات کیا ہیں؟'' مس گلبرٹ نے پوچھا۔

ریاض نے جواب دیا۔

''تنخواہ میں اضافہ، کام کے اوقات کا تعین، بس ایسی ہی باتیں ہوں گی میں پوری تفصیل سے واقف نہیں۔''

اب سائیسوں کی ایک ٹولی آئی جنہوں نے سر اور ماتھے پر سیندور ڈال رکھا تھا۔ وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ پوربی زبان میں ایک انقلابی گیت گاتے چلے آرہے تھے

بھیا

بولو بھیا

رکت چوس لیو ہمرو سارو

تن نا چھٹے گا ہے بھیا

بھیا

بولو بھیا

جونکن جیسن پرت پکھو نا ہیں

چوسن نا چت تھیا تھیا

بھیا

بولو بھیا

ریاض نے اس انقلابی گیت کا ترجمہ مس گلبرٹ کو سنایا تو وہ بہت خوش ہوئی اور فوراً اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا۔ ریاض کا کمال یہ تھا کہ وہ غیر متعلقہ آدمیوں کو بھی جلوس ہی کا ایک حصہ ظاہر کر رہا تھا۔ مثلاً دو تین لڑکے آگے پیچھے بیڑی کے اشتہار کے بورڈ لٹکائے خواہ مخواہ جلوس میں آ شامل ہوئے تھے۔ وہ آوازیں لگا رہے تھے "چھ نمبر کی بیڑی پیا کرو۔"

"یہ کون لوگ ہیں؟" مس گلبرٹ نے پوچھا۔

ریاض نے جھٹ جواب دیا "یہ بیڑی بیچنے والوں کے نمائندے ہیں وہ کہہ رہے ہیں ہماری ہمدردی سائیسوں کے ساتھ ہے۔"

اب سونٹے والا مست فقیر مس گلبرٹ کی بگھی کے بالکل نیچے پہنچ گیا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر زور سے اللہ ہو کا نعرہ لگایا۔ ساتھ ہی مس گلبرٹ کے چہرے پر بھی نظر پڑی اور اس نے پہلے سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ رقص کرنا شروع کر دیا۔ مس گلبرٹ نے خاص طور پر اس فقیر کے کئی شاٹ لئے۔

پانچ سات منٹ کے بعد یہ جلوس دوسرے موڑ پر پہنچ کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم نے چائے کی پیالیاں اور دوسرا سامان ٹوکری میں ڈالا اور بگھی سے اتر کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ مس

گلبرٹ راستے بھر میرا اور ریاض کا شکریہ ادا کرتی رہی۔ اس نے کہا:

"میں اس جلوس کا حال اپنی مما اور پپا کو آج ہی لکھ کر بھیجوں گی۔"

ٹیکسی ہوٹل کے پاس پہنچی تو میری جان میں جان آئی۔ ریاض کا چہرہ کامرانی سے چمک رہا تھا اور میں آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی ذہانت کی داد دے رہا تھا۔ مس گلبرٹ کے رخصت ہونے سے پہلے ریاض نے پیش بندی کے طور پر اس کو بتا دیا تھا کہ آج کل چونکہ حکومت اور رعایا میں مفاہمت ہو گئی ہے اس لئے ہمارے لیڈروں نے تمام اخبارات کو ہدایت کر رکھی ہے کہ کوئی ایسی تصویر یا خبر نہ چھاپی جائے جس سے دونوں کے تعلقات میں بد مزگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی کوئی اخبار اس جلوس کی خبر یا تصویر چھاپے۔

مس گلبرٹ کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس نکتہ کو بخوبی سمجھ گئی ہے۔ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے اس نے ایک معقول رقم کا چیک کاٹ کر ریاض کو دیا اور کہا "جہاں آپ نے میرے لئے اتنی زحمت اٹھائی ہے وہاں اتنی تکلیف اور کیجئے گا کہ یہ حقیر سی رقم میری طرف سے ان غریب سائیسوں کو دے دیجئے گا۔"

چیک لے کر ریاض جلد ہی رخصت ہو گیا۔

اس معاملے کے یوں خیر و خوبی سے سرانجام پا جانے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ مگر پھر بھی دو تین دن تک میں نے مس گلبرٹ سے بات کرنے سے پہلو تہی کی۔ بس مزاج پرسی کر لیتا۔ اور یوں ظاہر کرتا جیسے کام میں سخت مصروف ہوں۔ جب ایک ہفتہ یوں ہی گزر گیا اور کسی قسم کا ناخوش گوار واقعہ پیش نہ آیا تو میری فکر دور ہوئی۔

اگلے روز اتوار تھا۔ میں پہلے کی طرح چونچال ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ آج مس گلبرٹ سے جی بھر کر باتیں کروں گا مگر اتنے ہی میں کیا دیکھتا ہوں کہ ریاض بھاگا چلا آرہا ہے۔

"ارے غضب ہو گیا۔" اس نے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا "اس دن والے مذاق نے یکایک سنجیدہ رنگ اختیار کر لیا۔"

پھر کچھ بتائے بغیر وہ مجھے زبردستی کھینچتا ہوا ہوٹل سے باہر لے گیا جہاں اس کی ٹیکسی کھڑی تھی۔ ہم شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔

شہر میں سچ مچ ایک جلوس نکلا ہوا تھا۔ کسی الگ تھلگ گمنام گوشے میں نہیں بلکہ شہر کے عین بیچوں بیچ۔ اس میں دس بیس نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں سائیس شامل تھے۔ جلوس بڑا قاعدے کا تھا جس

میں کسی قسم کا غیر متعلق عنصر شامل نہیں تھا۔ نہ ڈھول ڈھمکا تھا اور نہ دف۔ البتہ یہ لوگ ریاض ہی کا بنایا ہوا انقلابی گیت جوش و خروش سے گاتے ہوئے جا رہے تھے:

ہیا

ہو لو ہیا ہیا

جو کی مٹی پہ ت پھوٹا ہے

چوان ناچیت تھیا تھیا

ہیا

ہو لو ہیا ہیا

اس میں شبہ نہیں کہ یہ جلوس بڑے معرکے کا تھا اور مس گلبرٹ کے دیکھنے کی خاص چیز۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ ہوٹل واپس آ کر میں نے اور ریاض نے اس کا ذکر مس گلبرٹ سے کرنا مناسب نہ سمجھا۔

فینسی ہیر کٹنگ سیلون

آبادیوں کی ادل بدل نے ایک دن ایک اجنبی شہر میں چار حجاموں کو اکٹھا کر دیا۔ وہ ایک چھوٹی سی دکان پر چائے پینے آئے۔ جیسا کہ قاعدہ ہے ہم پیشہ لوگ جلد ہی ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں یہ لوگ بھی جلد ایک دوسرے کو جان گئے۔ چاروں وطن سے لٹ لٹا کر آئے تھے جب اپنی بپتا سنا چکے تو سوچنے لگے کہ اب کریں تو کیا کریں۔ تھوڑی سی پونجی اور اپنی اپنی کسبت ہر ایک پاس تھی ہی۔ صلاح ٹھہری کہ چاروں مل کر ایک دکان لیں۔ اور ساجھے میں کام شروع کریں۔

یہ تقسیم کے آغاز کا زمانہ تھا۔ شہروں میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ دل جمعی سے کوئی کام نہ کر پاتے تھے۔ تمام کاروبار سرد پڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی ان حجاموں کو دکان کے لئے کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑی۔ وہ کئی دن تک سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتے رہے اور چھوٹے افسروں کلرکوں اور چپراسیوں تک کو اپنی دکھ بھری کہانی بڑھا چڑھا کر سناتے رہے۔ آخرکار ایک افسر کا دل پسیج گیا اور اس نے ان چاروں کو شہر کے ایک اہم چوک میں ایک حجام ہی کی دکان دلا دی جو ہنگامے کے دنوں میں تالا ڈال بھاگ گیا تھا۔

یہ دکان زیادہ بڑی تو نہ تھی پر اس کے مالک نے اس میں اچھا خاصا سیلونوں کا سا ٹھاٹھ باٹھ کر رکھا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ لکڑی کے تختے جوڑ اوپر سنگ مرمر کی لمبی لمبی سلیں جما انجیل سے بنا

لئے تھے۔ تین ایک طرف اور دو ایک طرف۔ ہر ایک بجلی کے ساتھ دیوار میں جڑا ہوا ایک بڑا آئینہ تھا اور ایک اونچے پایوں کی کرسی جس کے پیچھے لکڑی کا گدی دار اسٹینڈ لگا ہوا تھا۔ گاہک ٹھگنے قد کا ہوا تو اسٹینڈ کو نیچے سرکا لیا۔ لمبے قد کا ہوا تو اونچا کر لیا۔ اور گدی پر اس کے سر کو ٹکا کر مزے سے داڑھی مونڈنے لگے۔

ضرورت کی یہ سب چیزیں مہیا تو تھیں مگر تھیں ذرا پرانے فیشن کی اور ٹوٹی پھوٹی۔ سنگ مرمری سلوں کے کنارے اور کونے جگہ جگہ سے شکستہ تھے آئینے تھے تو بڑے بڑے مگر ذرا پچکے۔ اس کی وجہ سے گاہکوں کو اپنی صورتیں چپٹی چپٹی سی نظر آتی تھیں۔ ایک آئینے کے بیچ میں کچھ اس طرح بال پڑ گیا تھا کہ دیکھنے والے کو اس میں بیک وقت ایک کے دو چہرے نظر آتے مگر دونوں ادھورے جو ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر مضحکہ خیز صورتیں پیدا کرتے۔ چنانچہ اس آئینے کے سامنے بیٹھنے والا اپنی گردن کو تین چار مرتبہ مختلف زاویوں پر اونچا نیچا کئے بغیر نہ رہ سکتا۔ علاوہ ازیں اس دکان میں شیمپو کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔

لیکن ان حجاموں نے ان خامیوں کا زیادہ خیال نہ کیا۔ سچ یہ ہے یہ بات ان کے وہم و خیال میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ ایک دن انہیں یہ سب سامان بنا بنایا مفت مل جائے گا۔ اپنے وطن میں وہ اب تک بڑی گمنامی کی زندگی بسر کرتے رہے تھے۔ ان میں سے ایک جو عمر میں سب سے بڑا تھا اور استاد کہلاتا تھا۔ اس نے کچھ مستقل گاہک باندھ رکھے تھے جن کے گھر وہ ہر روز یا ایک دن چھوڑ کر داڑھی مونڈنے جایا کرتا تھا۔ اس سے عمر میں دوسرے درجے پر جو حجام تھا اس نے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم اور لاریوں کے اڈے سنبھال رکھے تھے۔ دن بھر بہت گھومتے میں ایسے داڑھی بڑھوں کی ٹوہ میں رہا کرتا تھا۔ اور دوسرے دو حجام جو عمر میں تھے ذرا چھوٹے وہ روپے یومیہ پر کبھی کسی دکان میں تو کبھی کسی دکان میں کام کیا کرتے تھے۔ اب اچانک قسمت نے ان لوگوں کو زندگی میں پہلی مرتبہ آزادی اور خودمختاری کا یہ موقع جو بخشا تو وہ بہت خوش ہوئے اور دکان کو اور زیادہ ترقی دینے اور اپنی حالت کو سنوارنے پر کمربستہ ہو گئے۔

سب سے پہلے ان لوگوں نے بازار سے ایک کوچی اور چونا لا کر خود ہی دکان میں سفیدی کی اور اس کے فرش کو خوب دھویا پونچھا۔ اس کے بعد نیلام گھر سے پرانے انگریزی کپڑوں کے دو تین گٹھر سستے داموں خریدے۔ ان میں سے قمیصوں اور پتلونوں کو چھانٹ کر الگ کیا۔ پھٹے کپڑوں کو سیا۔ جہاں جہاں پیوند لگانے کی ضرورت تھی وہاں پیوند لگائے۔ جن حصوں کو چھوٹا کرنا تھا ان کو چھوٹا

کیا۔ اور یوں ہر ایک نے اپنے لئے دو دو تین تین جوڑے تیار کر لئے۔ اس کے علاوہ ہر ایک کو ایک ایک چادر کی بھی ضرورت تھی۔ جسے بال کاٹنے کے وقت گاہک کے جسم پر گردن سے نیچے نیچے لپیٹنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ ذرا مشکل کام تھا مگر ان لوگوں نے بنا لیں۔ جمپروں، کوٹوں اور پتلونوں کو پھاڑ کر جیسے تیسے وہ چادریں بنائی ہیں۔ کپڑوں کے اسی ذخیرے میں انہیں ریشم کا ایک سیاہ پردہ بھی ملا جس میں سنہرے رنگ میں تتلیاں بنی ہوئی تھیں۔ کپڑا تھا تو بوسیدہ مگر ابھی تک اس میں چمک دمک باقی تھی اسے احتیاط سے دھو کر دکان کے دروازے پر لٹکا دیا۔

اپنے اپنے اوزار سب کے پاس تھے ہی ان کی تو فکر نہ تھی۔ البتہ تھوڑے تھوڑے داموں والی کئی چیزیں خریدی گئیں۔ مثلاً سلولائڈ کے پیالے صابن کے لئے داڑھی کے برش، پھٹکری، چھوٹی بڑی کنگھیاں، تولئے، دو تین تیز خوشبو والے دیسی تیلوں کی شیشیاں ایک گھٹیا درجے کے کریم کی شیشی ایک سستا سا پوڈر کا ڈبہ۔ علاوہ ازیں کباڑیوں کی دکانوں سے ولایتی لونڈر کی ٹیڑھی ترچھی خالی شیشیاں خرید ان میں سرسوں کا تیل بھر دیا۔

دکان کی آرائش کی طرف سے بھی یہ لوگ غافل نہیں رہے۔ دکان کے پچھلے مالک نے اس میں نہ جانے کس زمانے کی دقیانوسی مذہبی تصویریں لگا رکھی تھیں ان کو اتار ڈالا۔ اور ان کی جگہ دو ایک پرانے امریکن فلموں کے بڑے بڑے رنگ دار پوسٹر جو ایک کباڑیے کے ہاں سے لے آئے تھے۔ دکان کے اندر دیواروں پر چسپاں کر دیئے۔ علاوہ ازیں دو تین قطعات اور ایک کیلنڈر جس میں ملک کے بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کے فوٹو تھے۔ دیوار پر ٹانگ دیئے۔

دکان کو جلد چلانے کے خیال سے انہوں نے اجرتیں بہت کم رکھیں۔ مروجہ اجرتوں سے نصف سے بھی کم۔ چنانچہ ایک گتے پر سیاہ روشنائی سے حجامت کی مختلف قسموں کی اجرتیں لکھوا کر اسے دیوار پر ایسی جگہ لٹکا دیا کہ گاہک جیسے ہی دکان میں داخل ہو اس کی نظر سب سے پہلے اسی پر پڑے۔

پچھلے حجام نے اس دکان کا نام "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" رکھا تھا۔ یہ نام دکان کی پیشانی پر بہت جلی حروف میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھا ہوا تھا۔ ایک بابو سے "فینسی" کا مطلب معلوم کر کے بہت خوش ہوئے۔ اور فیصلہ کیا کہ فی الحال اسی سے کام لیا جائے۔ کوئی نیا نام رکھتے تو اس کو مٹانے اور اس کو لکھوانے پر خاصی رقم خرچ کرنی پڑتی۔

جس روز باقاعدہ طور پر دکان کا افتتاح ہونا تھا۔ انہوں نے دوپہر کو بڑی محنت سے ایک دوسرے کی حجامتیں بنائیں۔ لمبی لمبی قلمیں رکھیں۔ گرم پانی سے خوب مل مل کر نہائے صاف ستھری

قینچیاں اور چاقو نہیں چھینیں۔ جن کو انھوں نے قریب کی ایک لانڈری سے دھلوا لیا تھا۔ بالوں میں تیل ڈال ڈال کر پٹیاں جمائیں، گردن اور چہرے پر ہلکا ہلکا پوڈر ملا اور یوں حجامت و چہرہ بنوا کر گاہکوں کی بھینی بھینی خوشبو میں استروں کو ان کی دعا دی رات بھر سیلون پر تیز کرتے رہے تھے۔ ہتھیلی پر ہلکا ہلکا چھڑکتے ہوئے گویا وہ خدمت خلق کے لئے پیش کر دیا۔

پہلی شام کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ کل پانچ گاہک آئے۔ تین شیو اور دو بال کٹائی کے اور وہ بھی آدھ آدھ پاؤ پاؤ گھنٹے کے وقفے پر۔ مگر یہ لوگ دل برداشتہ نہ ہوئے۔ ہر گاہک کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ اس کو بٹھانے سے پہلے کرسی کو دوبارہ جھاڑا پونچھا۔ اس کی ٹوپی، پگڑی یا کوٹ لے کر احتیاط سے کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ داڑھی کے بال نرم کرنے کے لئے دیر تک برش سے جھاگ کو پھیلایا۔ بڑے نرم ہاتھ سے استرا چلایا۔ اور اگر احتیاط کے باوجود کہیں ہلکا سا چرکا لگ بھی گیا تو بڑی چابک دستی سے خون کو صابن کے جھاگ میں چھپائے رکھا۔ تا وقتیکہ پوری داڑھی نہ مونڈ لی اور پھر اطمینان سے پھٹکری پھیر کر زخم کو نیست و نابود کر دیا۔

ایک حجام نے اس خیال سے کہ بال کاٹنے میں زیادہ وقت لگایا جائے تو گاہک خوش ہوتا ہے۔ ایک دفعہ بال تراش کر دوبارہ پھر تراشنے شروع کر دیے۔ آخر میں اس نے گاہک کے سر میں تیل ڈال یوں ہلکے ہلکے مزے مزے ملنا شروع کیا کہ گاہک کی آنکھوں میں سرور کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کو اپنی محنت کا صلا جلد ہی مل گیا۔ گاہک نے اجرت کے علاوہ ایک آنہ اسے بخشش کے طور پر بھی دیا۔

اس شام کام کی کمی کے باوجود ان لوگوں نے دیر تک دکان کھلی رکھی۔ پھر دکان بند ہو جانے کے بعد بھی وہ دیر تک جاگتے رہے اور ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے۔

دوسرے دن دفتروں میں کوئی تعطیل تھی۔ صبح کو آٹھ بجے ہی سے گاہک آنے شروع ہو گئے۔ دس بجے کے بعد تو یہ کیفیت ہوئی کہ ایک گیا نہیں کہ دوسرا آ گیا۔ پھر بعض دفعہ تو تینوں کاریگر بیک وقت کام میں مصروف رہے۔ رات کو دکان بند کر کے حساب کیا تو ہر ایک کے حصے میں تقریباً چار چار روپے آئے۔ تیسرے روز پھر مندا رہا۔ مگر چوتھے روز پھر گاہکوں کی بھیڑ دیکھ کر چاروں کو یقین ہو گیا کہ دکان قطعی طور پر چل نکلی ہے۔

یہ لوگ اس اجنبی شہر میں اکیلے ہی آئے تھے۔ لہٰذا رات کو فرش پر بستر بچھا دکان ہی میں پڑ رہتے۔ ایک چھوٹی سی انگیٹھی، ایک کیتلی اور دو تین رکابیاں پرچ پیالیاں خرید لیں۔ صبح کو دکان ہی میں

چائے بناتے اور ناشتہ کرتے۔ دوپہر کو تنور سے وہ ایک قسم کے سالن اور روٹیاں لے آتے اور چاروں مل کر پیٹ بھر لیتے۔

دکان کو قائم ہوئے ابھی آٹھ دن ہی ہوئے تھے کہ ایک دن سہ پہر کو ایک ادھیڑ عمر دبلا پتلا شریف صورت آدمی دکان میں داخل ہوا۔ اس کے کپڑے میلے تھے مگر پھٹے ہوئے نہ تھے۔ سر پر اس وضع کی پگڑی جیسے منشی لوگ باندھا کرتے ہیں۔ پاؤں میں تری کا جوتا۔ داڑھی بڑھی ہوئی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اس میں سفید بال زیادہ ہیں یا کالے۔ ایک گھٹیا دھات کی عینک لگائے تھا جس کی ایک کمانی ٹوٹی ہوئی تھی اور اسے دھاگے سے جوڑ رکھا تھا۔ ان لوگوں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ پہلے تو وہ جھجکا مگر پھر بیٹھ گیا۔

ایک حجام نے پوچھا۔ "شیو؟"

اس نے کہا۔ "نہیں"

"بال؟"

"نہیں"

"اور پھر کیا چاہتے ہو؟" استاد نے پوچھا

"مہربانی کر کے میرے ناخن کاٹ دو" اس نے کہا

ناخن کٹوانے کے بعد بھی وہ شخص وہیں بیٹھا رہا۔ آخر جب ان لوگوں نے بار بار اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے کہنا شروع کیا۔

"صاحب میں ایک غریب مہاجر ہوں۔ میں اپنے وطن میں ایک بنئے کا منشی تھا۔ اس کے ہاں راشن کارڈوں کی پرچیاں لکھا کرتا تھا اور حساب کتاب کا کام بھی کیا کرتا تھا۔ وطن چھوٹا تو یہ روزگار بھی چھوٹ گیا۔ اس شہر میں کئی دن سے بیکار پھر رہا ہوں۔ کئی جگہ نوکری کی تلاش میں گیا مگر ہر جگہ پہلے ہی سے منشی موجود تھے۔ اگر آپ مجھے کوئی کام دلوا دیں تو عمر بھر احسان نہ بھولوں گا میں۔ اس بیکاری سے ایسا تنگ آ گیا ہوں کہ جو کام بھی آپ مجھے بتائیں گے دل و جان سے کروں گا۔ حساب کتاب کے کام کے علاوہ میں کھانا پکانا بھی جانتا ہوں۔"

اس کی بات سن کر یہ لوگ تھوڑی دیر خاموش رہے۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے صلاح مشورہ کرتے رہے۔ آخر استاد نے زبان کھولی:

"دیکھو میاں ہم خود مہاجر ہیں اور نیا نیا کام شروع کیا ہے۔ تنخواہ تو ہم تم کو دینے کے نہیں۔ ہاں

کھانا دونوں وقت ہمارے ساتھ کھاؤ۔ بلکہ خود ہی پکاؤ۔ کیونکہ تم ہمارے بھائی ہو۔ بس اپنی دکان کو جھاڑ پونچھ دیا کرنا۔ پھر جب کہیں تمہارا کام بن جائے تو شوق سے چلے جانا ہم روکیں گے نہیں۔''

اس شخص نے بڑی خوشی سے ان کی یہ شرط منظور کر لی۔ شکریہ ادا کیا اور وہیں رہ پڑا۔

دوسرے دن بازار سے ایلومینیم کی ایک دیگچی اور کچھ برتن خریدے گئے اور دکان میں ہنڈیا پکنے کا سامان ہونے لگا۔ مگر پہلے ہی روز ان پر یہ بات ظاہر ہو گئی کہ یہ شخص کھانا پکانا کچھ واجبی ہی جانتا ہے۔ تاہم اسے نکالا نہیں گیا۔ جھاڑنے پونچھنے میں وہ کافی چست تھا۔ بازار سے سودا بھی دوڑ کر لے آتا تھا۔ پھر یہ کہ ایک شخص جو آٹھ پہر خدمت کرنے کو تیار تھا۔ خط پتر لکھ سکتا تھا۔ حساب کتاب جانتا تھا۔ آقاؤں سے ادب سے پیش آتا تھا دو وقت کی روٹی پر کچھ مہنگا نہ تھا۔

یوں ہی دن گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ دکان کھلے دو مہینے ہو گئے۔ اس عرصے میں دکان نے خاصی ترقی کر لی تھی۔ ان لوگوں نے اس کے لئے کچھ نیا فرنیچر بھی خرید لیا تھا۔ شیمپو کے لئے ٹین وغیرہ بھی لگوایا تھا اور تھوڑی تھوڑی رقم ہر ایک نے بچا بھی لی تھی۔

تیسرا مہینہ ابھی آدھا ہی گزرا تھا کہ ایک دن صبح ہی صبح استاد کو اپنے بیوی بچوں کی یاد بے طرح ستانے لگی۔ وہ دوپہر ہوتے ہوتے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس لینے لگا۔ تیسرے پہر اس کی اداسی اور بھی بڑھ گئی۔ شام ہونے سے پہلے ہی اس نے اپنے ساتھیوں سے چار دن کی چھٹی لی اور بیوی بچوں کو لے آنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ جو کوئی دو سو میل دور کسی شہر میں اپنے کسی رشتہ دار کے دروازے پر ناخواندہ مہمان بنے پڑے تھے۔

استاد نے چار دن میں لوٹ آنے کا پکا وعدہ کیا تھا اور بڑی بڑی قسمیں کھائی تھیں۔ مگر واپسی میں پورے پندرہ دن لگ گئے۔ بیوی بچوں کو تو انجمن کے مسافر خانے ہی میں چھوڑا اور خود دکان پر پہنچا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بیماریوں کی ایک طویل داستان سنائی جن میں اس کی بیوی اور چاروں بچے مبتلا تھے۔ اور وہ تکلیفیں بھی بیان کیں جو بیوی بچوں کو یہاں تک لانے میں اسے اٹھانی پڑیں۔ آخر میں اس نے خرچ کی تنگی کا ذکر کیا اور روپیہ قرض مانگا۔

یہ بات تو ظاہر ہی تھی کہ جتنے روز استاد نے دکان میں کام نہیں کیا تھا۔ اتنے روز کی آمدنی میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اور پھر ایک کاریگر کے کم ہو جانے سے آمدنی بھی نسبتاً کم ہی ہوئی تھی۔ مگر کچھ تو بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے اور کچھ مروت کی وجہ سے اس کے ساتھیوں نے اسے یہ بات نہ جتائی بلکہ ہر ایک نے اپنی اپنی جیب سے پانچ پانچ روپے نکال کر اس کے حوالے کر دیئے۔ پندرہ روپے استاد کی

ضرورتوں کے مقابلے میں بہت ہی کم تھے۔ مگر وہ چپ چاپ یہ رقم لے کر چلا گیا۔

دوسرے دن سے پھر چاروں آدمی کام کرنے لگے۔ اب تک تو ان کا یہ قاعدہ رہا تھا کہ گاہکوں سے اجرتیں لے لے کر اپنے پاس ہی جمع کرتے رہتے۔ اور رات کو دکان بڑھاتے وقت ساری رقم اکٹھی کر کے آپس میں برابر برابر تقسیم کر لیتے۔ دکان کے کرایہ، ٹوٹ پھوٹ اور اپنے اور نوکر کے کھانے پینے پر جو رقم خرچ ہوتی اس میں وہ چاروں برابر کے ساجھی تھے۔ مگر استاد نے دوسرے ہی دن باتوں باتوں میں اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا کہ بھئی میں بیوی بچوں والا ہوں۔ پردیس کا معاملہ ہے ان کو اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ اس لئے رات کو میں ان کے پاس سویا کروں گا دوسرے یہ کہ کھانا بھی میں ان کے ساتھ ہی کھایا کروں گا۔ آج سے تم کھانے پینے کے خرچ میں سے میرا نام نکال دو ... اور بھائیو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں ادھر تو تمہارے ساتھ خرچ کروں اور ادھر گھر پر بھی۔

اس کے ساتھی یہ بات سن کر خاموش ہو رہے۔ اب استاد دوپہر کو کھانا کھانے گھر چلا جاتا۔ جو اس نے قریب ہی کہیں لے لیا تھا۔ دو گھنٹے بعد لوٹتا۔ رات کو بھی وہ جلد ہی دکان بڑھوا اپنا حصہ لے چلتا بنتا۔

کوئی ہفتہ بھر تک یہی سلسلہ رہا۔ مگر اس کے بعد استاد کے تینوں ساتھیوں کے طور ایک دم بدل سے گئے۔ اب وہ اکثر آپس میں کھسر پھسر کرتے اور چپکے چپکے استاد کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھتے رہتے۔ خصوصاً اس وقت جب حجامت کے بعد استاد گاہک سے اجرت وصول کرتا۔ وہ کن انکھیوں سے دیکھتے رہتے کہ استاد پیسے کس جیب میں ڈالتا ہے۔

ایک رات جب استاد دکان سے رخصت ہوا۔ تو اس کے تینوں ساتھی دیر تک جاگتے اور آپس میں باتیں کرتے رہے۔ انہیں استاد کے خلاف کئی شکایتیں تھیں۔ جنھیں وہ اب تک بڑے صبر سے درگزر کرتے رہے تھے۔ مگر اب جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ استاد روپے پیسے کے معاملے میں بھی کھرا نہیں ہے تو وہ صبر نہ کر سکے۔ انہوں نے استاد کی اس دھوکا بازی کی روک تھام کے لئے بہت سی تجویزیں سوچیں۔ مگر کسی پر دل نہ جما۔ آخر بڑی رات گئے ایک ترکیب ان کے ذہن میں آئی۔ اور وہ اطمینان سے سو گئے۔

دوسرے دن جب استاد دکان پر آیا تو ان تینوں نے آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا:

''میں نے خود اپنی ان گنہگار آنکھوں سے دیکھا ہے کہ رات تم نے گاہک سے چونی لے کر اپنی

پتلون کی جیب میں ڈال لی۔ حالانکہ ہمارے پیسے تم اپنی قمیص کی جیب میں ڈالا کرتے ہو۔"

دوسرے نے کہا "تم بکتے ہو۔ تم خود بڑے بے ایمان ہو۔ پرسوں گاہک نے تمہیں ایک دونی اور دو اکنیاں دی تھیں۔ ایک دونی اور ایک اکنی تو تم نے جیب میں ڈال لی اور ایک اکنی چالاکی سے انگلیوں کے بیچ ہی میں دبائے رکھی" ۔۔۔۔

اس پر تیسرے نے کہا "ارے میاں تم کیے جھگڑتے کیوں ہو۔ جو ہوا اس کو تو کرو معاف آئندہ کے لئے میں تمہیں ایک ترکیب بتاتا ہوں کہ ہم میں سے کوئی چاہے بھی تو اس قسم کا دھوکا نہیں کر سکے گا۔ وہ یہ کہ دروازے کے قریب میز کرسی ڈال دو۔ کرسی پر منشی کو بٹھاؤ اور میز پر ایک صندوقچی رکھ دو جس کے ڈھکنے میں سوراخ ہو۔ ہر گاہک حجامت کے پیسے اس صندوقچی میں خود ہی ڈال دیا کرے ہم میں سے کوئی خود ایک پائی بھی وصول نہ کرے۔ منشی مفت میں روٹیاں توڑا کرتا ہے۔ اس سے یہ کام کیوں نہ لیا جائے۔ یہ اس بات کا بھی دھیان رکھے گا کہ کوئی شخص بغیر اجرت دیئے نہ چلا جائے۔ یا کھوٹے سکے نہ دے دے۔ پھر چاہو تو منشی ساتھ ساتھ کاپی میں رقمیں بھی لکھتا جائے گا۔ آخر کس لئے رکھا ہے اس کو؟"

اس پر پہلے نے کہا۔ "بہت ٹھیک مجھے منظور ہے لیکن یہ تمہیں ماننا ہوگا کہ بے ایمانی جو ٹھہری تو تم ہی میں۔"

اس پر دوسرے نے بگڑ کر کہا۔ "کیوں میں کیوں نہ مانوں گا۔ اچھا ہے ایسا ہو جائے جھوٹ سچ آپ ظاہر ہو جائے گا۔"

تیسرے نے استاد سے پوچھا "کیوں استاد تمہاری کیا رائے ہے؟"

استاد کچھ نہ بولا۔ وہ نہ اس تجویز کے حق میں تھا نہ اس کے خلاف۔ اس نے خاموش ہی رہنے میں مصلحت سمجھی۔

دوسرے ہی دن سے اس تجویز پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ ہر روز رات کو دن بھر کی آمدنی کا باقاعدہ حساب ہوتا اور اس میں سے ہر ایک کو پورا پورا حصہ ملتا۔ چار دن نہ گزرنے پائے تھے کہ اس میں اتنی ترمیم اور کر دی گئی کہ آمدنی کا حصہ بجائے روز کے ہفتے کے ہفتے کیا جائے۔ اس طرح ہر شخص کو معقول رقم مل سکے گی۔ ہر روز جو تھوڑے تھوڑے پیسے ملتے ہیں ان سے تو کسی کی بھی پوری نہیں پڑتی۔ ہاں اگر ہفتہ ختم ہونے سے پہلے ہی کسی ساجھے دار کو کچھ رقم کی ضرورت پڑ جائے تو وہ منشی سے پرچی لکھوا کر پیشگی لے سکتا ہے۔

استاد نے اس کی بھی نہ مخالفت کی نہ موافقت، وہ خاموش ہی رہا۔

مگر استاد اپنی اس خاموشی کو زیادہ دن تک قائم نہ رکھ سکا۔ ایک دن وہ صبح ہی صبح دکان پر پہنچا اور چھوٹے پاسترے کی دھار کو گھستے ہوئے ایک دم اپنے ساتھیوں پر برس پڑا:

"بس جی بس میں تم لوگوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ انصاف کا تو آج کل زمانہ ہی نہیں ہے۔ تم نے گدھے اور گھوڑے کو برابر سمجھ لیا ہے۔ تم میں سے نہ تو کوئی میرے جتنا پرانا کاریگر ہے اور نہ ہنر مند۔ پھر ڈاڑھی مونڈنے میں میرا ہاتھ ایسا ہلکا ہے کہ ہر شخص مجھ ہی سے ڈاڑھی منڈانا چاہتا ہے۔ میں ایسے کئی آدمیوں کو جانتا ہوں کہ جب میں کام میں مصروف ہوتا ہوں تو وہ دکان میں آتے ہی نہیں بلکہ باہر ہی باہر ٹہلتے رہتے ہیں کہ کہیں دوسرے سے ڈاڑھی نہ منڈانی پڑ جائے۔ پھر جہاں مجھے خالی ہوتے دیکھتے ہیں لپک کر میری کرسی پر آ بیٹھتے ہیں۔ منشی اس بات کا گواہ ہے کہ میری روز کی کمائی تم لوگوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اب تم ہی انصاف کرو کہ جب میں ہنر میں بھی تم سے بڑھ کر ہوں اور گاہک بھی زیادہ میرے ہی پاس آتے ہیں، کام بھی زیادہ میں ہی کروں، کمائی بھی زیادہ میری ہی ہو تو پھر اس کی کیا وجہ کہ مجھے بھی اتنا ہی ملے جتنا تم سب کو ملتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم لوگ میرا حصہ مجھے دے دو اور دکان خود سنبھال لو۔ اگر یہ نہیں تو کام کے لحاظ سے ہر ایک کی تنخواہ مقرر کر دو۔ آمدنی میں سے تنخواہیں نکال کر جتنی رقم بچے گی وہ ہم چاروں آپس میں برابر برابر بانٹ لیا کریں گے۔ اگر تم کو یہ بات منظور ہو تو اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں۔ ورنہ صاحب ایسی دکان اور ایسی ساجھے داری کو میرا دور ہی سے سلام۔ بندہ کہیں اور قسمت آزمائے گا۔ جتنے پیسے مجھے یہاں ملتے ہیں اس سے زیادہ تو میں آنکھ بند کر کے جس سیلون میں چلا جاؤں لے سکتا ہوں۔"

استاد کی یہ تقریر اس کے تینوں ساتھیوں نے بہت غور اور توجہ سے سنی۔ اس میں کچھ باتیں ٹھیک بھی تھیں۔ مثلاً ہنرمندی میں استاد واقعی ان تینوں سے کہیں بڑھ کر تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا کہ وہ ساجھے داری میں اپنی ہنرمندی کا ناجائز دباؤ ڈالے۔ جب ساجھا ہی ٹھہرا تو برتری کی کون پروا کرتا ہے۔ ساجھا ایک کنبے کی طرح ہے۔ جس میں کمانے والے افراد اپنی اپنی بساط کے مطابق کنبے کی پرورش کرتے ہیں۔ کم و بیش کمانے والوں یا نہ کمانے والوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاتی اور یہ استاد کی صریحاً کم ظرفی ہے کہ وہ زیادہ ہنرمند اور کم ہنرمند کا سوال اٹھا کر ساجھے میں تفریق پیدا کرنا چاہتا ہے۔

استاد کے دکان سے قطع تعلق کر لینے کا مطلب بھی وہ خوب سمجھتے تھے۔ اس کا مطلب تھا ایک

بھاری رقم بطور معاوضہ استاد کو دیتا اور یہ رقم ان کے پاس نہ تھی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ یہ تینوں دکان سے علیحدہ ہو جاتے مگر علیحدہ ہو کر جاتے تو کہاں جاتے۔ نہ کام ہی میں اتنی مہارت تھی کہ دوسری جگہ آسانی سے نوکری مل سکتی اور نہ سر چھپانے ہی کا کوئی ٹھکانہ تھا۔ لہٰذا گلے شکوے تو انہوں نے بہت کیے مگر انجام کار انہوں نے استاد کی تنخواہوں والی شرط مان ہی لی۔ تنخواہیں مقرر کرنے کے مسئلے نے خاصا طول کھینچا۔ آخر بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ استاد کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملے اور اس سے نچلے کاریگر کو ایک سو تیس۔ تیسرے کو سو اور چوتھے کو اسی۔ ساتھ ہی یہ بھی قرار پایا کہ تنخواہوں کا حساب مہینے کے مہینے ہوا کرے۔

استاد دل میں بہت خوش تھا کہ بالآخر اس نے اپنا تفوق اپنے ساتھیوں پر قائم کر لیا۔ ادھر اس کے ساتھی کچھ دن پژمردہ رہے۔ مگر پھر مہینے کے بعد ایک معقول رقم ہاتھ آنے کے خیال نے رفتہ رفتہ ان کا غم دور کر دیا۔ اور وہ بڑی بے تابی سے مہینے کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

خدا خدا کر کے جب مہینہ ختم ہوا اور تنخواہ کا دن آیا تو یہ دیکھ کر ان چاروں نوجوانوں کی حیرت اور مایوسی کی کوئی حد نہ رہی کہ پچھلے مہینے دکان سے جو آمدنی ہوئی تھی اس میں سے ان کی آدھی آدھی تنخواہیں بھی نہیں نکلتی تھیں۔ ان لوگوں کو سب سے زیادہ اچنبھا اس بات پر ہوا کہ دکان پہلے سے زیادہ ترقی پر تھی گاہک بھی پہلے سے زیادہ آ رہے تھے مگر اس کے باوجود اتنی جو رقم تھی اس کا یومیہ ابتدائی دنوں کے یومیہ سے بھی کم تھے۔ منشی کے کھاتے کی جانچ پڑتال کی گئی۔ مگر اس نے پائی پائی کا حساب بتا دیا۔ ہر شخص کی روز کی کمائی، چاروں کی روز کی کمائی، ہفتے کی کمائی، مہینے کی کمائی۔ الگ الگ بھی اور مشترک بھی، پورا چٹھا کھول کر رکھ دیا۔ کیا مجال جو کوئی شخص اس کے حساب میں غلطی نکال سکے۔

قاعدہ ہے کہ روپیہ باہر سے آنے والا ہو یا بندھی ہوئی تنخواہ ہو تو انسان خواہ مخواہ اپنا خرچ بڑھا لیتا ہے یا اس کے بھروسے پر قرض لے لیتا ہے۔ ان میں سے دو حجام، ایک استاد اور ایک اور اسی امید پر محلے کے بعض دکانداروں کے مقروض ہو گئے۔ قرض خواہ کے تقاضوں کا ڈر تو تھا ہی، آئندہ قرض کا دروازہ بند ہو جانے کا بھی احتمال تھا۔

اس روز رات کو جب وہ دکان بڑھانے لگے تو حد درجہ دل شکستہ اور مایوس نظر آتے تھے۔ سب سے زیادہ مسکین پن منشی کے چہرے سے ٹپک رہا تھا۔ ہر چند اس کی کوئی تنخواہ مقرر نہ تھی پھر بھی اپنے آقاؤں کی اس مصیبت میں وہ برابر کا شریک نظر آتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ان کے قریب آیا اور رندھی ہوئی آواز میں جھجک جھجک کر کہنے لگا۔

"آپ لوگوں نے میرے ساتھ جو بھلائی کی ہے میں عمر بھر اسے نہیں بھول سکتا آج آپ کو پریشان دیکھ کر میرا دل بے حد کڑھ رہا ہے۔ اب میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ جب میں اپنے وطن میں بنیے کے ہاں نوکر تھا تو ہر مہینے تنگی ترشی کر کے اپنی تنخواہ میں سے کچھ روپے بچا لیا کرتا تھا۔ چند مہینوں میں خاصی پونجی جمع ہو گئی وطن سے چلتے وقت ساتھ لیتا آیا اور یہاں ڈاک خانے میں جمع کرا دی تاکہ آڑے وقت میرے کام آئے۔۔۔۔ مگر اب آپ کو پریشان دیکھ کر دل نے گوارا نہ کیا کہ میرے پاس روپیہ ہو اور میں اسے اپنے بھائیوں سے چھپائے رکھوں۔۔۔۔ اگر آپ کہیں تو کل میں ڈاک خانے سے اپنا روپیہ نکال لاؤں۔ آپ اسے کام میں لائیے۔ جب دکان کی آمدنی بڑھ جائے تو مجھے لوٹا دیجئے میں کوئی نفع نہیں لوں گا۔"

"تمہارے پاس کتنے روپے ہیں؟" حجاموں نے پوچھا۔ کچھ تامل کے بعد منشی نے دھیرے سے کہا "سو روپے!"

دوسرے دن منشی ڈاک خانے سے سو روپے نکال لایا۔ اور ان سے الگ الگ رسید لے کر وہ رقم ان میں تقسیم کر دی۔ اس طرح ان کی پریشانیاں کسی قدر دور ہو گئیں مگر اگلے مہینے دکان میں اس سے بھی کم آمدنی ہوئی۔ اب تو یہ لوگ بہت ہی گھبرائے۔ منشی نے بڑی چھان بین کے بعد آمدنی کے کم ہونے کی یہ وجہ دریافت کی کہ چونکہ چوک کے دوسرے ہیر کٹنگ سیلونوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی یا حسد کی وجہ سے اپنے ہاں کی اجرتیں کم کر دی ہیں اس لئے وہ گاہک جو محض کفایت کے خیال سے ان کے ہاں لپکے آتے تھے۔ اب ان سب سیلونوں میں بٹ گئے ہیں۔

ان لوگوں نے منشی کی بات کا کچھ یقین کیا کچھ نہ کیا۔ بہر حال وہ اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ چونکہ منشی اب کے اپنے ایک بھائی سے سو روپے قرض لے آیا تھا اس لئے ان لوگوں کو زیادہ پریشانی نہ اٹھانی پڑی۔ تیسرے مہینے صورت حال کچھ سدھر گئی اور انہوں نے کسی قدر اطمینان کا سانس لیا۔ مگر چوتھے مہینے آمدنی ایک دم پھر کم ہو گئی اس پر ستم یہ ہوا کہ اس دفعہ منشی نے ان کی امداد کرنے سے بالکل معذوری ظاہر کر دی۔ اس نے کہا:

"بھائیو، اگر میرے پاس روپیہ ہوتا یا میں کہیں سے لا سکتا تو میں آپ کے قدموں میں نچھاور کر دیتا۔ لیکن میرے پاس جو کچھ تھا میں پہلے ہی آپ کی نذر کر چکا ہوں۔"

اس روز تو انہوں نے زیادہ اصرار نہ کیا مگر دوسرے دن صبح ہوتے ہی چاروں کے چاروں نے منشی کو آ گھیرا۔ جب ان کی خوشامدوں اور التجاؤں کی حد نہ رہی تو منشی نے کہا "اچھا بھائیو شام تک

صبر کرو۔"

شام ہوئی تو وہ چاروں حجاموں سے یوں مخاطب ہوا:

"صاحبو۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دکان کی حالت کبھی نہیں سدھرے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ لوگوں نے اپنی اتنی تنخواہیں مقرر کر رکھی ہیں جو آمدنی سے کہیں زیادہ ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دکان چلے اور آپ کی پریشانیاں دور ہوں تو سب سے پہلے آپ اپنی اصلاح کیجئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ سب اپنے اپنے اخراجات کم کیجئے۔ اور دوسرے یہ کہ آپ اپنی اتنی تنخواہیں مقرر کیجئے جتنی عام طور پر اس قسم کے سیلونوں میں ملازموں کو دی جاتی ہیں۔ اگر آپ میری تجویز کی ہوئی تنخواہ منظور کریں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں بلکہ اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ ہر مہینے آپ کو پوری تنخواہ ادا کرے گی۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر آپ میرے کہنے پر چلیں تو آپ کو ہر مہینے کی پہلی پیشگی ہی تنخواہ مل جایا کرے گی۔ یہ روپیہ کہاں سے آئے گا اس سے آپ کو مطلب نہیں۔ چاہے میں چوری کروں، ڈاکہ ڈالوں مگر آپ کو تنخواہ پیشگی ہی ملتی رہے گی۔ آپ نے میرے ساتھ ایسی بھلائی کی ہے کہ میں عمر بھر بھول نہیں سکتا۔ اور بھائیو اگر آپ کو یہ شرط منظور نہ ہو تو آپ جانیں اور آپ کا کام۔ میں آپ کے لئے روپے کا بندوبست نہیں کر سکتا۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ اس کے بعد استاد نے منشی سے پوچھا:

"اچھا بتاؤ تو تم ہماری کیا کیا تنخواہیں مقرر کرتے ہو؟"

منشی نے جواب دیا: "گستاخی معاف۔ میں زیادہ سے زیادہ آپ کو اسی روپے دے سکتا ہوں۔ دوسرے نمبر والے کو ساٹھ، تیسرے کو پچاس اور چوتھے کو چالیس۔ اگر آپ لوگ یہ تنخواہیں منظور کر لیں تو میں ابھی جا رہا ہوں۔ مجھے کتنے ہی سود پر قرض لینا پڑے آپ سب کے لئے دو سو تیس روپے بطور پیشگی تنخواہ کے لے آتا ہوں۔ اور وعدہ کرتا ہوں کہ ہر مہینے اسی طرح آپ کو پیشگی تنخواہ ملا کرے گی۔ یاد رکھو میرے دوستو یہ تنخواہیں کسی بڑے ہیر کٹنگ سیلون کے ملازموں کی تنخواہوں سے کم نہیں ہیں۔ آپ لوگ جا کر خود دریافت کر سکتے ہیں۔ البتہ اپنے ملازموں کو پیشگی تنخواہیں دینا صرف اسی سیلون کی خصوصیت ہوگی۔۔۔۔"

منشی کی یہ تقریر سن کر چاروں حجام گم سم سے رہ گئے۔ اور کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا مگر یہ خاموشی بڑی صبر آزما تھی۔ انھوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر گردنیں جھکا لیں۔

بردہ فروش

پنجاب کے اضلاع میں ایسے کئی چھوٹے چھوٹے قصبے ہیں جن کی آبادی تو چند سو نفوس سے زیادہ نہیں۔ مگر جن کو ریلوے اسٹیشن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان اسٹیشنوں پر عموماً ایک ویرانی کی سی کیفیت رہتی ہے۔ کیونکہ میل اور ایکسپریس کی قسم کی گاڑیاں تو یہاں ٹھہرنا کسر شان سمجھ کر آندھی کے تیز جھکڑ کی طرح گزر جاتی ہیں۔ البتہ سست رفتار گاڑیاں چار چار پانچ پانچ گھنٹے کے بعد ان اسٹیشنوں پر آ کے رکتی اور گھڑی دو گھڑی کے لئے ان کی رونق بڑھا جاتی ہیں۔ مگر ان کے جاتے ہی یہاں پر الو بولنے لگتا ہے۔

ہمال پور دہ پنجاب کا ایک ایسا ہی ریلوے اسٹیشن ہے۔ اسوج کا مہینہ۔ سہ پہر کا وقت۔ چار پانچ بجے ہیں۔ ٹھیک پینتالیس منٹ کے بعد ایک ڈاؤن پسنجر ٹرین آنے والی ہے۔ اسٹیشن پر چہل پہل شروع ہو گئی ہے۔ اسٹیشن کا بابو جو دیر سے نہ جانے کہاں غائب تھا۔ اب بار بار اپنے کمرے سے نکلتا اور اندر جاتا ہوا دکھائی دینے لگا ہے۔ آس پاس کے گاؤں کے مسافر جو گاڑی سے گھنٹوں پہلے آ کے اسٹیشن کی ڈیوڑھی میں یا ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے آس پاس لمبی تانے پڑے تھے انگڑائیاں لیتے ہوئے اٹھ بیٹھے ہیں اور اسٹیشن کے نل کے ارد گرد بڑی فراغت کے ساتھ جو شاید صرف دیہاتیوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ ہاتھ منہ دھونے میں مصروف ہیں۔ ایک خوانچے والا بھی پلیٹ فارم پر ہانک لگاتا ہوا

"چلو ہٹ!"

"جھاڑی بوٹی کے بیر"

"ہشت"

"مونگ پھلی۔ میٹھے چنے"

"لا ایک آنے کی مونگ پھلی دے"

مونگ پھلی اپنے دوپٹے کے پلے میں ڈلوا کے وہ واپس چل دی۔

"لا بی بی پیسے تو دیتی جاؤ"

"کیسے پیسے؟"

"مونگ پھلی جو دی ہے اکنی کی"

"اکنی تو میرے پاس نہیں ہے"

"تو لا دو پیسے کا تو واپس دے دوں"

"دو پیسے بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر مونگ پھلی ہی پھیر دو"

"واہ۔ وہ تو میں نہیں پھیرنے کی۔"

خوانچے والے کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا اور قریب تھا کہ وہ چلا اٹھتا۔ مگر عین اس وقت اس لڑکی کے ساتھ والی ادھیڑ عورت آ پہنچی وہ ایک ہی نظر میں معاملے کو تاڑ گئی۔

"گھبراؤ نہیں بھیا۔ کتنے پیسے ہیں تمہارے؟"

"چار"

"یہ لو"

اور وہ لڑکی کا بازو پکڑ کر اسے وہاں سے لے گئی۔

"ریشماں" اس نے پیار اور ملامت کے ملے جلے لہجے میں کہا۔ "میں نے بہت دفعہ تمہیں سمجھایا ہے کہ پیسہ پاس نہ ہو تو کوئی چیز نہ خریدا کرو۔"

"اونہہ" ریشماں نے الھڑپن سے کہا "دکاندار کو پیسے تو مل ہی جاتے ہیں مائی جی!"

کوئی گھنٹہ بھر کے بعد وہ دونوں عورتیں تیسرے درجے کے ایک زنانہ ڈبے میں سفر کر رہی تھیں۔ ڈبا سواریوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مگر انہوں نے جیسے تیسے ایک کونے میں جگہ حاصل کر لی

پھرنے لگا ہے۔ ایک سوکھا ہوا کھجلی کا مارا کتا اس کی گھنٹی کی زد سے دور دور رہ کے اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ جس جگہ وہ خوانچہ لگاتا ہے کتا بھی وہیں اس سے کچھ ہٹ کر بیٹھ جاتا ہے۔

اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے باہر پلیٹ فارم کی واحد بنچ پر دو عورتوں نے قبضہ جما رکھا ہے۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر ہے اور ایک جوان۔ ادھیڑ ایک گٹھڑی سر کے نیچے رکھے لیٹی ہوئی ہے اور جوان اس کے پائنتی بیٹھی ہے۔ ادھیڑ عمر اپنی سیدھی سادی وضع اور کپڑوں سے صاف دیہاتن معلوم ہوتی ہے۔ مگر جوان کا لباس تیکھے طیکھے کی شہری لڑکیوں کا سا ہے جو کسی میلے یا شادی بیاہ میں گئی ہوں۔ ہاتھ پاؤں میں مہندی رچی ہوئی۔ بڑے بڑے پھولوں والی اودے رنگ کی چھینٹ کی شلوار اور قمیص۔ سر پر ململ کا دوپٹہ سرخ رنگا ہوا جس کے کناروں پر جھوٹا سنہری گوٹا ٹکا ہوا۔ ناک میں سونے کی کیل۔ کان میں چاندی کی بالیاں۔ ہونٹوں پر دنداسے سے سیاہی مائل گہرا سرخ رنگ چڑھا ہوا۔ تیکھے نقش۔ نظر میں حد درجے کی شوخی اور بے باکی۔ جوانی اس کے انگ انگ سے ابلی پڑتی ہے۔ وہ بازو پھیلائے دونوں ہتھیلیوں کو گدی کے پیچھے رکھے بنچ سے ٹیک لگائے بیٹھی ہے اور آتے جاتے کو غور سے دیکھ رہی ہے۔ لیکن چونکہ پلیٹ فارم پر سواریاں کم ہیں۔ اس لئے اسٹیشن کے کوے اور کتے ہی زیادہ تر اس کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔

اسٹیشن کا بابو سر پر تیل چپڑے پٹیاں جمائے منہ میں سگرٹ دبائے اپنے کمرے سے باہر نکلا اور جوان لڑکی پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کے پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ لڑکی اسے دیکھتے ہی بنچ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور کولہے مٹکاتی ہوئی اس کے پاس پہنچی۔

"بابو صاحب۔ ایک سگرٹ اور پلاؤ۔"

بابو نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا کہ کوئی سن تو نہیں رہا۔

"بھاگ جاؤ۔ سگرٹ نہیں ہے۔"

"پلا بھی دو بابو صاحب ابھی ابھی سو کے اٹھی ہوں۔ اللہ کی سوں بڑی طلب لگی ہے۔"

مگر بابو نے کچھ جواب نہ دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پلیٹ فارم پر دور نکل گیا۔ لڑکی کھسیانی سی ہو کر کچھ دور اس کے پیچھے پیچھے چلی۔ راستے میں اسے ایک کتا لیٹا ہوا نظر آیا اور اس نے شرارت سے اس کی دم پر پاؤں رکھ دیا۔ کتا چڑ بڑا کر بھونکتا بھاگا اور لڑکی خوانچے والے پر گرتے گرتے بچی۔ پل بھر کے بعد وہ خوانچے والے سے کہہ رہی تھی: "خوانچے والے کیا ہے تیرے پاس؟"

"پکوڑے۔ گزک۔ ریوڑیاں۔"

تھی۔ دونوں سر جوڑ کر چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں۔ مائی شیر کہہ رہی تھی:

"اور پھر ریشماں یہ چودھری ہے بڑا کھاتا پیتا۔ اس کے پاس وکیل بیوی کا بہت سارا زیور ہے جو اس نے کہیں چھپا رکھا ہے۔ تمہیں الھڑ پن کی باتیں چھوڑ کر اس کا دل مٹھی میں لینا ہوگا۔ خوب اس سے پیار محبت کی باتیں کرنا۔ حقہ خوب تازہ کر کے بھرا کرنا۔ رات کو ہاتھ پاؤں داب دیا کرنا۔ بس اس کو تم پر بھروسہ ہو جائے گا۔ اور وہ گھر کی کنجیاں تمہارے حوالے کر دے گا اسی طرح جب دو تین مہینے میں ساری چیزیں تمہارے قبضے میں آ جائیں گی تو میں تمہیں اس کے گھر سے نکال لے جاؤں گی۔"

"اس بڈھے کھوسٹ کرم دین کے بارے میں بھی تو تم یہی کہتی تھیں کہ ہے تو کنجوس مگر بڑا پیسے والا ہے۔ خاک بھی نہ نکلا کم بخت کے گھر سے۔"

"اس نے سب کو دھوکا دیا۔ بڑا فریبی دغا باز تھا۔ اچھا ہوا میں نے جلد ہی اس کے گھر سے تمہیں نکال لیا۔"

"کم بخت میری کتنی چوکسی کرتا تھا۔ مجھے والوں سے الگ کمرہ رکھا تھا اور ایک بڑھیا دیکھ بھال کے لئے الگ رکھ چھوڑی تھی۔ ایک دن مجھ پر شک ہوا مجھے کوٹھری کے اندر لے گیا چھری دکھا کے کہنے لگا۔ "یاد رکھو تم نے کبھی بھاگنے کی کوشش کی تو اس چھری سے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ بس اسی دن سے مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔"

"خیر اس سے تو خدا نے تمہارا پیچھا چھڑا دیا۔ مگر یہ چودھری ہے بڑا نمازی پرہیزگار۔ جب سے بیوی مری ہے۔ گھر بسانے کے سوا اور کوئی فکر ہی نہیں۔"

"زیادہ بڈھا تو نہیں؟"

"نہیں ایسا بڈھا نہیں۔"

"کیا عمر ہوگی بھلا؟"

"یہی کوئی پچاس پچپن برس۔"

رات کے کوئی پونے بارہ بجے گاڑی اس قصبے کے اسٹیشن پر رکی جہاں ان عورتوں کو جانا تھا۔ گاڑی سے اتر کر اسٹیشن کے مسافر خانے میں پہنچیں۔ اور رات وہیں گزاری۔ صبح کو ابھی اندھیرا ہی تھا کہ مائی شیر نے ریشماں سے اس کا سرخ دوپٹہ لے لیا۔ اور اسے اوڑھنے کے لئے ایک سفید چادر دے دی تا کہ وہ بھی دیہاتن معلوم ہو۔ نئے گاؤں کا معاملہ تھا۔ احتیاط شرط تھی جتنے کم لوگوں کی نظر ان پر پڑے اتنا ہی اچھا۔ دونوں نے لمبے لمبے گھونگھٹ نکال لئے اور پیدل قصبے کی طرف چل دیں۔

ریشماں کو چودھری گلاب کے گھر میں رہتے ہوئے چودہ روز ہو چکے تھے۔ مگر وہ ابھی تک نہیں سمجھ سکی تھی کہ اس نئے گھر میں اسے کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ پہلے دن جب وہ آئی تھی تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ نہ جانے اسے کن حالات سے واسطہ پڑے گا چودھری کس قماش کا آدمی ہے۔ کرم دین کی طرح ظالم تو نہیں اس سے زیادہ کام تو نہیں لے گا۔ اسے مارے پیٹے گا تو نہیں۔ اس کی رکھوالی کون لوگ کریں گے۔ تاہل کی قربتیں کن ناخوشگوار فرائض کی حامل ہوں گی اور کیا ایک مرتبہ پھر وہ زندگی کو مسلسل فریب بنائے رکھنے میں کامیاب ہو سکے گی؟ مگر چند ہی روز میں اس کے یہ سارے اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ اور اس میں پھر اس کی فطری چونچالی اور الھڑ پن پیدا ہو گیا۔

چودھری گلاب ایک سیدھا سادہ کم گو اور بے آزار انسان تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی عمر ساٹھ برس سے کم نہ تھی۔ مگر وہ دیہاتی زمینداروں کی طرح لمبا چوڑا تھا اور ابھی اس کے ہاتھ پاؤں خوب مضبوط تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی عمر کا وہ دور شروع ہو گیا تھا جب جوش سرد پڑ جاتا ہے اور احساس کو بیدار کرنے کے لئے چرکوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ عمل کی جگہ ذہنی آسودگی اور اطمینان قلب لے لیتے ہیں اور لذت کشی میں کوئی کمی رہ جاتی ہے تو اسے تخیل پورا کر دیتا ہے۔

پھر چونکہ وہ نمازی اور پرہیزگار تھا۔ اس لئے ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا۔ ریشماں کو اس کے کپڑوں اور جسم کے کسی حصے سے بدبو نہیں آتی تھی اس کی سفید لمبی داڑھی تھی جس میں وہ ہر روز کنگھی کیا کرتا تھا۔ سر پر اکا دکا ہی بال رہ گئے تھے۔ آنکھوں میں صبح شام سرمہ لگاتا۔ اس کے طور طریقوں میں ایک عجیب طرح کا بھولا پن تھا۔ جس نے اسے ایک پیارا پیارا بڈھا بنا دیا تھا۔ پچھلی بیوی سے اس کی دو بیٹیاں تھیں جو مدت ہوئی بیاہی جا چکی تھیں۔ اولاد نرینہ کوئی نہ تھی۔ جس کی اسے آج بھی حسرت تھی۔

ریشماں اکثر اس سے الھڑ پن میں پوچھتی:

"چودھری تم نماز کے بعد کیا دعا مانگا کرتے ہو؟"

چودھری مسکرانے لگتا۔

"اللہ سے بیٹا مانگتے ہو؟"

چودھری ہنس پڑتا۔

"یہ بھی تو دعا مانگا کرو کہ ریشماں کی بڑی سی عمر ہو۔"

اس کے جواب میں چودھری گلاب بڑے پیار سے اس کا گال تھپتھپا دیتا۔

ریشماں کو دو وقت کی ہنڈیا کے سوا گھر کا اور کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اپلے تھاپنا، جھاڑو بہارو

گائے بھینسوں کی سانی۔ دودھ دوہنا۔ یہ سب کام گاؤں کی ایک بڑھیا کیا کرتی تھی۔ جسے چودھری معاوضے میں اجناس اور سبزیاں دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کئی کسان تھے جو چودھری کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ خود چودھری بھی زیادہ تر کھیتوں ہی پر رہا کرتا۔ اس نے پہلے ہی دن سے گھر کا سارا انتظام ریشماں کے سپرد کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ بڑھیا روٹی سے فارغ ہو کر دن بھر مزے سے پلنگ پر پڑی بڑھیا پر حکم چلایا کرتی۔

کرم دین کے گھر میں اور اس گھر میں کتنا فرق تھا۔ وہاں وہ بے زر خرید لونڈی تھی۔ اور یہاں گھر کی مالکہ۔ وہاں وہ خود اپنی نظروں میں ذلیل تھی اور یہاں سب لوگ اس کا ادب کرتے تھے۔ یہاں تک کہ خود چودھری بھی اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

ریشماں کی عمر پانچ برس کی تھی کہ کوئی شخص اسے شہر کے ایک میلے سے اٹھا لے بھاگا تھا۔ اس نے مختلف دیہات میں پرورش پائی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی عمر شادی کے لائق ہو گئی۔ ایک عورت نے اپنے کو اس کی چچی ظاہر کر کے ایک کھاتے پیتے گھر میں اچھی قیمت پا کے بیچ ڈالا۔ پہلے پہل وہ جس شخص کے پلے پڑی وہ تھا تو کم عمر مگر بالکل سودائی تھا جس سے کوئی باپ اپنی بیٹی بیاہنے کو تیار نہ تھا۔ سودائی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ حد درجہ ظالم بھی تھا۔ جب وحشت اٹھتی تو بلا قصور ریشماں کو مارنے پیٹنے لگتا۔ ایک دفعہ اس زور سے ریشماں کا گلا گھونٹا کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ قریب تھا کہ ریشماں دم توڑ دے مگر عین اس وقت ایک نوکرانی نے دیکھ کر شور مچا دیا اور وہ ڈر کر بھاگ گیا۔

رفتہ رفتہ ریشماں نے اس وحشی سے بچاؤ کی ایک ترکیب سوچ لی۔ جس دن ریشماں کو اس کے تیور ذرا بھی بدلے ہوئے نظر آتے وہ خود بھی سودائی بن جاتی اور چیخنے، چلانے، کرونے، ہو بھی ہاتھ لگتا میاں کے دے مارتی۔ یہ حربہ کارگر ثابت ہوتا اور وہ فوراً ٹل جاتا۔ یوں ہی چار سال گزر گئے۔ لیکن اس قسم کی زندگی جس میں ہر وقت جان کا خوف لگا رہتا ہو آخر کب تک گزاری جا سکتی تھی۔ چنانچہ وہ بھاگنے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ اس کی جان پہچان ایک بڑھیا سے ہو گئی جس کا تعلق بردہ فروشوں کے ایک گروہ سے تھا۔ یہ بڑھیا ریشماں کو تھوڑے ہی دنوں میں وہاں سے بھگا لے جانے میں کامیاب ہو گئی اور اس نے اسے مائی جمی کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

سودائی کے ساتھ چار سال گزار کے وہ خود بھی نیم وحشی ہو گئی تھی۔ اس میں اچھے برے کی تمیز نہ رہی تھی۔ مگر مائی جمی نے تین چار مہینے اپنے ساتھ رکھا اسے خوب کھلایا پلایا اور آخر پیار محبت سے اسے رام کر لیا۔ اب اس نے اسے اپنے پیشے کی تعلیم دینی شروع کی۔

مائی جمی کا بردہ فروشی کا طریقہ سب سے جدا تھا۔ اور ایک فن کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ بڈھوں بڈھوں کو پھانسا کرتی۔ جو خاص کر جوان لڑکیوں کے آرزو مند رہتے۔ اور جن سے ان کی اچھی قیمت مل جاتی۔ پھر جب لڑکیاں زیور اور روپیہ لے کر بھاگ جاتیں تو وہ بدنامی اور جگ ہنسائی کی وجہ سے اس کا زیادہ چرچا نہ کرتے اور بڑھاپے کی وجہ سے دوڑ دھوپ اور پیچھا کرنے کی بھی ان میں ہمت نہ ہوتی۔ اس طرح چند ہی ماہ میں یہ واقعہ رفت گزشت ہو جاتا اور پھر کہیں دوسرے شکار کی تلاش از سر نو شروع ہو جاتی۔

ریشماں نے جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ جس قسم کی زندگی گزاری تھی۔ اس سے وہ زندگی کو ایک خوفناک کھیل سمجھنے لگی تھی۔ جس میں کھلاڑی ہر وقت جان کی بازی لگائے رکھتا ہے۔ اور آخر ایک دن اسے جان سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ ریشماں کی مہم پسند طبیعت کو یہ کھیل۔ جس میں ایک طرح سے مردوں سے انتقام لینے کا جذبہ بھی شامل تھا بھا گیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے اب تک اسے تکلیفیں ہی تکلیفیں اٹھانی پڑی تھیں اور وہ لذت نہ مل سکی تھی جو کسی خوفناک کھیل کی کامیابی پر کھلاڑی کو حاصل ہوتی ہے۔ چودھری گلاب کے گھر بس کر اسے پہلی مرتبہ زندگی کی قدر و قیمت معلوم ہوئی۔ اس گھر میں کیسی عافیت تھی اور باہر کیسے کیسے خطرے۔ جن لوگوں کو فریب دیا گیا ان کے غضبناک چہروں کا ہر وقت آنکھوں کے سامنے پھرتے رہنا۔ انجانی شکلوں پر خواہ مخواہ ان کا دھوکا ہوتا۔ رہ رہ کے چونک پڑنا۔ سوتے سوتے چیخ اٹھنا۔

دن گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ ریشماں کو چودھری گلاب کے گھر میں بسے تین مہینے ہو گئے۔ اس دوران میں وہ آرام اور عافیت کی اور بھی زیادہ عادی ہو گئی۔ ادھر چودھری روز بروز اس کا پہلے سے زیادہ گرویدہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور آئے دن اس کے لئے چھوٹے چھوٹے زیور لانے لگا تھا۔

ایک دن وہ گھر میں اکیلی تھی کہ ایک بڑھیا بھیک مانگنے آئی۔ جب ریشماں آٹے کی مٹھی بھر کر اس کی جھولی میں ڈال رہی تھی تو اس نے چپکے سے کہا:

"مجھے پہچانا؟ مجھے مائی جمی نے بھیجا ہے۔ کہو کب چلنا ہے؟"

اس نے بڑھیا کو پہچان لیا اور یکبارگی کانپ اٹھی۔ چہرے کا رنگ فق ہو گیا مگر پھر جلد ہی سنبھل گئی بولی:

"مائی جمی سے کہنا ابھی نہیں۔ ابھی مجھے زیوروں کا پتہ نہیں لگا۔ ایک مہینہ اور ٹھہر جائے۔"

فقیرنی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

ایک مہینہ اور گذر گیا۔ اب کے مائی جی خود آئی اور صبح کو ایسے وقت آئی جب چودھری گھر میں موجود تھا۔ وہ اسے ریشماں کی خالہ سمجھتا تھا۔ جو غربت کی وجہ سے اپنی بہن کی نشانی کو بیچنے پر مجبور ہوئی تھی۔ اس نے مائی جی کو عزت سے گھر میں بٹھایا اس کی مزاج پرسی کی۔ پھر دونوں کو تنہا چھوڑ کر کھیتوں پر چلا گیا۔

"ہوں زیوروں کا پتہ لگا؟" مائی جی نے پوچھا۔

"مجھے کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ وہ ایک ایک کر کے خود ہی مجھے زیور دے رہا ہے۔ لو دیکھو۔"

"اری ان دو انگوٹھیوں اور کان کے بندوں کو تو زیور کہہ رہی ہے۔ پگلی زیور تو ہوتا ہے ست لڑا۔ کڑے۔ جھومر۔ چمپا کلی۔ لیکن بس اب ہمیں کچھ نہیں چاہئے۔ میں تجھے لینے آئی ہوں۔ آج رات کو تیار رہیو۔ میں نے گھوڑی کا انتظام کر لیا ہے۔"

"نہیں مائی جی ابھی نہیں" اس نے سہم کر لجاجت سے کہا "مجھے اس گھر میں بہت آرام مل رہا ہے میں ابھی نہیں جانا چاہتی۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ مجھے کوٹے بھی یہی کہتا تھا کہ اس کے طور بدلے ہوئے ہیں۔ مگر میں نے یقین نہیں کیا۔" پھر وہ تحکمانہ لہجے میں کہنے لگی۔ "سن لڑکی۔ بے وقوفی کی بات نہ کر۔ تجھے میرے ساتھ جانا ہے۔ اور آج ہی رات کو۔ ایک بڑا امیر جمعدار تیرا گاہک پیدا ہوا ہے۔ جو تجھے سونے سے لاد دے گا اور میں اس سے بات پکی کر آئی ہوں۔"

"مائی جی" ریشماں نے اور بھی گڑگڑا کر کہا "میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے اسی گھر میں رہنے دے۔ میں تجھے یہ سارا زیور دے دوں گی۔ اور چودھری اور جو کچھ دے گا وہ بھی تیرا ہی ہوگا۔ مگر مجھے یہیں چھوڑ دے۔"

مائی جی کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اری ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے۔ بڈھے پر کیا مرنا۔ زندگی کا مزہ لینا ہے تو کسی جوان پر مر۔ اس بڈھے میں رکھا ہی کیا ہے۔"

"نہیں نہیں مجھے کسی مرد کی ضرورت نہیں۔ مجھے یہ بڈھا بھی نہیں چاہئے میں تو فقط آرام سے زندگی گذارنا چاہتی ہوں۔"

"دیکھ ریشماں" مائی نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا "جو تو چاہتی ہے وہ تو ہونے کا نہیں۔ اور اگر تو

سیدھی طرح نہیں مانے گی تو پھر میں دوسرا گر بھی جانتی ہوں۔ تجھے معلوم نہیں کہ کرم دین ابھی تک تیرے لئے تیری تلاش میں پھر رہا ہے اسے یہ معلوم نہیں کہ میں نے تجھے بھگایا تھا۔ میں اب بھی اس کے پاس جا سکتی ہوں اور تیرا پتہ بتا سکتی ہوں۔"

مائی جی کی زبان سے یہ الفاظ مشکل ہی سے نکلے ہوں گے کہ ایسا معلوم ہوا جیسے یکبارگی بھونچال آ گیا ہو۔ ریشماں نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح مائی کو دبوچ لیا۔ اور ناخنوں سے اس کا چہرہ لہولہان کر دیا۔ پھر پیٹ پر اس زور کی دو تین لاتیں ماریں کہ تھوڑی دیر کے لئے بڑھیا کا سانس بند ہو گیا۔

"حرامزادی۔ کٹنی۔ بدمعاش۔ دفان نکل جا میرے گھر سے نہیں تو خون پی لوں گی تیرا۔"

یہ کہتے کہتے اس نے مارے طیش کے مائی جی کے منہ پر تھوک دیا۔

ریشماں کے چہرے سے اس وقت ایسا وحشی پن ٹپک رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا جو کچھ کہہ رہی ہے وہ سچ کر گذرے گی۔ اس کے پہلے ہی حملے نے مائی جی کی ایسی مت گم کر دی تھی کہ وہ اپنی مدافعت بھی نہ کر سکی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کپڑے جھاڑے۔ چادر سے چہرہ پونچھا۔ جو اس وقت نفرت سے سخت گھناؤنا ہو رہا تھا۔ وہ بغیر ایک لفظ منہ سے نکالے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی ریشماں نے خود کو پلنگ پر پٹخ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دوپہر کو جب چودھری گلاب کھانا کھانے آیا تو وہ پہلے کی طرح ہشاش بشاش پلنگ سے اٹھی۔ اور کھانا نکالنے کے لئے چولھے کی طرف گئی۔

"تمہاری خالہ چلی گئیں؟" چودھری نے پوچھا۔

"ہاں"

"کھانا تو کھلا دیا ہوتا۔"

"ان کے پیٹ میں اچانک سخت درد اٹھا اور وہ اپنے گاؤں کے حکیم کے پاس دوا لینے چلی گئیں۔"

اس واقعے کو ایک ہفتہ گذر گیا۔ مگر اس عرصے میں ریشماں کے دل کا چین مفقود ہو چکا تھا۔ ہر آہٹ پا کے کسی کے قدموں کا گمان ہونے لگتا وہ بار بار دروازے کی طرف جاتی اور واپس آ جاتی۔ دو چار ہی دن میں اس کی آنکھوں کے گرد گڑھے پڑ گئے اور چہرے پر زردی چھا گئی۔ جیسے یکبارگی کسی مہلک مرض نے آ لیا ہو۔ وہ چودھری سے کچھ کہنا چاہتی تو منہ سے بات نہ نکلتی۔ چودھری اس سے کچھ کہتا تو وہ بے خیالی میں کچھ نہ سنتی۔ اور چودھری کو ایک ایک بات تین تین چار چار بار دہرانی پڑتی

چودھری نے اس تبدیلی کو محسوس کیا اور کہا:

"تمہاری طبیعت اچھی نہیں ہے چلو میں تمہیں حکیم کے پاس لے چلوں۔"

"نہیں مجھے کچھ نہیں ہوا۔" اس نے کہا "بچپن ہی سے میری حالت کبھی کبھی ایسی ہو جایا کرتی ہے۔ مگر چند ہی دنوں میں آپ ہی آپ ٹھیک ہو جاتی ہوں۔"

دن پر دن گذرتے گئے۔ مگر اس کی حالت میں فرق نہ آیا۔ اس دوران اس کا جی چاہا کہ وہ چودھری سے سارا حال کہہ دے۔ اور اپنے کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ مگر اس کا احساس خودی جسے تو چودھری کے حسن سلوک نے اس میں پیدا کر دیا تھا۔ اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ کیا وہ چودھری کے سامنے اعتراف کرے کہ وہ پرلے درجے کی مکار اور جھوٹی ہے۔ اور ان چار ماہ میں جو اس نے اس گھر میں گذارے ہیں اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ فریب سے پر تھا۔ اور پھر اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ چودھری پر یہ حقیقت کھلنے پر کہ وہ ایک جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتی ہے جو کئی گھروں کو لوٹ چکا ہے اور عنقریب اس کو بھی لوٹنے والا تھا۔ اسے بے عزت کر کے گھر سے نکال نہ دے گا۔ چنانچہ اس نے خاموش ہی رہنا مناسب سمجھا اور اپنے معاملے کو تقدیر پر چھوڑ دیا۔

اسے اس بات کا افسوس نہیں تھا کہ اس نے مائی جی کے ساتھ ایسا درشت سلوک کیا۔ اگر وہ زمانہ سازی سے کام لیتی تو شاید مائی جی کو وہ تین مہینے تک اور ٹال سکتی تھی۔ مگر امید و بیم میں رہ کر جینا اس کی آزاد سرشت کے لئے موت سے بدتر تھا وہ چاہتی تھی کہ جو بات بھی ہونی ہو وہ جلد ہو جائے۔ اور وہ خوش تھی کہ اس نے مائی جی سے اپنا بدلہ لے لیا تھا۔ وہ صبر کے ساتھ اس آنے والی گھڑی کا انتظار کرنے لگی۔ اسے زیادہ مدت نہ اٹھانی پڑی اور وہ گھڑی آن پہنچی۔

شام کا وقت تھا۔ گھروں میں دیے جل چکے تھے۔ وہ چولہے کے پاس بیٹھی چودھری کو کھانا کھلا رہی تھی کہ ایک کسان کھانستا ہوا گھر کے آنگن میں داخل ہوا۔

"چودھری صاحب" اس نے کہا "کوئی شخص آپ سے ملنے آیا ہے۔"

"کون ہے؟"

"کوئی بوڑھا سا آدمی ہے۔ سفید داڑھی والا۔ نام نہیں بتلایا۔ کہتا ہے بہت ضروری کام ہے۔ بڑی دور سے آیا ہوں۔"

"اچھا اسے باہر چارپائی پر بٹھاؤ اور حقہ بھر کے پلاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

ریشماں کا سر چکرا گیا اور اس نے سہارا لینے کے لئے اپنا ایک ہاتھ زمین پر ٹیک دیا۔ مگر یہ

کیفیت لمحہ بھر سے زیادہ نہ رہی۔ وہ سنبھل گئی اور خاموشی سے چودھری کو کھانا کھاتے دیکھنے لگی۔ رفتہ رفتہ اس کے ارادے میں مضبوطی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ہر خطرے کا مقابلہ کر سکے گی۔

کھانا کھا کے چودھری نے کلی کی۔ داڑھی مونچھ پر ہاتھ پھیرا۔ پھر تہمد کے پلے سے منہ پونچھتا ہوا باہر نکل گیا۔

ایک منٹ، دو منٹ، پانچ منٹ، پندرہ منٹ گذر گئے مگر چودھری نہ آیا۔ ریشماں نے سوچا کہ ابھی وہ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے ہوں گے اور اصل واقعہ ابھی نہیں چھڑا ہوگا۔ کیونکہ وہ برابر حقے کی گڑگڑاہٹ سن رہی تھی۔

آخر کوئی آدھ گھنٹے کے بعد چودھری واپس آیا۔ اس کی حالت انتہائی اضطراب کی تھی۔ اس کی آنکھیں ابلی ہوئی تھیں۔ ہاتھ کانپ رہے تھے اور داڑھی کف آلود تھی۔

"کیوں ری" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا "تو کرم دین کو جانتی ہے؟"

ایک ایسی آواز میں جو سرگوشی سے ذرا ہی اونچی تھی ریشماں نے کہا۔

"ہاں"

"تو پھر وہ سب سچ ہے جو وہ کہتا ہے؟"

بغیر یہ جاننے کی خواہش رکھے کہ وہ کیا کہتا ہے ریشماں نے کہا:

"ہاں"

اور اس کے ساتھ ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یکبارگی کوئی بڑا بھاری بوجھ اس کے سینے سے اٹھ گیا۔

"بدذات۔ بے حیا عورت۔"

یہ پہلے سخت لفظ تھے جو چودھری گلاب کی زبان سے اس نے اپنے بارے میں سنے تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ ان لفظوں نے اس کے احساس خودی کو صدمہ نہیں پہنچایا بلکہ اسے مزہ آیا اور ایک لطیف سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔

چودھری نے غصے سے ایک دو مرتبہ زمین پر پاؤں پٹکے۔ کوٹھری کے اندر گیا۔ آنگن میں گھوما۔ جیسے نہیں جانتا کہ کیا کرے۔ آخر وہ باہر نکل گیا۔

ریشماں اب اپنے کو پہلے کی طرح پھر بے خوف اور آزاد محسوس کر رہی تھی ہر قسم کے بندھنوں

سے آزاد تھیں۔ ان میں اخلاق، عزتِ نفس اور خودداری کے جذبے بھی شامل تھے۔ ان جذبوں میں اس نے اپنے کو ڈوبا تو ڈوبا چھوڑ دیا تھا۔ مگر اب وہ مسرت کے ساتھ جو تماشہ دیکھنے کے لیے تیار تھی۔ خود وہ انجام کار اس کی اپنی زندگی کا المیہ ہی کیوں نہ ثابت ہو۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی آنگن میں گئی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کے ان کی باتیں سننے لگی۔ وہ دونوں چارپائی پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ چودھری گلاب بڑے جوش میں تھا۔ کہہ رہا تھا:

"نالش دعوے کرنا، عدالت میں جانا تو نامردوں کا کام ہے۔ مردوں کا طریقہ دوسرا ہے۔ اگر تمہیں منظور ہے تو ابھی چل کے فیصلہ کیے لیتے ہیں۔"

"مجھے منظور ہے۔" کرم دین نے تاؤ کھا کے کہا "میں بھی کوئی گیدڑ نہیں ہوں۔"

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد چودھری گلاب، کرم دین اور ریشماں تینوں کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے قصبے کے اس طرف جا رہے تھے جدھر گھنا جنگل تھا اور آبادی کے آثار نہ تھے۔ جاڑے کے آخری دن تھے۔ سردی زوروں پر تھی۔ تیرھویں یا چودھویں کا چاند نکلا ہوا تھا۔ جوں جوں وہ بڑھتے جاتے خنکی بڑھتی جاتی۔ انہوں نے گاڑھے کی چادروں میں اپنے کو لپیٹ رکھا تھا۔ دونوں مرد آگے تھے اور ریشماں پیچھے پیچھے۔ وہ خاموش چلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ جنگل میں پہنچ گئے۔ مگر ان کے قدم اب بھی نہیں تھمے۔ وہ چاندنی کرنوں کی روشنی میں جو درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر پگڈنڈی پر پڑ رہی تھیں برابر چلتے رہے۔ آخر وہ جنگل بھی ختم ہو گیا اور ایک ایسی جگہ آ گئی جہاں ہر طرف نیچے اونچے ٹیلے تھے۔ خاردار جھاڑیاں تھیں اور مردہ جانوروں کے پنجر پڑے تھے۔ یہ جگہ ایسی اجاڑ تھی کہ رات تو رات دن کے وقت بھی کسی انسان کا ادھر گزر نہیں ہوتا تھا۔

ایک اونچا سا صاف اور ہموار قطعۂ زمین دیکھ کے چودھری گلاب ٹھہر گیا۔

"یہ جگہ ٹھیک ہے" اس نے کہا۔ یہ پہلا فقرہ تھا جو پچھلے دو گھنٹے کی مسافت کے دوران ان میں سے کسی کی زبان سے نکلا تھا۔

"جیسی چودھری صاحب کی مرضی" کرم دین نے جواب دیا۔

دونوں کے چہروں پر تناؤ تھا اور ابرو چڑھے ہوئے۔ دونوں نے اپنی اپنی چادریں اور پگڑیاں اتار کے زمین پر رکھ دیے اور تہمد کو لنگوٹ کی طرح کس لیا۔ پھر دو چھویاں چاندنی میں چمکنے لگیں اور وہ دونوں میدان میں اتر آئے۔

ریشماں چلتے چلتے تھک گئی تھی۔ وہ ان سے ذرا فاصلے پر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر

ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ دل چسپی سے ان کی لڑائی دیکھنے لگی۔ ایسا منظر اس نے اپنی عمر میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے دل میں اب ذرہ بھر خوف باقی نہ رہا تھا۔ نہ اس کی فکر تھی کہ ان دونوں میں سے کون فتح یاب ہو کر اس کی قسمت کا مالک بنتا ہے۔ وہ بڑی مسرت اور چونچالی کے ساتھ ان بڈھوں کی جنگ دیکھ رہی تھی۔ جیسے بچے ریچھوں کی کشتی کا تماشہ دیکھتے ہیں۔

کچھ دیر تو دونوں چھویاں تانے بے حرکت آمنے سامنے کھڑے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے پینترے بدلے۔ چاندنی میں ان کی چھویاں چمک رہی تھیں اور سفید ڈاڑھیاں جو اس وقت اور بھی سفید دکھائی دے رہی تھیں، ہل رہی تھیں۔

وہ آدھ گھنٹے تک اسی طرح برابر پینترے بدلا کیے۔ مگر ابھی تک ایک کی چھوی نے دوسرے کے جسم کو نہیں چھوا تھا۔ صرف ایک مرتبہ چودھری گلاب کی چھوی کرم دین کی چھوی سے ٹکرا گئی تھی۔ مگر اس کے بعد دونوں پیچھے ہٹ گئے تھے۔ اس میں وہ دونوں ہانپنے لگے تھے۔

ریشماں کو اس تماشے سے جلد ہی اکتاہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے جمائیاں لینی شروع کر دیں۔ اسے اب سردی بھی لگنے لگی تھی۔ اس نے ٹیلوں کے اس پار دیکھنا شروع کیا۔ شاید وہ کوئی نالہ بہہ رہا تھا جس کا ہلکا ہلکا شور اس ہو کے عالم میں بڑا تسکین بخش معلوم ہوتا تھا۔

اچانک کرم دین نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ذرا تھم جاؤ۔ اس کے تہمد کا پلو جس کو اس نے لنگوٹ کی طرح پیچھے اڑس رکھا تھا۔ باہر نکل آیا تھا۔ اسے ایک ہاتھ میں چھوی اور دوسرے میں لنگوٹ تھامے دیکھ کر ریشماں ضبط نہ کر سکی۔ اور اس نے بے اختیار قہقہہ لگا دیا۔ دونوں مرد پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

ریشماں ہنسے جا رہی تھی۔ ہر چند اسے احساس تھا کہ ایسے نازک وقت میں اس کا ہنسنا بڑا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر اسے پروا نہ تھی۔

"اگر میں زندہ بچ رہا" کرم دین نے کھسیانا سا ہو کر کہا "تو سب سے پہلے اس چھنال کے ٹکڑے کروں گا۔"

"اس بے حیا کو تو اب میں بھی گھر میں نہیں بساؤں گا۔" چودھری گلاب نے کہا "اس کی ناک کاٹ کے چھوڑ دوں گا۔"

"تو چودھری، تو پہلے کیوں نہ اسی کا قصہ پاک کریں۔ ہم بھی کیسے بیوقوف ہیں کہ اس فاحشہ کے پیچھے جانیں دیے دیتے ہیں۔ اس کا کیا ہے کل کسی اور کی بغل گرم کر رہی ہوگی۔"

چودھری گلاب نے کچھ جواب نہ دیا۔ کرم دین نے اس کی خاموشی کو رضا تصور کیا اور وہ یکبارگی چھوی لے کر ریشماں کی طرف جھپٹا مگر جلدی میں کیکروں کے ڈھیر میں اس کا پاؤں الجھ گیا اور ریشماں کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔ وہ تیزی سے دوڑ کر ایک ٹیلے پر چڑھ گئی۔ کرم دین بھی اس کے پیچھے بھاگا! اسے دیکھ کر وہ پھر دوڑی۔ کرم دین نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور دونوں دیر تک ٹیلوں پر ادھر ادھر بھاگتے رہے کرم دین دوڑتے دوڑتے بے دم ہو گیا تھا۔ مگر انتقام کی آگ نے اسے اپنا پاگل بنا رکھا تھا کہ وہ مرتے مرتے اس کا تعاقب کئے جا رہا تھا۔ یہ سلسلہ آدھ گھنٹے تک جاری رہا۔ بالآخر ریشماں کے کپڑے ایک جھاڑی کے کانٹوں میں الجھ گئے اور دوسرے لمحے کرم دین نے آ کے اسے چٹیا سے پکڑ لیا۔ اور گھسیٹتا ہوا لے چلا۔ ریشماں نے دانتوں سے اس کے ہاتھوں کو کاٹ کاٹ کے لہولہان کر دیا۔ مگر اس نے چٹیا نہ چھوڑی۔

دونوں اس جگہ پہنچے۔ جہاں چودھری گلاب ان کا انتظار کر رہا تھا اس دوران میں وہ کپڑے پہن چکا تھا۔ اس بلا کی سردی میں ننگے رہنے پر اس کا جسم اکڑ گیا تھا۔ مگر اب گاڑھے کی چادر کی بکل مارے وہ بہت مگن معلوم ہوتا تھا۔

کرم دین نے کہا" بے حیا بھاگنا چاہتی تھی۔ مگر میں بھی پاتال تک اس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔ کیوں چودھری جی لگاؤں ایک ہاتھ۔"

یہ کہہ کر اس نے چھوی اٹھائی۔ چودھری گلاب جواب نہ دینے پایا تھا کہ ایک آواز ٹیلوں میں گونج اٹھی:

"او چودھری ٹھہر جاؤ۔"

یہ مائی جی تھی جو ان کے پیچھے پیچھے چلتی رہی تھی اور ایک ٹیلے کے کھڈ میں چھپ کے دور سے سارا ماجرا دیکھتی رہی تھی۔

"او بردہ فروش چڑیل تو کہاں سے آ گئی" کرم دین نے غصے میں کہا" یہ سب تیرے ہی کرتوت ہیں۔ آ اس کے ساتھ تیری زندگی کا بھی قصہ پاک کر دیں۔"

چند لمحوں میں مائی جی ان کے پاس پہنچ گئی۔

"او مار ڈالو" اس نے بے خوفی سے اپنا سینہ آگے کرتے ہوئے کہا مگر یاد رکھو تم بھی پھانسی سے نہیں بچو گے۔ میرے کنبے والے تھانے میں فوراً اطلاع کر دیں گے۔ اور سپاہی آ کے تمہیں ہتھکڑیاں لگا کے لے جائیں گے۔"

"کیا بکتی ہے گنی" چودھری گلاب نے کہا۔ وہ اب تک اس قصے میں خاموش رہا تھا۔ مگر مائی کی اس زبان درازی کو برداشت نہ کر سکا۔

کچھ لمحے خاموشی رہی اس کے بعد مائی نے پھر زبان کھولی مگر اب کے اس کا لہجہ مصالحت آمیز تھا۔

"سنو" اس نے کہا" اگر تمہیں وہ سارا روپیہ مل جائے جو تم نے اس پر خرچ کیا ہے۔ تو کیا تم اسے مجھے دے دو گے؟"

دونوں شخص کچھ دیر سوچتے رہے اس کے بعد کرم دین نے کہا:

"اگر میرے چار سو روپے مجھے واپس مل جائیں تو پھر وہ چاہے بھاڑ میں جائے میری بلا سے۔"

"تم چار سو چھوڑ پانچ سو لینا۔ اور چودھری گلاب تم کیا کہتے ہو۔"

"اگر کرم دین کو اعتراض نہیں تو مجھے بھی اعتراض نہیں" چودھری نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تمہیں بھی تمہارا سات سو روپیہ مل جائے گا۔ چودھری گلاب۔ بات یہ ہے کہ یہاں سے کوئی دس کوس پر ایک جمہرا اور رہتا ہے جو ریشماں جیسی لڑکی کے دو ہزار روپے دینے کو تیار ہے۔ تم مجھے ایک دن کی مہلت دو اور ریشماں کو بھی اپنے پاس رکھو۔ کل شام کو جب میں تمہارا روپیہ لوٹاؤں گی تو تم اسے میرے حوالے کر دینا۔"

ریشماں نے گردن اٹھائی۔ مائی جی کی طرف دیکھا اور ایک جھرجھری لی۔ چودھری گلاب نے مائی جی کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ مائی جی نے اس کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس کے لئے اس کی خاموشی ہی کافی تھی۔

اب کرم دین بھی کپڑے پہن چکا تھا۔ وہ چاروں واپس چل دیے پہلے کی طرح مرد آگے آگے اور عورتیں پیچھے پیچھے۔ سردی اب پہلے سے بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے اب ان کے قدم آپ ہی آپ تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ کچھ دیر تو خاموشی سے چلتے رہے۔ آخر کرم دین نے چودھری گلاب سے کہا:

"بڑی خشک سردی پڑ رہی ہے اب کے سال۔ ہماری فصلوں کا تو ناس ہی ہو گیا۔ یہاں کیا حال ہے چودھری صاحب؟"

"یہاں بھی بارش کی ایک بوند نہیں پڑی۔" چودھری گلاب نے جواب دیا۔

"پھر یہ خشک سردی بیماریاں بھی تو لاتی ہے۔ خاص کر ڈھور ڈنگر کے لئے۔ میری ایک بھینس پالا کھا کے مر گئی۔"

"اوہو"

کچھ دیر پھر خاموشی رہی۔۔

"چاول کا کیا بھاؤ ہے یہاں؟" کرم دین نے پھر پوچھا۔

"یہی سولہ سیر" چودھری گلاب نے جواب دیا۔

"ہمارے ہاں ڈھائی سیر کا بھاؤ ہے۔" کرم دین نے کہا۔

راشاں اس خنک چاندنی میں ایک خواب کے سے عالم میں چلی جا رہی تھی نہ تو اس کے کان کچھ سن رہے تھے نہ آنکھیں کچھ دیکھ رہی تھیں اور نہ یہ خبر تھی کہ قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔

تنکے کا سہارا

ہمارے محلے میں ایک میر صاحب رہا کرتے تھے۔ نام سے تو ان کے شاید وہ ایک آدھ ہی واقف تھے مگر رفتہ رفتہ سب کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ چنگی خانے میں ملازم ہیں۔ خدا معلوم وہاں کیا کام کرتے تھے مگر شام کو جب وہ لوٹتے تو کبھی دو چار گنے کبھی ککڑی کبھی بھٹے کبھی پان کبھی کھجوریں رومال میں بندھی ہوئی ان کے ہاتھ میں ہوتیں۔ ادھیڑ عمر، دبلے پتلے منحنی سے آدمی۔ مگر خوش اخلاق اور وضعدار۔ کتھئی رنگ کی بوسیدہ سی شیروانی اور سفید صافہ۔ جاڑے گرمی یہی ان کا لباس رہتا۔ چگی ڈاڑھی باچھوں میں ہلکی ہلکی پیک بہی ہوئی۔ راستے میں کبھی محلے کے بچے کھیلتے ہوئے مل جاتے تو رومال سے کھجوریں یا بیر نکال نکال کے انہیں دیا کرتے اور شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا کرتے۔ وہ خود بھی کئی بچوں کے باپ تھے۔

اس محلے میں یوں تو غریب غربا ہی بستے تھے مگر کچھ کھاتے پیتے لوگوں کے بھی تھے۔ یہ ایک بڑا سا چوکور احاطہ تھا جس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے دو منزلہ مکان تھے اور بیچ میں کھلا میدان۔ نچلی منزل میں دو دو کوٹھریاں اور ایک ایک آنگن کے مکان تھے۔ ان میں زیادہ تر گاڑی بان بسے ہوئے تھے جن کے نام سے یہ محلہ مشہور تھا۔ ان کی گاڑیاں اور مویشی رات کو اسی میدان میں پڑے رہتے تھے اور وہ خود بھی سخت جاڑے کے دو ایک مہینوں کو چھوڑ کر باقی سارے سال باہر میدان ہی میں

سوتے تھے۔ میر صاحب کا خاندان بھی ان نچلے مکانوں ہی میں سے ایک میں رہتا تھا۔

اوپر کی منزل والے مکانوں میں جن کی مکانیت نسبتاً بہتر تھی، دفتروں کے بابو اور منشی متصدی رہتے تھے اور کچھ بیوپاری اور دکاندار جن کی دکانیں محلے کے قریب ہی بازار میں تھیں۔ ایک حاجی صاحب تھے جو ہیڈ کلرکی سے ریٹائر ہو کر پنشن پا رہے تھے۔ ان کا بڑا لڑکا کسی دفتر میں ملازم تھا۔ دوسرا پریس کا کام کرتا تھا۔ دونوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ علاوہ ازیں ایک لڑکا اسکول میں پڑھتا تھا۔ اور حاجی صاحب کی بیگم بھی حیات تھیں۔ یہ سب لوگ دو متصل گھروں میں رہتے تھے جن کی درمیانی دیوار کو بیچ میں سے توڑ کر آنے جانے کے لئے راستہ بنا لیا گیا تھا۔

حاجی صاحب کے علاوہ اس احاطے میں ایک اور کھاتا پیتا گھر ٹھیکیدار انعام رسول کا تھا جس نے سرکاری عمارتوں کے ٹھیکے میں خاصی دولت پیدا کی تھی۔ ایک گھر مہر فضل دین فروٹ مرچنٹ کا تھا۔ ایک میں چوہدری شیخ محمد انجینئر رہتے تھے۔ ایسے ہی دو ایک گھر اور تھے جن کو نسبتاً خوش حال کہا جا سکتا تھا۔

ایک دفعہ جاڑوں میں میر صاحب بیمار پڑ گئے۔ معمولی مرض تھا انہوں نے پروا نہ کی اور برابر کام پر جاتے رہے۔ مگر مرض بڑھتا گیا اور وہ چار ہی دن میں نڈھال ہو کر چارپائی پر پڑ گئے۔ محلے کے لوگوں نے دو ایک مرتبہ انہیں لاٹھی کے سہارے عطار کی دکان پر کھڑے دیکھا۔ اس کے بعد وہ کئی دن نظر نہ آئے اور آخر ایک دن اچانک یہ خبر سارے محلے میں پھیل گئی کہ پنچی والے میر صاحب چل بسے۔

محلے والے ان کی خستہ حالی سے تو واقف تھے مگر یہ بات کسی کے گمان میں نہ تھی کہ مرنے کے بعد ان کی تجہیز و تکفین کے لئے بھی گھر سے کچھ نہیں نکلے گا۔ مرحوم کو اس محلے میں رہتے قریب بارہ برس ہو گئے تھے مگر اس عرصے میں وہ سب سے الگ تھلگ ہی رہے تھے۔ ویسے تو محلے کے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ خوش اخلاقی سے پیش آتے رہے مگر انہوں نے کسی سے میل جول بڑھانا پسند نہیں کیا۔ نہ خود کسی کے ہاں گئے نہ کسی کو اپنے ہاں بلایا۔ ان کے بچے بھی گھر سے کم ہی باہر نکلا کرتے۔ چنانچہ ہمسایوں پر ان کے گھر کی صحیح حالت کبھی ظاہر نہ ہونے پائی تھی مگر اب اچانک میر صاحب مرحوم کی غربت کا پورا اندازہ ہو جانے پر اہل محلہ بھونچکا رہ گئے۔ پردیس میں ایک شریف سید مسلمان کے لاشے کی اس بے کسی و رسوائی پر ان کی رگ حمیت پھڑک اٹھی۔ دم بھر میں محلے کی عورتیں مرحوم کے گھر میں اور مرد باہر جمع ہو گئے۔ فوراً چندہ کیا گیا اور میر صاحب کی میت کو عزت و آبرو کے ساتھ آخری منزل تک پہنچا

دیا گیا۔

اگلے روز صبح کو محلے کی مہترانی صفائی کو آئی تو دیکھا کہ سید کی بیوہ آنگن میں زمین پر بیٹھی ہے۔ چار بچوں کو تو اپنے گرد بٹھا رکھا ہے اور پانچواں گود میں ہے۔ سسکتی جا رہی ہے اور مٹھی میں مٹی بھر بھر کے بچوں کے سروں پر ڈالتی جا رہی ہے۔ اس واقعہ کے بعد محلے والوں نے میر صاحب مرحوم کے بیوی بچوں کو اپنی سرپرستی میں لے لینا اپنا فرض قرار دے لیا۔

میر صاحب مرحوم ایک زوال پذیر خاندان کے آخری فرد تھے جنہیں فکر معاش نے ترک وطن پر مجبور کیا تھا۔ وہ برسوں دیس دیس کی خاک چھانتے پھرے۔ جہاں ذرا سا بھی سہارا ملا وہیں کے ہو رہے۔ اور بیوی بچوں کے ساتھ جیسے تیسے زندگی کے دن پورے کرتے رہے۔ وہ خود تو شہری زندگی کے پروردہ تھے مگر بیوی گاؤں کی رہنے والی سیدھی سادی عورت تھی۔ زمانے کی اونچ نیچ سے بے خبر۔ صحت اچھی تھی، شکل صورت کی بھی بری نہیں تھی۔ تھی تو وہ بھی سیدزادی ہی مگر اس میں غرور نام کو نہ تھا۔ میاں کی تابع داری کرنا اور بچے پالنا یہی دو باتیں اس نے اپنی ماں سے سیکھی تھیں۔

میر صاحب سے شادی کے نو برس میں اس کے ہاں چھ بچے ہوئے تھے۔ چار لڑکیاں اور دو لڑکے۔ ایک لڑکی شیر خوارگی ہی میں مر گئی تھی۔ باقی پانچ بچوں میں سب سے بڑی کبریٰ تھی۔ جس کی عمر آٹھ برس تھی اس سے چھوٹی صغریٰ کی سات برس۔ پھر دو لڑکے تھے فرزند علی اور حشمت علی۔ ایک پانچ برس کا دوسرا ساڑھے تین برس کا۔ سب سے چھوٹی کلثوم تھی جو ابھی چار ہی مہینے کی تھی۔ پردیس میں یوں اچانک شوہر کے اٹھ جانے اور خود بچوں کے ساتھ بے سہارا رہ جانے پر غریب عورت کے دماغ کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اور وہ اپنے اور بچوں کے بارے میں کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر تھی۔ ادھر بچے بھی اپنی اپنی عقل کے مطابق اس واقعہ کی اہمیت کو کچھ کچھ سمجھ کر گم سم رہ گئے تھے۔ انہوں نے نہ تو روٹی کے لئے ضد کی تھی اور نہ مٹھائی کے لئے پیسہ مانگا۔ وہ خود ہی چنگیر میں سے سوکھی روٹی کے ٹکڑے نکال نکال کر کھاتے رہے تھے۔

اگلے روز محلے والوں کی سرپرستی عملی صورت میں ظاہر ہونی شروع ہو گئی۔ محلے میں ایک شخص رہتا تھا جس کی قریب ہی بازار میں دودھ دہی کی دکان تھی۔ علی الصباح اس کی دکان کا ایک لڑکا ایک کوزے میں پاؤ بھر تازہ دودھ لئے میر صاحب مرحوم کے مکان پر پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ کبریٰ نے دروازہ کھولا تو وہ بولا:

"استاد نے یہ دودھ بھیجا ہے بچوں کے لئے۔ ہر روز ایسے ہی آیا کرے گا۔" اور وہ دودھ کا

کوزواڑی کو دے کر چلا گیا۔

اسی طرح تھوڑی دیر کے بعد محلے کے جو قصاب کے ہاں سے ڈیڑھ پاؤ چھوٹی دار گوشت آ گیا۔ کنجڑے نے سبزی بھیج دی۔ غرض اس بیچتے بیچتے ضرورت کی کچھ اور چیزیں بھی پہنچ گئیں۔ بارہ بجے گئے تو بیب بھٹیارے کے ہاں سے آٹھ دس گرم گرم روٹیاں لگ کر آ گئیں۔ ان میں ایک روٹی اس نے خاص طور پر چھوٹے بچوں کے لئے روغنی لگا کر بھیجی تھی اور کہلا بھیجا تھا کہ کم پڑیں تو اور منگوا لیجئے۔ اس نیک کام میں پورا محلہ شامل تھا۔ کیونکہ جن جن گھروں سے روٹیاں لگنے آتی تھیں بیبیوں نے ایک ایک پیڑا سیدانی کے نام کو پہلے ہی الگ کر دیا تھا۔

محلے کا ایک گاڑی بان اپنے چھکڑے میں ٹال کے لئے لکڑیاں لادا کرتا تھا۔ وہ بھرا ہوا چھکڑا لے کر بیوہ کے دروازے پہنچا اور پردہ کرا کر دو من لکڑی گھر کے اندر ڈال گیا۔

دوپہر ڈھلی تو حاجی صاحب کے ہاں سے پرانے کپڑوں کا ایک گٹھر سیدانی بیوہ کے پاس بھیجا گیا۔ ساتھ ہی گھن بی بی نے کہلا بھیجا کہ کبریٰ اور صغریٰ کو بھیج دو کلام پاک کا سبق پڑھ جایا کریں اور سینا پرونا بھی سیکھ لیا کریں۔

تیسرے پہر حاجی صاحب نے محلے کے تین چار معتبر آدمیوں کو اپنے ساتھ لیا اور اس مکان کے مالک کے پاس پہنچے۔ انہوں نے اس سے دین اور آخرت کی بہت سی باتیں کیں۔ سادات کی قربانیاں اور فضیلتیں جتلائیں۔ اور بالآخر اسے اس امر پر راضی کر لیا کہ وہ بیوہ سیدانی کا پچھلے چار ماہ کا واجب الادا کرایہ معاف کر دے اور آئندہ اس سے آٹھ کے بجائے چھ روپے ماہوار کرایہ لیا کرے۔ یہ رقم حاجی نے محلے کے کھاتے پیتے گھروں پر بطور ماہانہ چندہ ڈال دی۔ چونکہ چار روپے آنے کی بات تھی۔ غریب بھی خوشی خوشی اس چندہ میں شامل ہو گئے اور یہ طے پایا کہ کرایہ ادا کر کے جو رقم بچ رہے وہ بیوہ کو نقدی کی صورت میں دے دی جائے تاکہ اس سے وہ اپنی دوسری ضرورتیں پوری کر سکے۔

ملو نے کہا۔ "میں اپنی آٹھ آنے مہینہ تنخواہ چھوڑ دوں گی۔" مگر اس کی اس پیشکش کو منظور نہیں کیا گیا کہ یہ مسکین لوگ ہیں شاید کبھی طعنہ دے بیٹھیں۔

نچلے مکانوں میں میر صاحب مرحوم کے مکان سے ملا ہوا ایک گھر تھا جس میں ایک نوجوان جوڑا حال ہی میں آ کر بسا تھا۔ میاں کسی چھاپے خانے میں کام کرتا تھا۔ بیوی گھر کے دھندے سے فارغ ہو کر دن بھر پلنگ پر پڑی رہتی۔ جس دن محلے والوں کی طرف سے بیوہ سیدانی کے ہاں کھانے

پینے کا سامان پہنچا وہ جلد جلد میاں کو ناشتہ کرا کام پر بھیج، دروازے پر قفل ڈال سیدانی کے ہاں چلی آئی۔ گھر میں جھاڑو دی، بچوں کا منہ دھلایا۔ چولھے میں راکھ بھری تھی اسے صاف کر کے آگ جلائی۔ پکانے کا سامان آ ہی چکا تھا۔ جلد جلد مصالحہ پیس کر ہنڈیا چولھے پر چڑھا دی۔ روٹیاں تنور سے آ گئی تھیں سب بچوں کو کھانا نکال کر دیا۔ سیدانی خاموش بیٹھی کھوئی کھوئی نظروں سے اسے یہ سب کام کرتے دیکھتی رہی۔ جب ہمسائی نے اس سے بھی کھانا کھانے کو کہا تو اس نے منہ پھیر لیا۔ اس پر ہمسائی نے اسے سمجھایا کہ اپنی شیر خوار بچی کا خیال کرو۔ کھاؤ گی نہیں تو دودھ کیسے اترے گا۔ غرض زور دے کر چند نوالے اس کو کھلا ہی دیئے

شام کو اس کا میاں چھاپے خانے سے سینما کے کچھ رنگدار پوسٹر لایا۔ یہ پوسٹر اس نے بیوہ کے بچوں کو دے دیئے۔ پھر بڑے لڑکے فرزند علی کو سائیکل پر اپنے آگے بٹھا کر کمپنی باغ کی سیر کرانے لے گیا۔

غرض دو چار ہی دن میں محلے کے سب لوگوں نے مل کر میر صاحب مرحوم کے پسماندگان کے رہنے سہنے کا خاطر خواہ انتظام کر دیا۔ رفتہ رفتہ بیوہ کے حواس بھی بجا ہونے لگے اور وہ گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کی طرف زیادہ توجہ کرنے لگی۔ شروع شروع میں اسے محلے والوں کی امداد قبول کرتے ہوئے حجاب محسوس ہوا تھا۔ مگر وہ اس بے چارگی میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ ناچار قسمت پر شاکر ہو کر بیٹھ گئی۔

ادھر محلے والوں کو اپنی اس اجتماعی کوشش سے ایک ایسی تسکین کا احساس ہو رہا تھا۔ جو زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ نیکی کے جذبے نے دلوں کو گداز کر دیا تھا۔ ہر شخص اخلاقی طور پر اپنے کو پہلے سے بلند محسوس کرنے لگا تھا اور وہ لوگ جو اب تک ایک دوسرے سے بے تعلق خود غرضانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان میں ایک باہمی رواداری پیدا ہو گئی تھی۔ جیسے وہ ایک ہی خاندان کے فرد ہوں۔

اس سلسلے میں سب سے پیش پیش حاجی صاحب کا گھر تھا۔ جہاں اس لاوارث سید خاندان کو زیادہ سے زیادہ آسائش پہنچانے کے لئے تجویزیں سوچی جاتی تھیں۔ حاجی صاحب مردوں میں اور گھن بی بی عورتوں میں پہروں اسی کا تذکرہ کیا کرتیں۔ بڑی بی کو سب سے زیادہ فکر کبریٰ و صغریٰ کی شادی کے لئے جہیز جمع کرنے کی تھی۔ وہ ابھی سے ان لڑکیوں کے لئے مناسب رشتوں کی کھوج میں رہنے لگیں۔

دن گزرتے گئے، یہاں تک ایک سال ہو گیا اس عرصے میں محلے والے میر صاحب مرحوم کے اہل و عیال کی پرورش کرتے رہے اور جس نے جو جو چیز اپنے ذمے لی تھی اسے وہ بلا ناغہ مہیا

کرتا رہا۔ ادھر اب بیوہ سیدانی کو بھی کچھ سلائی کا کام بھی ملنے لگا تھا جس میں اس کی بڑی بیٹی اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ دونوں لڑکوں کو اسکول میں داخل کر دیا گیا تھا۔ حاجی صاحب نے اپنے رسوخ سے ان کی فیسیں معاف کرا دی تھیں۔ بڑا لڑکا فرزند علی جسے میر صاحب مرحوم نے گھر پر پڑھانا شروع کیا تھا، دوسری میں اور چھوٹا حشمت علی پہلی جماعت میں داخل کرا لئے گئے۔ لڑکیوں کو مجھن بی گھر میں پڑھاتیں ساتھ ساتھ خانہ داری کی باتیں اور سینا پرونا بھی سکھاتیں۔

اسی طرح چار برس گذر گئے۔ سید کی بیوہ اور اس کے بچے محلے والوں کی امداد پر جو نقد یا جنس کی صورت میں انہیں ملتی گذر کرتے رہے۔ چونکہ اس امداد میں پندرہ بیس گھر شامل تھے اس لئے کسی کو بوجھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اتنی رقم تو ہر ماہ جھوٹ موٹ کے یتیم خانے والے ہی بٹور لے جاتے تھے۔ چنانچہ ہر شخص مطمئن تھا کہ وہ صحیح معنوں میں مستحقوں کی امداد کر رہا ہے۔

اب صغریٰ اور کبریٰ تیرہ تیرہ چودہ چودہ برس کی ہو گئی تھیں۔ بلوغت کو پہنچ کر دونوں نے خوب رنگ روپ نکالا تھا۔ اگرچہ گھر میں سخت پردہ تھا، اور لڑکیاں محلے کے دو ایک گھروں کے سوا اور کہیں آتی جاتی نہ تھیں۔ پھر بھی محلے کے ہر گھر میں ان کے حسن و جمال کا چرچا تھا۔ خاص کر صغریٰ کا جس کی نیلی نیلی آنکھیں اور بھورے بال اس کے سرخ و سفید چہرے پر بہت بھلے معلوم ہونے لگے تھے۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں ان کے مستقبل کے بارے میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہونے لگے تھے۔

ایک دن میر فضل دین فروٹ مرچنٹ سے اس کی بیوی نے کہا:

"کچھ خبر بھی ہے۔ یہ صغریٰ کبریٰ کو مجھن بی سارا سارا دن اپنے پاس کیوں بٹھا رکھتی ہیں!"

میر فضل دین نے استفسار بھری نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔

"وہ اپنے بیٹے الطاف سے صغریٰ کو بیاہنے کی فکر میں ہیں۔ جبھی تو کوئی اور لڑکا ان کی نظروں میں نہیں جچتا۔ میں نے اپنے بھانجے کے لئے کوشش کی تو ٹال مٹول کرنے لگیں۔ میں کہتی ہوں ان لڑکیوں کا مجھن بی کے ہاں جانا بند کرانا چاہئے۔"

"مگر وہاں تو وہ مجھن بی سے کلام مجید پڑھنے جاتی ہیں۔"

"مجھن بی کو خود تو کچھ آتا جاتا نہیں دوسروں کو خاک پڑھائیں گی۔ میں نے سنا ہے جیسا الٹا سیدھا کلام مجید وہ پڑھتی ہیں۔"

ادھر شیخ محمد اشتیاق اپنی بیوی سے کہہ رہے تھے:

"ہمیں لڑکیوں کی ضرورت نہیں۔ ہمیں تو میر صاحب کا چھوٹا لڑکا مل جائے تو ہم اسے پالیں

میں اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت بھیج سکتا ہوں۔ ہمارے کوئی اولاد تو نہیں۔ بس وہی ہماری جائداد کا مالک ہوگا۔ مگر حاجی صاحب کہاں ماننے والے ہیں۔"

غرض رفتہ رفتہ اہل محلہ اس خاندان کی سرپرستی میں حاجی صاحب کے حد سے بڑھتے ہوئے دخل کو ناپسند کرنے لگے تھے۔ پھر جس ڈھب سے بچوں کی پرورش ہو رہی تھی اس سے بھی بعض لوگوں کو اختلاف تھا۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ حاجی صاحب کا بیٹا جو بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ علانیہ صغریٰ سے اپنے عشق کا اظہار کرنے لگا۔ اس نے اپنے "عشق جنوں پرور" کے بارے میں ایک نظم بھی ایک ادبی رسالے میں چھپوائی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محلے کی عورتوں نے سید کی بیوہ پر دباؤ ڈال کر حاجی صاحب کے ہاں صغریٰ کبریٰ کا آنا جانا بالکل بند کرا دیا۔ رہی لڑکیوں کی تعلیم تو یہ کام محلے کی مسجد کے امام صاحب کے سپرد کر دیا گیا۔

ان مولوی صاحب کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ رنگ سانولا تھا۔ مگر خدوخال میں جاذبیت تھی۔ آنکھوں میں سرمہ لگاتے۔ داڑھی میں بھی سفید بال کم ہی نمودار ہوئے تھے۔ خاصے خوش الحان تھے۔ ان کی اذان کی آواز محلے بھر میں سنائی دیا کرتی تھی۔ وہ کئی شہروں میں مسجدوں کے امام رہ چکے تھے مگر طبیعت سیلانی تھی۔ اس لئے کہیں بھی پانچ چھ مہینے سے زیادہ نہیں ٹکے۔ امام صاحب صبح کی نماز کے بعد بیوہ سیدانی کے گھر آ جاتے اور دو گھنٹے تک لڑکیوں کو قرآن شریف کے ساتھ ساتھ اردو فارسی بھی پڑھاتے۔

اسی زمانے میں میر صاحب مرحوم کے خاندان پر اچانک ایک ایسی مصیبت ٹوٹ پڑی جس سے محلے کے لوگ وقتی طور پر اپنے اختلافات بھول گئے۔ ہوا یہ کہ فرزند علی نے جو اب بارہ برس کا ہو گیا تھا۔ اسکول میں کسی لڑکے کے پیٹ میں چاقو گھونپ دیا۔ اس لڑکے کو کسی طرح فرزند علی کے خاندان کے حالات معلوم ہو گئے تھے اور وہ اسے اکثر چھیڑا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا "تو بے غیرت ہے تو محلے والوں کے ٹکڑوں پر پلا ہے۔ دیکھ لیجو ایک دن تیری بہنیں ایکٹرسیں بنیں گی ایکٹرسیں۔"

چونکہ وہ لڑکا عمر میں فرزند علی سے بڑا تھا اور طاقتور بھی تھا۔ اس لئے فرزند علی طرح دے جایا کرتا لیکن آخر ایک دن تنگ آ کر اس لڑکے کے چاقو مار دیا۔ وہ لڑکا تھوڑی ہی دیر میں چل بسا اور فرزند علی کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔

یہ مقدمہ مہینوں چلتا رہا۔ حاجی صاحب اور محلے کے دوسرے با اثر لوگوں نے بہتیرا زور لگایا مگر فرزند علی سزا سے نہ بچ سکا اور وہ پانچ برس کے لئے بورسٹل جیل بھیج دیا گیا۔ اس واقعہ سے محلے والوں کی

ہمدردی میر صاحب مرحوم کے خاندان سے پھر تازہ ہو گئی۔ کئی دن تک محلے کی عورتیں بیوہ سیدانی کے گھر آتی اور اس کی دلجوئی کرتی رہیں۔ غریب عورت ایک بار پھر قسمت کو رو کر چپ ہو رہی۔

جس زمانے میں صغریٰ اور کبریٰ جن بی بی سے پڑھنے آیا کرتی تھیں تو الطاف کو کبھی کبھار ان کی ایک جھلک دیکھ لینے کا موقع مل جاتا تھا۔ مگر اب جو مہینوں صغریٰ اس کی نظروں سے اوجھل رہی تو اس کی بے تابی حد سے بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی ماں جن بی بی سے صاف کہہ دیا کہ اگر میری شادی صغریٰ سے نہ ہوئی تو میں زہر کھا لوں گا۔

اس کی اس بے تابی نے اس مسئلے کو اور بھی الجھا دیا۔ کیونکہ اس کی ان حرکات کی وجہ سے اہل محلہ اسے لچھورا اور آوارہ مزاج سمجھنے لگے تھے۔ اور حاجی صاحب کو ان کی مخالفت کے ڈر سے اس رشتے کا ذکر چھیڑنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ دوسرے یہ دقت بھی تھی کہ جب تک بڑی لڑکی کا بیاہ نہ ہو جائے چھوٹی لڑکی کا سوال کیونکر اٹھایا جائے۔

جوں جوں دن گزرتے گئے محلے والے حاجی صاحب کے اور بھی زیادہ مخالف ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ معمولی معمولی دکاندار بھی ان پر آوازے کسنے لگے اور ان کے لئے بازار میں آنا جانا مشکل ہو گیا۔

بدو قصاب کہتا ''دیکھیں حاجی صاحب کیسے لڑکے کی شادی رچاتے ہیں۔ پہلے وہ میرا ڈیڑھ سو روپیہ تو ادا کر دیں۔ میں تو انہیں کے کہنے پر اتنے عرصے میر صاحب کے ہاں گوشت پہنچاتا رہا ہوں۔''

کنجڑا کہتا ''اجی! نو آنے میرا بھی نکلتا ہے بھائی۔''

شیر فروش کہتا ''ہم نے بھی مفت دودھ نہیں پلایا۔''

غرض محلے کے حالات اس درجہ بگڑ گئے تھے کہ اگر حاجی صاحب کی بزرگی آڑے نہ آتی تو ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی ہوتی۔

ایک دن جب اہل محلہ مسجد میں عشاء کی نماز پڑھ کر جانے لگے تو امام مسجد نے جو میر صاحب مرحوم کی لڑکیوں کو گھر پر پڑھانے آیا کرتے تھے۔ حاجی صاحب اور چند دوسرے معتبر لوگوں کو یہ کہہ کر روک لیا کہ آپ سے ایک ضروری مسئلے پر بات کرنی ہے۔ جب اور لوگ چلے گئے تو امام صاحب نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا:

''آپ سب حضرات نہایت ہی نیک دل اور خدا ترس ہیں۔ خدا شاہد ہے میں نے اتنے شریف اور ہمدرد انسان اور کسی محلے میں نہیں دیکھے۔ آپ نے میر صاحب مرحوم کے خاندان سے جو

فیاضانہ سلوک کیا ہے اور اس سلسلے میں جو عملی قدم اٹھائے ہیں اس کا اجر خدا اور اس کا رسول آپ کو دے گا۔ کاش میرے پاس بھی پیسہ ہوتا اور میں بھی اس کارِ خیر میں آپ کا شریک ہوتا لیکن اب میں آپ کے سامنے ایک تجویز پیش کرتا ہوں جو فرمانِ خدا اور سنتِ رسول ہے۔ یعنی میں سید کی بیوہ سے عقد کا خواہاں ہوں۔ مجھے آپ لوگوں پر پورا اعتماد ہے کہ اس لاوارث سید خاندان کی بہتری کے لئے آپ اس کارِ خیر میں میری امداد کریں گے۔''

حاجی صاحب اور دوسرے لوگ امام صاحب کی اس تجویز کو سن کر دم بخود رہ گئے۔

''بہتر ہے'' آخر حاجی صاحب بولے ''اس امر میں بیوہ سیدانی کی رائے بھی لے لی جائے۔''

دوسرے دن دوپہر کے بعد محلے کی کچھ عورتیں بیوہ سیدانی کے ہاں پہنچیں اور اس سے عقد ثانی کی بات چھیڑی۔ سیدانی بڑی دیر تک خاموش سر جھکائے بیٹھی رہیں۔ پھر یک لخت ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ جب محلے کی عورتوں نے بار بار اپنا سوال دہرایا تو وہ رک رک کر اتنا کہہ سکیں۔

''جب اللہ اور رسول کا یہی حکم ہے تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔''

یہ کہتے کہتے سیدانی کے رخساروں پر جن میں ابھی تک خون کی چند بوندیں باقی تھیں ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد امام مسجد جو قاری نور الہدیٰ کے نام سے یاد کئے جاتے تھے اپنا مختصر سامان جس میں ایک صندوقچی، ایک چھوٹی دری اور مسئلے مسائل کی چند کتابیں شامل تھیں لے کر مسجد کے حجرے سے سید کی بیوہ کے گھر اٹھ آئے۔

صبح صبح شیر فروش کا لڑکا حسب معمول میر صاحب مرحوم کے بیوی بچوں کے لئے کوزے میں دودھ لے کر آیا اس کی آواز سن کر امام صاحب خود دروازے پر آ گئے۔

''میاں لڑکے'' انہوں نے پر وقار لہجے میں کہا ''اپنے استاد سے کہنا وہ اب دودھ نہ بھیجا کریں۔ ہمیں جتنے کی ضرورت ہوگی ہم خود مول لے آئیں گے۔ ہاں کوئی نذر نیاز کی چیز ہو تو مسجد میں بھیج دی جایا کرے۔''

پتلی بائی

محبت کا جذبہ پہلے پہل انسان کے دل میں کب بیدار ہوتا ہے، اس کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں۔ بعض لوگ لڑکپن ہی سے عاشق مزاج ہوتے ہیں اور بعض بڑھاپے کو پہنچ کے بھی اس جذبے سے بے بہرہ ہی رہتے ہیں۔

میری عمر کوئی نو دس برس کی ہوگی کہ مجھے عشق ہو گیا۔ عہد طفلی کا وہ معصوم عشق نہیں جو کھلونوں سے بہل جاتا ہے۔ بلکہ سچ مچ کا ہجر و وصال والا عشق جس میں محبوب کی یاد آ آ کر ستاتی ہے۔ دل میں ہوک اٹھتی ہے۔ چہرے کا رنگ زرد پڑنے لگتا ہے۔ بھوک پیاس کی سدھ نہیں رہتی۔

جس نے مجھے اس مرض میں مبتلا کیا وہ میری کوئی ہم عمر لڑکی نہ تھی۔ بلکہ بیس بائیس برس کی ایک پوری جوان عورت تھی۔ ایک خوبصورت ایکٹرس!

ان دنوں ہم جس محلے میں رہتے تھے۔ اس کے قریب ہی ایک تھیٹر تھا۔ اس کے پچھواڑے ایک گلی تھی جس میں کئی چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔ ان مکانوں میں متوسط درجے کے لوگ رہا کرتے تھے علاوہ ازیں کچھ کمرے تھیٹر کے مالک نے اپنے ایکٹروں کے رہنے کے لئے کرائے پر لے رکھے تھے۔ اس ایکٹرس کو جو دو کمرے دیے گئے وہ ہمارے مکان کے بالکل سامنے تھے، اور خاص کر وہ کمرہ تو جس میں وہ سویا کرتی تھی۔ میرے اس چھوٹے سے کمرے کے عین مقابل تھا جو والد نے مجھے لکھنے

پڑھنے کے لئے دے رکھا تھا۔ اس کا کمرہ روشنی کے لحاظ سے ایسے رخ پر تھا کہ باوجود اس چق کے جو ہر وقت اس کے دروازے پر پڑی رہتی تھی، مجھے کمرے کی ایک ایک چیز صاف دکھائی دیتی تھی۔ چنانچہ میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے اسے دن رات دیکھا کرتا۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، سنگھار کرتے، کھانا کھاتے۔ کبھی کبھی میں اپنے کمرے کی کھڑکی بند کر لیتا تاکہ اس کے شیشوں میں سے اسے اور زیادہ آزادی کے ساتھ دیکھ سکوں۔

میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ والد کی کاروباری مصروفیتیں انھیں دن بھر گھر سے باہر رکھتیں۔ والدہ کا وقت زیادہ تر باورچی خانے میں کٹتا۔ کھانا پکانے سے فرصت ملتی تو سینا پرونا لے بیٹھتیں۔ غرض گھر میں مجھے اس تاک جھانک سے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔

وہ ایک دبلی پتلی نازنین سی عورت تھی۔ پتلی بائی کا نام اس پر خوب پھبتا تھا۔ قد کسی قدر لمبا۔ بال، سیاہی میں سنہرا پن لئے ہوئے جو اس کی کمر تک پہنچتے تھے۔ بلور کی طرح صاف و شفاف جسم۔ چہرہ کندن کی طرح دمکتا ہوا، ماتھے پر سرخ بندی، تیکھی تیکھی سی آنکھیں جنھیں کاجل سے لمبا لمبا کیا جاتا اور جو مصر قدیم کی عورتوں کی آنکھوں کی یاد دلاتی تھیں۔ ہاتھ پاؤں میں مہندی رچی ہوئی۔ حرکات میں ایک تھکی تھکی سی کیفیت۔ صبح کو جس وقت وہ انگڑائی لیتی ہوئی پلنگ سے اٹھتی تو اس کی لمبی لمبی لچکتی ہوئی بانہوں میں شاخوں کی سی ادا پیدا ہو جاتی۔

اس کا شب خوابی کا لباس بس باریک ململ کی ایک سفید دھوتی تھا جسے وہ بے پروائی سے اپنے گرد لپیٹے رکھتی اور جس میں سے اس کے جسم کے خطوط و خم کی ساری رعنائیاں پھوٹی پڑتی تھیں۔ اسے پھولوں کا بہت شوق تھا۔ میں نے اس کی سنگھار میز کسی روز بھی پھولوں کے گلدستے سے خالی نہیں دیکھی۔ کبھی کبھی اس کی خواب گاہ کی کسی دیوار کی کھونٹی پر بھی پھولوں کا ہار ٹنگا ہوا نظر آتا۔ وہ خود بھی اپنے جسم کو پھولوں کے طرح طرح کے گہنوں سے آراستہ کیا کرتی۔ چنانچہ صبح کو اس کے بستر پر، گلے میں، کانوں میں، کلائیوں پر، جوڑے میں پھول ہی پھول دکھائی دیتے۔ رات بھر میں وہ باسی ہو جاتے، اور صبح کو وہ انھیں نوچ نوچ کے پھینک دیتی۔ یہ وہ پھول تھے جو ہر روز رات کو اس کے مداح اسٹیج پر اس پر نچھاور کیا کرتے تھے۔

میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ایک حیرت کے عالم میں اس کی کیفیت دیکھا کرتا۔ گھنٹوں دیکھتے رہنے پر بھی سیری نہ ہوتی۔ خاص کر اتوار کو جب مجھے اسکول سے چھٹی ہوتی۔ تو میں اسکول کے کام کے بہانے سارے دن اپنے کمرے میں پڑا رہتا اور اس کو مختلف کیفیتوں میں دیکھا کرتا۔ اور

دنوں میں جب مجھے طوعاً و کرہاً اسکول جانا پڑتا وہاں بھی میرا وقت اسی کے خیال میں کٹتا۔ تنگ آ کر میری بے خیالی اور سبق سے عدم توجہی پر استاد میری سرزنش کر چکے تھے۔ چنانچہ مجھ کو بڑی کوشش کے ساتھ اپنا دھیان کتاب کی طرف لگانا پڑتا۔ مگر جیسے ہی اسکول سے چھٹی ہوتی، بھاگا بھاگا گھر پہنچتا۔ اور سب سے پہلے اپنے کمرے میں پہنچ کے اپنی محبوبہ پر ایک نظر ڈالتا۔ وہ عموماً اس وقت تک ریہرسل سے آ چکی ہوتی اور غسل کر کے سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اپنے لمبے سیاہی مائل سنہرے بالوں میں کنگھی کر رہی ہوتی۔

کبھی کبھی وہ آئینے کے سامنے بیٹھی خود اپنے حسن کا مشاہدہ کرنے میں محو ہوتی۔ وہ اپنے جسم کو گھما پھرا کے مختلف زاویوں سے اس پر ناقدانہ نظریں ڈالتی۔ ایسے میں میں چپکے سے اپنے کمرے کے دروازے میں اندر سے کنڈی لگا لیتا۔ اور اس کے ساتھ ہی کھڑکی کے پٹ بھی بند کر دیتا کہ اسے شبہ تک نہ ہو کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اور چپکے چپکے کھڑکی کے شیشے میں سے اسے دیکھتا رہتا۔ اس کا یہ انداز مجھے ان قدیم یونانی مرمریں مجسموں کی یاد دلایا کرتا، جنھیں میں نے اپنے شہر کے عجائب خانے میں دیکھا تھا۔

اس کے ساتھ کوئی مرد نہ تھا۔ بس ایک بوڑھی ماما تھی جو اوپر کا کام بھی کرتی اور ہنڈیا بھی پکاتی تھی۔ یہ کام وہ دوسرے کمرے میں انجام دیتی۔ اور میری محبوبہ زیادہ تر اپنی خوابگاہ ہی میں رہا کرتی۔ اس سے کوئی ملنے نہیں آتا تھا۔ البتہ کسی کسی شام تھیٹر کا مالک موٹر لے کے نیچے آ جاتا اور ہارن بجاتا۔ وہ پہلے ہی سے تیار ہوتی اور اس کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کے سیر کو چلی جاتی۔ ایسے موقعوں پر میں اس سے پہلے ہی گلی سے باہر سڑک پر پہنچ جایا کرتا تاکہ قریب سے اس کو ایک نظر دیکھ سکوں اس سے آنکھیں چار کرنے کی مجھے کبھی جرأت نہیں ہوئی۔ میں ہمیشہ اسے چھپ چھپ کے یا صرف اس وقت گھورا کرتا۔ جب وہ میری طرف نہ دیکھ رہی ہوتی۔

میرے والد پرانے خیال کے آدمی تھے اور تھیٹر تماشے کو برا جانتے تھے۔ میں کبھی یہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ مجھے تھیٹر جانے کی اجازت مل جائے گی۔ اس لئے اپنی محبوبہ کو اسٹیج پر دیکھنے کی حسرت میرے دل ہی میں رہتی۔ البتہ میں اس کی آواز برابر سنا کرتا۔ اس کے لئے مجھے راتوں کو جاگنا پڑتا۔ پچھلے پہر جب سب سو جاتے تو رات کے سناٹے میں اس کی آواز تھیٹر سے ہمارے گھر تک صاف سنائی دیا کرتی اور میں اس کے سریلے نغموں کو سن سن کے میٹھے سپنوں میں کھو جاتا۔

دن پر دن گذرتے گئے۔ اور میرا عشق بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں روز بروز دبلا ہوتا گیا۔ میرے چہرے کا رنگ زرد رہنے لگا۔ آنکھوں کے نیچے گڑھے پڑ گئے۔ میں ہر وقت سہما سہما سا

رہتا۔ کسی سے آنکھ ملا کے بات کرنے کی مجھے جرأت نہ ہوتی۔ شاید ڈر تھا کہ کہیں میری آنکھیں میرے دل کا راز فاش نہ کر دیں۔

میرے ماں باپ نے میری یہ حالت دیکھی تو سخت فکرمند ہوئے والد مجھے ایک حکیم صاحب کے پاس لے گئے۔ وہ حضرت دیر تک میری نبض دیکھا کئے۔ مگر انہیں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ مجھے کیا مرض ہے فرمانے لگے ”لڑکا پڑھنے میں بہت محنت کرتا ہے۔ اسے خشکی ہو گئی ہے۔“ اور انھوں نے کئی قسم کی مرغن غذائیں میرے لئے تجویز کیں۔ میرے لئے گھر کا معمولی کھانا بھی زہر تھا۔ ان غذاؤں سے رغبت کیونکر پیدا ہوتی۔ چنانچہ والدہ کے سخت اصرار پر دو چار نوالے حلق سے اتار کے ہاتھ کھینچ لیتا۔

یہ تو گھر کا حال تھا۔ اسکول میں مجھے اور بھی مشکل پیش آتی۔ وہاں میری تندرستی کی تو کسی کو فکر نہ تھی۔ البتہ تعلیم کی طرف سے بے پروائی کسی طرح بھی برداشت نہ کی جا سکتی تھی۔ اور میری یہ کیفیت تھی کہ مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ استاد پڑھا کیا رہے ہیں وہ مجھے سزائیں دے دے کے تھک گئے تھے انہیں حیرت تھی کہ جس کو وہ ہونہار سمجھ رہے تھے اچانک ایسا غبی کیونکر ہو گیا۔

گھر آ کر جب میں کھڑکی میں سے اپنی محبوبہ کو دیکھتا تو خوشی کی ایک لہر میرے سارے جسم میں دوڑ جاتی اور میں دن بھر کی تکلیفیں بھول جاتا۔

ایک دن مجھے اسکول سے جلدی چھٹی مل گئی، مجھے خوب یاد ہے۔ یہ بڑا سہانا دن تھا۔ کئی روز کی مسلسل گرمی اور دھوپ کے بعد آسمان پر ابر چھایا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ میرے ساتھی تو گیند بلا اور فٹ بال لے کر خوشی خوشی کھیل کے میدان کی طرف چلے اور میں نے گھر کی راہ لی۔ جلد جلد مکان کی سیڑھیاں چڑھ کے اپنے کمرے میں پہنچا۔ کھڑکی سے جھانکا تھا کہ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میری محبوبہ جن دو کمروں میں رہتی تھی وہ خالی پڑے تھے۔ چقیں اتار لی گئی تھیں۔ اور کھلے دروازوں کے کواڑ ہوا سے ہل رہے تھے۔ میں دوڑ کر نیچے گلی میں پہنچا اور بازار کی طرف گیا۔ جدھر تھیٹر کا دروازہ تھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ تھیٹر کے پردے اور ساز و سامان چھکڑوں پر لادا جا رہا ہے۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ کمپنی کا ایک ملازم لڑکا اسباب لدوا رہا تھا میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا۔

”یہ کمپنی کہاں جا رہی ہے؟“

”دوسرے شہر کو“ اس نے جواب دیا۔

”وہاں سے کب واپس آئے گی؟“

"واپس نہیں آئے گی، وہاں سے کسی اور شہر کو چلی جائے گی۔"

"کیا یہاں پھر کبھی نہیں آئے گی؟"

"کیا پتہ۔ شاید پانچ چھ برس کے بعد پھر آ جائے۔"

یہ سن کر مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ اس لڑکے کو میری حالت پر اچنبھا ہوا۔ وہ مجھ سے کچھ پوچھنے کو ہی تھا کہ میں جلد ہی سنبھل کر وہاں سے بھاگ آیا۔

یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔ میں گرتا پڑتا گھر پہنچا۔ میں نے بے جان سا ہو کے اپنے کو پلنگ پر پٹخ دیا۔ نہ جانے کب تک میں بے حس پڑا رہا۔ جب ہوش آیا تو میرا جسم تنور کی طرح تپ رہا تھا۔ کئی دن تک میری یہی کیفیت رہی۔ والد نے میرے علاج معالجے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ نئے دن نئے نئے ڈاکٹر حکیم مجھے دیکھنے آتے۔ والدہ دیر دیر تک سجدے میں پڑی میری صحت یابی کے لئے دعائیں مانگا کرتیں۔ اور طرح طرح کی منتیں مانتیں۔ آخر خدا نے مجھے شفا دی اور میں کوئی دو مہینے کے بعد بستر سے اٹھ بیٹھا۔

ان ہی دنوں ایسا اتفاق ہوا کہ والد کو اپنا کاروبار کسی دوسرے شہر میں منتقل کرنا پڑا چنانچہ ہم سب ان کے ساتھ اس شہر کو خیرباد کہہ کر وہاں چلے گئے۔ اور اس طرح تبدیلی آب و ہوا سے میں رفتہ رفتہ بالکل اچھا ہو گیا۔

اس کے بعد جو دس برس گزرے ان میں میں نے پتلی باجی کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اس عرصے میں میں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی۔ اور والد کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹانے لگا اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے اپنے لڑکپن کے عشق کو فراموش کر دیا تھا یا اس عورت کی یاد میرے دل سے محو ہو گئی تھی۔ میں اب بھی درد محبت کی اس خلش کو محسوس کرتا تھا۔ میں اب بھی اکثر اس کے تصور سے دل بہلایا کرتا تھا۔ البتہ اب میرے دل کو صبر آ گیا تھا۔ اور اس کی یاد لذت بخش تھی۔

جب میری عمر پچیس برس کی ہوئی۔ تو والد نے اپنے ایک عزیز دوست کی صاحبزادی سے جو علاوہ قبول صورت ہونے کے پڑھی لکھی بھی تھی، میرے رشتے کی بات ٹھہرائی۔ مجھے شادی کی کچھ ایسی خواہش نہ تھی۔ مگر والدین کی خوشی کے آگے میں نے سر جھکا دیا۔ شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جب شادی میں ایک مہینہ رہ گیا تو میں نے والد سے کہا کہ میں گرمیوں کے دو ہفتے اپنے ایک دوست کے پاس پہاڑ پر گزارنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کسی قدر تامل کے بعد مجھے اجازت دے دی۔ دراصل میں تاہل کے رشتے میں جکڑے جانے سے پہلے اپنی آزادی کے آخری دن فراغت سے گزارنا چاہتا تھا۔

وہ پہاڑی اسٹیشن جہاں میں اپنے دوست کے ہاں مہمان ٹھہرا تھا اپنے پورے شباب پر تھا۔ موسم اتنا اچھا تھا کہ پچھلے کئی برس میں دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ چنانچہ چاروں طرف سے مخلوق ٹوٹ پڑی تھی۔ کوئی پورے سیزن کے لئے، کوئی دو مہینے کے لئے اور کوئی ہفتے ہی بھر کے لئے چلا آیا تھا۔ تمام ہوٹل اور مکان سیلانیوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ ان میں زیادہ تر مرفہ الحال لوگ تھے جو نشاط اور تفریح کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔ ان کی بیٹیاں چست لباس پہن کر گھوڑے کی سواری کرتیں۔ لڑکے جوا کھیلتے۔ بیویاں شادی سے پہلے کے معاشقوں کے ہیروؤں کو جن کے جذبات سرد پڑ چکے ہوتے، رام کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ میک اپ کرتیں اور ان سے طرح طرح کے کام نکلوانے میں جٹی مصروف رہتیں اور شوہر کلب میں اپنی جوانی کے پرانے دوستوں کے ساتھ مل کر دل کھول کر پیتے اور ایک دوسرے کو فحش لطیفے سناتے رہتے۔ جوان لڑکوں اور لڑکیوں سے کہیں زیادہ ادھیڑ عمر والوں کے رومان چلتے، اور شادی بیاہ کے مرحلے طے ہوتے۔

میرا میزبان ایک عیال دار اور کاروباری شخص تھا۔ اس کو اپنے ہی جھمیلوں سے فرصت نہ تھی کہ میری طرف توجہ کرتا۔ چنانچہ اس نے مجھے خوشی اجازت دے دی تھی کہ جہاں چاہوں جاؤں اور جب چاہوں آؤں۔ اگر کھانے کے وقت پر آ جاؤں تو خیر ورنہ میرا انتظار نہ کیا جائے۔ اس طرح مجھے اس مقام پر آزادی سے گھومنے پھرنے کا خوب موقع مل گیا اور میں نے دس بارہ روز ہی میں خوب سیر و تفریح کر لی۔

ایک دن سہ پہر کو میں ایک لمبی سڑک پر، جو ایک اونچے پہاڑ کے گرد اگرد تقریباً ہموار چلی گئی تھی چلا جا رہا تھا کہ سامنے سے دو عورتوں کو آتے دیکھا۔ یوں تو اس سڑک پر ایک سے ایک فیشن ایبل عورت نظر آتی تھی مگر ان کا انداز مختلف تھا۔ ان کے سنگھار اور لباس میں بھڑک کم اور سادگی زیادہ تھی وہ ہلکے رنگوں کی ساڑیاں پہنے ہوئے تھیں۔ ایک ہی نظر میں میں نے اپنے بچپن کی محبوب تھیٹر کی ایکٹرس پتلی باجی کو پہچان لیا۔ ہر چند وہ اب ادھیڑ عمر ہو گئی تھی اور جسم میں کسی قدر بھاری بھرکم پن بھی آ گیا تھا۔ مگر سنگھار اور چست لباس نے ابھی تک اسے جوان بنائے رکھا تھا۔ اس کا حسن آج بھی ویسا ہی نظر فریب تھا جیسا کہ چودہ برس پہلے میں نے دیکھا تھا۔ بال ویسے ہی سیاہی میں تہرا پن لئے ہوئے، چہرہ پہلے سے زیادہ دمکتا ہوا۔ وہی نشیلی نشیلی سی آنکھیں جو مجھے بے خود بنا دیا کرتی تھیں۔ پھولوں سے اس کا شوق بدستور قائم معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ ڈیلیا کا ایک سیاہی مائل سرخ پھول اس کے جوڑے کی زینت تھا۔

اس کو دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا۔ اور پھر جلد ہی میرے دل میں اپنے لڑکپن کا خوابیدہ جذبۂ عشق ایک طوفان کی طرح امنڈنے لگا۔ اب میں لڑکا نہیں تھا۔ بلکہ چھبیس برس کا ایک پورا جوان تھا۔ میرے احساسات اب مبہم نہیں رہے تھے۔ بلکہ واضح اور زیادہ ابھرے ہوئے تھے۔ اب میں اچھی طرح سمجھنے لگا تھا کہ ایک مرد جب کسی عورت سے محبت کرتا ہے تو اس سے کیا چاہتا ہے۔

چنگی بائی کے ساتھ جو نوجوان لڑکی تھی وہ بھی حسن و جمال میں اس سے کسی طرح کم نہ تھی۔ بلکہ شباب نے اس کے حسن کو کچھ زیادہ ہی شاداب بنا دیا تھا۔ لیکن مجھ کو اس کے حسن و شباب سے کیا غرض تھی میری نظریں تو اپنی محبوبہ کے پیارے پیارے چہرے ہی پر گڑی ہوئی تھیں۔

ذرا سی دیر میں وہ دونوں میرے سامنے سے گزر گئیں۔ میں پلٹا۔ اور میرے قدم مجھے بے اختیار ان کے پیچھے پیچھے لے گئے۔ تقدیر نے یوں غیر متوقع طور پر مجھے اس کے دیدار کا جو موقع دیا تھا۔ میں چاہتا تھا اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں۔ اس کو جی بھر کے دیکھ لوں۔ پھر کون جانے کب دیکھنا نصیب ہو۔ ممکن ہے کہ شادی کے بعد میں اس کے خیال تک کو گناہ سمجھنے لگوں۔ لیکن ابھی تک تو میں آزاد تھا۔

وہ دیر تک اس سڑک پر چہل قدمی کرتی رہیں۔ میں بھی ان سے تھوڑی دور رہ کر ان کا تعاقب کرتا رہا۔ جب کبھی وہ سورج اور بادلوں یا نیچے پھیلی ہوئی وادی کا نظارہ کرنے ٹھہر جاتیں تو میں بھی رک جاتا لیکن اس طرح کہ میری بیگانگی کا بھرم قائم رہے۔ کبھی کبھی وہ سڑک کے کنارے زمین پر لگی ہوئی کسی دکان پر چیزیں دیکھنے ٹھہر جاتیں تو میں ان سے آگے بڑھ جاتا۔ مگر تھوڑی ہی دور جا کر لوٹ آتا۔ اس طرح مجھے اپنی محبوبہ کا چہرہ اچھی طرح دیکھنے کا موقع مل جاتا۔

غروب آفتاب کے بعد وہ سیر سے لوٹیں۔ اور تھوڑی دیر میں ایک متوسط درجے کے فیشن ایبل ہوٹل میں پہنچ گئیں۔ میں دل میں بہت خوش تھا کہ میں نے ان کی قیام گاہ کا پتہ لگا لیا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ چاہتا بھی نہ تھا۔ نہ مجھے اس کے حالات معلوم کرنے کی خواہش تھی نہ یہ جاننے کی کہ وہ تھیٹر یا فلم کمپنی میں کام کرتی ہے یا اس پیشے سے الگ ہو گئی ہے۔ میں تو فقط اس کی صورت کا دیوانہ تھا جیسے کسی کو آرٹ کی کوئی تصویر عزیز ہو۔

اگلے روز دیوانگی مجھے کشاں کشاں اس ہوٹل کی طرف لے گئی۔ کوئی دو گھنٹے کے عرصے کے دوران میں میں نے اس ہوٹل کے بیسیوں چکر کاٹ ڈالے ہوں گے۔ وہ دونوں پھر نمودار ہوئیں آج انہوں نے اور ہی رنگوں کی ساڑیاں پہن رکھی تھیں۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پھر تعاقب

کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور اس وقت تک پیچھا نہ چھوڑا جب تک انہیں واپس ہوٹل میں نہ پہنچا دیا۔

تیسرے دن جو اس پہاڑ پر میرے قیام کا آخری دن تھا میری بے قراری کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی، اور میں نے صبح ہی سے ہوٹل کا طواف شروع کر دیا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب وہ نمودار ہوئیں اور کوئی گھنٹہ بھر تک دکانوں میں خرید و فروخت کرنے کے بعد وہ پھر ہوٹل میں پہنچ گئیں۔ میرے دل نے وہاں سے جانا گوارا نہ کیا اور میں نے وہ دن اسی ہوٹل کے پاس گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

سہ پہر کو چار بجے وہ پھر ہوٹل سے نکلیں۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک کے چور ہو گیا تھا۔ مگر اپنی محبوبہ کو دیکھنا تھا کہ اچانک مجھ میں پھر چستی و توانائی پیدا ہو گئی۔ چونکہ اسے دیکھنے کا یہ آخری موقع تھا اور میرا دل اس کے قرب کا متمنی تھا۔ اس لئے میں نے ساری احتیاطیں بالائے طاق رکھ کے ان کے قریب قریب ہو کے چلنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔۔ شام ہو چکی تھی۔ ہم ایک چھوٹی سی بل کھاتی ہوئی سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ نیچے میلوں تک وادی پھیلی ہوئی تھی جس پر دھند کی چادر گہری ہونی شروع ہو گئی تھی۔ دیودار کے اونچے اونچے درختوں کے لامتناہی سلسلے سڑک کے کنارے سے شروع ہو کے نیچے کھڈوں میں دور دور تک چلے گئے تھے۔ مغرب میں سرمئی بادل شفق کے لالہ زار پر چھائے جا رہے تھے۔ اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔ اور لوگوں کی آمد و رفت کم ہو چلی تھی۔ ہوا نرم اور سبک تھی۔ میں ایک نشے کے سے عالم میں بڑھا چلا جا رہا تھا۔ اس وقت میرے اور ان کے درمیان پانچ سات قدم ہی کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

اچانک ایک موڑ پر پہنچ کے چنگی بائی پیچھے مڑی اور مجھے گھورنے لگی۔ میرے قدم وہیں جم کے رہ گئے اور اتنی ہمت نہ ہوئی کہ ان کے پاس سے گزر جاؤں۔ وہ نہایت غصے میں تھی اس کی آنکھوں سے قہر و غضب برس رہا تھا۔ اس نے بلند آواز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے گویا وہ اسٹیج پر ایکٹ کر رہی ہو مجھ سے کہا:

"بدمعاش تو میری بیٹی کا پیچھا کرنے سے باز نہیں آئے گا۔ میں تجھے پولیس کے حوالے کر دوں گی۔"

مجھے چکر آ گیا۔ اگر میں جلدی سے ایک درخت کی ٹہنی کو نہ تھام لیتا تو میرا کھڈ میں گر پڑنا یقینی تھا۔ خدا معلوم وہ لوگ کب اور کدھر چلے گئے خدا معلوم میں کب اور کس راستے سے اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ لیکن وہ دن اور آج کا دن اپنے بچپن کے اس رومان کی یاد سے جی بہلانے کی میرے دل میں پھر کبھی خواہش پیدا نہ ہوئی۔

مکرجی بابو کی ڈائری

کئی روز کی مسلسل مصروفیتوں کے بعد وریا انشیا نمک کمپنی کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر مکرجی بابو کو فراغت کی ایک شام نصیب ہوئی تو انہوں نے سوچا کہ اسے یونہی نہیں گنوانا چاہئے۔ لندن کی ایک تنگ اور پر پیچ گلی میں جو پکاڈلی سرکس سے زیادہ دور نہ تھی، ایک پرانے مکان کی چوتھی منزل پر ان کا ایک چھوٹا سا دفتر تھا۔ دفتر کیا تھا ایک مختصر سا نیم خنک روم تھا۔ جس کو دو تین چھوٹی چھوٹی میزوں، کرسیوں، ٹائپ رائٹر، میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون اور فائلوں کی کثرت نے جنہیں کمرے کے کونوں میں سلیقے اور بڑی ترتیب سے چنا گیا تھا، اچھا خاصا کاروباری رنگ دے دیا تھا۔

مکرجی بابو آج دفتر میں اکیلے ہی تھے، کیونکہ ڈائریکٹر پچھلے روز پیرس کے ہفتہ بھر کے دورے پر چلا گیا تھا۔ اور سوئس ٹائپسٹ لڑکی نے، جس کا کام دفتر کی دیکھ بھال اور جھاڑ پونچھ بھی تھا، دانت کے درد کی وجہ سے چھٹی لے لی تھی۔ چنانچہ وہ خود کو بہت آزاد محسوس کر رہے تھے۔

مکرجی بابو کو لندن آئے پندرہ برس سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ باپ نے انجنیری کی تعلیم کے لئے بھیجا تھا۔ مگر تعلیم ختم نہ ہوئی تھی کہ جنگ چھڑ گئی۔ انہوں نے انجنیری کو تو خیر باد کہا اور اے۔ آر۔ پی میں بھرتی ہو گئے۔ اسی دوران میں باپ کا انتقال ہو گیا۔ بڑے مکرجی نے کچھ زیادہ جائداد نہیں چھوڑی تھی اور حقدار کئی تھے۔ چار تو بیٹے ہی تھے چنانچہ انہوں نے

وطن کو لوٹنا زیادہ سود مند نہ سمجھا۔ اور روزی کمانے کے لئے یہیں ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ شروع شروع میں انہوں نے کئی دھندے کئے مگر کام نہ چلا۔ آخر ایک ہم وطن بھائی کے ساتھ مل کر ایک کمپنی کھول لی۔ اس کام میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ مگر وہ خود درآمد و برآمد کے چکر میں ایسے پھنسے کہ یہیں کے ہو کے رہ گئے۔

مکرجی بابو خاصے بھاری بھرکم خوش وضع آدمی تھے۔ ٹھنڈے ملک میں عرصہ دراز کی بود و باش سے ان کا سانولا رنگ نکھر آیا تھا۔ چالیس کے لگ بھگ عمر تھی۔ کن پٹیوں پر بالوں نے سفید ہونا شروع کر دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود چہرے پر نوجوانوں کی سی شادابی تھی۔ آنکھیں دائمی مسکراہٹ لئے ہوئے۔ انہوں نے مغربی اطوار و مسائل کا مطالعہ نفسیات کے ایک طالب علم کی طرح کیا تھا۔ اور وہ انگریزوں کے مزاج کو خوب سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے میل جول میں ایک کاروباری بے لاگ پن بھی ہوتا تھا۔ ان ہی خصوصیات کی وجہ سے لندن کے نچلے متوسط طبقوں میں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔

مکرجی بابو نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی۔ گرجا گھر کی نوکیلی چوٹی کے پیچھے نیلا سا آسمان نظر آ رہا تھا۔ یہ جولائی کی ایک نہایت گرم سہ پہر تھی صبح کو سورج خاصا تیزی سے چمکا تھا۔ مگر یاوہ بجتے بجتے بادل گھر آئے تھے، جو اب چھٹنے شروع ہو گئے تھے۔ غرض موسم کی طرف سے زیادہ اندیشہ نہ تھا اور ایک دلچسپ شام گذارنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔

لندن میں سینما، تھیٹر اور ناچ رنگ کی محفلوں کو چھوڑ کر تفریحات کے بیسیوں اور ذریعے ہیں، جو ندرت، رومان، لذت پرستی اور مہنگائی کے مختلف درجے رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض بہت گراں ہیں اور خطرناک نتائج کے حامل بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً نے فیری کی کسی کلب کو رونق بخشنا اور کسی پری کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کرنا اور بعض بالکل معصوم جن پر کچھ بھی خرچ نہیں آتا۔ مثلاً ٹرافالگر سکوائر میں کبوتروں کو دانہ کھلانا یا ہیں بھیڑ بھڑکے کے وقت خود کو لندن کی ٹیوب کے ہجوم میں گم کر دینا۔ مکرجی بابو کا تفریح کا طریق اوروں سے کسی قدر مختلف تھا۔ وہ پہلے کسی ہم صحبت سے ملاقات کی ٹھہراتے اور پھر باقی پروگرام اس کی مرضی پر چھوڑ دیتے تھے۔ چنانچہ آج بھی انہوں نے اسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔

انہوں نے میز کی دراز سے ایک پرانی، سیاہ جلد والی کتاب نما ڈائری نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ ڈائری کے کنارے پر انگریزی کے حروف تہجی مرقوم تھے اور ان ہی کے مطابق

دو مختلف جزوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس پندرہ سال کے عرصے میں جو انہوں نے لندن اور اس کے گرد و نواح میں گذارا تھا۔ ان کی ملاقات طبقہ اناث کی جن جن دل چسپ ہستیوں سے ہوئی تھی، وہ ان کا نام، پتا، ٹیلی فون نمبر، ابتدائی ملاقات کا حال اور کئی اور ضروری اور کارآمد باتیں اس ڈائری میں درج کرتے گئے تھے۔ یہ ڈائری ان کی برسوں کی رفیق تھی اور ہر قسم کی تفریحی مہمات میں مشعلِ ہدایت کا کام دیتی تھی۔

مکرجی بابو کو اے کے جزو میں سب سے پہلے جو نام نظر آیا وہ تھا ایڈمز مس پیٹریشیا ایڈمز۔ اس کے ذیل میں پتہ اور ٹیلیفون نمبر کے بعد یہ باتیں بطور یادداشت لکھی تھیں

سکاٹ لینڈ کی رہنے والی عمر ستائیس برس۔ ریڈ کراس کے دفتر میں سکریٹری۔

روپہلے بال، لمبا قد، دانت خراب، وعدے کی پابند، صرف شیری پیتی ہے۔ پہلی ملاقات کوئنز کورٹ میں۔

دو گھنٹے کی تفریح میں جس میں ہندوستانی کھانا شامل ہے۔ کل خرچ تین پونڈ۔

مکرجی بابو نے ٹیلی فون اٹھایا۔

"کیا میں مس ایڈمز سے بات کر سکتا ہوں؟...... شکریہ۔ ...... ہیلو پیٹ، کہو کیسی ہو؟ مدت سے ملاقات نہیں ہوئی، کہو چوٹ کا کیا حال ہے۔ کونسی چوٹ؟ ارے بھول گئیں۔ اس دن سرپینٹائن میں کشتی چلاتے چوٹ آ گئی تھی نا ہاتھ میں!...... اب یاد آیا۔ اچھی ہو گئی، مجھے سن کر خوشی ہوئی۔ کہو آج شام فارغ ہو؟...... نہیں!...... ارے یہ کیوں؟ ...... سر میں درد ہے۔ پھر تو آج کی شام میں نے سوچا تھا ہم اکٹھے شام گذاریں گے، کھانا بھی ساتھ ہی کھائیں گے۔ خیر نہیں تو نہ سہی ...... کیا کہا...... کل آ سکتی ہو، لیکن کل شاید مجھے فرصت نہ ہو۔ بہرحال ٹیلی فون کر لینا...... ہاں موسم برا نہیں، بادل چھٹ رہے ہیں۔ اچھا خدا حافظ پیٹ!"

اس کے بعد انہیں ایمی ایڈورڈز، شیلا آرچرڈ، ربیکا ہنگسن کے نام نظر آئے مگر انہوں نے درخور اعتنا نہ سمجھا اور ورق الٹتے چلے گئے۔

بی کے جزو میں ان کی نظر مس مارجری بلس پر پڑی اور وہیں اٹک کر رہ گئی

عمر اکیس برس۔ قومیت خالص انگریز۔ برٹش میوزیم میں ملازم ہے۔ وہیں پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

سیاہ چمکدار بال، خوب صورت آنکھیں جو کبھی نیلی معلوم ہوتی ہیں۔ کبھی سبز [illegible]

فلم دیکھنے کا شوق۔ فلم دیکھ کر بور ہوتی رہتی ہے۔...... رات کو ایسٹ اینڈ کی سیر کی شوقین۔ کریم دہاں لوئی بالخصوص پسند کرتی ہے۔ اصرار سے جن بھی پی لیتی ہے۔ مگر بیئر ہرگز نہیں پیتی۔

عام طور پر تنگی رہتی ہے۔ جیب میں احتیاطاً پانچ پونڈ رکھنے چاہئیں۔

"ہیلو مارجری...... کہو کیسی ہو...... نہیں بتاتے......

پوچھو تو جانیں، ارے بنگی میں ہوں تمہارا مکو۔ کہو آج شام آ سکتی ہو؟...... کیا کہا نسبت ٹھہر گئی تمہاری؟ سگائی ہو گئی ارے کس کے ساتھ؟ ارے بتاؤ ہم نہیں بتائیں گے کسی کو، وہ کون خوش قسمت شخص ہے؟...... اچھا نہ سہی لیکن مبارک باد تو قبول کر لو...... شادی کے بعد مجھ سے ضرور ملنا...... ہاں صبح کو سورج نکلا تھا بڑا پیارا پیارا، پھر بادل چھا گئے۔ لو اب بادل پھر چھٹ رہے ہیں۔ اچھا مارج، خدا حافظ، بہت بہت مبارک باد......"

مکرجی بابو نے دل میں کہا "یہ بھی ٹھیک ہی رہا کہ وہ نہ آ سکی۔ کیونکہ جیب میں تو صرف تین پونڈ اور کوئی سات شلنگ ہی ہیں۔" اور انہوں نے ڈائری کے اس ورق کے کونے پر جس پر مارجری بلس کا حال مرقوم تھا۔ کاٹے کا نشان بنا دیا اور پھر ورق الٹنے میں مصروف ہو گئے۔

اگلے دو بی کے بجائے اور سی ڈی ای کے تمام ناموں کو چھوڑتے ہوئے ایف پر رکے اور میڈموزیل سیمن فے ایٹ کے نام کے نیچے یہ عبارت پڑھنے لگے:

فرانسیسی نژاد، سنہرے بال، بڑی بڑی آنکھیں، چنچل، فربہ جسم، ہنستی ہے تو گال میں گڑھا پڑ جاتا ہے۔

میڈموزیل میں ایک انگریز خاندان کے بچوں کی معلمہ ہے۔

ڈی اپ سے پیرس کے سفر میں ملاقات ہوئی تھی، اور اس نے سیب کھانے کو دیا تھا۔

فرانسیسی ادب کی تعریف کرو تو خوش ہوتی ہے۔ شیری کے ساتھ ساتھ لائٹ ایل بھی پی لیتی ہے۔ ہندوستانی سالن اور پلاؤ سے رغبت ہے۔

وقت مقررہ سے آدھ پون گھنٹہ زیادہ انتظار کراتی ہے مگر پہنچ جاتی ہے۔

خاصی مہنگی ہے۔

"ہیلو کون سیمن تم ہو۔ بھئی شکر ہے اس وقت تم گھر پر مل گئیں۔ کہو کیا کر رہی ہو آج شام؟...... کیا کہا پیرس سے بہن آئی ہے اور اس کا میاں بھی؟ تب تو تمہیں بہت مصروفیت ہو گی۔ کہو تو میں بھی آ جاؤں...... ارے تم تو پریشان ہو گئیں...... نہیں نہیں میں نے تو یونہی دل لگی سے کہا تھا، پھر کبھی سہی۔

دیکھو سورج نکل آیا۔ موسم بہت سہانا ہو رہا ہے۔ خدا حافظ۔"

اُف! دوّا سیوں کے بعد بھی کیا مجال جو مکرجی بابو کی پیشانی پر شکن تک پڑی ہو۔ جن حرفوں کے ناموں پر قسمت آزمائی کئے بغیر وہ آگے بڑھ گئے تھے اگر انہیں چھوڑ دیا جائے تو بھی ابھی ڈائری میں بے شمار نام اور باقی تھے۔

مونیکا ہیزل۔۔۔ عمر ۲۵ برس۔ ماں اطالوی، باپ انگریز۔ ناٹس برج کی ایک ملبوسات کی دکان میں ملازم ہے۔ کچھ کچھ مصوری بھی جانتی ہے۔

سیاہ بال، سیاہ چشم، بالکل مشرقی حسن کا نمونہ۔ خوش مذاق، بذلہ سنج۔ کسی بات پر اصرار نہیں کرتی۔ زیادہ خرچ نہیں کراتی۔

ٹوٹنم کورٹ روڈ کے ایک حبشی ناچ گھر میں ملاقات ہوئی تھی۔

تین سے چار تک ٹیلی فون کے قریب رہتی ہے۔

انہوں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر نمبر ملانے لگے:

"ہیلو۔۔۔۔ ہیلو بے بی، پہچانا تم نے؟ میں ہوں میں۔ اس رات اس آخری سنیما کے بعد تم اچانک کہاں گم ہو گئی تھیں؟۔۔۔۔ او ہو معاف کیجئے گا میڈم۔ کیا میں مس مونیکا ہیزل سے بات نہیں کر رہا؟ مجھے مغالطہ ہوا میڈم۔ میں سخت شرمندہ ہوں میڈم، کیا کہا آپ نے؟ مس ہیزل نے نوکری چھوڑ دی، آپ ان کی جگہ کام کرتی ہیں۔ میں اپنی غلطی پر دوبارہ معافی کا خواستگار ہوں۔ کیا فرمایا آپ نے؟ میں دلچسپ آدمی معلوم ہوتا ہوں؟ شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔۔۔۔ ہاں ہاں شاید کبھی ملاقات ہو جائے۔ خدا حافظ۔"

ٹیلی فون بند کر کے مکرجی بابو مسکرائے اور دل میں کہنے لگے۔ "مجھے ان خاتون سے آج ہی ملاقات ہو سکتی تھی۔ بس ذرا دعوت دینے کی دیر تھی۔ مگر بلا جانے بوجھے دیکھے بھالے دعوت دینا شاید ٹھیک نہ رہتا۔ ارے اس سے مونیکا کا پتہ تو پوچھ ہی لیا ہوتا! فی الحال اس نام کو خارج ہی سمجھنا چاہئے۔"

وہ حروف جے، کے اور ایل کے ناموں سے گزرتے ہوئے ایم کے جزو میں ہیلن منٹی فی کے نام کے نیچے یہ عبارت پڑھنے لگے:

عمر چھبیس برس۔ سکاٹ لینڈ کی رہنے والی۔ مارش آرچ کار زیاؤس میں خادمہ ہے۔

نیلی آنکھوں کے سوا چہرے میں اور کوئی جاذبیت نہیں مگر جسم خوب گداز ہے۔

تند خو۔ مگر شادی کی بات چیت کرو۔ تو نرم پڑ جاتی ہے۔

گھر جانے کی آرزو کا پتہ ہے بے انتہا۔ زیادہ مکمل جول خطرناک

کم خرچ بالا نشین۔ دس شلنگ بھی پاس ہوں تو شام گزاری جا سکتی ہے۔

سہ پہر کو کام سے واپس آ جاتی ہے۔ گھر پر ٹیلی فون کرنا چاہئے۔

لینڈ لیڈی سے ہوشیار۔

یہ یادداشت پڑھ کر مکرجی بابو کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ مگر آخر کار انہوں نے نمبر ملا ہی ڈالا۔

"ہیلو میڈم۔ کیا میں مس منگے ٹی سے بات کر سکتا ہوں؟ بڑی نوازش ہوگی۔ کیا فرمایا آپ نے؟ کام میں مصروف ہیں اس وقت نہیں مل سکتیں؟ خیر کوئی بات نہیں۔ میں دوبارہ ٹیلی فون کروں گا۔ آپ کو زحمت ہوئی۔ معافی چاہتا ہوں شکریہ۔ بادل چھٹ رہے ہیں، بہت بہت شکریہ!"

لینڈ لیڈی کے درشت لہجے سے نجات حاصل کر کے مکرجی بابو نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر دل میں کہنے لگے۔ "اچھا ہی ہوا وہ نہ ملی۔ ورنہ اپنی جانب سے تو میں نے خطرہ مول لینے میں کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔"

اب وہ ڈائری میں حرف این کے ناموں کی سیر کر رہے تھے۔

مس نورا ٹریک۔

عمر اٹھائیس برس۔ کیمڈن ٹاؤن کے چاکلیٹ فروش کی بیٹی۔ کاروبار میں باپ کا ہاتھ بٹاتی ہے۔

فربہ اندام۔ ایک مدت سے دوست مرد کی تلاش میں ہے۔

"ہیلو مہربانی کر کے ذرا مس نورا ٹریک سے ملوا دیجئے؟ ارے یہ تم ہی ہو۔ کہو کیا حال ہے۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک، میری راحت جان۔ میں نے آواز تو پہچان لی تھی۔ مگر ابھی ابھی ایک مغالطہ ایسا ہوا کہ مجھے محتاط ہونا پڑا۔۔۔۔ کیا کہا؟ تم خود مجھے ٹیلی فون کرنے کی سوچ رہی تھیں؟ سچ؟ پھر تو میں تمہارا شکرگزار ہوں۔ کہاں ملاقات ہو؟ پکاڈلی ٹیوب اسٹیشن پر؟ وقت عالم کے نقشے کے سامنے؟ بالکل ٹھیک! ——ہاں ہاں ٹھیک چار بجے۔ اس وقت تین بج کر پینتیس منٹ آئے ہیں، بس میں بھی ٹہلتا ٹہلتا پندرہ بیس منٹ میں وہیں پہنچ جاؤں گا۔ اور پھر ہم تم پروگرام بنائیں گے۔ واللہ سچ ہے دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ او وہ سویٹ ہارٹ تم اس مثل کو نہیں سمجھتیں۔ یہ خالص مشرقی مثل ہے۔ میں آج تمہیں اس کا مطلب سمجھاؤں گا۔ دیکھو بادل چھٹ گئے ہیں۔ پیارا پیارا سنہرا سورج پھر نکل آیا ہے۔ انتظار نہ کرانا۔۔۔۔ اچھا خدا حافظ میری جان!

اور مکرجی بابو نے وہیں ڈائری بند کر دی۔ پھر ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر وہ کرسی سے اٹھے، انتہائی عجلت سے ہیٹ، مفلر اور بارانی اٹھائی اور دفتر سے نکل پکاڈلی سرکس کو ہو لئے۔

ایک دردمند دل

آرکسٹرا نے ناچ کی ایک نئی دھن بجانی شروع کی۔ اور ناچنے والے جن میں زیادہ تعداد لندن یونیورسٹی کے شعبۂ السنۂ شرقیہ و افریقہ کے طلباء اور طالبات کی تھی۔ پھر مصروف رقص ہو گئے۔

ناچ کا یہ ہنگامہ لندن کی ایک بھیگی ہوئی سرد شام کو، یونیورسٹی کی وسیع عمارت کے ایک کمرے میں برپا تھا۔ مجمع کچھ زیادہ بڑا تو نہیں تھا، پھر بھی دنیا کے چھ براعظموں میں سے کم از کم چار کی نئی پود کی نمائندگی کرتا تھا۔ یوں تو انگریزی زبان، لباس اور آداب مجلسی نے سب کو ایک رنگ میں رنگ دیا تھا۔ مگر رنگ، خدوخال، لب و لہجہ اور چال ڈھال کے اختلافات قدم قدم پر، کبھی کھلے بندوں اور کبھی چپکے سے ان کے غیر قوم ہونے کی غمازی کر دیتے تھے۔ بعض اوقات کسی زبان کے حروف تہجی کی محض ایک مخصوص صوت متکلم کی قومیت کا راز فاش کر دینے کے لئے کافی ہوتی تھی۔

فضل نے دوبارہ اسی سنہرے بالوں والی اجنبی لڑکی سے ناچنے کی درخواست کی جس کے ساتھ وہ ایک مرتبہ پہلے بھی ناچ چکا تھا۔ لڑکی نے اس کی درخواست کو کسی قدر تامل کے بعد منظور کر لیا۔ اور وہ دونوں ناچنے والوں میں شامل ہو گئے۔

سنہرے بالوں والی لڑکی کا تامل کچھ رنگ اور قومیت کی تفریق کی بنا پر نہ تھا۔ کیونکہ اول تو یونیورسٹی کی تقریبات میں یہ چیز لندن کی عام مجلسی زندگی کی نسبت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ دوسرے اسکی

پارٹیوں میں جو تعلیم کی ایک مقررہ میعاد ختم ہونے پر دی جاتی ہیں اور جن میں لڑکیاں اور لڑکے ایک دوسرے سے بچھڑنے کے خیال سے جذباتی ہو کے کچھ زیادہ ہی اپنائیت جتلانے لگتے ہیں۔ اس کا سکوں اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ دراصل اس کے تائید کی وجہ یہ تھی کہ وہ فضل کے ساتھ رقص کر کے اس کی مہارت فن دیکھ چکی تھی اور وہ خود کو اس کے مقابلے میں کمتر پاتی تھی۔

ناچ کے چکر ایک دو تین ایک دو تین کی تال پر مزے مزے چل رہے تھے۔ سازندے کچھ زیادہ سریلے نہ تھے اور طلبا سے یہ امید بھی نہ ہو سکتی تھی کہ وہ لندن کے کسی چوٹی کے آرکسٹرا کا انتظام کریں گے۔ پھر بھی یہ لوگ نغمگی پیدا کرنے کے لئے جی توڑ کوشش کر رہے تھے۔ ان کے چہروں کی سرخی و بشاشت اور چشم و ابرو کی جنبشیں کہے دیتی تھیں کہ وہ حیا کو یوں نہیں کریں گے۔

اس سنہرے بالوں والی لڑکی نے فضل کے ساتھ رقص کرتے ہوئے بالآخر خود ہی خاموشی کو توڑا۔

"آپ تو بہت اچھا ناچتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے فن کا ساتھ نہیں دے رہی۔"

"کسرِ نفسی سے کام نہ لیجئے" فضل نے کہا "آپ بھی بہت اچھا ناچتی ہیں یہ اور بات ہے کہ آپ کے پاس ڈپلومہ ہو" اور یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔

"تو کیا آپ کے پاس ڈپلومہ ہے؟" لڑکی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"جی ہاں اور کیا۔ باقاعدہ امتحان پاس کر کے سند حاصل کی ہے" اور وہ پھر مسکرایا "مگر یہ سودا خاصا مہنگا پڑا۔ ایک گنی کے تین سبق یعنی یہ سلسلہ جاری رہا۔"

"تو کیا اپنے ملک سے آپ یہی کام سیکھنے آئے تھے؟" لڑکی نے کسی قدر حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"جی نہیں" وہ بدستور مسکراتا رہا "میں قانون پڑھتا ہوں۔ ناچ تو مجھے مجبوراً سیکھنا پڑا۔"

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں وہ کیا مجبوری تھی؟"

"جی ہاں۔ وہ بات یوں ہے پچھلی گرمیوں کی تعطیلات میں میرا ارادہ یورپ کی سیاحت کا ہو مگر افسوس والد میری رائے سے متفق نہ ہو سکے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں لندن ہی میں رہ کے زیادہ سے زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں صرف کروں۔ چنانچہ مجھے یہیں اپنے لئے دلچسپی کا سامان پیدا کرنا پڑا۔"

"مگر معاف کیجئے وہ ڈپلومے کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"یہ بات خاصی مذاق معلوم ہوتی ہے۔ اور شروع شروع میں میں خود بھی اسے مذاق ہی

تصور کرتا رہا۔ ہوا یہ ______ مگر دیکھئے یہ بات ذرا تفصیل کی محتاج ہے۔ اور ناچ ختم ہوا چاہتا ہے۔ اگر آپ کو دلچسپی ہو تو ناچ کے بعد چند لمحوں کے لئے میری میز پر آ جائیے گا۔ میں اکیلا ہی ہوں۔ میں آپ کو بتاؤں گا۔"

ناچ ختم ہوا۔ مگر سنہرے بالوں والی لڑکی فضل کی میز کی طرف نہ گئی بلکہ ایک ٹولی میں جو چھ سات یورپین اور ایشیائی لڑکوں اور لڑکیوں پر مشتمل تھی شامل ہو گئی۔

فضل اکیلا ہی کونے میں اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا اور سگرٹ سلگا کر پینے لگا۔ آرکسٹرا نے کئی اور دھنیں بجائیں۔ مگر وہ اپنی کرسی سے نہ اٹھا۔ اس دوران میں وہ لڑکی اپنی ٹولی کے نوجوانوں کے ساتھ دو تین مرتبہ ناچی۔ اس کا آخری ناچ ایک ناٹے قد کے بھاری بھرکم حبشی نوجوان کے ساتھ تھا۔ فضل دور سے اس کا یہ ناچ بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ ناچ کے ختم ہونے پر اچانک اس نے فضل کی میز کا رخ کیا اور مسکراتی ہوئی اس کے قریب آ کر کہنے لگی:

"لیجئے میں چند منٹ کے لئے اپنے دوستوں سے اجازت لے کر آ گئی ہوں اب جلدی سے اپنا قصہ بیان کر دیجئے۔"

"بہت بہت شکریہ" فضل نے کہا۔ "ابھی عرض کرتا ہوں۔ لیکن پہلے یہ پوچھنے کی اجازت دیجئے کہ آپ یہاں کس شعبے سے تعلق رکھتی ہیں؟"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے" وہ فوراً بول اٹھی "میں سٹوڈنٹ نہیں ہوں میں تو ایک لائبریری میں کام کرتی ہوں۔ البتہ میری ایک سہیلی یہاں ملائی زبان کی سٹوڈنٹ ہے اور وہی مجھے یہاں لائی ہے..... آپ بھی تو یہاں نہیں پڑھتے؟"

"جی نہیں" وہ مسکرایا "آپ ہی کی طرح میں بھی یہاں مہمان ہوں فرق یہ ہے کہ میرے دوست کو ناچ گانے سے دلچسپی نہیں۔ اسے مجبوراً اس تقریب کا ٹکٹ خریدنا پڑا۔ جو اس نے مجھے دے دیا۔"

لمحہ بھر خاموشی رہی۔

"میں آپ کو زیادہ دیر روکنا نہیں چاہتا" فضل نے کہا "لہٰذا ڈپلومے کی بات عرض کرتا ہوں۔ وہ بات دراصل کچھ بھی نہیں۔ میں ایک پرائیویٹ ڈانسنگ اسکول میں جایا کرتا تھا۔ دو تین مہینے میں جب میرا جی بھر گیا تو میں نے اس سلسلے کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر سکول کی مالکہ جو سویڈن کی رہنے والی ایک ادھیڑ عمر عورت تھی مجھ سے کہنے لگی۔ تم میں اس فن کے لئے قدرتی صلاحیت ہے۔ جو بہت کم لوگوں

میں پائی جاتی ہے۔ پھر تم نے خاصی فنی استعداد بھی پیدا کر لی ہے۔ اب اگر تم صرف چند ہفتے اور مشق کر لو تو تمہیں اس فن میں باقاعدہ ڈپلوما مل سکتا ہے۔

میں یہ سن کر بے اختیار مسکرا دیا۔ مگر اس نے اپنی متانت قائم رکھی۔

''آخر اس کا فائدہ بھی کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''اور نقصان بھی کیا ہے؟'' اس نے کہا۔

آخر میں رضامند ہو گیا۔ اس خاتون نے مجھے رقص کے کچھ خاص خاص پیچیدہ انداز سکھلائے۔ چار پانچ ہفتے بعد میرا امتحان ہوا اور سچ مچ مجھے ڈپلوما مل گیا۔''

اور یوں فضل اور روزمری کی دوستی کی ابتدا ہوئی۔ شروع شروع میں وہ ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ ملتے مگر جلد ہی تین تین چار چار مرتبہ ملنے لگے۔ وہ کبھی کسی ٹیوب سٹیشن کے باہر ملاقات کی ٹھہراتے کبھی ہائیڈ پارک میں، کبھی سرپنٹائن کے کنارے کبھی البرٹ ہال کے سامنے۔ ان چار ہی ملاقاتوں میں ولایت کی رہنے والی اس لڑکی کو اندازہ ہو گیا کہ فضل کی زندہ دلی، خوش گفتاری، امیرانہ رقص اور خوش وضعی محض اوپری صفات ہیں۔ دراصل حقیقت میں وہ ایک ذہین، سنجیدہ مزاج اور صالح نوجوان ہے جو اپنے اندر ایک درد مند دل رکھتا ہے۔ وہ چاہتا تو آسانی سے لندن کے عشق پسند اور تفریح طلب حلقوں کی آنکھ کا تارا بن سکتا تھا۔ مگر اس کی اسے کوئی تمنا نہ تھی۔ وہ ضبط کم آمیز اور خلوت پسند تھا۔ روزمری کو یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ فضل کا حلقہ احباب بہت محدود ہے۔

رفتہ رفتہ روزمری نے اس کے دل کی گہرائیوں میں اترنا شروع کیا۔ اسے معلوم ہوا کہ فضل کو قانون سے جس کی تحصیل کے لئے اس کے والدین نے اسے ولایت بھیجا تھا، کوئی رغبت نہیں ہے۔ اس نے خود ہی یہ نتیجہ نکالا کہ شروع شروع میں فضل کا سیاحت یورپ کے منصوبے بنانا اور ان میں ناکامی پر رقص کی طرف رجوع کرنا، قانون کی تعلیم سے فرار ہی کی ایک صورت تھا۔

پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ وہ اپنے دل میں اپنے وطن کی خدمت کا جو حال ہی میں غلامی سے آزاد ہوا تھا شدید جذبہ رکھتا ہے۔ وہ ان سرپھرے نوجوانوں میں سے نہیں تھا جو غیر ممالک میں جا کر خدمت وطن کے لئے عجیب و غریب منصوبے بناتے ہیں جنہیں عملی جامہ پہنانا مشکل ہوتا ہے۔ وہ کوئی سیدھا سادا ٹھوس کام کرنا چاہتا تھا۔

''روزی'' وہ کہتا'' قانون جاننا بے شک ملک کی خدمت کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن ذرا غور تو کرو۔ مجھے اس کے لئے کتنے عرصے انتظار کرنا ہو گا۔ اگر میں دن رات ایک کر کے ہر سال امتحانات

میں کامیابی حاصل کرتا رہوں تو بھی مجھے تین چار برس اور یہاں گزارنے ہوں گے۔ اور پھر امتحان پاس کر لینا ہی تو کامیابی کی نشانی نہیں ہے۔ اس کے بعد بھی سالہا سال تک سخت محنت اور دوڑ دھوپ کی ضرورت ہے۔ تب کہیں رفتہ رفتہ ناموری حاصل ہوتی ہے۔''

''تم اپنے والد کو صاف صاف کیوں نہیں لکھ دیتے؟'' روزمری نے ایک دن پوچھا۔

''کچھ فائدہ نہیں'' فضل نے کہا'' وہ بہت پرانے خیال کے آدمی ہیں جو اولاد کو اپنی مرضی سے ہانکنا چاہتے ہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ وہ حصول زر کے لئے مجھے قانون پڑھانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس پہلے ہی دولت کی فراوانی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ کسی نے ان کے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ قانون کا سیاست سے گہرا تعلق ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کا خاندان دولت کے ساتھ ساتھ سیاسی اقتدار بھی حاصل کر لے۔''

ایک دن صبح کو روزمری اس کے کمرے میں آئی تو دیکھا کہ وہ بڑے انہماک سے کچھ اخباروں کے مطالعہ میں مصروف ہے۔ یہ اخبار اس کے وطن سے آج ہی اسے موصول ہوئے تھے۔ روزمری کو دیکھتے ہی وہ اچھل پڑا۔ اور بڑے جوش و خروش سے کہنے لگا۔

''روزی جب میرے ملک کو آزادی ملی تو میں وہیں تھا۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ قومی ایثار و قربانی کا کتنا عظیم طوفان تھا جو میرے اہل وطن کے دلوں میں امنڈ رہا تھا۔ عورتیں اور مرد بوڑھے اور بچے خدمت وطن کی اس نئی لگن سے بے چین تھے۔ کالجوں کے طلبا اپنی تعلیم کے اوقات کے بعد بیلچوں سے نہریں کھودتے، ریلیں بناتے۔ مہاجروں کے لئے جھونپڑیاں تیار کرتے۔ تعطیل کے دنوں میں استادوں اور طالب علموں کی ٹولیاں دیہات کا گشت کرتیں۔ تاکہ دیہاتیوں میں جنہیں ان کے پچھلے حکمرانوں نے مصلحتاً جاہل اور ان پڑھ رکھا تھا۔ تعلیم اور حفظان صحت کا پرچار کریں۔

''غلامی اور پس ماندگی کے طویل زمانے کے باوجود میرے اہل وطن نے دنیا پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ ذہانت، فراست، شجاعت، علم و فن کسی لحاظ سے بھی اقوام عالم سے پیچھے نہیں ہیں۔ میرے ملک کی عورتوں نے اپنے چہروں سے نقاب الٹ دیے۔ قدامت پسندوں نے مخالفت کی۔ مگر وہ جرأت کے ساتھ اپنی چار دیواریوں سے باہر نکل آئیں اور للکاریں: دشمن سے جنگ پر زخمیوں کی مرہم پٹی کون کرے گا؟''

''تمہیں خبر ہے روزی میرے اہل وطن خوشی خوشی اپنے نور چشموں کو ہوابازی کے مدرسوں میں بھیج رہے ہیں۔ انہیں اس کی پرواہ نہیں ہے کہ یہ بڑے جان جوکھوں کا کام ہے؟ آزادی کے بعد میں

نے اپنی فوج کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ وہ جوان رضا کار سینہ تانے بندوقیں اٹھائے اونچی لے میں وطن کے گیت گاتے جا رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مدت کی غلامی کے بعد پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ ان کی قربانیوں کو غیر کی دولت نہیں خرید سکے گی۔

"میں نے دیکھا کہ تمام انسان یکایک ایک دوسرے کے کیسے ہمدرد بن گئے ہیں۔ غلامی کے زمانے میں میں پولیس والوں کو ہمیشہ بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا۔ رشوت خور، سفاک، بدزبان اکھڑ۔ لیکن روزمری اب میرا دل چاہا کہ بے اختیار ان سے لپٹ جاؤں۔ ان کو پیار کروں۔ کیونکہ وہ میرے وطن کے امن کے محافظ ہیں۔

"روزمری تم اندازہ کر سکتی ہو کہ آج کل میرے دل کی کیا کیفیت ہے۔ اور اگر مجھے تمہاری رفاقت اور ہمدردی نصیب نہ ہوتی تو میں یقیناً کسی شدید مرض میں مبتلا ہو گیا ہوتا۔"

روزمری ایک حیرت کے عالم میں فضل کی یہ بے ربط تقریر سن رہی تھی۔ فضل کی کیفیت یہ تھی جیسے کوئی بخار میں بہک رہا ہو۔ مگر روزمری کو اس کا ایک ایک لفظ انتہائی خلوص میں ڈوبا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے وطن کی خدمت کا اس قدر شدید جذبہ کسی شخص میں نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ماں باپ بھائی بہن سب آسودہ حال تھے اور وہ بڑے امن و عافیت کی زندگی گزار رہے تھے۔ مگر اس کا مزاج ان سب سے مختلف تھا۔ وہ طبعاً بڑی حساس، نیک دل اور منکسر لڑکی تھی جو انسانی اخوت پر ایمان رکھنے والی۔ وہ چاہتی تھی کہ دنیا میں اس کا وجود کسی مقصد کے لئے کارآمد ثابت ہو۔ یہی جذبہ اسے وطن سے جدا کر کے لندن لایا تھا۔ مگر یہاں ابھی تک اسے اس تمنا کے پورا ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے وطن کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور وہ ان لاکھوں لڑکیوں میں سے ایک ہے جو ہر روز صبح و شام لندن کی سڑکوں پر تیز تیز چلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ اس کے سنہرے بالوں کی ایک لٹ اس کی پیشانی پر آ پڑی۔ مگر وہ بدستور سوچ میں ڈوبی رہی۔

"فضل.... فضل....!" اس نے رک رک کے کہا "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہارے وطن کے کسی کام آ سکتی ہوں؟"

فضل یہ سن کے پہلے تو بھونچکا رہ گیا، پھر یکدم اچھل پڑا اور بے اختیار روزمری سے لپٹ کے اس طرح ناچنے لگا جیسے بچے ناچتے ہیں۔

اگلے روز اس نے اپنے باپ کے نام اس مضمون کا ایک تار بھیجا:

"میں اب ایک لمحہ بھی قانون پر ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں واپس آ رہا ہوں۔ نیز میں نے شادی بھی کر لی ہے۔"

جس وقت جہاز وطن پہنچا تو فضل کو یہ دیکھ کے بڑی مایوسی ہوئی کہ اس کے اقربا میں سے کوئی بھی اس کے استقبال کے لئے بندرگاہ پر نہیں آیا تھا۔ ہاں ایک پرانا نوکر جس نے فضل کو گودیوں میں کھلایا تھا موجود تھا۔ اپنے آقازادے کو دیکھ کے وہ رو پڑا۔ اور ایک خط نکال کے اسے دیا۔ اس کے والد نے لکھا تھا:

"برخوردار گھر کا رخ نہ کرنا مجھ سے اب تمہیں کچھ واسطہ نہیں رہا۔"

وہ والد کی طرف سے اسی قسم کے سلوک کی توقع کر رہا تھا۔ لیکن یہ امید نہ تھی کہ سارے کے سارے رشتہ دار اس سے برگشتہ ہو جائیں گے روزمری صورت حال کو بھانپ گئی۔ اس نے محبت سے فضل کا ہاتھ دبایا اور کہا:

"فکر نہ کرو، تمہارے ساتھ میں بھی نوکری کروں گی۔"

فضل نے اس کے سنہرے بالوں کی ایک لٹ ہاتھ میں لی۔ اسے ہلکے سے جھنجھوڑا اور مسکرا دیا۔

اس کے والد نے شروع ہی میں اس کی تعلیم اور دوسرے اخراجات کے لئے ایک گرانقدر رقم لندن کے ایک بنک میں اس کے نام جمع کرا دی تھی۔ اس میں سے دونوں کے جہاز کے کرائے کے علاوہ وطن پہنچ کے بھی دو ایک ماہ تک ان کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا خرچ نکل سکتا تھا۔ وہ روزمری کے ساتھ درمیانے درجے کے ایک انگریزی ہوٹل میں مقیم ہو گیا۔

دو چار دن میں جب سفر کی تکان اتر گئی تو اس نے ملک کے حالات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ہر چند ملک رفتہ رفتہ ترقی کر رہا تھا۔ مگر نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ لوگوں میں پہلا سا جوش و خروش نظر نہیں آتا تھا۔ اخبارات میں طالب علموں کے نہریں کھودنے اور پل بنانے کی خبریں بھی نہیں آ رہی تھیں۔ البتہ مہاجرین کا مسئلہ روز بروز سخت مشکلات پیدا کرتا جا رہا تھا جنہیں حل کرنے کی حکومت مقدور بھر کوشش کر رہی تھی۔

اگلے روز اس نے سرکاری دفاتر کے چکر لگانے شروع کئے۔ اسے بعض افسروں کے نام شناسا معلوم ہوئے اور ایک نوجوان افسر تو اس کے کالج کے زمانے کا دوست نکل آیا۔ وہ فضل سے بڑی گرمجوشی سے ملا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فضل نے اصل مقصد چھیڑا۔

"کیا سرکار مجھے کوئی کام دے سکتی ہے؟" اس نے پوچھا۔

دوست نے فوراً جواب دیا:

"گورنمنٹ کی اونچی نوکریاں تو تم جانتے ہی ہو کہ مشتہر کی جاتی ہیں اور بڑی چھان بین کے بعد پبلک سروس کمیشن کے ذریعے پر کی جاتی ہیں۔ بے فکر تو ان کی پہلے ہی افراط ہے۔ کئی عارضی محکمے اس وجہ سے ابھی تک توڑے نہ جا سکے کہ ان کے کارکنوں کا کیا حشر ہوگا۔ البتہ پرائیویٹ فرموں میں آئے دن اچھی اچھی نوکریاں نکلتی رہتی ہیں۔"

فضل نے ہوٹل میں آ کر اخبارات میں "ضرورت" کے کالموں کا بغور مطالعہ کیا۔ منیجر، اسسٹنٹ سیکرٹری، اکاؤنٹنٹ، دلچسپ صحبتوں کی آسامیوں کے اشتہار تھے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ ان میں سے کسی کا بھی تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ لڑکوں کے پڑھانے کے دو ایک اشتہار تھے، یہ کام البتہ وہ کر سکتا تھا کیونکہ اس نے کالج میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس نے ان آسامیوں کے لئے درخواستیں بھیجیں جن میں اپنے کم سے کم اخراجات کا اندازہ کر کے تنخواہ لکھی۔ مگر اسے رسید تک نہ ملی۔

ایک پرائیویٹ فرم میں انٹرویو کے لئے گیا اور خط و کتابت کا کام کرنے کا ایک حقیر سا مشاہرہ منظور کر لیا۔ مگر چند ہی روز میں اس فرم نے اسے جواب دے دیا۔ انہیں عالم فاضل نہیں چاہئے تھا بلکہ ایسا تجربہ کار جو منڈیوں کے اتار چڑھاؤ سے واقف ہو اور زیادہ سے زیادہ نفع اندوزی کے گر جانتا ہو۔ البتہ اگر وہ ٹائپ کا کام جانتا ہوتا تو کہیں نہ کہیں کھپ سکتا تھا۔ مختلف اسکولوں میں قسمت آزمائی کی لیکن کم سے کم تنخواہ پر بھی کوئی اسے لینے کو تیار نہ تھا۔ کیونکہ وہ معلمی کی کوئی سند یا تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ اخباروں کے لئے مضامین لکھے۔ مگر انہیں بلامعاوضہ بھی کسی نے قبول نہ کیا۔

اسے وطن آئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ اس کے پاس جو پونجی تھی اس کا ایک بڑا حصہ ہوٹل کے کرائے اور کھانے پینے کے بلوں کی نذر ہو چکا تھا اور وہ دن دور نہیں تھا جب اسے اپنی اور بیوی کی طلائی گھڑیوں، بروچ، کیمرے، چاندی کے سگریٹ کیس وغیرہ کے گاہکوں کی ٹوہ لگانی پڑے۔

ایک دن وہ علی الصباح اپنے کمرے سے نکل گیا۔ دوپہر ہوئی مگر وہ کھانا کھانے نہ آیا۔ اور روز مری نے اس کے انتظار میں خود بھی کھانا نہ کھایا۔ جب وہ چائے کے وقت بھی نہ پہنچا تو اس کی بیوی کو تشویش ہوئی اور اس نے ہوٹل کے منیجر اور ملازموں سے پوچھ گچھ شروع کی۔ مگر کسی نے اس کے بارے میں کوئی اطلاع بہم نہ پہنچائی۔

آخر شام کے چھ بجے کے قریب وہ لوٹا۔ مگر روز کی طرح مضمحل اور تھکا ماندہ نہیں بلکہ چہکتا کودتا

ہنستا کھلکھلاتا۔

"پیاری روز مری" اس نے کہا۔ "معاف کرنا تمہیں انتظار کی زحمت ہوئی مگر یہ جان کر تمہیں خوشی ہوگی کہ آخر کار، کام بن ہی گیا۔ میں تمہیں بتاؤں گا نہیں، بلکہ تمہیں ابھی میرے ساتھ چل کے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہوگا۔ میں نے آج ہی سارے انتظامات مکمل کر لئے ہیں۔"

اس نے ٹیکسی لی اور روز مری کو لے کر شہر کے ایک ایسے حصہ میں پہنچا، جو تھا تو بارونق مگر آبادی زیادہ گنجان نہ تھی۔ مکانوں کی بالائی منزلوں میں متوسط طبقے کے لوگ رہتے تھے۔ اور نچلے حصوں میں قریب قریب۔ ایک بازار کے نکڑ پر کھڑے ہو کر اس نے روز مری سے کہا "ذرا اوپر دیکھو۔"

وہ ایک سہ منزلہ عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔ جس کی اوپر کی منزلیں خاصی صاف ستھری تھیں البتہ نچلا حصہ رہنے والوں نے اپنے پھوہڑپن سے خراب کر دیا تھا اور پچھلی دیوار پر جڑا اس کی گئی کو اس نے اپنے ابھی تھوپ رکھے تھے۔ بالائی منزل کی پیشانی پر ایک بڑا سا نیا بورڈ آویزاں تھا جس کا روغن ابھی پورے طور پر سوکھنے نہیں پایا تھا۔ اس بورڈ پر جلی حروف میں لکھا تھا:

لندن سکول

آف

بال روم ڈانسنگ

روز مری فی الفور کھو گئی اور اس کا چہرہ یک لخت زرد پڑ گیا۔ مگر کچھ تو جھٹپٹے کی وجہ سے اور کچھ اپنی کامیابی کے نشے میں چور ہونے کے باعث فضل اس کے چہرے کے تغیر کو نہ دیکھ سکا۔

"آخر فنون لطیفہ کی خدمت بھی تو قومی خدمت ہی ہے نا!" اس نے کہا۔

دو تماشے

مرزا برجیس قدر کو میں ایک عرصے سے جانتا تھا۔ ہر چند ہماری طبیعتوں اور ہماری سماجی حیثیتوں میں بڑا فرق تھا۔ پھر بھی ہم دونوں دوست تھے۔ مرزا کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جو کسی زمانے میں بہت معزز اور متمول سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب اس کی حالت اس پرانے تناور درخت کی سی ہو گئی تھی جو اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور آخر ایک دن اچانک زمین پر آ رہتا ہے۔

مرزا کو اپنے خاندان کے اس زوال کا پورا احساس تھا۔ مگر اس کو روکنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ البتہ جہاں تک ظاہری رکھ رکھاؤ کا تعلق تھا۔ مرزا اس میں ذرا سی کوتاہی بھی نہ ہونے دیتا تھا۔ اس کے دل میں نہ جانے کیوں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ خاندان کا وقار قائم رکھنے کے لئے درشت مزاجی اور تحکم لازمی ہیں۔ اس خیال نے اسے سخت دل بنا دیا تھا۔ مگر یہ درشتی اور سختی اوپر ہی اوپر تھی اندر سے مرزا بڑا نرم تھا اور یہی ہماری دوستی کی بنا تھی۔

ایک دن سہ پہر کو میں اور مرزا برجیس قدر انارکلی میں اس کی شاندار موٹر میں بیٹھے ایک مشہور جوتے والے کی دکان سے سلیم شاہی جوتا خرید رہے تھے۔ مرزا نے اپنا ٹھاٹھ دکھانے کے لئے یہ ضروری سمجھا تھا کہ وہ موٹر میں بیٹھے بیٹھے دکان کے مالک کو پکارے اور جوتے اپنی موٹر ہی میں ملاحظہ کرے۔ شہر میں ابھی مرزا کی ساکھ قائم تھی۔ اور دکاندار عام طور پر اس کی ان اداؤں کو سہنے کے عادی

تھے۔ چنانچہ جوتے والے نے اپنے دو کارندے مرزا کی خدمت پر مامور کر دیے۔

مگر مرزا کو کوئی جوتا پسند نہیں آ رہا تھا۔ اور وہ بار بار ناک بھوں چڑھا کر ان کارندوں کو تخت و سست کہہ رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مرزا کو دراصل جوتے کی ضرورت ہی نہیں، اور یہ جھوٹ موٹ کی خریداری محض بھرم رکھنے کے لئے ہے۔

ٹھیک اس وقت ایک بڈھا بھکاری ایک پانچ سالہ لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھے مرزا کی موٹر کے پاس آ کھڑا ہوا۔ یہ بڈھا اندھا تھا۔ لڑکی کے بالوں میں تنکے الجھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا مدت سے کنگھی نہیں کی گئی۔ دونوں کے تن پر چیتھڑے لگے تھے۔

"اندھے پر ترس کھاؤ رے بابا!" بڈھے نے ہانک لگائی۔

"بابو جی میں بھوکی ہوں پیسہ دو۔" لڑکی نے لجاجت سے کہا۔

مرزا نے ان لوگوں کی طرف توجہ نہ کی۔ وہ بدستور جوتوں پر تنقید کرتا رہا۔ اندھے فقیر اور لڑکی نے اپنا سوال دہرایا۔ اس پر مرزا نے ایک غلط انداز نگاہ ان پر ڈالی۔ اور کہا:

"معاف کرو۔ معاف کرو۔"

بھکاری اب بھی نہ ٹلے۔

"بابو جی رات سے کچھ نہیں کھایا ہے۔" اندھے نے کہا۔

"بابو جی بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ پیٹ میں کچھ نہیں ہے۔ لو دیکھو۔" بچی نے کہا۔ اور جھٹ میلا کچیلا کرتا اٹھا اپنا پیٹ دکھانے لگی۔ لاغری سے بچی کی پسلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں اور گنی جا سکتی تھیں۔

"بس ایک پیسے کے چنے بابو جی۔"

مرزا کو اس لڑکی کا میلا میلا پیٹ دیکھ کر گھن سی آئی۔

"توبہ توبہ" اس نے بیزاری کے لہجہ میں کہا۔ "بھیک مانگنے کے لئے کیا کیا ڈھونگ رچائے جاتے ہیں۔ جاؤ جاؤ بابا خدا کے لئے معاف کرو۔"

مگر فقیر اب بھی نہ گئے۔ قریب تھا کہ مرزا غصے سے بھنا جاتا۔ مگر یہ تماشا اس طرح ختم ہو گیا کہ مرزا کو اس دکاندار کا کوئی جوتا پسند نہ آیا۔ اور وہ اپنی موٹر کو وہاں سے بڑھا لے گیا۔

اس واقعے کے پندرہ روز بعد میں اور مرزا برجیس قدر شہر کے ایک بڑے سنیما میں ایک دیسی فلم دیکھ رہے تھے۔ فلم بہت گھٹیا تھی۔ اس میں بڑے نقص تھے۔ مگر ہیروئن میں بڑی چٹک مٹک تھی اور وہ گاتی بھی خوب تھی۔ اس نے فلم کے بہت سے عیوب پر پردہ ڈال دیا تھا۔ کہانی بڑی دقیانوسی تھی۔ اس میں

ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ بنک کے ایک چپراسی کو اس الزام میں کہ اس نے بنک لوٹنے میں چوروں کی مدد کی، پانچ سال قید کی سزا ہو جاتی ہے۔ اس چپراسی کی بیوی مر چکی ہے۔ مگر اس کا ایک چار سالہ بیٹا ہے جو اپنی بوڑھی دادی کے پاس رہتا ہے۔ چپراسی کے قید ہو جانے پر یہ دادی پوتا بھوکوں مرنے لگتے ہیں۔ ادھر کوٹھری کا کرایہ نہ ملنے پر مالک مکان انہیں گھر سے نکال دیتا ہے۔ بڑھیا پوتے کا ہاتھ پکڑ بازار میں بھیک مانگنے لگتی ہے۔ وہ ہر راہ گیر سے کہتی ہے۔

''بابو جی ہم بھوکے ہیں۔''

''ایک پیسے کے چنے لے دو بابو جی'' لڑکا کہتا۔

جب فلم اس مقام پر پہنچی۔ تو مرزا جی نے اس قدر نے اندھیرے میں مجھ سے کہا۔

''ذرا اپنا رومال تو دینا۔ نہ جانے میرا کہاں گیا۔''

میں نے اپنا رومال دے دیا۔

جب تک تماشا ہوتا رہا۔ میں نے مرزا کو حسرت سے آنکھیں دیکھا وہ بار بار کرسی پر پہلو بدلتے۔ وہ ہاتھ پھیرتے تک نہ جاتے۔ خدا خدا کر کے فلم ختم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ جلدی جلدی اپنی آنکھیں پونچھ رہا ہے۔

''ارے! مرزا صاحب'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا ''آپ رو رہے تھے؟''

''نہیں تو'' مرزا نے بھرائی ہوئی آواز میں جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

''سگرٹ کے دھوئیں سے آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ ابھی تک یہ سوچ رہا ہوں کہ سرکار ایسے دردناک فلم دکھانے کی اجازت کیوں دیتی ہے۔''

غازی مرد

رات کو جب کبھی کتوں کے بھونکنے، یا مرغ کی بے وقت اذان سے چراغ بی بی کی نیند اچٹ جاتی۔ تو وہ دبے پاؤں اپنی کوٹھری سے نکلتی۔ اور راہ ٹٹولتی ہوئی باہر آنگن میں اپنے شوہر کی چارپائی پر آکر آہستہ سے بیٹھ جاتی۔ اور اس کے پاؤں دابنا شروع کر دیتی۔ اور پھر جب تک اسے دوبارہ نیند کے جھونکے نہ آنے لگتے۔ وہ برابر دابتی رہتی۔

علیا اس کے ہاتھوں کے گرم گرم لمس کا ایسا عادی ہو گیا تھا کہ اس سے اس کی نیند میں ذرا خلل نہ پڑتا بلکہ ایسا آرام ملتا۔ کہ وہ اور بھی بے خبر ہو کر سوتا رہتا۔ اگر کبھی وہ جاگ بھی رہا ہوتا تو چادر کے پیچھے دم سادھے پڑا رہتا۔ یہ چادر در اصل اس کا تہبند تھی، جسے وہ مچھروں سے بچنے کے لئے رات کو اوڑھ لیا کرتا تھا مگر اس سے اس کا پورا جسم نہیں ڈھکتا تھا۔ اگر سر چھپاتا تو پاؤں ننگے رہتے۔

صبح کو جب علیا بیدار ہوتا تو چراغ بی بی اس سے پہلے جاگی ہوتی اور آنگن میں وضو کرنے یا کوٹھری میں نماز پڑھنے میں مشغول ہوتی۔ وہ نماز کے الفاظ اس طرح ادا کرتی جیسے کوئی سرگوشی کر رہا ہو۔ خاص طور پر آخر کے دعائیہ فقرے علیا کو صاف سنائی دیا کرتے:

''یا پاک پروردگار! اپنے حبیب کے صدقے میں اس اندھی محتاج کے سر کے سائیں کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھ۔ یا پاک پروردگار اپنے حبیب کے صدقے اس کے سب دشمنوں کو نیچا دکھا۔ یا پاک پروردگار

اپنے بچّے کے صدقے اسے جہنم سے بچا۔ یا اے پروردگار میری دعا قبول کر کہ پہلے میں مروں۔ بعد میں وہ مرے آمین۔"

علیا چارپائی سے اٹھتا۔ بوریے کو جھاڑ پھٹک کر کمر پر باندھ لیتا۔ چادر کا پھٹا کا سن کر چراغ بی بی جلدی سے کوٹھڑی سے باہر نکلتی۔ اور بڑی لجاجت سے پوچھتی: "مجھے جانا ہے جی؟"

جس وقت علیا حاضر بھی ہوتا تو وہ اسے غائب تصور کر کے آپ ہی آپ بولتی رہتی:

"مجھے یوں بھری کو گلے سے لگایا۔ اس کا اجر اللہ اور اس کا حبیب اس کو دے گا۔ میں اندھی محتاج کس لائق ہوں۔ میں اس کا بدلہ کیا دے سکتی ہوں۔ میں تو آگ بھی نہیں جلا سکتی۔ روٹی بھی نہیں پکا سکتی۔ کپڑا بھی نہیں سی سکتی۔ کوئی گھر کا یا باہر کا کام نہیں کر سکتی۔ ہاں ایک پاؤں دابنا ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔"

چراغ بی بی گاؤں کی مسجد کے بوڑھے امام کی بیٹی تھی جس کی ماں بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ مولوی صاحب خود تو بینا تھے۔ مگر بیٹی کی آنکھیں بچپنے میں جاتی رہی تھیں۔ مولوی صاحب نے بن ماں کی بیٹی کو بڑی مصیبتوں سے پالا تھا۔ گاؤں کے سب چھوٹے بڑے ان کی عزت کرتے تھے۔ گاؤں کے سب نوجوان بلکہ ان کے باپ بھی مولوی صاحب سے کم از کم بغدادی قاعدہ ضرور پڑھ چکے تھے۔ جب امام صاحب کا آخری وقت آیا تو انہوں نے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو بلوایا۔ اور ان سے بڑی عاجزی سے کہا:

"میں اپنے پیچھے ایک یتیم بچی چھوڑے جا رہا ہوں۔ وہ کسی کی بیاہتا بننے کے لائق ہو چکی ہے۔ مگر ابھی تک اس کا بیاہ نہیں ہوا۔ اگر میرے پیچھے بھی وہ یونہی رہی تو میری روح ہمیشہ تڑپتی رہے گی۔ میں نے عمر بھر آپ لوگوں کی جو بری بھلی خدمت کی ہے۔ اس کے بدلے میں اگر میری بچی کو کہیں ٹھکانے لگا دیا جائے تو اس سے میری روح ہی خوش نہیں ہوگی بلکہ آپ لوگوں کو بھی اس کا اجر ملے گا۔ اس دنیا میں بھی۔ آخرت میں بھی۔"

اور مولوی صاحب چل بسے۔ ان کی تجہیز و تکفین کے بعد گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے یہ مسئلہ پنچایت میں پیش کیا اور خاص طور پر نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"ہے کوئی تم میں سے وہ غازی مرد۔ جو خدا ترسی کرے اور امام صاحب کے احسان کا بدلہ اتارے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ آخر ایک نوجوان کی غیرت جوش میں آئی۔ وہ تھا تو غریب زمیندار کا بیٹا

مگر اپنے من چلے پن کی وجہ سے ہر کام میں سب نوجوانوں سے آگے آگے رہتا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کارِ خیر کے لئے خود کو پیش کر دیا۔ یہ علیا تھا۔

ان بڑی بن بیاہی بیٹیوں کے باپ جو علیا کو داماد بنانے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ گم سم ہو گئے۔ وہ اپنے گاؤں کے نوجوانوں میں سے کسی ایسے شخص سے اسی قربانی کی توقع رکھتے تھے جو ان کی نظر میں سیدھا سادہ ہو۔ اور گاؤں میں اس کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ نہ کہ علیا سے جو اپنی کئی خوبیوں کی وجہ سے گاؤں بھر کے نوجوانوں میں انتخاب تھا۔ اور اس طرح چراغ بی بی علیا کے گھر میں بس گئی۔

علیا کو باپ سے ورثے میں زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ملا تھا۔ بڑی محنت سے اس پر کھیتی باڑی کرتا۔ اور جو تھوڑا بہت اناج مل جاتا اس پر صبر و شکر کر کے گزارا کرتا۔ بیوی کا کوئی خاص خرچ نہیں تھا۔ نہ اسے زیوروں اور نئے کپڑوں کی تمنا تھی۔ وہ مسجد کے حجرے میں پلی بڑھی تھی۔ روزہ نماز گویا اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ ابھی بچی ہی تھی کہ پانچوں وقت کی نماز بڑی پابندی سے ادا کرنے اور رمضان کے تیسوں روزے رکھنے لگی تھی۔ اس پر وہ نابینا بھی تھی اسے سوائے اللہ کو یاد کرنے کے اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ بہت سی دعائیں اس نے چھوٹی عمر ہی میں باپ سے سیکھی تھیں ایک دو پارے بھی اسے حفظ تھے۔ علیا کے گھر آ کر اس کے مذہبی جوش میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ بلکہ عبادت گزاری نے کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر لی۔ اس کی کوٹھڑی میں آٹھ پہر اس کا مصلیٰ بچھا رہتا۔ جس پر وہ نمازوں کے علاوہ دیر تک وظیفے بھی پڑھتی رہتی۔ اس کی کوٹھڑی سے اکثر اگر اور لوبان کی خوشبو آتی رہتی اور ساتھ ساتھ یا غفور۔ یا رحیم۔ یا غفور یا رحیم کا ورد بھی جو دھیرے دھیرے بلند ہوتا جاتا۔ ایسے میں اگر علیا گھر آتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کسی خانقاہ میں داخل ہو گیا ہو۔ وہ خود تو نماز روزے کا زیادہ قائل نہ تھا۔ مگر چراغ بی بی کے اس مذہبی ولولے کو احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیا کرتا کہ کسی پاک ہستی کے ساتھ مناکحت کے فرائض انجام دینا بھی عبادت سے کم نہیں ہے۔

علیا نے تھوڑے سے اناج اور چارے پر گاؤں کی ایک بیوہ کی لڑکی رحمتے کو ہنڈیا روٹی اور گھر کے دوسرے کاموں کے لئے رکھ لیا تھا۔ یہ لڑکی جس کی عمر دس گیارہ برس کی تھی۔ محنتی تو تھی ہی۔ مگر ساتھ شوخ اور چنچل بھی تھی دن بھر چراغ بی بی کے ساتھ اس کی خوب گزرتی۔ چراغ بی بی اس سے خدا اور رسول کی باتیں کیا کرتی۔ اور رحمتے اسے ادھر ادھر کے لطیفے اور چٹکلے اور گاؤں کی روز روز کی خبریں سناتی۔ گاؤں بھر میں صرف رحمتے ہی ایک ایسی لڑکی تھی جس سے چراغ بی بی اپنے دل کے راز کہا کرتی:

"رحمتے میرا بابا کہا کرتا تھا۔ بیٹا صبر کر۔ اللہ کا کوئی مردِ ولی آئے گا۔ ضرور آئے گا وہ تجھے خاک

سے اٹھنے لگا۔ وہ تیجے گھٹنے لگانے کو۔ بابا کا کھونگٹ ہوا۔ آخر میرا شہزادہ آ ہی گیا۔

"رحمتے وہ یوسف سے زیادہ حسین ہے۔ اس میں شہزادوں والی شان ہے۔ وہ غازی مرد ہے۔ اس نے میری خاطر گدڑی قبول کی۔ گاؤں کا نمبردار اپنی بیٹی کو اس سے بیاہنا چاہتا تھا۔ اور سیکڑوں ایکڑ زمین اس کے نام لکھنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے مجھ جیسی بھری گدڑی کی خاطر دولت کو ٹھکرا دیا۔ دھن دولت آنی جانی ہے۔ مرنے پر سارا مال و زر یہیں دھرا رہ جاتا ہے۔ اس کے اعمال انسان کے ساتھ جاتے ہیں۔" رحمتے کہتی۔

"چاگاں بی بی، اللہ کی سوں۔ چودھری علیا بڑا گھبرو جوان ہے۔ تو بڑی بھاگوں والی ہے۔ اس کے گلے میں چاندی کا تعویذ کالے دھاگے میں بندھا ہوا بڑا اچھا لگتا ہے۔"

اس پر چراغ بی بی جوش میں آ کر کہتی۔

"رحمتے۔ سارے گاؤں میں کوئی اور جوان جو گھوڑے کی سواری میں، کشتی میں، کبڈی میں اس سے بازی لے جائے۔ فصل کاٹنے میں اس کا ہاتھ اتنی تیزی سے چلتا ہے جیسے پانی میں مچھلی چلتی ہے۔ جتنی دیر میں چار جوان فصل کاٹیں اتنی دیر میں وہ اکیلا ان کے برابر کاٹ کے رکھ دیتا ہے۔ اس کے بال گھنگھریالے ہیں۔ اس کا جسم صندل ہے۔ جب میں اس کے پاؤں داب رہی ہوں تو مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ جب اکھاڑے کی مٹی اس کے جسم کو لگتی ہے تو وہ اور بھی چمکنے لگتا ہے۔"

ان باتوں کا سب سے اچھا وقت وہ ہوتا، جب رحمتے آنگن میں چولھے کے پاس بیٹھی توے پر روٹیاں ڈال رہی ہوتی۔ اور چراغ بی بی اس کے پاس ہی چوکی پر آ بیٹھتی۔ جب وہ علیا کے بعض ایسے کمالات جو ظاہر میں فطرت آنے بیان کرتی تو رحمتے بے اختیار کہہ اٹھتی "اچھا چاگاں بی بی!"

اور جب چراغ بی بی بولتے بولتے تھک جاتی تو رحمتے شروع ہوتی۔ "سنا چاگاں بی بی آج رسولاں کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ آج پھولی جیسے جو بیاہ ہو..... نمبردار کی بیٹی کریماں کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں ان دنوں۔ سنا ہے کہ شہر سے بینڈ باجے والے بلائے جا رہے ہیں..... رات معشوق دکان سے پانچ سیر تمباکو چوری ہو گیا۔"

ایک دن رحمتے روز سے ذرا جلدی آ گئی۔ وہ جوش میں بھری تھی جیسے کوئی بڑی انوکھی خبر لائی ہو۔ جیسے ہی علیا کھیت پر روانہ ہوا۔ وہ پھوٹ پڑی:

"سنا چاگاں بی بی۔ ہمارے قریب جو گاؤں ہے "دھوپ چڑھی" اس میں ایک زمیندار غفور رہتا ہے اس نے نئی شادی کی ہے۔ خود تو کمبخت ساٹھ برس کا ہے مگر دلہن سولہ سترہ برس سے زیادہ کی نہیں۔

ہے۔ سب گاؤں والے اسے برا کہہ رہے ہیں۔ مگر اس کو کسی کی پروا نہیں بلکہ اس نے سب کو جلانے کے لئے دلہن کا گھونگھٹ اٹھوا دیا اور بڑی عجیب عجیب باتیں شروع کر دیں۔

"سنا ہے اس نے دو سفید گھوڑے خریدے ہیں۔ ایک اپنے لئے ایک دلہن کے لئے ہر روز صبح کو دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر سیر کو نکلتے ہیں۔ کبھی بڈھے کو کوئی کام ہوتا ہے تو وہ گلنار کو اکیلا ہی بھیج دیتا ہے۔ سنا ہے کل گلنار اکیلی گھوڑے پر سوار سیر کرتی ہمارے گاؤں کی طرف آ نکلی۔ اس نے گاؤں والوں سے بڑی آزادی سے باتیں کیں۔ بچے ٹڈ کے اس کے سفید گھوڑے کے پیچھے ہو لئے۔ وہ سب اس کو بڑی حیرانی سے دیکھتے تھے۔ اس کا رنگ میموں کی طرح گورا ہے اور بال سنہرے ہیں۔ سنا ہے وہ بڑی خوبصورت ہے۔ اس نے ریشمی قمیص اور شلوار پہن رکھی تھی۔ اس پر بڑے بڑے گلاب کے پھول بنے تھے۔ پاؤں میں زری کی جوتی تھی۔ اس نے سرخ دوپٹے کو جس کے کناروں پر گوٹا لگا تھا۔ چھاتی پر بل دے کر گرہ سی باندھ لی تھی۔ وہ بڑی شان سے گھوڑے پر بیٹھی تھی جیسے کہیں کی رانی ہو۔ اس نے ہمارے کھیتوں کی بھی خوب سیر کی..... اور چاگاں بی بی چودھری علیا نے بھی تو اسے دیکھا تھا۔ بلکہ کچھ باتیں بھی کی تھیں۔ شاید وہ راستہ پوچھ رہی تھی۔"

"کیا کہا تو نے؟ اس نے دیکھا تھا؟ اس نے باتیں کی تھیں؟"

"ہاں چاگاں بی بی۔"

"میرے شہزادے نے؟"

"ہاں علیا چودھری نے۔ چاگاں بی بی۔"

"چل چپ رہ۔ زیادہ باتیں نہ بنا۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے میں جاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ چوکی سے اٹھی اور لڑکھڑاتی ہوئی اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔ اس دن اس نے رحمتے سے اور کوئی بات نہ کی۔

شام کو علیا کھیتوں سے واپس آیا۔ گھر پر وہ زیادہ تر خاموش ہی رہا کرتا تھا۔ مگر اس شام وہ گھر میں زیادہ چلا پھرا بھی نہیں۔ پہلے خاموشی سے چارپائی پر بیٹھ کر کھانا کھاتا رہا۔ پھر حقہ بھرا اور دیر تک پیتا رہا۔ اس عرصے میں چراغ بی بی بھی خاموش رہی۔ مگر جب علیا سونے لگا اور تہبند کو چادر کی طرح اوڑھ کر چارپائی پر لیٹ گیا تو وہ حسب معمول اس کے پاس آئی اور اس کی چارپائی پر بیٹھ کر اس کے پاؤں دابنے لگی۔ مگر ابھی چند منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ علیا نے کہا "چاگاں بس کر۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

حیا کے اس خلافِ معمول رویہ پر وہ بھونچکی رہ گئی۔ اس نے ایک دبی دبی سی آہ بھری اور پھر خاموشی سے اٹھ کر اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کی کوٹھری سے "یا غفور یا رحیم یا غفور یا رحیم" کے الفاظ سنائی دینے لگے۔ یہ وظیفہ کوئی گھنٹہ بھر جاری رہا۔ پھر چراغ بی بی ہاتھوں سے راہ ٹٹولتی اس کی چارپائی کے پاس پہنچی اور بڑی ملائمت سے اس کے پاؤں کو جو چادر سے باہر نکلے ہوئے تھے چھوا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چارپائی پر بیٹھ جائے اور معمول کی طرح اس کے پاؤں دابنا شروع کر دے۔ مگر اسے جرأت نہ ہوئی اور وہ واپس اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد کوٹھری سے پھر آواز آنے لگی جیسے کوئی سرگوشی کر رہا ہے:

"مجھ جیسوں بھری کو گلے سے لگایا۔ اس کا اللہ اور اس کا حبیب اس کو دے۔ میں اندھی اپاہج کس لائق ہوں۔ یا پاک پروردگار اپنے حبیب کے صدقے میرے سر کے سائیں کو ہمیشہ خوش رکھ۔ یا پاک پروردگار اس کے دشمنوں کو زیر کر۔ یا پاک پروردگار اسے ہر بلا سے محفوظ رکھ۔ یا پاک پروردگار اپنے حبیب کے صدقے جو کوئی اس پر حسن کا وار کرے اس کے حسن کو غارت کر۔ یا پاک پروردگار اپنے حبیب کے صدقے میری دعا قبول کر۔ یا پاک پروردگار پہلے میں مروں بعد میں وہ مرے۔ آمین۔"

دو گھنٹے بعد وہ اپنی کوٹھری سے پھر نکلی اور اس کی چارپائی کے پاس پہنچ کر اس کے پیروں کو ٹٹولنے لگی اور یہ اطمینان کر کے کہ وہ چارپائی پر بدستور چادر تانے سو رہا ہے وہ پھر اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔

ابھی کچھ کچھ رات باقی تھی کہ وہ پھر کوٹھری سے نکلی اور سائے کی طرح چلتی ہوئی حیا کی چارپائی کے قریب آئی۔ اور اپنے گرم گرم ہاتھوں سے اس کے پاؤں ملنے لگی۔ پھر اس کے پائنتی زمین پر بیٹھ گئی اور اس کے دونوں پاؤں کے تلووں کو چوما۔ حیا نے سوتے میں کروٹ بدلی۔ اور اپنی ٹانگیں سکیڑ کر چادر کے اندر کر لیا۔

جب صبح صادق نمودار ہوئی تو چراغ بی بی کی کوٹھری سے پھر آواز آنے لگی اب کے آواز میں غیر معمولی جوش تھا اور وہ معمول سے زیادہ بلند تھی۔

"اس نے مجھ اندھی جیسوں بھری کی خاطر گدائی قبول کی۔ اس نے مجھے گلے سے لگایا۔ میرا شہزادہ یوسف سے زیادہ حسین ہے۔ اس میں پیغمبروں والی شان ہے۔۔۔"

کن رس

(۱۹۶۹)

کن رس

بعض لوگوں کو گانے بجانے سے قدرتی لگاؤ ہوتا ہے۔ خود چاہے بے سرے ہی کیوں نہ ہوں مگر سریلی آواز پر جان دیتے ہیں۔ راگ ان پر جادو کا سا اثر کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ گانے بجانے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں جیسے کسی کو کوئی نشہ لگ جائے۔ صاحب ثروت ہوئے تو عمر بھر گویوں کی پرورش کرتے رہے۔ نہیں تو استادوں کی جوتیاں سیدھی کر کے ہی اپنے ذوق کی تسکین کر لی۔ دراصل ان ہی لوگوں کے لئے موسیقی روح کی غذا کے مصداق ہوتی ہے۔ گانے بجانے والوں کی اصطلاح میں ایسے لوگوں کو 'کن رسیا' کہتے ہیں۔

فیاض کو بھی قدرت کی طرف سے موسیقی کا کچھ ایسا ہی ذوق عطا ہوا تھا۔ مگر بدقسمتی سے ایک تو وہ پیدا ہی ایک غریب اشٹام نویس کے گھر ہوا۔ دوسرے اس کا باپ بڑا سخت گیر اور پابند صوم و صلوٰۃ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فیاض کا یہ ذوق پنپنے نہ پایا۔ پھر بھی اس نے بچپن سے لے کر جوانی تک جیسے تیسے موسیقی سے اپنی دلی وابستگی قائم رکھی۔

جب اسکول میں پڑھتا تھا تو کبھی کبھی اسے بھی حمد گانے کو کہا جاتا۔ وہ بھی عجب سماں ہوتا تھا۔ سب لڑکے قطاریں باندھے کھڑے ہیں اور فیاض ان کے سامنے کھڑا حمد کا ایک ایک مصرعہ گا رہا ہے۔ جسے سارے لڑکے کورس کی صورت میں دہراتے جاتے ہیں۔ قوالی اور سماع کی محفلوں میں بھی وہ

بچپن ہی سے شریک ہونے لگا تھا کیونکہ باپ ان میں جانے کی اجازت دے دیتا بشرطیکہ وہ پڑوس ہی میں کہیں منعقد ہوتیں۔ کبھی کبھی وہ ان براتوں کے ساتھ بھی ہو لیتا جن کے آگے آگے بینڈ باجا جاتا۔ اور ڈھولکیا زرق برق وردی پر شیر کی کھال پہنے طرح طرح کے کرتبوں سے ڈھول بجاتا جو اس نے گلے میں لٹکا رکھا ہوتا۔ وہ جو سڑک کی پٹڑی پر کسی ہنڈے کے پیچھے میاں مکھی سی چادر بچھا ہارمونیم کھول بیٹھ جاتا ہے۔ اور بیوی ڈھولک ٹھنکنے لگے وہاں گھونگھٹ کے اندر سے کراری کوئل کی سی آواز سے الاپنے لگتی ہے ان کا گانا بھی فیاض بڑی محویت سے سنا کرتا۔ ایسے موقع پر اس کی تمنا ہوتی کہ میں بھی کوئی سستا سا ہارمونیم خرید لوں۔ اور گھر میں گانے کی مشق کیا کروں۔ مگر وہ جانتا تھا کہ باپ کے جیتے جی یہ ارمان پورا ہونا محال ہے۔

طالب علمی ہی کے زمانے میں ایک بار جب اس کے باپ کو کسی ضروری کام سے کسی دوسرے شہر جانا پڑا تھا تو فیاض کا ایک دوست ایک رات اسے تھیٹر دکھانے لے گیا۔ یہ پارسیوں کی کوئی مشہور کمپنی تھی جس میں نامی گرامی ایکٹر اور گویے ملازم تھے۔ کھیل بھی ایسا تھا کہ اس میں شروع سے آخر تک گانا ہی گانا تھا۔ فیاض تمام وقت مبہوت ہو کر سنتا رہا۔ اور پھر برسوں اسے اپنے کانوں میں ان نغموں کی گونج سنائی دیتی رہی۔

فیاض نے اسکول کی تعلیم ختم کی تو باپ نے تنگدستی کے باوجود اسے کالج میں داخل کرا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکا جتنی زیادہ تعلیم حاصل کرے گا اتنی ہی اچھی اسے نوکری مل جائے گی۔ کالج میں فیاض نے خود کو زیادہ آزاد محسوس کیا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ باپ کی نظروں سے اوجھل رہ کر اسے کالج کی "بزم موسیقی" میں اپنے ذوق کی تسکین کا سامان نظر آنے لگا تھا۔

باپ کا قاعدہ تھا کہ رات کو جب تک فیاض بستر پر لیٹ نہ جاتا وہ خود بھی آرام نہ کرتا تھا۔ اور پھر رات کو وہ ایک بار اٹھ کر بیٹے کے پلنگ کے پاس ضرور جاتا۔ ایک دفعہ پچھلے پہر اس نے فیاض کو نیند میں بڑبڑاتے سنا۔ وہ اٹھ کر بیٹے کے پلنگ کے پاس گیا۔ فیاض کی زبان سے بے خبری میں عجیب عجیب الفاظ نکل رہے تھے۔ کچھ انگریزی کے کچھ اردو کے۔ بیچ بیچ میں وہ کبھی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتا کبھی کراہ اٹھتا۔ باپ بڑے تعجب کے ساتھ یہ کیفیت دیکھتا رہا۔ رات بھر وہ طرح طرح کے اندیشوں میں گھلتا رہا۔ اگلے ہی روز اس نے بیٹے کے لئے موزوں رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر تھوڑے ہی دنوں میں ایک اپنے سے بھی غریب گھر کی مگر شکل صورت کی اچھی لڑکی منتخب کر کے فیاض کی شادی کر دی۔ اور یوں بیٹے کی آوارگی کے امکانات کا بڑی حد تک سد باب کر دیا۔

کالج میں فیاض کا تیسرا سال تھا کہ اچانک باپ کا انتقال ہو گیا۔ ماں اس سے ایک برس پہلے ہی سدھار چکی تھی۔ چنانچہ اب فیاض آزاد تھا۔ مگر یہ آزادی اپنے ساتھ کئی ذمہ داریاں لے کر آئی تھی۔ سب سے اہم مسئلہ اپنی اور اصغری کی جو ایک بچی کی ماں بن چکی تھی، گزر اوقات کا تھا۔ کیونکہ باپ اپنے پیچھے نہ تو کوئی جائیداد ہی چھوڑ مرا تھا اور نہ کچھ روپیہ پیسہ ہی۔ چنانچہ اگلے روز اس نے کالج کے بجائے دفتروں کا رخ کیا اور نوکری کی تلاش شروع کردی۔ اسے اپنی بیوی اور بچی سے بڑی الفت تھی چنانچہ ان کی خاطر اس نے ادنیٰ سے ادنیٰ محنت مزدوری کو بھی اپنے لئے عار نہ جانا۔ جیسے تیسے ان کا پیٹ پالتا رہا۔ آخر مہینوں سڑکوں کی خاک چھانے اور دفتروں میں دھکے کھانے کے بعد اسے آبکاری کے محکمے میں ایک کلرک کی جگہ عارضی طور پر مل گئی۔

اس نے دن رات کی محنت اور اپنی قابلیت سے جلد ہی اس دفتر میں اپنے لئے مستقل جگہ پیدا کرلی۔ اس کے بعد سے اپنی آمدنی بڑھانے کی فکر ہوئی کیونکہ دوسری بچی کی پیدائش کے ساتھ ہی گھر کے اخراجات بڑھ گئے تھے۔ چنانچہ وہ دن کو دفتر میں کام کرتا اور رات کو گھروں پر جا کر لڑکوں کو پڑھاتا اور اس طرح بڑی مشکل سے گھر کا خرچ چلاتا۔

اس زمانے میں اس کا ذوق موسیقی فائلوں کے انبار اور تنگی خرچ کے اندراجات میں گم ہو کے خواب و خیال ہو گیا تھا۔ پھر بھی کسی رات پچھلے پہر کے سناٹے میں اگر وہ جاگ رہا ہوتا اور کوئی تانگے والا سنسان سڑک پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سریلی اور پاٹ دار آواز میں کوئی ٹپہ گیت گاتا ہوا نکل جاتا تو اس کے دل میں ہوک سی اٹھنے لگتی۔

رفتہ رفتہ اس کی حالت سنبھلتی گئی۔ یہاں تک کہ دس سال کے عرصہ میں وہ اپنی لیاقت، محنت اور خوش اخلاقی کے باعث اسی دفتر میں ہیڈ کلرک بن گیا۔ سب افسران کے کام سے خوش تھے اور وہ بھی اپنی حالت پر مطمئن تھا۔ اسے جو مشاہرہ ملتا وہ اس کے اور بیوی بچوں کے گزارے کے لئے کافی تھا اور اب اسے دوسرے کے بچوں کو ان کے گھر پر جا جا کر پڑھانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔

جب سے اسے ہیڈ کلرکی ملی تھی اس کا کام خاصا بڑھ گیا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ جب سب لوگ دفتر سے چلے جاتے تو وہ تنہائی میں اپنے ماتحت کلرکوں کے کام کا محاسبہ اور حسابات کی جانچ پڑتال کیا کرتا۔ اس طرح اسے دفتر میں دو ڈھائی گھنٹے زیادہ گزارنے پڑتے مگر اس کی دل جمعی ہو جاتی۔ وہ چراغ جلنے سے پہلے شاذ ہی دفتر سے اٹھتا۔ دفتر سے نکل کر وہ اس باغ کا راستہ لیتا جو فصیل کے ساتھ ساتھ شہر کے گرد اگرد چلا گیا تھا۔ اس کا گھر شہر کے اندر ایک تنگ اور گنجان آباد محلے میں تھا۔ باغ سے

ہو کر گھر پہنچنے میں اسے ایک آدھ میل زیادہ چلنا پڑتا۔ پھر بھی وہ اسے شہر کے پر شور بازاروں اور تنگ گلیوں والے راستے پر ترجیح دیتا۔

وہ باغ کی کشادہ سڑک پر جس پر سرخ بجری بچھی تھی اور جس پر ہر قسم کی گاڑیوں کے چلنے کی ممانعت تھی، مزے مزے سے قدم اٹھاتا خاصی دیر میں گھر پہنچا کرتا۔ اس ہوا خوری سے اس کے دن بھر کے تھکے ہوئے دماغ کو آسودگی حاصل ہوتی۔ اور جس وقت وہ گھر پہنچتا تو خاصا تازہ دم ہوتا۔ اس کے بیوی بچے ملازمت کے ابتدائی زمانے ہی سے اس کے دیر سے گھر پہنچنے کے عادی ہو چکے تھے۔

ایک دفعہ ہفتے کی ایک شام کو وہ معمول سے بھی کچھ زیادہ ہی دیر میں دفتر سے نکلا۔ یہ گلابی جاڑوں کے دن تھے۔ ابر چھایا ہوا تھا اور اکا دکا بوند بھی اس کے منہ پر آ پڑتی تھی۔ وہ حسب عادت باغ کی سڑک پر جھومتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ سڑک کے کنارے کنارے تھوڑے فاصلے پر بجلی کے کھمبے تھے، جن کی روشنیوں کی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ خم کھاتی ہوئی دور سے بڑی بھلی معلوم دیتی تھی۔

فیاض اپنی دھن میں مست چلا جا رہا تھا کہ اچانک اس کے کان میں کسی ساز کے بجنے کی دھیمی دھیمی آواز پڑنی شروع ہوئی۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا آواز زیادہ واضح ہوتی گئی۔ آخر جب وہ قریب پہنچا تو اس نے بجلی کے ہنڈے کی روشنی میں دیکھا کہ سڑک کے قریب ہی باغ کے گوشے میں ایک درخت کے نیچے کوئی شخص فقیروں جیسی گدڑی اوڑھے سرکاری بنچ پر اکڑوں بیٹھا ایک بڑا سا ساز بجا رہا ہے۔

اس موسیقی میں بلا کا سوز تھا۔ لگتا تھا کہ بے اختیار دل میں اترا جاتا تھا۔ رات کی خاموشی میں ایک ایک سر واضح اور الگ الگ سنائی دے رہا تھا۔ فیاض کے قدم خود بخود رک گئے۔ اور وہ سازندے پر نظریں جمائے ایک محویت کے عالم میں اس موسیقی کو سننے لگا۔

سازندہ آنکھیں بند کئے اس امر سے بے نیاز کہ کوئی اس کے فن پر دھیان دے رہا ہے یا نہیں، بڑے انہماک کے ساتھ ساز بجا رہا تھا۔ اس کی انگلیاں تھمنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ وہ کبھی اس تار پر دوڑتیں کبھی اس تار پر۔ دوسرے ہاتھ سے وہ تاروں پر ضربیں لگا رہا تھا اس قدر تیزی کے ساتھ کہ فضا میں ایک مسلسل ارتعاش کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ عجب سماں بندھا ہوا تھا۔

فیاض کے دل و دماغ پر اس موسیقی کا کچھ ایسا اثر پڑا کہ پہلے تو اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ اعصاب ڈھیلے پڑنے شروع ہوئے اور نقاہت سی محسوس ہونے لگی۔ پھر ایک آنسو اس کی آنکھ سے بے اختیار ٹپک پڑا۔

فیاض کی زندگی کے پچھلے دس گیارہ سال ایسے سپاٹ گذرے تھے کہ ان میں موسیقی یا کسی اور فن لطیف کا کچھ دخل نہ رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا مقصد فقط عزت و آبرو کی روزی کمانا اور بچوں کی پرورش کرنا قرار دے لیا تھا اور وہ یہ فرض بڑی مسرت کے ساتھ انجام دے رہا تھا۔ اور اگر اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی رہ جاتی تھی تو اصغری سے اس کی والہانہ گرویدگی اس کو پورا کر دیتی تھی مگر اب اس موسیقی کو سن کر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل کے اندر کوئی سوئی ہوئی چیز دفعتاً جاگ اٹھی ہو۔

کچھ دیر کے بعد سازندے نے ساز بجانا بند کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی فیاض کو ایسا محسوس ہوا کہ جس طلسم نے اسے مسحور کر رکھا تھا وہ ٹوٹ گیا۔ اور اب وہ چاہے تو جا سکتا ہے۔ مگر اتنے ہی میں سازندے نے آنکھیں کھول دیں اور پہلی مرتبہ سڑک پر اپنے واحد سامع کو دیکھا۔ پھر اس خیال سے کہ کہیں وہ چل نہ دے۔ اس نے جلدی سے ہانک لگائی:

"بابو جی کی خیر ہو۔ مل جائے کوئی دھیلی پاولا فقیر کو نئے پانی کے لئے۔"

فیاض کے قدم رک گئے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جس میں اتفاق سے اس وقت صرف ایک دونی ہی تھی۔ ایسے صاحب کمال کو ایسا حقیر نذرانہ پیش کرتے ہوئے اسے بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ آخر اس نے سازندے کی طرف بڑھتے ہوئے ہمت کر کے کہا۔ "استاد۔ اس وقت تو یہی قبول کرو۔ ہاں اگر کھانا کھانا ہو تو میرے ساتھ چلے چلو۔ میرا گھر یہاں سے قریب ہی ہے۔"

سازندے نے لمحہ بھر تامل کیا۔ ساز بجاتے بجاتے تھک بھی گیا تھا اور اسے بھوک بھی لگی تھی۔ ایسے میں گھر کا پکا پکایا گرم گرم کھانا مل جائے تو کیا برا تھا!

"چلتا ہوں بابو جی۔ اللہ تمہاری خیر رکھے۔"

اور وہ ساز بغل میں دبا گدڑی سنبھال بیچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور فیاض کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ لمبے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ ادھیڑ عمر۔ سر پر لمبی سی ترکی ٹوپی جو بہت میلی ہو گئی تھی اور جس کا پھندنا ٹوٹ چکا تھا۔ لمبے لمبے پٹے جن میں گھاس پھوس کے تنکے الجھے ہوئے تھے۔ کھچڑی داڑھی جو کئی روز سے منڈائی نہیں گئی تھی۔ آنکھیں سرخ سرخ گویا دکھنے آئی ہوں۔ ان میں سے پانی رستا ہوا۔ اس کا لباس جو کرتے پاجامے اور کالی واسکٹ پر مشتمل تھا نہایت بوسیدہ اور میلا تھا۔ پاؤں میں ٹوٹا ہوا جوتا جو اس کے پاؤں کے ناپ سے بڑا تھا۔ اور اسے جوتے کو گھسیٹ گھسیٹ کر چلنا پڑتا۔ پیٹھ میں تھوڑا سا کب۔ جو شاید جھک کر ساز بجانے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔

"یہ باجا جو تم بجاتے ہو اس کو کیا کہتے ہیں؟" فیاض نے چلتے چلتے پوچھا۔

"اس کو سرود کہتے ہیں تمہاری خیر رہے بابو جی۔"

"سرود!"

"جی ہاں، سرود۔"

"بہت کمال کا بجاتے ہو استاد تم تو۔"

"اجی کمال تو بس اللہ کی ذات کو حاصل ہے بابو جی۔"

"میں نے آج تک اتنا اچھا ساز بجاتے کسی کو نہیں سنا۔"

"کرم ہے کلیر والے بابا کا۔ میں کس لائق ہوں بابو جی۔"

"مجھے تو آج تک خبر ہی نہ تھی کہ موسیقی میں اس قدر دلکشی ہوتی ہے۔"

"اجی کیا پوچھتے ہو بابو جی۔ ایک مرتبہ اس کی چیٹک لگ جائے تو پھر عمر بھر چھٹکارا مشکل ہے۔ مجھی کو دیکھو۔ فقیروں سے بدتر حال ہے۔ جیتے جی کا جنجال ہو گئی ہے۔"

"کب سے یہ ساز بجا رہے ہو استاد؟"

"کوئی چالیس برس کا ریاض ہے بابو جی۔ چار برس کا تھا جب بجانا شروع کیا تھا۔ باوا نے چھوٹا سا بنوا کے دیا تھا کھیلنے کو۔ کیونکہ میں ان کا سرود بجانے کے لئے بہت مچلا کرتا تھا۔ میں اپنے اس کھلونے سے کھیلتا رہتا۔ اور اپنے کبھی ٹوں ٹاں بھی کر لیا کرتا۔"

"ایک دن کیا ہوا اللہ تمہاری خیر رکھے بابو جی، کہ صبح ہی صبح استاد دلدار خاں مرحوم باوا سے ملنے گھر پر آئے۔ استاد دلدار خاں مرحوم کے سرود کی ساری خدائی میں دھوم تھی۔ مگر اللہ بخشے بیچاروں کی الٹے ہاتھ کی کلائی پر بجلی کا پاٹ گر پڑا تھا۔ اور ہاتھ بیکار ہو گیا تھا۔ خود بجانے سے معذور ہو گئے تھے۔ بس سکھلایا کرتے تھے۔ وہ بھی رجواڑوں میں۔ باوا سے ان کا بڑا یارانہ تھا۔"

"ہاں تو بابو جی، وہ دونوں آنگن میں چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اور میں ان سے ذرا ہٹ کے زمین پر اپنے اسی کھلونے سے کھیل رہا تھا۔ ایکا ایکی استاد دلدار خاں باوا کی بات کاٹ کر چلا اٹھے:

"اے میاں ذرا سننا یہ لونڈا کیا بجا رہا ہے؟"

"لو بابو جی، مولا تمہاری خیر رکھے، دونوں نے سنا تو میں یمن کری کی گت بجا رہا تھا۔ باوا نے کلام مجید اٹھا لیا کہ میں نے بچے کو بتایا ہو تو اسی کی مار پڑے۔ بلکہ میں نے تو اس کے ساز کے کبھی تار بھی ملا کے نہیں دیے۔ اس پر استاد دلدار خاں مرحوم باوا سے کہنے لگے، میاں یہ لونڈا تو تم مجھے دے

وہ۔ دیکھو میرا ہاتھ بیٹھ گیا ہے۔ دل میں بہت سی حسرتیں رہ گئی ہیں۔ اب میری جگہ یہ لونڈا دنیا کو بتائے گا کہ دلدار خان کیا چیز تھا۔"

"لو بابو جی، مولا تمہاری خیر رکھے، بڑی چہل پہل ہوتی۔ آخر یار اماں گئے۔ کیونکہ مجھ سے بڑے دو بیٹے اور تھے ان کے۔ استاد مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔ بس اس دن سے میں ان کی خدمت میں رہنے لگا۔ چلموں پر آگ رکھتے رکھتے چٹکیاں جل جل گئیں۔ چار چوٹ کی مار مارا کرتے تھے بابو جی مجھے۔ آج جو چار آدمیوں میں میری واہ واہ ہوتی ہے استاد دلدار خاں کی جوتیوں کا ہی صدقہ ہے بابو جی۔"

فیاض نے بڑی دلچسپی سے یہ قصہ سنا۔ جب ختم ہوا تو دونوں کچھ دیر چپ چاپ چلتے رہے۔

"تمہارا نام کیا ہے بابو جی؟" اچانک سرودے نے سوال کیا۔

"مجھے فیاض کہتے ہیں"

"طبیعت کے بھی ماشاءاللہ فیاض ہو۔ اسم با مسمیٰ۔ اور کام کیا کرتے ہو بابو جی؟"

"میں ایک دفتر میں ملازم ہوں۔"

"تنخواہ کیا ملتی ہے تمہیں بابو جی؟"

"کچھ زیادہ نہیں۔ مگر شکر ہے، گزارا ہو جاتا ہے۔"

"پھر بھی کتنی؟"

"یہی کوئی ڈیڑھ سو۔"

"اور بچے کتنے ہیں۔ ماشاءاللہ سے تمہارے؟"

"دو"

"لڑکے یا لڑکیاں؟"

"لڑکیاں۔"

یہ سن کر سرودے کی زبان سے ایک مہمل سا کلمہ نکلا۔ پھر وہ کہنے لگا:

"خیر جیتی رہیں۔ اللہ کی دین ہے اور بابو جی........؟"

فیاض اس کے ان تابڑ توڑ سوالوں کا جواب دیتے دیتے زچ ہو گیا۔ اس نے اس سلسلے کو روکنے کے لئے خود بھی یہی حربہ استعمال کرنے کی سوچی اور خود اس سے سوال کرنے شروع کر دیئے۔ اسے معلوم ہوا کہ سرودے کا نام حیدری خاں ہے۔ وہ یار خاں کا چھوٹا بھائی ہے۔ جو کسی مہاراجہ کے دربار

میں "پان سے" روپے پر ملازم ہے۔ ایک بڑا بھائی اور تھا۔ وہ بھی کسی رجواڑے میں ملازم تھا مگر کسی نے دشمنی سے اسے زہر دے کر مار ڈالا۔ اپنی بدمزاجی کی وجہ سے اس کی اپنے گھرانے میں کسی سے نہیں بنتی۔ وہ کسی کا دست نگر ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اس کی طبیعت میں آزادی اور فقیری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا گھر گھاٹ ہے نہ جورو جاتا۔

جس وقت وہ دونوں باغ سے نکل فصیل کی ایک گلی سے شہر کے اندر داخل ہوئے تو رات کے کوئی دس بجے کا عمل ہوگا۔ فیاض حیدری خاں کے آگے آگے چلتا راستہ دکھاتا دو تین گلیوں سے گزر کر آخر اسے اپنے بالاخانے کے نیچے لے آیا۔

"استاد تم ذرا یہاں گلی میں ٹھہرو۔" اس نے کہا۔ "میں اوپر جا کر پردہ کرا دوں۔"

"بہت دیر نہ لگانا بابو جی اللہ تمہاری خیر رکھے۔"

فیاض سیڑھیاں چڑھ کر مکان میں پہنچا۔ اس کی بیٹیاں تو سو گئی تھیں مگر اصغری حسب معمول اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ فیاض نے مختصر الفاظ میں اسے حیدری خاں سے ملنے اور اپنے ساتھ لانے کا حال سنایا اور تاکید کی کہ جلدی سے کھانا گرم کر لو۔ پھر وہ لالٹین لے کر نیچے گیا اور حیدری خاں کو اوپر بیٹھک میں لے آیا۔ اس گھر میں باورچی خانہ کے علاوہ دو کمرے تھے۔ ایک بڑا جس میں وہ، اس کی بیوی اور لڑکیاں سویا کرتیں۔ دوسرا کچھ چھوٹا جو سیڑھیاں چڑھتے ہی سامنے پڑتا۔ اور بیٹھک کا کام دیتا۔ فیاض اکثر وہاں بیٹھ کر دفتر کا کام کیا کرتا۔ اس میں ایک پرانی دری بچھی تھی۔ ایک چھوٹی سی میز، دو کرسیاں اور کتابوں کی ایک الماری تھی۔

حیدری خاں نے سرودے کو بہت احتیاط سے کمرے کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ خود دری پر بیٹھ گیا اور گردن پھرا پھرا کر گھر کا جائزہ لینے لگا۔

"کیا کرایہ دیتے ہو بابو جی اس کا؟" اس نے پھر سلسلہ سوالات شروع کیا۔

"پندرہ روپے"

"اوہو اتنے سے مکان کے پندرہ روپے! بہت کرایہ دیتے ہو تم تو بابو جی۔ بجلی بھی تو نہیں ہے اس میں۔"

اس کی چندھی آنکھیں چمنی کے اس پرانے لیمپ پر جمی ہوئی تھیں جو تپائی پر رکھا ہوا تھا اور جس کی چمنی کچھ کچھ دھواں دے رہی تھی۔

"ہاں استاد کرایہ تو کچھ زیادہ ہی ہے۔" فیاض نے کہا۔ "پر کیا کروں مدت سے یہیں رہتا

ہوں۔ اس گلے میں ہی تنگ کیا ہے۔"

ایک لمحہ خاموشی رہی۔ پھر حیدری کہنے لگا:

"لے اب بابو جی جلدی سے کھانا لے آؤ۔ اللہ تمہاری خیر رکھے۔"

چند منٹ کے بعد اس کے سامنے دری پر ایک چھوٹا سا دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا گیا۔ کھانا تو معمولی سا تھا مگر پکانے والی نے اپنے سلیقے سے پکایا تھا کہ حیدری خاں کی زبان چٹخارے لینے لگی۔

"خوب پیٹ بھر کر کھاؤ استاد" اور یہ کہہ کر فیاض نے اپنے حصے کا سالن بھی جو وہ اندر سے اٹھا لایا تھا اس کے سامنے رکھ دیا۔ حیدری خاں کے سرود کا ابھی تک اس کے دل و دماغ پر ایسا اثر تھا کہ اسے کھانے کی ذرا اشتہا نہ تھی۔

"بس بس بابو جی" حیدری خاں نے کہا۔ "فقیر کا تو بس دو نوالوں ہی میں پیٹ بھر جاتا ہے۔ لے اب بس چائے اور پلوا دو۔ اللہ تمہاری خیر رکھے۔"

"چائے ابھی آتی ہے۔ میں نے کیتلی چولہے پر رکھوا دی ہے۔"

برتن بڑھا دیے گئے اور فیاض حیدری خاں کے پاس ہی دری پر بیٹھ گیا اور بڑی اشتیاق بھری نظروں سے اس کے سرود کو دیکھنے لگا۔ حیدری خاں اس کے اشتیاق کو بھانپ گیا۔ وہ کونے سے اپنا ساز اٹھا لایا اور فیاض کی طرف بڑھا کر کہنے لگا:

"او شوق سے دیکھو بابو جی۔ ایسا ساز بھی تم نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ یہ میرے استاد دلدار خاں مرحوم (کان کی لو چھو کر) کی نشانی ہے۔ کئی سرودیوں نے سینکڑوں روپے کا لالچ دے کر مجھ سے یہ سرود خریدنا چاہا مگر میں نے ان کے روپے پر لات مار دی۔ میری تو جان ہے اس میں بابو جی جیسے پریوں کی کہانی میں جن کی جان طوطے میں تھی۔ مجھے کوئی لاکھ روپیہ دے تب بھی میں اس سرود کو اپنے سے جدا نہ کروں۔"

فیاض نے سرود کو اپنی گود میں رکھ لیا۔ اچھا تو یہی وہ طلسمی ساز ہے جس سے ایسے سُر نکلتے ہیں اور بڑے غور سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی عجیب ہی بناوٹ، اس کی درجنوں کھونٹیاں، اس کا بڑا سا ڈھانچہ جس پر کھال منڈھی تھی، اس کی سینگ کی بنی ہوئی گھوڑی جس پر سارے تار کسے تھے۔ غرض ہر چیز اس کے لیے عجوبہ تھی۔

"اس کو بجاتے کس طرح ہیں بھلا؟" فیاض بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

"او میں تمہیں بتاتا ہوں بابو جی" حیدری خاں نے کہا۔ "پہلے یوں آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاؤ جیسے

میں بیٹھا ہوں۔ اور سرود کو یوں اپنے آگے رکھ لو۔ یہ لو جوا۔ اس کو دہنے ہاتھ کی انگلیوں میں یوں پکڑ لو اور اس طرح تار پر ضرب لگاؤ۔"

فیاض نے ایسا ہی کیا۔ ایک پھیکی سی آواز نکلی۔

"پھر ضرب لگاؤ۔"

اب کے آواز کچھ بہتر تھی۔

"شاباش! بس یوں ہی ضربیں لگاتے رہو۔ لو اب بایاں ہاتھ سرود کے نیچے سے نکال لو۔ یوں۔ اب چھنگلی انگلی سے یوں اس تار کو دباؤ۔ اور دہنے ہاتھ سے ضرب لگاؤ۔ دیکھا ایک نئی آواز پیدا ہوئی۔"

سبق یہیں تک پہنچا تھا کہ دوسرے کمرے سے کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔

"خاں صاحب ذرا سرود کو تھامنا میں چائے لے آؤں۔"

چائے پینے کے بعد موسیقی کی تعلیم پھر شروع ہو گئی۔ حیدری خاں نے فیاض سے کھرج، رکھب، گندھار اور مدھم یہ چار سُر سرود پر نکلوائے۔ اس وقت فیاض کی یہ کیفیت تھی کہ فرطِ شوق سے اس کا بند بند کانپ رہا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ سُر میرے ہاتھوں سے نکل رہے ہیں۔ اس سرود نوازی کی دھن میں اسے یہ بھی دھیان نہ رہا تھا کہ رات تیزی سے گزری جا رہی ہے۔ آخر دوسرے کمرے سے پھر کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ فیاض ناچار اٹھ کر اندر گیا تو اختری نے کہا:

"شاباش ہے تم کو۔ بارہ بج گئے مگر تمہاری تن تن ختم نہ ہوئی۔ اب سونے بھی دو گے کسی کو۔ شریفوں کا محلہ ہے لوگ کیا کہیں گے آخر۔"

"تم سچ کہتی ہو۔ بس اب میں ختم کیا چاہتا ہوں۔"

وہ بیٹھک میں آیا تو حیدری خاں کو گدڑی اوڑھے فرش پر دراز پایا۔ سرود کو اس نے پھر کونے میں رکھ دیا تھا۔ اس سے فیاض کو کسی قدر مایوسی ہوئی۔

"بابو جی" حیدری خاں نے گدڑی کے اندر سے کہا۔ "رات بہت بیت لی۔ میں نے سوچا اب کہاں جاؤں گا۔ یہیں پڑ رہتا ہوں۔ صبح ہوتے ہی چل دوں گا۔ تمہاری خیر ہو ذرا لیمپ کی بتی نیچی کر دینا پر بجھانا نہیں۔"

"بہت اچھا" فیاض نے کہا۔ اور وہ لیمپ کی بتی نیچی کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اگلے روز صبح ابھی سورج نکلنے نہ پایا تھا کہ فیاض بستر سے اٹھ بیٹھک میں آ گیا۔ اس وقت سردی خاصی بڑھ گئی تھی۔ حیدری خاں اپنی گدڑی میں گٹھڑی بنا بے خبر سو رہا تھا۔ مگر فیاض کو جیسے سردی کی کوئی تشویش کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ وہ سرود اٹھا فرش پر آ کر وہیں بیٹھ گیا اور جھکے جھکے ان ہی چاروں سروں کو بجانے لگا جو حیدری خاں نے رات اسے سکھائے تھے۔ سرود کی آواز سن کر گٹھڑی میں حرکت ہوئی۔ حیدری خاں نے گدڑی میں سے سر نکالا۔ فیاض کی صورت دیکھی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور اس نے سر پھر گدڑی کے اندر کر لیا۔

فیاض بڑے انہماک کے ساتھ سرود پر مشق کرتا رہا۔ اس کام میں اسے ایسی طمانیت حاصل ہو رہی تھی کہ زندگی میں پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ جب اسے سرود بجاتے کافی دیر ہو گئی تو اس کی دونوں بیٹیاں نجمہ اور حمیدہ بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ دونوں نے سر اور کانوں کو اونی رنگ دار گلوبند سے ڈھک رکھا تھا۔ نجمہ کی عمر گیارہ برس کی تھی اور حمیدہ کی نو برس۔ دونوں بڑی پیاری پیاری بچیاں تھیں۔ وہ ایک معصومانہ ادا کے ساتھ جس میں حیرت کے ساتھ ساتھ تمسخر کا عنصر بھی شامل تھا باپ کو یہ بڑا سا عجیب و غریب ساز بجاتے دیکھ رہی تھیں۔ ہنسی ان کے ہونٹوں پر آ آ کر رک جاتی۔

"میں نے کہا آج دفتر نہیں جاؤ گے؟" اصغری نے چلمن کے پیچھے سے کہا۔

"اتوار ہے بھئی اتوار ہے"۔

یہ کہہ کر فیاض پھر سرود بجانے میں مشغول ہو گیا۔ اصغری نے حیدری خاں کو گدڑی میں منہ چھپائے بے خبر ہوتے دیکھا تو دوپٹہ سنبھالتی ہوئی بیٹھک میں چلی آئی اور فیاض کے کان کے قریب منہ لا کر کہنے لگی:

"یہ کب دفان ہو گا؟"

"خدا کے لیے چپ رہو۔ کہیں سن نہ لے۔ بڑا صاحب کمال آدمی ہے۔"

"ہوا کرے۔ میں پوچھتی ہوں یہ جائے گا کب؟"

"بس ناشتہ کرا کے بھیج دیں گے۔ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ کہیں اٹھ نہ بیٹھے۔"

کوئی دس بجے کے قریب حیدری خاں جماہیاں لیتا اپنی کالی کالی انگلیوں کو جن کے ناخن بڑھے ہوئے تھے اور ان میں میل بھرا تھا، چٹخاتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ فیاض ابھی تک سرود بجانے میں منہمک تھا۔ اس تین چار گھنٹے کے ریاض سے اسے ان چاروں سروں کی خوب مشق ہو گئی تھی۔ سر روانی اور وزن کے ساتھ نکلنے لگے تھے۔ حیدری خاں کو فیاض کے اس انہماک پر اچنبھا سا ہوا۔

"او بابو جی۔ اب تم گنڈا بندھوانے کی فکر کرو۔ تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ تم تو سچ مچ بجانے لگے۔ مجھے اب تک جو شاگرد ملا کمبخت کوڑھ مغز ملا۔ تم جیسا ذہین شاگرد ہو تو تین ہی مہینے میں استاد نہ بنا دوں تو میری مونچھیں منڈوا دینا۔ پر یہ سن رکھو میاں میری ٹیوشن کی فیس سو روپیہ مہینہ ہے سو روپیہ مہینہ!" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ "ایک بات ہے بابو جی ماشاءاللہ سے تمہارے ڈیل ڈول پر یہ ساز پھبتا بھی خوب ہے۔ شیر کے بچے معلوم ہوتے ہو شیر کے بچے!"

ناشتہ ہو لیا مگر حیدری خاں کے رخصت ہونے کے آثار دکھائی نہ دیے۔ اس پر دوسرے کمرے میں اصغری نے پھر کنڈی کھٹکھٹائی۔ فیاض اٹھ کر اندر گیا۔

"میں نے کہا آج سودا سلف نہیں آئے گا؟ تم کو تو گانے بجانے میں کھانے پینے کی بھی سدھ نہ رہی۔ مگر بچوں کو تو بھوکا نہ مارو۔"

"اوہو۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ لو ابھی بازار جاتا ہوں۔"

جس وقت فیاض کپڑے بدل کر بیٹھک میں آیا تو حیدری خاں بھی سر پر اپنی بے پھندنے کی مخملی ٹوپی رکھ، سرود بغل میں دبا، گدڑی سنبھال چلنے کو تیار کھڑا تھا۔ فیاض کا منہ اتر سا گیا۔

"کیوں استاد کہاں چل دیے؟"

"ذرا جا کر نشہ پانی کروں گا" حیدری خاں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "ایک روپیہ ہو تو دلواؤ۔"

فیاض فوراً اندر جا کر روپیہ لے آیا۔

"جیتے رہو بابو جی" اس نے روپیہ واسکٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "شاید شام کو پھر آنا ہو۔"

اس نے ایک اور جماہی لی۔ واقعی اس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ دروازے کی طرف چلا۔ جب تک وہ سیڑھیوں سے اتر نہ گیا فیاض برابر دروازے میں کھڑا اسے جھانکتا رہا۔ اس کے جانے کے بعد فیاض کو اچانک ایک بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ کاش حیدری خاں اپنا سرود یہیں چھوڑ جاتا اور وہ آج چھٹی کے دن خوب خوب مشقیں کرتا رہتا۔ وہ کھویا کھویا سا چارپائی پر لیٹ گیا۔ رات سے اس پر ایک مسلسل اضطراب کی کیفیت طاری تھی۔ اسے نیند بھی اچھی طرح نہ آئی تھی۔۔۔ اصغری نے اس کی اداسی کو بھانپ کر کہا:

"یا اللہ! کیسا شوق لگ گیا ہے تمہیں۔ ڈوم ڈھاڑی ہو گئے! اور یہ موا فقیر۔۔۔۔۔۔"

فیاض نے اس کی بات کاٹ کر کہا:

"جس کو تم موا فقیر کہتی ہو ملک میں جواب نہیں اس کا۔"

"ہلا سے نہ ہو۔ بھاڑ میں جائے۔ مجھے تو بیڈر ہے کہ نامراد نے گھر دیکھ لیا ہے اب تو روز ہی آ دھمکا کرے گا۔"

"کاش ایسا ہی ہو۔"

"تو کیا ساز بجانا سیکھو گے تم؟"

"کاش میں اسے سو روپیہ ٹیوشن کی فیس دے سکتا!"

اصغری کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

سودا سلف آیا۔ کھانا پکا۔ میاں بیوی اور لڑکیوں کھانے بیٹھیں۔ مگر فیاض نے دو چار نوالوں کے بعد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ اصغری نے یہ حال دیکھا تو اس کو سچ مچ تشویش ہونے لگی۔ پچھلے چند گھنٹوں میں وہ اسے بہت بدلا ہوا پا رہی تھی۔ وہ نہ تو اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتا۔ نہ اس کی بات غور سے سنتا اور نہ ڈھنگ کا جواب دیتا۔ لڑکیوں کی طرف بھی اس کی یکسو توجہ معلوم نہ ہوتی تھی۔

دن ڈھل گیا۔ شام ہوگئی۔ چراغ جل گئے مگر حیدری خاں نہ آیا۔ فیاض بار بار سیڑھیوں میں جھانکتا۔ پھر آکر بستر پر لیٹ جاتا۔ پھر اٹھ بیٹھتا۔ اس کی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ آخر آٹھ بجے کے قریب سیڑھیوں میں کسی کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ یہ حیدری خاں ہی تھا۔ وہ جھوم رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پچھلی رات سے زیادہ سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کے حواس بجا نہ تھے۔ معلوم ہوتا تھا آج اس نے کچھ زیادہ ہی نشہ پانی کر رکھا ہے۔ سرود کو دیکھ کر فیاض کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"لو میاں آ گئے ہم۔ تم بھی کیا یاد کرو گے" یہ کہہ کر وہ آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھ گیا۔

"فیاض میاں ذرا ہوٹے کہہ کر چائے ہوا لو۔ بس چائے ہی۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

پھر نہ جانے کیا ترنگ اٹھی کہ وہ سرود بجانے لگا۔ ابتدا تو بڑے جوش و خروش سے کی۔ مگر دو ہی منٹ بعد انگلیاں سست پڑنے لگیں اور جب اندر سے چائے بن کر آئی تو وہ سرود پر جھکا خراٹے لے رہا تھا۔

فیاض نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ مگر اس پر ایسی بے ہوشی کی نیند طاری تھی کہ مطلق آنکھ نہ کھولی۔ فیاض نے سرود کو اس کی گرفت سے الگ کر کے اسے آہستگی سے فرش پر لٹا دیا اور گدڑی اوڑھا دی۔ پھر بڑے اشتیاق کے ساتھ سرود کو اٹھا کر بجانا شروع کر دیا۔

اگلے روز حیدری خاں کی آنکھ صبح سویرے ہی کھل گئی۔ دیکھا کہ فیاض اس کے قریب ہی بیٹھا

اس کے بتائے چاروں سروں کی مشق کر رہا ہے۔ وہ سراہے بغیر نہ رہ سکا۔

"فیاض میاں ماشاء اللہ سے کیا سچے سر نکال رہے ہو۔ واہ واہ جی خوش ہو گیا۔ آج میں تمہیں اگلے تین سر بھی بتا دوں گا۔ پھر چلنک مکمل ہو جائے گی۔"

اور سچ مچ تھوڑی ہی دیر میں حیدری خاں نے جیم دھیوت اور نکھاد کے سر بھی فیاض کے ہاتھ سے نکلوا دیے۔ خوشی سے فیاض کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر جلد ہی بادل نخواستہ اسے موسیقی کی یہ تعلیم ختم کرنی پڑی کیونکہ آٹھ بجنے والے تھے اور اسے دفتر جانے کے لیے تیار ہونا تھا۔

حیدری خاں نے ناشتے کے بعد اپنا سرود اٹھایا۔ اس دفعہ اسے روپیہ مانگنے کی ضرورت نہ پڑی۔ کیونکہ فیاض نے خود ہی اندر سے روپیہ لا کر اسے دے دیا تھا۔

"خوش رہو میاں" حیدری خاں بولا۔ پھر چند لمحے تامل کر کے اس نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہنا شروع کیا:

"سنو میاں۔ اگر تمہیں مجھ سے سیکھنا ہے تو تمہیں میری تین شرطیں منظور کرنی ہوں گی۔ یوں تو یہ شرطیں بہت آسان معلوم ہوں گی۔ پر غور کرو تو دشوار بھی بہت ہیں۔ کیونکہ میں مزاج کا مشہور ہوں۔ ذرا بھی کوئی کام میری مرضی کے خلاف ہو تو مجھے بڑا قلق ہوتا ہے۔ اپنی اسی بدمزاجی کی خاطر میں نے فقیری قبول کی ہے۔ لو اب وہ شرطیں بھی سن لو۔ اول یہ کہ صبح کو تمہیں میرے ناشتے اور حقے پانی کا انتظام کرنا ہوگا۔ دوپہر کو میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ صبح ادھر تم دفتر کو چلے ادھر میں کھسکا۔ شام کو جب تم دفتر سے آ چکو گے تو میں بھی اپنے پھیرے کے پھیرے لگایا کروں گا۔ دوسری شرط یہ کہ رات کا کھانا ہم دونوں ساتھ ساتھ کھائیں گے اور تیسری شرط یہ۔ میں سویا کبھی بیٹھک میں کروں گا۔ وہ جو میں نے سو روپیہ مہینہ ٹیوشن کی بات کی تھی وہ تو میں تم سے مذاق کرتا تھا میاں۔ مجھے روپے کا لالچ ہوتا تو حویلیاں نہ کھڑی کر لی ہوتیں اب تک۔ بس یہی ہیں میری شرطیں اگر تمہیں منظور ہوں تو بسم اللہ!"

فیاض کچھ دیر گردن جھکائے ہوئے سوچ میں ڈوبا رہا۔ جب اس نے سر اٹھایا تو سب سے پہلے اس کی نظر چلمن پر پڑی۔ حیدری خاں کی طرح اصغری بھی اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"خان صاحب" اس نے دھیمی آواز مگر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "مجھے آپ کی تینوں شرطیں منظور ہیں۔ آج سے آپ میرے استاد ہیں۔"

اسی شام حیدری خاں اپنا بوریا بدھنا لے فیاض کے ہاں اٹھ آیا۔ یہ بوریا بدھنا کیا تھا ٹین کا ایک ٹرنک جس کا روغن اڑا ہوا اور کنڈا

غائب تھا۔ حیدری خاں نے اسے بند کرنے کے لئے رسی باندھ رکھی تھی۔ ایک مٹی کا مڑا سا حقہ تھا اور ایک پیالہ۔

اصغری کے دل کو چوٹ تو لگی اور اس نے کچھ آنسو بھی بہائے۔ مگر وہ مطیعان اطاعت گذار بیویوں میں سے تھی جو شوہر کو مجازی خدا سمجھتی ہیں اور ہر حال میں ان کی خوشنودی کی جویا رہتی ہیں۔ موسیقی سے میاں کے اس جنون کی حد تک بڑھتے ہوئے شوق کو دیکھ کر اس نے زیادہ مزاحمت نہ کی۔ اور حیدری خاں کا اپنے ہاں رہنا منظور کر لیا۔ دو چار ہی دن میں اسے حیدری خاں کی سرشت کا اندازہ بھی ہو گیا۔ وہ نشہ باز تو تھا مگر بد نظر ہرگز نہ تھا۔ پرائی بہو بیٹیوں کو تاکنے جھانکنے کی اسے عادت نہ تھی۔ وہ اصغری کو ہمیشہ بہو یا بیٹی کہہ کر پکارتا اور جب تک فیاض باہر رہتا گھر کے نزدیک نہ پھٹکتا۔

سب سے پہلے فیاض کو حیدری خاں کی ظاہری حالت سدھارنے کی فکر ہوئی۔ حیدری خاں بہتیرا منع کرتا رہا مگر اس نے ایک نہ سنی۔ اس نے خاں صاحب کے لئے ایک نیا جوڑا سلوایا۔ اس کے پاس بڑھیا سے کپڑے کی ایک شیروانی تھی جسے وہ کبھی کبھی پہن لیا کرتا تھا۔ یہ شیروانی وہ ایک جگہ سے سستے داموں لایا تھا مگر ابھی اچھی حالت میں تھی۔ وہ اسے ایک درزی کے پاس لے گیا اور اس میں قطع و برید کرا کے اسے خاں صاحب کے ناپ کا بنوا لیا۔ پھر اس نے خاں صاحب کی ترکی ٹوپی کو دھلوا کے اس میں نیا پھندنا لگوایا۔ اس نے خاں صاحب کے لئے ایک مضبوط سا جوتا بھی خریدا۔ پھر ان سب چیزوں کو ایک سوٹ کیس میں رکھ کر خاں صاحب کو ساتھ لے ایک حمام میں پہنچا۔ وہاں پہلے تو خاں صاحب کے بالوں کو مختصر کرایا۔ داڑھی منڈوائی اور مونچھوں کو ترشوایا۔ ناخن کٹوائے۔ پھر حمام والے سے دو تین مرتبہ حمام میں پانی بھروا کے اسے خوب نہلوایا۔ اس کے کپڑے بدلوائے۔ جس وقت حیدری خاں حمام سے نکلا تو وہ ایک اچھا خاصا معقول انسان نظر آنے لگا۔

اس وقت دوپہر ہو چکی تھی۔ ظہر کا وقت قریب تھا۔ دونوں گھر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں ایک مسجد نظر آئی۔ حیدری خاں وہیں ٹھہر گیا۔ اس نے بڑی رقت بھری آواز میں فیاض سے کہا:

"فیاض بیٹے۔ آج بڑی مدت کے بعد پاک صاف ہوا ہوں اور کپڑے بھی پاک ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آج اپنے مولا کے سامنے ذرا سر جھکا لوں۔"

فیاض کو کچھ تعجب تو ہوا مگر اس نے خاں صاحب کی خواہش کو رد نہ کیا اور وہ دونوں دوسرے نمازیوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب حیدری خاں مسجد سے نکلا تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی تھی۔ لباس کی اس تبدیلی کے ساتھ ہی اس کے طور طریقے بھی ایک

دم بدل گئے۔ اس کی زبان سے وہ بات بات پر دشنام گلمات کا نکلنا بند ہو گیا۔ اس کے بجائے اس کے انداز تخاطب میں ایک تحکم پایا جانے لگا۔ جس وقت فیاض اس کے ہمراہ بازار سے گذر رہا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مودب شاگرد استاد کے ساتھ ساتھ جا رہا ہو۔

اصغری نے حیدری خاں کی یہ دھج دیکھی تو حیران رہ گئی۔ اسے پہلے پہل اس شخص سے جو کراہت محسوس ہوئی تھی وہ جاتی رہی تھی۔ حیدری خاں مجھ اور سلیمہ سے بڑی شفقت سے پیش آنے لگا تھا۔ فیاض اسے ہر روز نشے پانی کے لئے جو ایک دو روپیہ دیا کرتا تھا۔ وہ اس میں سے دو تین آنے بچا ان بچوں کے لئے کچھ مٹھائی یا پھل ضرور خرید لاتا۔ بچیاں چند ہی روز میں اس سے خوب مانوس ہو گئیں۔ وہ اسے "خاں صاحب جی" کہہ کر بلاتیں۔

حیدری خاں اصغری کے کھانا پکانے کی بھی سچے دل سے تعریف کیا کرتا۔ وہ کہتا:

"بیٹی سبحان اللہ کیا لذیذ کھانا پکاتی ہو۔ جو راجوں اور نوابوں کو بھی نصیب نہیں۔ ان کے کھانوں میں تو بس تکلف ہی تکلف ہوتا ہے۔ مزہ خاک بھی نہیں۔"

رفتہ رفتہ اس کی تعریفوں میں اصغری کو مزہ آنے لگا۔ وہ کبھی کوئی خاص چیز پکاتی تو دل میں کہتی۔ "دیکھیں آج خاں صاحب کیا کہتے ہیں" اب خاں صاحب پر گھر میں آنے جانے کی کوئی پابندی نہ رہی تھی کیونکہ اصغری نے میاں کا عندیہ پا کر ان سے پردہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ حیدری خاں سے کہا کرتی: "خاں صاحب آپ دوپہر کا کھانا بھی گھر ہی آ کر کھا لیا کریں۔" مگر حیدری خاں کو یہ وقت تکیوں ہی میں گذارنا زیادہ پسند تھا۔

ادھر فیاض خاں کے ذوق و شوق کو دیکھ کر حیدری خاں نے اسے پوری توجہ سے سرود کی تعلیم دینی شروع کر دی تھی۔ اس نے مہینے ڈیڑھ مہینے کے اندر ہی فیاض کو دو تین راگوں کی الاپ اور کچھ گتیں بھی سکھا دی تھیں اور اب فیاض سرود نوازی میں روز بروز ترقی کرنے لگا تھا۔ اگرچہ اس پر حیدری خاں کے اخراجات کا پورا بوجھ پڑ گیا تھا جس سے وہ بہت تنگ دست ہو گیا تھا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ایسا خوش کہ زندگی میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

چونکہ حیدری نے بازاروں میں بیٹھ کر سرود بجانا اور مانگنا ترک کر دیا تھا۔ اس لئے اس کا سرود زیادہ تر گھر ہی میں رہتا۔ اس نے فیاض کو پوری اجازت دے رکھی تھی کہ وہ جب تک چاہے اس کے سرود پر ریاض کرتا رہے۔ فیاض صبح کو دفتر جانے سے پہلے دو گھنٹے خوب ریاض کرتا۔ دفتر میں بھی سارا دن اس کی انگلیاں فائلوں پر یوں دوڑتی رہتیں جیسے وہ سرود بجانے کی مشق کر رہا ہو۔ اب وہ ٹھیک پانچ

بیٹے دفتر سے چھٹی کر لیتا اور شہر کے پرشور بازاروں اور تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا جلد سے جلد گھر پہنچ جاتا۔ چھٹی کے روز سرود کو ہاتھ سے چھوڑنے کی اسے قسم ہو جاتی۔

تھوڑے ہی دنوں میں حیدری خاں کے دل میں فیاض کی اہمیت بے حد بڑھ گئی۔ وہ اس سے اس طرح پیش آتا جیسے باپ اپنے بیٹے سے۔ وہ اب گھنٹوں اس کو ریاض کرواتا۔ جب فیاض کے دفتر سے آنے کے وقت دو گھنٹے قبل ہی وہ گلی میں اس کے مکان کے نیچے چارپائی ڈال کر بیٹھ جاتا۔ اکثر اوقات وہ اکیلا ہی ہوتا مگر کبھی کبھی اس کے دو تین دوست بھی اس کے ساتھ آ جاتے۔ اس پر گلی میں آنے جانے کے لیے لوگ مشکل سے گزر سکتے۔

[illegible]

تھے۔ انہیں تعجب تھا کہ فیاض نے اپنے گھر پر ایسے عجیب و غریب قماش کے لوگوں کے تسلط کو کیسے گوارا کر لیا۔ پھر فیاض کو یہ بھی تو احساس نہیں کہ ان لوگوں کی بے ہودہ حرکات کا اس کی زوجہ اور معصوم بچوں کے اخلاق پر کتنا گھناؤنا اثر پڑتا ہوگا۔ جگہ جگہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ناراضگی کی لہر بڑھتی ہی چلی گئی یہاں تک کہ ایک شام جب فیاض دفتر سے گھر آ رہا تھا تو گلی کے موڑ پر اس کی مڈبھیڑ محلے کی بڑی مسجد کے امام صاحب سے ہوئی۔

"السلام علیکم" امام صاحب نے مصافحہ کرنے کے بعد سینے پر ہاتھ رکھا اور یوں گویا ہوئے "برادر میں کئی دن سے آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ بات یہ ہے کہ آپ کو موسیقی سے ازحد لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ ہر چند اسلام میں خوش آوازی اور لحن کو بڑا درجہ حاصل ہے۔ مگر استغفر اللہ۔ یہ خرافات جو دن رات آپ کے گھر پر ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی تو کسی صورت میں بھی اجازت نہیں ہے۔ بلاشک آپ اپنے فعل کے خود مختار ہیں اور رب العزت کے سامنے آپ اپنے اعمال کے خود جواب دہ ہوں گے مگر یہ مسئلہ صرف آپ ہی کی ذات تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ پورے محلے پر آپ کی ان خرافات کا نہایت قبیح اثر پڑ رہا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ جناب ٹھنڈے دل سے میری اس گذارش پر غور فرمائیں گے اور ان لغویات سے جلد چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔ بس مجھے یہی کہنا تھا۔"

جس وقت فیاض گھر پہنچا تو وہ بڑا رنجیدہ اور دل شکستہ تھا۔ اتفاق سے حیدری خاں ابھی گھر نہیں آیا تھا۔ فیاض سیدھا اپنے کمرے میں جا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ گو اس کا دل ریاض کرنے کے لئے بے چین تھا مگر اسے سرود کو ہاتھ لگانے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ اصغری نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو پوچھا

"نصیب دشمناں کچھ طبیعت خراب ہے، آپ کی؟"

"نہیں تو" فیاض نے کہا۔ مگر وہ بستر سے نہ اٹھا۔

آخر جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو حیدری خاں آیا۔ فیاض سیڑھیوں سے ہی اس کے قدموں کی چاپ سن کر جلدی سے سرود اٹھا بجانے بیٹھ گیا۔ وہ اب استاد سے ڈرنے لگا تھا اور اس پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ اس نے یہ دو گھنٹے یونہی ضائع کر دیے۔

"فیاض بیٹے" حیدری خاں نے بیٹھک میں قدم رکھتے ہی کہا۔ "تھک گئے ہو تو ذرا دم لے لو۔ بھئی آج میں نے اپنے ایک واقف کار کے ذریعہ تمہارے لئے بمبئی سے اچھا سا سرود منگوانے کا بندوبست کر ہی لیا۔ اب اللہ نے چاہا تو جلد ہی پیٹی کا انتظام بھی ہو جائے گا۔"

فیاض نے تشکر آمیز نظروں سے استاد کی طرف دیکھا۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس کے بعد حیدری خاں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں کھانے کا وقت ہو گیا۔ اور یوں فیاض اس شام سرود سے کنارہ کش ہی رہا۔ مگر اس کے دل میں اہل محلہ اور امام مسجد کے خلاف سخت غصہ بھرا ہوا تھا۔

اگلے روز فیاض وقت سے کچھ پہلے ہی دفتر چلا گیا۔ دوپہر کو حیدری خاں ایک شخص کو ساتھ لئے ہوئے آیا۔ جس کی وضع قطع پنڈتوں کی سی تھی۔ پردہ کرا دیا گیا اور وہ دونوں بیٹھک میں فرش پر بیٹھ گئے۔ ٹھیک اسی وقت نجمہ اور سلیمہ اسکول سے پڑھ کر گھر آ گئیں۔ انہوں نے حیدری خاں کو سلام کیا۔

"جیتی رہو میری بچیو۔" حیدری خاں نے پرشفقت لہجہ میں کہا۔ "بس جلدی ذرا بستے رکھ کر ادھر آ جاؤ۔ آج تمہارا امتحان لیں گے ہم۔"

دونوں لڑکیاں بستے ماں کے حوالے کر کے خان صاحب کے سامنے ادب سے آ کر بیٹھ گئیں۔ خان صاحب نے سرود اٹھایا اور اس کا ایک سر بجا کر نجمہ سے کہا:

"لے بیٹی ذرا اس آواز کے ساتھ اپنی آواز تو ملا۔ شاباش۔"

نجمہ کچھ شرمائی۔ مگر خان صاحب کے اصرار پر آواز ملانے کی کوشش کرنے لگی۔

"نہیں اونچی آواز سے کہو آ۔ آ۔ یوں۔"

لڑکی ذہین تھی تھوڑی ہی مشق کے بعد اس نے ساز کے سر کے ساتھ اپنی آواز ملا دی۔ اس پر حیدری خاں نے اپنے ساتھی پنڈت کی طرف پرمعنی نظروں سے دیکھا۔ اور کہا

"کیوں کالکا پرشاد جی؟"

کالکا پرشاد نے تحسین آمیز نظروں سے بچی کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ اس کے بعد چھوٹی بہن سلیمہ کی باری آئی۔ وہ بڑی آپا کو آواز ملاتے دیکھ چکی تھی۔ اس لئے وہ جلدی اس امتحان میں پوری اتر گئی۔ ایک بار پھر حیدری خاں نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر کہا

"کیوں کالکا پرشاد جی؟"

کالکا پرشاد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے دو تین مرتبہ "ہوں ہوں" کہا۔ اس کے بعد حیدری خاں نجمہ اور سلیمہ سے کہا:

"بس جاؤ۔ شاباش شاباش اب ہاتھ دھو کر کھانا کھاؤ۔"

جب لڑکیاں چلی گئیں تو وہ کالکا پرشاد سے کہنے لگا:

"شام کو ان کا باپ آئے گا تو اس سے بات کروں گا۔" پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد اپنے دوست کو

لے کر چلا گیا۔

اس شام جب فیاض دفتر سے آیا۔ تو اصغری بھری بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی برس پڑی:

"دیکھو جی اب تک تو ہم تمہاری سب باتیں مانتے چلے گئے تھے مگر اب معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے میں اپنی لڑکیوں کو ہرگز ہرگز گانا نہ سیکھنے دوں گی۔"

"کچھ بتاؤ تو کیا ہوا کیا۔ تم تو معموں میں باتیں کر رہی ہو۔"

"آج دوپہر کو خان صاحب آئے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی پنڈت جی بھی تھے۔ نجمہ اور سلیمہ بھی اسی وقت اسکول سے آئی تھیں۔ پہلے خان صاحب نے دونوں لڑکیوں کو گوایا۔ پھر نہ جانے چپکے چپکے آپس میں کیا باتیں کرتے رہے۔ میں چلمن میں سے سب دیکھتی رہی۔ سنو جی اگر خان صاحب چاہیں کہ میری معصوم بچیاں رنڈیوں کی طرح ناچنے گانے لگیں تو یہ ہونے کا نہیں۔ چاہے مجھے ان کو لے کر میکے ہی میں کیوں نہ بیٹھ رہنا پڑے۔"

فیاض کچھ کہنے ہی کو تھا کہ اتنے میں حیدری خاں بھی آ گیا۔

"فیاض بیٹے" اس نے بیٹھک میں قدم رکھتے ہی کہنا شروع کیا۔ "اللہ تمہاری عمر میں برکت دے۔ میں تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں اور اصغری بیٹی اللہ تیرا سہاگ قائم رکھے تو بھی کان دھر کے سن۔ تم دونوں نے کبھی یہ بھی سوچا کہ دونوں بچیاں ماشاءاللہ سے دو تین برس میں جوان ہونے کو ہیں۔ تم نے کچھ ان کی شادی بیاہ کی بھی فکر کی۔ مجھے تو نظر آتا نہیں کہ تم نے ان کے لئے کچھ جہیز جمع کیا ہو اور پھر تم کر بھی کیا سکتے ہو۔ ڈیڑھ سو روپلی کی بھلا حقیقت ہی کیا ہے۔ آخر تم ان معصوم بچیوں کو کس طرح ٹھکانے لگاؤ گے۔ کسی کنجڑے قصائی کو تو خدانخواستہ تم بیٹی دینے سے رہے۔ رہے دفتروں کے بابو جن کو تیس چالیس روپلی سے زیادہ تنخواہ نہیں ملتی۔ ان کو لڑکی دینا ایسا ہی ہے جیسے بھاڑ میں جھونک دینا۔ بچیاں ماشاءاللہ سے ایسی خوبصورت ہیں جیسے چاند کا ٹکڑا۔ ان کو تو کسی قدردان رئیس کے ہاں رانی بن کر راج کرنا چاہیے۔ مگر میاں صاحب زادے امیر لوگ شادی بیاہ کے معاملے میں بڑی مین میخ نکالتے ہیں۔ لڑکی خوبصورت ہو، پڑھی لکھی ہو، بہت سا جہیز لائے۔ اور پھر اسے کوئی ہنر بھی آتا ہو جیسے گانا یا مصوری۔ مگر ان بچیوں میں سوائے صورت شکل کے اور رکھا ہی کیا ہے!

"مجھے کئی دن سے اس بات کی بڑی فکر تھی۔ تم دونوں میاں بیوی تو سو جاتے تھے مگر میں رات رات بھر اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا تھا۔ آخر سوچ سوچ کر میں نے یہ ترکیب نکالی ہے کہ ان لڑکیوں کو تھوڑا سا ناچ گانا سکھا دیا جائے۔ تم جانو آج کل امیر امرا میں ناچ گانے کا شوق کس قدر ترقی پر

ہے۔ پچھلے ہفتوں نے یہ بات شروع کی تھی۔ ان کی دیکھا دیکھی اب مسلمان بھی اپنی بیٹیوں کو گانا بجانا سکھانے لگے ہیں۔

"میں دوپہر کو پنڈت کالکا پرشاد کو لایا تھا۔ وہ شہر کے نامی مغنی ہیں۔ نواب شمشیر علی خاں کی لڑکیاں، رائے بہادر مختار کی لڑکیاں، چودھری نیک عالم کی لڑکیاں آج کل ان ہی سے سیکھ رہی ہیں۔ ان تین گھرانوں کو تو میں جانتا ہوں۔ اللہ جانے اور کتنے گھرانوں میں جاتے ہوں گے۔"

"تو میاں صاحبزادے، خدا شاہد ہے تم مجھے بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہو اور اصغری بیٹی تو بھی میری بچیوں سے کم نہیں۔ میں نے جو بات سوچی ہے تمہارے ہی بھلے کے لئے سوچی ہے۔ میرے تو آل ہے نہ اولاد۔ جو کچھ ہو تمہیں ہو۔ پھر میں تمہارا برا کیوں چاہوں گا۔"

اس تقریر کے آخری حصے کے دوران حیدری خاں کی آواز شدت جذبات سے بھرا گئی تھی اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔ آخر وہ کرتے کے دامن سے آنسو پونچھتا ہوا اٹھا اور یہ کہتا ہوا سیڑھیوں کی طرف چلا:

"تم دونوں خوب سوچ سمجھ لو۔ اگر منظور ہو تو کل ہی سے بچیوں کی تعلیم شروع کرا دی جائے۔۔۔ لو اب میں چلتا ہوں۔ میرے ایک دوست تکیے پر ٹھہرے ہیں۔ مجھے ان سے کام ہے۔ میں ذرا دیر میں آ جاؤں گا۔"

اس کے جانے کے بعد فیاض اور اصغری دیر تک خاموش بیٹھے ایک دوسرے کا منہ تکا کئے۔ آخر فیاض نے سکوت توڑا:

"کہو کیا کہتی ہو؟"

"میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں۔" اصغری نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے خاں صاحب جو کچھ کہتے ہیں درست ہی کہتے ہیں۔ واقعی ہم نے بچیوں کے مستقبل کا کچھ خیال نہیں کیا اور جو تمہیں اس میں برائی نظر آتی ہو تو ہمارے ہوتے کوئی کیا کر سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ تم مختار ہو جو چاہے کرو۔"

حیدری خاں رات کو کوئی دس بجے کے قریب گھر آیا۔ اصغری نے اس کے اور فیاض کے لئے کھانا گرم کیا۔ کھانے کے دوران میں فیاض نے مسجد کے امام سے اپنی ملاقات کا حال سنایا۔ حیدری سنتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"وہ تو میں پہلے ہی سمجھے ہوئے تھا بیٹے۔ مگر تم کوئی فکر نہ کرو اپنے کام سے کام رکھو۔ جب دیکھیں گے کہ کوئی چارہ نہیں تو اس محلے ہی کو چھوڑ دیں گے۔"

یہ سن کر فیاض کی کچھ کچھ ہمت بندھی اور اس نے پھر ریاض شروع کر دیا۔

اس واقعے کے دو دن بعد لڑکیوں کے ناچ گانے کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اب محلے والوں کے کانوں میں ظہر سے لے کر عصر تک یکساں قسم کی آوازیں، گھنگروؤں کی جھنکار کے ساتھ مل کر سنائی دینے لگیں:

تا تت تھئی تھئی۔ تا تت تھئی تھئی۔ ایک دو تین چار۔ ایک دو تین چار۔ تا تت تھئی۔ تا تت تھئی۔ ایک دو تین۔ ایک دو تین۔

اگلے روز جب نجمہ اور حلیمہ استانی کے ہاں پڑھنے گئیں تو پانچ ہی منٹ بعد بستے اٹھائے واپس آ گئیں۔ استانی نے بچیوں سے کہا تھا کہ تم یہاں نہ آیا کرو۔

اسی روز شام کو مالک مکان فیاض سے ملنے آیا۔ وہ سر جھکائے تھا۔ شرم کے مارے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ پچھلے دس برس میں اسے فیاض سے کسی قسم کی شکایت پیدا نہ ہوئی تھی۔ نہ فیاض نے کبھی مکان کی مرمت کے لئے کہا تھا۔ نہ سفیدی کرانے کے لئے اور کرایہ ہر مہینے بلا ناغہ پہلی ہی اس کی دکان پر پہنچ جاتا تھا۔

"معاف کیجیے گا فیاض صاحب" آخر اس نے زبان کھولی۔ "میں آپ کی بڑی عزت کرتا ہوں خواہ آپ کو گانے بجانے کا شوق ہی کیوں نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ خود مجھے بھی موسیقی سے دلچسپی ہے۔ مگر کیا کروں ان کم بخت محلے والوں نے میری دکان پر آ آ کر میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ آپ کے ہاں کا نقشہ ایسے بھیانک طریقے سے کھینچتے ہیں گویا محلے بھر کی بہو بیٹیوں کی عزت خطرے میں پڑ گئی ہے۔ میں جانتا ہوں یہ سراسر جھوٹ ہے۔ مگر اتنے آدمیوں کے سامنے مجھ اکیلے کی کچھ پیش نہیں چلتی۔ آپ جیسے شریف اور ایماندار کرایہ دار کو کھو کر مجھے بڑا دکھ ہوگا مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ امید ہے آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔"

"میں سمجھ گیا ہوں" فیاض نے جواب دیا۔ "آپ فکر نہ کیجیے میں ہفتے بھر میں مکان خالی کر دوں گا۔"

جب یہ ماجرا حیدری خاں کے کانوں تک پہنچا تو وہ بول اٹھا:

"چلو یہ جھگڑا بھی نمٹا۔ فیاض بیٹے ہم خود اس مکان میں رہنا نہیں چاہتے۔ شہر میں ایک سے

ایک اچھا مکان موجود ہے اور کرایہ بھی کم۔"

"مگر خاں صاحب مجھے مکان تلاش کرنے کی فرصت کہاں!"

"تم فکر نہ کرو میری جان۔ آج کیا دن ہے جمعرات۔ بس اسی اتوار تک میں خود مکان تلاش کروں گا۔ اس دن تمہیں چھٹی بھی ہوگی آسانی سے اسباب لے چلیں گے۔"

حیدری خاں نے بیچ بیچ اتوار سے پہلے ہی مکان تلاش کر لیا۔ وہ فیاض کو مکان دکھانے لے گیا۔ جس علاقے میں یہ مکان واقع تھا۔ وہ شہر سے الگ تھلگ مضافات کی سی کیفیت رکھتا تھا۔ فیاض کا اس علاقے میں کبھی جانا نہیں ہوا تھا۔ بازار خوب بڑا تھا۔ آمنے سامنے اونچے اونچے مکان، نیچے دکانیں، کسی میں بنیا، کسی میں قصاب، کسی میں کنجڑا، بساطی، تنبولی، بزاز۔ ان تمام اشیا کی دکانیں جنہیں خریدنے کے لئے فیاض کو لمبی لمبی گلیاں طے کرنی پڑتی تھیں۔ علاوہ ازیں جوتے والوں کی دکانیں، درزیوں کی دکانیں، لانڈری والے، کیمسٹ، ایک کارخانہ بسکٹ بنانے کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک حجام خانہ تھا اور ایک جگہ حکیم محمود میاں کے مطب کا بورڈ لگا تھا۔

ان دکانوں کے اوپر خوبصورت چھوٹے مکان تھے کوئی تین منزل کا اور کوئی چار منزل کا۔ زیادہ تر مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں یا تو بند تھیں یا ان پر چقیں پڑی تھیں۔

اسی نواح میں حیدری خاں نے فیاض کے لئے دو کمروں کا ایک فلیٹ تلاش کیا تھا۔ یہ ایک عمارت کی دوسری منزل پر تھا جس کے نیچے ایک ایرانی چائے خانہ تھا۔ فلیٹ کے دونوں کمرے صاف ستھرے اور کشادہ تھے۔ بجلی اور نل کا انتظام۔ ٹائلوں کے فرش۔ چوڑے چوڑے دروازے۔ کھلی کھلی کھڑکیاں، ان کے روشن دانوں میں سرخ سبز نیلے پیلے رنگوں کے شیشے لگے ہوئے، پھولوں کی وضع کے بنے تھے۔ بازار کے رخ ایک خوبصورت بالکونی تھی۔ اسے دیکھ کر فیاض کی باچھیں کھل گئیں۔ یہاں وہ گرمی کے دنوں میں چھوٹی سی چوکی بچھا سرود کا ریاض کیا کرے گا۔ وہ مارے خوشی کے اسی وقت لیٹ گیا۔

"فیاض بیٹے" حیدری خاں نے اس کے خیال کو بھانپتے ہوئے کہا۔ "یہاں تمہیں کوئی نہیں روکے ٹوکے گا۔ چاہے تو ساری رات سرود بجاتے رہو۔"

فیاض خوشی خوشی اصغری کو یہ مژدہ سنانے گھر آیا۔ مکان کی اتنی بہت خوبیاں سن کر اصغری اور نجمہ وسلیمہ کو بھی اس کے دیکھنے کا اشتیاق ہوا مگر حیدری خاں نے کہا:

"بس ایک ہی دفعہ چل کے دیکھ لینا۔ فوراً اسباب باندھنا شروع کر دو تاکہ تیسرے پہر تک وہاں پہنچ جائیں۔"

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر فیاض، حیدری خاں، اصغری اور دونوں لڑکیاں جلدی جلدی اسباب باندھنے میں مصروف ہو گئیں۔ پچھلے دس برس میں نہ جانے کیا کیا ضروری اور غیر ضروری سامان اکٹھا ہو گیا تھا جس کا چھانٹنا مشکل تھا۔ صلاح یہ ٹھہری کہ نئے مکان میں پہنچ کر چھانٹ لیں گے۔ فی الحال تو سارا کا سارا جوں کا توں وہاں پہنچا دیا جائے۔ پھر بھی سامان باندھتے باندھتے اور ٹھیلا آتے آتے چار بج ہی گئے۔ جس وقت یہ لوگ اپنے نئے مکان میں پہنچے تو شام ہونے کو تھی۔

فیاض، اس کی بیوی اور بیٹیاں صبح سے کام کرتے کرتے ایسی تھک گئی تھیں کہ انہوں نے مکان کا جائزہ بھی نہ لیا۔ چاروں ایک کمرے میں بڑی سی دری بچھا اس پر پڑ رہے۔ مگر حیدری خاں کے چہرے سے تھکاوٹ کے کچھ آثار ظاہر نہ ہوتے تھے۔ وہ کہیں جانے کی سوچ رہا تھا۔

"فیاض بیٹے اندر سے کنڈی لگا لینا" اس نے سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ جب تک میں نہ آؤں کنڈی نہ کھولنا۔ اگر مجھے دیر ہو جائے تو گھبرانا نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ سیڑھیوں سے اتر گیا۔ اس کے جانے کی دیر تھی کہ چاروں کو نیند نے آ دبوچا اور وہ دو ڈھائی گھنٹے خوب بے خبر سوتے رہے۔ سب سے پہلے فیاض کی آنکھ کھلی۔ اس نے خود کو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پایا۔ وہ جانتا تھا کہ دیوار پر بجلی کا بٹن کہاں ہے۔ مگر اس خیال سے اس نے روشنی نہ کی کہ کہیں اصغری اور بچیوں کی نیند نہ اچٹ جائے۔ وہ اندھیرے میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا بالکونی کی طرف گیا اور اس کے آہنی کٹہرے پر جھک کر اس نواح کی سیر دیکھنے لگا۔ آمنے سامنے اغل بغل نیچے اوپر جس طرف بھی اس کی نظر گئی اسے ایک نئی ہی کیفیت دکھائی دی۔ اس نے دیکھا کہ آس پاس کے تمام فلیٹوں میں بجلی کی تیز روشنی ہو رہی ہے اور کمروں کے دروازے اور کھڑکیاں جن پر دن کو چقیں پڑی تھیں، اب چوپٹ کھلے ہیں۔ جو کمرہ اس کے فلیٹ کے عین سامنے تھا اس میں اجلی چاندنی کا فرش بچھا ہے۔ گاؤ تکیے لگے ہیں۔ پاندان خاصدان تھوکدان قرینے سے رکھے ہیں اور وہ سارا اہتمام ہے جو کسی دعوت کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ مگر یہ کمرہ ابھی اپنے مکینوں سے خالی ہے۔

ادھر سے ہٹ کر اب اس کی نظر نیچے بازار پر پڑی۔ اس وقت وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ دکانیں جن میں دن کو آٹا دال گھی گوشت سبزی کپڑا سونا چاندی تانبا پیتل بکتا تھا وہ تو سب بند تھیں اور ان کے تختوں پر گل فروش چنگیروں میں طرح طرح کے ہار گجرے کنگن چمپاکلی وغیرہ پھولوں کے گہنے سجائے دکان لگائے بیٹھے تھے۔ گندھیوں نے اپنی بڑی بڑی پٹاریاں کھول رکھی تھیں۔ ان کی

چھوٹی چھوٹی عطر کی رنگ برنگی شیشیاں دور سے چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

یہ چند مٹھائی کے بڑے بڑے تھال پڑے ہوئے تھے جن میں قسم قسم کے لڈو، قلاقند اور جلیبیاں سجی تھیں۔ امرتی اور برفی کے تھال بھی تھے جن میں قیمہ خانے کا بہانہ تک بند تھا۔ ان کے پاس ہی نظر بندی کا تماشا ہو رہا تھا۔ ایک جگہ ایک نوجوان جوشیلا ناچ رہا تھا کہ کھلی ٹوپی پہنے بازو [illegible] رہا تھا۔ پاس ہی چادر پر اکنیاں دونیاں سکے پیچھے بکھرے پڑے تھے۔ وہ شخص خوش شکل کے سجاوٹ میں تھا۔ میلے کا سماں بندھا ہوا تھا۔ بازار میں خاصی بھیڑ تھی جب کوئی بڑی سی چمکتی ہوئی سواری پوں پوں کرتی ہوئی گزرتی تو لوگ سامنے سے یوں ہٹ جاتے جیسے سمندر میں کائی کشتی کے چلنے سے پیچھے کو پھٹ جاتی ہیں۔

فیاض کو اپنے فلیٹ کے سامنے جو کمرہ خالی نظر آیا تھا اب اس میں چہل پہل ہوئے تھی۔ لوگ آتے جاتے تھے اور گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھتے جاتے تھے۔ کچھ رنگی طبلے پر تھاپ پڑ رہی اور ایک خوبصورت مہ جبیں، مخملی پشواز پہنے چھم چھم کرتی محفل میں کودتی اور رقص کرنے لگی۔ ہاتھ پاؤں کی حرکت اس غضب کی تھی کہ ہر ادا پر دیکھنے والوں کے دل کھنچے جاتے۔ حسین تو صد ہزار بار دیکھے تھے مگر رقاصہ کو اپنے حسن اور اپنے کمال فن پر ایسا ناز تھا کہ وہ ہر تعریف سے بے نیاز معلوم ہوتی تھی۔

فیاض ایک حیرت کے عالم میں بالکونی پر کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ اسے محسوس ہوا جیسے اندھیرے میں کوئی سایہ سا اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ فیاض مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ وہاں سے کوئی حرکت نہ کی۔ آخر اس نے گردن پھیر کر دیکھا تو وہ اس کی بیوی اصغری تھی۔

بہروپیا

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میری عمر بس کوئی تیرہ چودہ برس کی تھی۔ ہم جس محلے میں رہتے تھے وہ شہر کے ایک بارونق بازار کے پچھواڑے واقع تھا۔ اس جگہ زیادہ تر درمیانے طبقے کے لوگ یا غریب غربا ہی آباد تھے۔ البتہ ایک پرانی حویلی وہاں ایسی تھی جس میں اگلے وقتوں کی نشانی کوئی حاجی زادہ صاحب رہا کرتے تھے۔ ان کے ٹھاٹھ تو کچھ ایسے امیرانہ نہ تھے مگر اپنے نام کے ساتھ "رئیس اعظم" لکھنا شاید وہ اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ ادھیڑ عمر، بھاری بھرکم آدمی تھے۔ گھر سے باہر ذرا کم ہی قدم نکالتے۔ یاں ہر روز تیسرے پہر حویلی کے احاطے میں اپنے احباب کے جھرمٹ میں بیٹھ کر گپیں اڑانا اور زور زور سے قہقہے لگانا ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔

ان کے نام کی وجہ سے اکثر حاجت مند، یتیم خانوں کے ایجنٹ اور طرح طرح کے چندہ اگاہنے والے ان کے دروازے پر سوالی بن کر آیا کرتے۔ علاوہ ازیں جادو کے پروفیسر، رمال، نجومی، نقال، بھانڈ اور اسی قماش کے دوسرے لوگ بھی اپنا ہنر دکھانے اور انعام اکرام پانے کی توقع میں آئے دن ان کی حویلی میں حاضری دیا کرتے۔

جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں ایک بہروپیا بھی طرح طرح کے روپ بھر کر ان کی حویلی میں آیا کرتا۔ کبھی خاکی کوٹ پتلون پہنے، چمڑے کا تھیلا گلے میں ڈالے، چھوٹے چھوٹے شیشوں اور دم

کمانیوں والی عینک آنکھوں پر لگائے جیتی رسالہ بنا ہوا ایک ایک سے ہیر پھیر کے دام وصول کر رہا ہے۔ کبھی جٹاداری سادھو ہے۔ لنگوٹ کسا ہوا جسم پر بھبوت رمائی ہوئی۔ ہاتھ میں لمبا سا چمٹا، سرخ سرخ آنکھیں نکال نکال "بم مہادیو" کا نعرہ لگا رہا ہے۔ کبھی بھنگن کے روپ میں ہے جو سرخ لہنگا پہنے کمر پر ٹوکرا ہاتھ میں جھاڑو لئے جھوٹ موٹ چیز دستوں سے لڑتی جھگڑتی آپ ہی آپ بکتی جھکتی چلی آ رہی ہے۔

میرے ہم جماعتوں میں ایک لڑکا تھا مدن۔ عمر میں تو وہ مجھ سے ایک آدھ برس چھوٹا ہی تھا مگر قد مجھ سے نکلتا ہوا تھا۔ خوش شکل بھولا بھالا۔ مگر ساتھ ہی بچوں کی طرح بلا کا ضدی۔ ہم دونوں غریب ماں باپ کے بیٹے تھے۔ دونوں میں گہری دوستی تھی۔ اسکول کے بعد کبھی وہ میرے محلے میں کھیلنے آ جاتا۔ کبھی میں اس کے ہاں چلا جاتا۔

ایک دن سہ پہر کو میں اور مدن صاحبزادہ صاحب کی حویلی کے باہر سڑک پر گیند سے کھیل رہے تھے۔ کہ ہمیں ایک عجیب سی وضع کا بوڑھا آدمی آتا دکھائی دیا۔ اس نے مہاجنوں کے انداز میں دھوتی باندھ رکھی تھی۔ ماتھے پر صندل کا ٹیکا تھا۔ کانوں میں سنہری بالے، بغل میں ایک لمبی سی سرخ بہی داب رکھی تھی۔ یہ شخص حویلی کے پھاٹک پر پہنچ کر ذرا ٹھٹھکا۔ پھر اندر داخل ہو گیا۔

میں فوراً جان گیا۔ یہ حضرت سوائے بہروپیے کے اور کون ہو سکتے تھے۔ مگر مدن ذرا ٹھٹکا۔ اس نے بہروپیے کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میں نے چھیڑنے کو پوچھا:

"مدن جانتے ہو ابھی ابھی اس حویلی میں کون گیا ہے؟"

"ہاں کیوں نہیں"

"بھلا بتاؤ تو"

"کوئی مہاجن تھا"

"یہاں کیوں آیا؟"

"میں کیا جانوں۔ تمہارے رئیس اعظم نے کچھ قرض ورض لیا ہوگا اس سے۔"

"ارے نہیں پگلے یہ تو بہروپیا ہے بہروپیا!"

"بہروپیا؟" مدن نے کچھ حیرانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "بہروپیا کیا ہوتا ہے؟"

"ارے تم نہیں جانتے۔ یہ لوگ طرح طرح کے روپ بھر کر امیر امرا کو اپنا کمال دکھاتے

ہیں۔ اور ان سے انعام لیتے ہیں۔"

"تو کیا یہ شخص ہر روز آتا ہے؟"

"نہیں مہینے میں بس دو ایک ہی بار۔ روز روز آئے تو لوگ پہچان جائیں۔ بہروپیوں کا کمال تو بس اسی میں ہے کہ ایسا سوانگ رچائیں کہ لوگ دھوکا کھا جائیں اور سچ سمجھنے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ کسی شہر میں دو تین مہینے سے زیادہ نہیں ٹکتے۔"

"کیا ان کو ہر دفعہ انعام ملتا ہے؟"

"نہیں تو۔ یہ جب پندرہ بیس مرتبہ روپ بھر چکتے ہیں تو آخری بار سلام کرنے آتے ہیں۔ بس یہی وقت انعام لینے کا ہوتا ہے۔"

"بھلا کتنا انعام ملتا ہوگا انہیں؟"

"کچھ زیادہ نہیں۔ کہیں سے ایک روپیہ کہیں سے دو روپے اور کہیں سے کچھ بھی نہیں۔ یہ رئیس اعظم صاحب اگر پانچ روپے بھی دے دیں تو بہت غنیمت جانو۔ بات یہ ہے کہ آج کل اس فن کی کچھ قدر نہیں رہی۔ اگلے وقتوں کے امیر لوگ تو اس قسم کے پیشے والوں کو اتنا اتنا انعام دے دیا کرتے تھے کہ انہیں کئی کئی مہینوں روزی کی فکر نہ رہتی تھی۔ مگر آج کل تو یہ بیچارے بھوکوں مر رہے ہوں گے اور۔۔۔"

میں کچھ اور کہنے ہی کو تھا کہ اتنے میں وہی بہروپیا مہاجن بنا ہوا حویلی کے پھاٹک سے نکلا۔ مدن جو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر چونک پڑا۔ بہروپیا ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اور پھر بازار کی طرف چل دیا۔

"بہروپیے کا پیٹھ موڑنا تھا کہ مدن نے اچانک میرا ہاتھ زور سے تھام لیا اور دھیمی آواز میں کہنے لگا:

"اعظم آؤ اس بہروپیے کا پیچھا کریں اور دیکھیں کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ اس کا گھر کیسا ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی میک اپ روم تو ہوگا ہی۔ شاید اس تک ہماری رسائی ہو جائے۔ پھر میں یہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی اصلی صورت میں کیسا لگتا ہے۔"

"مدن دیوانے نہ بنو" میں نے کہا "نہ جانے اس کا ٹھکانہ کدھر ہے۔ ہم کہاں مارے مارے پھریں گے۔ نہ جانے ابھی اس کو اور کن کن گھروں میں جانا ہے۔۔۔"

"مگر مدن نے ایک نہ سنی۔ وہ مجھے کھینچتا ہوا لے چلا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس کے

مزاج میں ظرافت ضد تھی۔ ایسے لوگوں کے سر پر جب کوئی دھن سوار ہو جائے۔ تو جب تک اسے پورا نہ کر لیں نہ خود چین سے بیٹھتے ہیں نہ دوسروں کو چین لینے دیتے ہیں۔ ناچار میں اس کی دوستی کی خاطر اس کے ساتھ ہو لیا۔

گرمیوں کی ایک شام تھی۔ کوئی چھ کا عمل ہوگا۔ اندھیرا ہونے میں ابھی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی دیر باقی تھی۔ میں دل ہی دل میں حساب لگانے لگا۔ ہمارا علاقہ شہر کے عین وسط میں ہے۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے اگر بہروپیے نے آدھے شہر کا احاطہ بھی کر لیا ہو تو ابھی آدھا شہر باقی ہے۔ جہاں اسے اپنے فن کی نمائش کے لئے جانا ضروری ہے۔ چنانچہ اگر دیا ہو تمیں تو دو گھنٹے تو ضرور ہی ہمیں اس کے پیچھے پیچھے چلنا پڑے گا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک سے دوسرے بازار میں گزرتا چلا جا رہا تھا۔ راستے میں جب کوئی کوئی بڑی حویلی یا مکان کا دیوان خانہ نظر آتا تو وہ بلا تکلف اندر داخل ہو جاتا۔ اور کوئی دو تین منٹ باہر اس کا انتظار کرنا پڑتا۔ بعض بڑی بڑی دکانوں میں بھی اس نے حاضری دی مگر وہاں وہ ایک آدھ منٹ سے زیادہ نہ رکا۔

شفق کی سرخی ابھی آسمان پر باقی تھی کہ ان حاضریوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ کیونکہ بہروپیا اب شہر کے دروازے سے باہر نکل آیا تھا اور فصیل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

ہم نے اب تک بڑی کامیابی سے اپنے کو اس کی نظروں سے اوجھل رکھا تھا۔ اس میں بازاروں کی ریل پیل سے ہمیں بڑی مدد ملی تھی۔ مگر اب ہم ایک غیر آباد علاقے میں تھے جہاں اکا دکا آدمی ہی چل پھر رہے تھے۔ چنانچہ ہمیں قدم قدم پر یہ خطرہ تھا کہ کہیں اچانک وہ گردن پھیر کر ہمیں دیکھ لے۔ بہرحال ہم انتہائی احتیاط کے ساتھ اور اس سے کافی دور دور رہ کر اس کا تعاقب کرتے رہے۔

ہمیں زیادہ چلنا نہ پڑا جلد ہی ہم ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں فصیل کے ساتھ ساتھ خانہ بدوشوں اور غریب غربا نے پھونس کے جھونپڑے ڈال رکھے تھے۔ اس وقت ان میں سے کئی جھونپڑوں میں چراغ جل رہے تھے۔ بہروپیا ان جھونپڑوں کے سامنے سے گزرتا ہوا آخری جھونپڑے کے پاس پہنچا جو ذرا الگ تھلگ تھا۔ اس کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ جھونپڑے کے باہر ایک ننھی سی لڑکی جس کی عمر کوئی تین برس ہوگی اور ایک پانچ برس کا لڑکا زمین پر بیٹھے ٹھیکریوں سے کھیل رہے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے بہروپیے کو دیکھا وہ خوشی سے چلانے لگے: ''ابا جی آ گئے ابا جی آ گئے!'' اور وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ بہروپیے نے ان کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ ٹاٹ کا پردہ سرکا کر بچوں سمیت جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ میں نے مدن کی

طرف دیکھا۔

''کہو اب کیا کہتے ہو؟''

''ذرا رکے رہو۔ وہ ابھی مہاجن کا لباس اتار کر اپنے اصلی روپ میں باہر نکلے گا۔ اتنی گرمی میں اس سے جھونپڑے کے اندر کہاں بیٹھا جائے گا۔''

ہم نے کوئی پندرہ بیس منٹ انتظار کیا ہوگا کہ ٹاٹ کا پردہ پھر سرکا۔ اور ایک نوجوان آدمی ململ کی دھوتی کرتا پہنے پٹیاں جمائے سر پر دو پلی ٹوپی ایک خاص انداز سے ترچھی رکھے جھونپڑے سے باہر نکلا۔ بوڑھے مہاجن کی سفید مونچھیں غائب تھیں۔ اور ان کے بجائے چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھیں اس کے چہرے پر زیب دے رہی تھیں۔

''یہ وہی ہے۔'' یکبارگی مدن چلا اٹھا۔ ''وہی قد۔ وہی ڈیل ڈول۔''

اور جب ہم اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے تو اس کی چال بھی ویسی ہی تھی جیسی مہاجن کا پیچھا کرنے میں ہم نے مشاہدہ کی تھی۔ میں اور مدن حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اب کے اس نے یہ کیسا روپ بھرا؟ اس وقت وہ کن لوگوں کو اپنے بہروپ کا کمال دکھانے جا رہا ہے؟

وہ شخص کچھ دور فصیل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر ایک گلی میں ہوتا ہوا دوبارہ شہر کے اندر پہنچ گیا۔ ہم بدستور اس کے پیچھے لگے رہے۔ وہ بازار میں چلتے چلتے ایک پنواڑی کی دکان پر رک گیا۔ ہم سمجھے کہ شاید پان کھانے رکا ہے۔ مگر نہ تو اس نے جیب سے پیسے نکالے اور نہ پنواڑی نے اسے پان ہی بنا کے دیا۔ البتہ ان دونوں میں کچھ بات چیت ہوئی جسے ہم نہیں سن سکے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ پنواڑی دکان سے اتر آیا اور بہروپیا اس کی جگہ گدی پر بیٹھ گیا۔

پنواڑی کے جانے کے بعد اس دکان پر گاہک آنے لگے۔ جن کو اس نے سگرٹ کی ڈبیاں دیں اور پان بنا بنا کے دیئے۔ وہ پان بڑی چابکدستی سے بناتا تھا جیسے یہ بھی کوئی فن ہو۔

ہم کوئی آدھ گھنٹے تک بازار کے نکڑ پر کھڑے یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ اس کے بعد ایک دم ہمیں سخت بھوک لگنے لگی اور ہم وہاں سے اپنے اپنے گھروں کو چلے آئے۔

اگلے روز اتوار کی چھٹی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ صبح آٹھ نو بجے تک سو کر کل کی تکان اتاروں گا۔ مگر ابھی نور کا تڑکا ہی تھا کہ کسی نے میرا نام لے لے کر پکارنا اور دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نیچے گلی میں جھانک کر دیکھا تو مدن تھا۔

میں پیچ و تاب کھاتا سیڑھیوں سے اترا۔

"اسلم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"کہاں کیا بات ہے؟"

"جلدی کرو۔ کہیں بہروپیا صبح ہی صبح گھر سے نہ چل دے۔"

"مدن تم بھی کمال کرتے ہو۔ اب اس کا خیال چھوڑ دو مدن۔ پھر رات تم نے اسے دیکھ بھی تو لیا تھا۔"

"وہ میں نے بہروپیے کو تھوڑا ہی دیکھا تھا۔ وہ تو چودھری تھا۔"

اور اس نے مجھے ایسی التجا بھری نظروں سے دیکھا کہ میرا دل فوراً پسیج گیا۔

جب ہم گلی دروازے کی جانب تیز تیز قدم اٹھاتے فصیل کی طرف جا رہے تھے تو مدن نے مجھے بتایا کہ رات بھر وہ بہروپیے کو خواب میں طرح طرح کے روپ میں دیکھتا رہا۔ پھر صبح کو چار بجے کے قریب آپ ہی آپ اس کی آنکھ کھل گئی اور اس کے بعد پھر اسے نیند نہ آئی۔

ابھی سورج نکلنے نہیں پایا تھا کہ ہم بہروپیے کے جھونپڑے کے پاس پہنچ گئے۔ پچھلی رات ہم اندھیرے میں اس علاقے کا کچھ جائزہ لے گئے تھے۔ مگر اب دن کی روشنی میں ہمیں ان جھونپڑوں کے مکینوں کی غربت اور خستہ حالی کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔ بہروپیے کے جھونپڑے پر ٹاٹ کا جو پردہ پڑا تھا اس میں بھی کئی پیوند لگے تھے۔

ہم دو تین بار اس کے جھونپڑے کے سامنے سے گزرے۔ ہر بار ہمیں اندر سے بچوں کی آوازیں اور ایک نسوانی آواز ان کے ساتھ ملی ہوئی سنائی دیں۔ آخر کوئی دس منٹ کے بعد ایک شخص سیدھا سادا تہمد باندھے، بنیان پہنے ایک ہاتھ میں گڑوی تھامے جھونپڑے سے برآمد ہوا۔ اس کی داڑھی مونچھ صاف تھی۔ سانولا رنگ۔ اس کو دیکھ کر اس کی عمر کا صحیح اندازہ کرنا مشکل تھا۔

وہ شخص آگے آگے اور ہم اس کے پیچھے پیچھے بچ بچ کر فصیل کے ساتھ ساتھ چلے۔ آگے ایک باڑا آیا جس میں کچھ گائیں بھینسیں کھونٹوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ وہ شخص اس باڑے کے اندر چلا گیا۔ اور میں اور مدن باہر ہی اس کی نظروں سے اوجھل ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ جہاں سے ہم اس کی حرکات و سکنات کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ اس نے ایک بھینس کو پچکارا۔ پھر وہ زمین پر بیٹھ کر اس کے تھنوں کو سہلانے لگا۔ اس کو دیکھ کر ایک بڈھا جو بھینسوں کے پاس ایک چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا، ایک بڑی سی بالٹی لے آیا۔ اب اس شخص نے بھینس کو دوہنا شروع کیا۔ ہم اگرچہ اس سے دور کھڑے تھے مگر دودھ کی دھاروں کی آواز دھیمی دھیمی سن سکتے تھے۔

جب وہ ایک بھینس کو دوہ چکا تو دوسری کی طرف گیا۔ پھر تیسری کی طرف۔ اس کے بعد گائیوں کی باری آئی اور اس نے دو تین گائیوں کو بھی دوہا، جن کے دودھ کے لئے بڈھے نے ایک اور بالٹی لا کر رکھ دی تھی۔

اس کام میں کوئی ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ بڈھے نے اس کی گڑوی کو دودھ سے بھر دیا۔ جسے لے کر وہ باڑے سے نکل آیا۔ ہم پہلے ہی وہاں سے کھسک لئے تھے۔ جب وہ ذرا دور چلا گیا تو میں نے مدن کو چھیڑنے کے لئے کہا:

"لو اب تو حقیقت کھل گئی تم پر۔ چلو اب گھر چلیں۔ ناحق تم نے میری نیند خراب کی۔"

"مگر بھیا وہ بہروپیا کہاں تھا۔ وہ تو گوالا تھا گوالا۔ آؤ تھوڑی دیر اور اس کا پیچھا کریں۔"

میں نے مدن سے زیادہ حجت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتے رہے۔ ہم نے اس کا ٹھکانا تو دیکھ ہی لیا تھا۔ اب وہ ہماری نگاہوں سے کہاں چھپ سکتا تھا۔

جب ہمیں اس کے جھونپڑے کے آس پاس گھومتے آدھ گھنٹہ ہو گیا تو ہمیں ایک تانگہ فصیل کے ساتھ والی سڑک پر تیزی سے ادھر آتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ تانگہ بہروپیے کے جھونپڑے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ اس میں کوئی سواری نہ تھی۔ جو شخص تانگہ چلا رہا تھا اس نے تانگے کی گھنٹی پاؤں سے دبا کر بجائی۔ اس کی آواز سنتے ہی ایک آدمی جھونپڑے سے نکلا جس نے کوچوانوں کا سا خاکی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کو دیکھ کر تانگے والا تانگے سے اتر پڑا۔ اور یہ شخص تانگے میں آ بیٹھا اور راسیں تھام گھوڑے کو بڑی مہارت سے ہانکنے لگا۔ جیسے ہی تانگہ چلا پہلے شخص نے پکار کر کہا:

"تانگہ ٹھیک دو بجے اڈے پر لے آنا۔"

دوسرے شخص نے گردن ہلائی۔ اس کے بعد ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ تانگہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں اور مدن یہ ماجرا دیکھ کر ایسے حیران ہوئے کہ کچھ دیر تک ہماری زبان سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ آخر مدن نے سکوت کو توڑا۔

"چلو یہ تو معلوم ہو گیا کہ یہ شخص دو بجے تک کیا کرے گا۔ اتنی دیر تک ہمیں بھی چھٹی ہو گئی۔ اب ہمیں ڈھائی تین بجے تک یہاں پہنچ جانا چاہیے۔"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ سچ یہ ہے کہ اس بہروپیے کے معاملے سے اب خود مجھے بھی بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اور میں اس کی اصلیت جاننے کے لئے اتنا ہی بے تاب ہو گیا تھا جتنا کہ مدن۔

ہم لوگ کھانے پینے سے فارغ ہو کر تین بجے سے پہلے ہی پھر بہروپیے کے جھونپڑے کے آس پاس منڈلانے لگے۔ جھونپڑے کے اندر سے بچوں اور عورتوں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی کسی مردانہ آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ اس سے ہم نے اندازہ کر لیا کہ بہروپیا گھر واپس پہنچ گیا ہے۔

ہمیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا اور اب کے بہروپیا ایک اور ہی دھج سے باہر نکلا۔ اس نے لمبا سیاہ چغہ پہن رکھا تھا۔ سر پر کالی پگڑی جو بڑی خوش اسلوبی سے باندھی گئی تھی۔ گلے میں رنگ برنگی تسبیحیں۔ ترشی ہوئی سیاہ داڑھی۔ شانوں پر زلفیں بکھری ہوئی۔ اس نے بغل میں لکڑی کی ایک سیاہ صندوقچی داب رکھی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج اس نے صوفی درویش کا سوانگ بھرا ہے۔ مگر ابھی کل ہی تو وہ اسی روپ میں شہر کا دورہ کر چکا تھا اور کوئی نیا روپ بھرنے کے لئے اسے دو تین دن کا وقفہ درکار تھا۔ پھر آج کس لئے اس نے یہ وضع بنائی ہے؟ اس سوال کا ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ چنانچہ ہم چپکے چپکے اس کے پیچھے پیچھے رہے۔

وہ شخص جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا شہر میں داخل ہو گیا۔ وہ کئی بازاروں میں سے گزرا۔ مگر خلاف معمول وہ کسی حویلی یا دکان پر نہیں رکا۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج اسے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے اور داد پانے کا کچھ خیال نہیں ہے۔

تھوڑی دیر میں ہم جامع مسجد کے پاس پہنچ گئے۔ جو شہر کے بیچوں بیچ واقع تھی اور جس کے آس پاس ہر روز پیر بازار لگا کرتا تھا اور اتوار کو تو وہاں بہت ہی چہل پہل رہا کرتی تھی۔ میلہ سا لگ جاتا تھا۔ پھیری والے ہانک لگا لگا کے طرح طرح کی چیزیں بیچتے تھے۔ بچوں کے سلے سلائے کپڑے، چھتریاں، ٹوپیاں، کنگھیاں، آئینے، ازار بند، عطر، چٹکلے، اگربتی، مچھلی مارنے کے پھندے، مٹھائیاں، چاٹ۔ علاوہ ازیں تعویذ گنڈے والے، جڑی بوٹی والے اور ایسے ہی اور پیشے والے اپنی الگ وضع اور اپنی مخصوص صدا سے اس بازار کی رونق بڑھاتے تھے۔

ہمارا بہروپیا بھی خاموشی سے ان لوگوں میں آ کر شامل ہو گیا۔ اس نے اپنی سیاہ صندوقچی کھول کر دونوں ہاتھوں میں تھام لی۔ اس صندوقچی میں بہت سی چھوٹی چھوٹی شیشیاں قرینے سے رکھی تھیں۔ اس نے کچھ شیشیاں صندوقچی کے ڈھکنے پر بھی جما دیں۔ پھر بڑے گمبھیر لہجے میں صدا لگانی شروع کی:

''آپ کی آنکھوں میں دھند ہو، لالی ہو، خارش ہو، گکرے ہوں، جالا ہو، کمزوری ہو، پانی بہتا ہو، رات کو نظر نہ آتا ہو تو میرا اپنا بنایا ہوا خاص سرمہ ''نین سکھ'' استعمال کیجئے۔

''اس کا نسخہ مجھے مکہ شریف میں ایک درویش بزرگ سے دستیاب ہوا تھا۔ خدمت خلق کے خیال سے قیمت بہت ہی کم رکھی گئی ہے۔ یعنی صرف چار آنے فی شیشی۔

''یہ سرمہ اسم بامسمیٰ ہے۔ اس کے لگاتے ہی آنکھوں میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔ آئیے ایک سلائی لگوا کر آزمائش کر لیجیے۔ اس کے کچھ دام نہیں۔

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا''

میں اور بدن حیرت زدہ ہو کر بہروپیے کو دیکھنے لگے۔ ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا۔ مگر اس نے سچ مچ سرمہ فروشی شروع کر دی تھی۔ دو تین آدمی اس کے پاس آ کھڑے ہوئے اور اس سے باری باری آنکھوں میں سرمے کی سلائی لگوانے لگے۔

ہم جلد ہی وہاں سے رخصت ہو گئے۔ ہم نے بہروپیے کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

جوار بھاٹا

ایک شجرۂ نسب

بگھو

باپ کا نام باوجود تحقیق بسیار معلوم نہ ہو سکا۔ کسی گاؤں میں کبابی کی دکان کرتے تھے۔

شیخ مسیتا

بگھو کے بیٹے۔ شہر میں پان سگرٹ کی دکان تھی پھر عطاری کرنے لگے۔

حکیم عمر دراز

شیخ مسیتا کے بیٹے۔ ان پڑھ تھے مگر ساری عمر حکمت کرتے رہے۔ بلا کے ذہین تھے۔ اگر تعلیم سے بہرہ یاب ہوتے تو نہ جانے کیا کیا کمالات ان کی ذات سے ظہور میں آتے۔ کہتے ہیں انہیں کیمیا بنانے کا شوق تھا جو جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ جو کچھ کماتے اسی کی نذر ہو جاتا مگر آخری عمر میں انہوں نے کیمیا گری سے توبہ کر لی۔

چودھری شمس الدین

حکیم عمر دراز کے بیٹے۔ پرائمری کی تین جماعتوں تک تعلیم پائی۔ ان کا شمار شہر کے بڑے ٹھیکیداروں میں ہوتا تھا۔ خاصی دولت کمائی اور صاحب جائیداد بھی ہوئے۔

حاجی شجاعت احمد

چودھری شمس الدین کے بیٹے۔ انٹرنس تک تعلیم پائی۔ مدتوں ایک سرکاری دفتر میں کلرکی کرتے رہے۔ اسی دفتر میں ترقی کرتے کرتے
سپرنٹنڈنٹ ہو گئے۔ پنشن لی۔ حج کو گئے۔

[نوٹ ان کے وقت سے اس خاندان کے ہاتھ سے کاروبار نکل گیا۔ اور اس کے افراد ملازمت کے رشتے میں منسلک ہونے لگے]

قاری غوث محمد

حاجی شجاعت احمد کے بیٹے۔ ابھی کالج میں زیر تعلیم ہی تھے کہ حاجی صاحب نے اپنے رسوخ سے کام لے کر انہیں ریلوے گارڈ کی نوکری دلوا دی۔ بڑے خوش الحان واقع ہوئے تھے۔ کالج کے زمانے میں قرأت بھی سیکھی تھی جس کی وجہ سے قاری کہلائے۔ نماز بھی قضا نہ ہونے دی۔ اس کی وجہ بعض لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ ریل کی نوکری نے انہیں وقت کا بہت پابند بنا دیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب!

خان صاحب غضنفر علی شاہ سب انسپکٹر پولیس

قاری غوث محمد کے بیٹے۔ بی اے تک تعلیم پائی۔ بعد میں پھلور جا کر پولیس کی ٹریننگ حاصل کی۔ بہت بارعب اور وجیہ تھے۔ مزاج بلا کا غصیلا تھا۔ بات بات پر ماتحتوں پر لال پیلے ہوتے تھے۔ بڑے دلاور اور کس بل والے تھے۔ بڑے بڑے نامی ڈاکوؤں کو کمال شجاعت سے گرفتار کیا تھا۔ شہر کے سارے بدمعاش اور اٹھائی گیرے ان کے نام سے کانپتے تھے۔ ان کی دلاوری کے قصے اکثر تھانے کے سپاہیوں کے گھروں میں مشہور تھے۔ مگر ان کی بدمزاجی اور کثرت شراب نوشی کے باعث افسران بالا ان سے ناخوش رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تھانیداری سے آگے ترقی نہ کر سکے۔ ان کی قومیت ہمیشہ ایک معمہ بنی رہی۔ جہلا انہیں "غضنفر علی شاہ سید بادشاہ" کہہ کر پکارتے جس کی وہ کبھی تردید نہ کرتے۔ خود وہ اپنے دستخط "خان صاحب غضنفر علی" کیا کرتے تھے۔

شیخ تراب علی چشتی صابری بی اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ

خان صاحب غضنفر علی شاہ سب انسپکٹر پولیس کے بیٹے۔ شہر کے قابل ترین وکلاء میں گنے جاتے تھے۔ بڑے خوش طبع اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔ ظریفانہ اشعار بھی کہا کرتے تھے قابلیت سے کہیں زیادہ ان کی بذلہ سنجی ان کی کامیابی کا باعث ہوئی۔ انہوں نے اپنے پیشے کی مصلحتوں کو نظر میں رکھ کر اپنے نام کے ساتھ شیخ لکھنا زیادہ مناسب سمجھا۔ ایک اہل حال بزرگ کی نظر کرم نے چشتی صابری بھی

بنا دیا۔

ڈاکٹر تحسین علی ایم۔بی۔بی۔ایس فزیشن اینڈ سرجن

شیخ تراب علی صابری بی۔اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ کے بیٹے۔ہر چند والد کا پیشہ وکالت تھا مگر انہوں نے ڈاکٹری کو ترجیح دی۔شاید سبب یہ ہو کہ ان کے جد امجد حکیم عمر دراز خلقت میں بڑا نام پیدا کر چکے تھے۔چنانچہ انہوں نے بھی اپنے مورث اعلیٰ کے نقش قدم پر چل کر خلق خدا کی خدمت میں عمر بسر کر دی۔

مسٹر الیاس ہارون بار ایٹ لا

ڈاکٹر تحسین علی ایم۔بی۔بی۔ایس فزیشن اینڈ سرجن کے بیٹے۔ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔پہلے وکالت کی ڈگری حاصل کی۔پھر ولایت جا کر بیرسٹری پاس کی۔خاندان کو عزت اور شہرت دینے کا موجب ہوئے۔دولت بھی خوب کمائی۔

خان بہادر میاں رکن الدین ممبر لیجسلیٹو کونسل

مسٹر الیاس ہارون بار ایٹ لا کے بیٹے۔ان کی عمر کا بیشتر حصہ سیاسی جدوجہد میں گزرا۔ہر چند زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے مگر اپنی خداداد ذکاوت و ذہانت کے باعث خاندان کا نام خوب روشن کیا۔

ابھی نوعمر ہی تھے کہ خدمت وطن کا جذبہ ایک جنون بن کر سر میں سما گیا اور وہ کالج کو خیرباد کہہ ایک اصلاحی جماعت میں بطور رضاکار بھرتی ہو گئے اور دیہات میں جا جا کر تقریریں کرنے لگے۔اس طرح چار پانچ برس میں خطابت کی بہت اچھی مشق بہم پہنچا لی۔شہر واپس آئے تو پورے لیڈر بن چکے تھے۔آواز قدرتی طور پر گمبھیر اور سریلی تھی۔اپنی تقریروں میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے اردو فارسی کے موزوں اشعار بڑی خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے۔ان کا یہ انداز خطابت سامعین کو بہت متاثر کرتا تھا۔اتفاق سے اس زمانے میں ملک میں لیڈری کا بازار بھی خوب گرم تھا۔بیکار مباش کچھ کیا کر کے مصداق میونسپل کمیٹی کی ممبری کے لئے کھڑے ہوئے۔مگر کامیابی نہ ہوئی ہر چند ووٹ خاصے حاصل کر لئے تھے۔اس سے دل میں قدرے مطمئن تھے۔اگلی مرتبہ پھر الیکشن کے لئے اپنا نام پیش کیا۔اب کے حفظ ماتقدم کے طور پر تین ماہ قبل ایک ہفتہ وار اخبار نکال لیا تھا جس میں اپنے حریفوں پر خوب خوب چوٹیں کیں اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا۔پھر کیا تھا اللہ نے کامیاب کر دیا۔ہوتے ہوتے لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بھی ہو گئے۔سرکار نے "خان بہادر" کا خطاب دیا۔سر بھی کہلائے۔

(نوٹ: ان کے وقت سے اس خاندان کے افراد سرکاری خطابات سے نوازے جانے لگے۔)

آنریبل سردار انگلو چیف جسٹس ہائی کورٹ

خان بہادر میاں رکن الدین ممبر لیجسلیٹو کونسل کے صاحبزادے۔ان کا زمانہ نسبتاً پرامن رہا۔انہیں زیادہ جدوجہد کرنی پڑی کیوں کہ خاندان کی شہرت اور باپ کی خدمات کے باعث انہیں ہر جگہ ہر دل عزیزی حاصل ہوئی اور سرکار نے بھی ان کی قدر و منزلت کی۔ان کے زمانے میں خاندان کی دولت و ثروت میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

رائٹ آنریبل سر جمشید جاہ بہادر پی۔سی۔، کے۔سی۔ایس۔آئی۔، کے۔سی۔آئی۔ای۔، گورنر۔۔۔

آنریبل سردار انگلو چیف جسٹس ہائی کورٹ کے فرزند ارجمند۔انہوں نے خاندان کے نام کو شہرت و جلال کے اوج کمال پر پہنچا دیا۔

خان بہادر صوفی بیدار بخت بی۔اے۔جاگیردار

رائٹ آنریبل سر جمشید جاہ بہادر پی۔سی۔، کے۔سی۔ایس۔آئی۔، کے۔سی۔آئی۔ای۔ کے فرزند دلبند۔بی۔اے تک تعلیم پائی۔بچپن ہی سے عزلت پسند اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے۔مذہب کی طرف رجحان زیادہ تھا۔خدا کا دیا سب کچھ تھا۔نہ اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ جانے کی ضرورت تھی نہ ملازمت کی حاجت۔عمر بھر گوشہ نشین ہو کر یاد الٰہی میں مصروف رہے۔سرکار نے ان کی امید اور مرضی کے خلاف انہیں "خان بہادر" کا خطاب دے دیا۔اسی میں رضائے الٰہی سمجھ کر خاموش ہو رہے۔

صاحبزادہ نسیم عرف چھوٹے مرزا رئیس اعظم

خان بہادر صوفی بیدار بخت بی۔اے۔جاگیردار کے بیٹے۔انٹرنس تک تعلیم پائی۔پھر اپنی جاگیر کا انتظام کرنے لگے۔باپ کی طرح انہوں نے بھی کسی قسم کی ملازمت کو اپنے لئے حرام جانا اور آخر ضرورت بھی کیا تھی۔خوب رئیسانہ ٹھاٹھ سے رہے۔بہت خوش وضع اور نفاست پسند تھے۔کہتے ہیں جیسا کھانا انہوں نے کھایا اور جیسا کپڑا انہوں نے پہنا کم ہی کسی رئیس کو نصیب ہوا۔

اپنے نام میں "مرزا" کا اضافہ سب سے پہلے انہوں نے ہی کیا۔

ابو الخیال مرزا ایکل

صاحبزادہ نسیم عرف چھوٹے مرزا رئیس اعظم کے بیٹے۔آٹھویں جماعت میں فیل ہونے کے

بعد ولی تعلیم سے ایسا اچاٹ ہوا کہ پھر اسکول کا رخ نہ کیا۔ شاعری سے بچپن سے لگاؤ تھا۔ دو چار شاعر ہر وقت ان کی مصاحبت میں رہتے تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے۔ مشہور تھا کہ فیضان شعری کی حالت میں چادر اوڑھ کر چارپائی پر لیٹ جاتے اور گھنٹوں لوٹتے پوٹتے رہتے اور جب تک غزل پوری نہ ہو جاتی چارپائی سے نہ اٹھتے۔

"نوائے بیگل" کے نام سے ایک دیوان بہت سا روپیہ خرچ کر کے اعلیٰ آرٹ پیپر پر سنہری روشنائی سے چھپوایا جس میں عربی فارسی اردو اور بھاشا چاروں زبانوں کا کلام جمع کیا گیا تھا۔ یہ دیوان اب نایاب ہے۔

خدا مغفرت کرے بڑے مرنجاں مرنج علم دوست بزرگ تھے۔ اپنی زندگی میں قلمی کتب اور پرانی تصاویر کا بڑا نادر ذخیرہ جمع کیا تھا۔ نہ معلوم ان کے انتقال کے بعد اس کا کیا حشر ہوا۔

ننھے مرزا

ابوالاقبال مرزا بیگل کے صاحبزادے۔ واجبی تعلیم پائی۔ انگریزی سے بالکل کورے ہیں۔ والد کی بے حد خواہش تھی کہ انہیں بھی شعر و سخن سے لگاؤ پیدا ہو تاکہ خاندان میں شمع سخن روشن رہے۔ مگر ان کو شاعری سے کبھی مس نہ تھا۔ ان کا رجحان بچپن سے موسیقی کی طرف تھا۔ باپ کی خفگی کے باوجود ملک کے نامی گرامی گویوں کو بلوا کر ان سے فن موسیقی سیکھتے رہے۔ سات مرتبہ گوالیار کا سفر اختیار کر کے تان سین کی قبر پر گئے اور ہر مرتبہ املی کے درخت کا پتا توڑ کر کھایا جو اس کی قبر پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ پہلے کئی برس تک گانا سیکھتے رہے۔ مگر چونکہ آواز بہت اچھی نہ تھی اس لئے استادوں کے مشورے سے گانا ترک کر کے ستار کا شوق کرتے رہے۔ انہیں لے اور تال کا بڑا گیان تھا۔ کہتے ہیں کہ سوتے میں ان کے داہنے پاؤں کا انگوٹھا تال دیتا رہتا تھا

ان کے پاس پرانے وقتوں کا ایک طنبورہ تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ محمد شاہی دربار کے گویے نعمت علی خاں سدا رنگ کا ہے۔ بیس سال ہوئے انھوں نے موسیقی کے بارے میں ایک کتاب بھی "صدائے دل نشیں" کے نام سے تصنیف کی تھی مگر چھپنے سے پہلے ہی اس کا مسودہ شاید ان کا کوئی دوست چرا لے گیا۔ اس صدمے نے مرزا کی کمر توڑ ڈالی اور یہ چند ہی روز بعد انتقال کر گئے۔

لاڈلے مرزا

ننھے مرزا کے فرزند دلبند۔ صرف قاعدہ پڑھ کر رہ گئے۔ بہت لاابالی طبیعت کے آدمی تھے۔ ایک دفعہ ایک فلم دیکھنے گئے۔ اس میں للی نامی ایک حسین اور طرحدار ایکٹرس نے کام کیا تھا۔ یہ

اس پر ریجھ گئے اور اسے اپنے عقد میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ بہت سی دولت خرچ کر کے اس تک رسائی حاصل کی۔ بڑے بڑے گراں قدر تحائف اسے پیش کیے۔ یہاں تک کہ اس کے نام سے ایک فلم کمپنی بھی قائم کر دی۔ آخر للی شادی پر آمادہ ہو گئی۔ شادی کے دوسرے ہی برس فلم کمپنی فیل ہو گئی اور للی کسی ایکٹر کے ساتھ بھاگ گئی۔ للی کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جسے وہ مرزا ہی کے پاس اپنی نشانی کے طور پر چھوڑ گئی تھی۔ اس کی پرورش کے لئے نرس رکھی گئی۔

مرزا کی بیشتر جائیداد للی کے عشق کی نذر ہو گئی تھی۔ بس لے دے کر ایک مکان اور چند دکانیں رہ گئی تھیں ان کے کرائے پر گزر اوقات کرنے لگے تھے۔

محمد شفیع

لاڈلے مرزا کے بیٹے۔ اسٹیشن کے قریب ایک چھوٹے سے ہوٹل کے مالک ہیں۔ بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ سنا ہے کہ اب انھوں نے چوری چھپے شراب کی بکری شروع کر دی ہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔

یہ پری چہرہ لوگ

پت جھڑ کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ بیگم بلقیس تراب علی ہر سال کی طرح اب کے بھی اپنے بنگلے کے باغیچے میں مالی سے پودوں اور پیڑوں کی کاٹ چھانٹ کرا رہی تھیں۔ اس وقت دن کے کوئی گیارہ بجے ہوں گے۔ سیٹھ تراب علی اپنے کام پر اور لڑکے لڑکیاں اسکولوں اور کالجوں میں جا چکے تھے۔ چنانچہ بیگم صاحب بڑی بے فکری کے ساتھ آرام کرسی پر بیٹھی مالی کے کام کی نگرانی کر رہی تھیں۔

بیگم تراب علی کو نگرانی کے کاموں سے ہمیشہ بڑی دلچسپی رہی تھی۔ آج سے چودہ سال پہلے جب ان کے شوہر نے جو اس وقت محض تراب علی تھے نہ کہ سیٹھ تراب علی کہلاتے تھے اور سرکاری تعمیرات کے ٹھیکے لیا کرتے تھے۔ اس نواح میں بنگلہ بنوانا شروع کیا تھا تو بیگم صاحب نے اس کے تعمیرات کے کام کی بڑی کڑی نگرانی کی تھی اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ یہ بنگلہ بڑی کفایت کے ساتھ اور تھوڑے ہی دنوں میں بن کر تیار ہو گیا تھا۔

بیگم تراب علی کا ڈیل ڈول مردوں جیسا تھا۔ آواز اونچی اور گمبھیر اور رنگ سانولا جو غصے کی حالت میں سیاہ پڑ جایا کرتا۔ چنانچہ نوکر چاکر ان کی ذات سے تھر تھر کانپتے اور گھر بھر پر سناٹا چھا جاتا۔ ان کی اولاد میں سے تین لڑکے اور دو لڑکیاں سن بلوغت کو پہنچ چکے تھے مگر کیا مجال جو ماں کو پلٹ کر جواب دے لیں یا نظر ملا کر بات ہی کر سکیں۔ اور تو اور خود سیٹھ تراب علی بیوی کے کاموں میں

دخل دینا یا اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ بیگم صاحب پورے خاندان پر ایک ملکہ کی طرح حکمراں تھیں۔ عمر اور خوش حالی کے ساتھ ساتھ ان کی فربہی بھی بڑھتی جا رہی تھی اور فربہی کے ساتھ رعب اور دبدبہ بھی۔

ان چودہ برس میں جو انہوں نے اس نواح میں گزارے تھے وہ یہاں کے قریب قریب بھی رہنے والوں سے بخوبی واقف ہو گئی تھیں۔ بعض گھروں سے میل ملاپ بھی تھا اور کچھ بی بیوں سے دوستی بھی۔ وہ اس علاقے کے حالات سے خود کو باخبر رکھتی تھیں۔ یہاں تک کہ املاک کی خرید و فروخت اور بنگلوں میں نئے کرایہ داروں کی آمد اور پرانے کرایہ داروں کی رخصت کی بھی انہیں پوری خبر رہتی تھی۔

اس وقت بیگم تراب علی کی تیز نظروں کے سامنے مالی کا ہاتھ بڑی پھرتی سے چل رہا تھا۔ اس نے پودوں اور چھوٹے چھوٹے پیڑوں کی کاٹ چھانٹ تو قینچی سے کھڑے کھڑے ہی کر ڈالی تھی اور اب وہ اونچے اونچے درختوں پر چڑھ کر بیگم صاحب کی ہدایت کے مطابق سوکھے یا زائد ٹہنے کلہاڑی سے کاٹ کاٹ کر نیچے پھینک رہا تھا۔

کچھ دیر بعد بیگم صاحب بیٹھے بیٹھے تھک گئیں اور کرسی سے اٹھ کر بنگلے کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگیں۔ بنگلے کے آگے کی دیوار کے ساتھ ساتھ جو پیڑ تھے ان میں دو ایک تو خاصے بڑے تھے جن کی چھاؤں گھنی تھی خاص کر ولایتی بادام کا پیڑ۔ اس کا سایہ نصف بنگلے کے اندر اور نصف باہر سڑک پر رہتا تھا۔ دن کو جب دھوپ تیز ہو جاتی تو کبھی کبھی کوئی راہگیر یا خوانچے والا ذرا دم لینے کو اس کے سائے میں بیٹھ جایا کرتا تھا۔

بیگم بلقیس تراب علی جیسے ہی اس پیڑ کے پاس پہنچیں ان کے کان میں دیوار کے باہر سے کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ انہوں نے اس آواز کو فوراً پہچان لیا۔ یہ اس علاقے کی مہترانی مگو کی آواز تھی جو اپنی بیٹی جگو سے بات کر رہی تھی۔ یہ ماں بیٹیاں بھی اکثر دوپہر کو اسی پیڑ کے نیچے ستانے یا ناشتہ پانی کرنے بیٹھ جایا کرتی تھیں۔

بیگم بلقیس تراب علی نے پہلے تو ان کی باتوں کی طرف دھیان نہ دیا۔ مگر یکا یکی ان کے کان میں کچھ ایسے الفاظ پڑے کہ وہ چونک اٹھیں۔ مگو اپنی بیٹی سے پوچھ رہی تھی:

”کیوں ری تو نے خوجے والی کے ہاں کام کر لیا تھا؟“

”ہاں“ جگو نے اپنی مہین آواز میں جواب دیا۔

"اور کھلونے والی کے ہاں؟"

"وہاں بھی۔"

"اور چپ دق والی کے ہاں؟"

اب کے مکو کی آواز سنائی نہ دی۔ شاید اس نے سر ہلا دینے ہی پر اکتفا کیا ہوگا۔

"اور کالی میم کے ہاں؟"

اب تو بیگم تراب علی سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ بے اختیار پکار اٹھیں:

"مکو۔ اری او مکو۔ ذرا اندر تو آئیو۔"

مکو کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس کی باتیں کوئی سن رہا ہوگا۔ خصوصاً بیگم تراب علی جن کی سخت مزاجی اور غصے سے اس کی روح کانپتی تھی۔ وہ پہلے تو سہم سی گئی۔ پھر مری ہوئی آواز میں بولی:

"ابھی آئی بیگم صاحب!"

تھوڑی دیر بعد وہ آنچل کو چہرے سے ہٹاتی، دبکا ہلاتی، بنگلے کا پھاٹک کھول اندر آئی۔ مکو اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ دونوں ماں بیٹیوں کے کپڑے میلے چکٹ ہو رہے تھے۔ دونوں نے سر میں سرسوں کا تیل خوب لیسا ہوا تھا۔

"سلام بیگم صاحب!" مکو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ابھی تک اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ کس قصور کی پاداش میں بیگم صاحب کے حضور پیش ہونا پڑا۔

بیگم صاحب نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا:

"کیوں ری مردار یہ تو باہر بیٹھی کن لوگوں کے نام لے رہی تھی؟"

"کیسے نام بیگم صاحب؟"

"اری تو کہہ رہی تھی نا طوطے والی، کھلونے والی، چپ دق والی، کالی میم؟"

مکو نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"وہ تو بیگم صاحب ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے۔"

"دیکھ مکو سچ سچ بتا دے ورنہ میں جیتا نہ چھوڑوں گی۔"

مکو پل بھر خاموش رہی۔ اس نے جان لیا کہ بیگم صاحب سے بات چھپانی مشکل ہوگی اور اس نے بڑی لجاجت سے کہنا شروع کیا

"وہ بات یہ ہے بیگم صاحب ہم لکھت پڑھت تو جانتے نہیں اور ہم کو لوگوں کے نام بھی معلوم نہیں۔ سو ہم نے اپنی آسانی کے لئے ان کے نام رکھ لیے ہیں۔"

"اچھا تو یہ طوطے والی کون ہے؟"

"وہ جو بڑا سا گھر ہے نا اگلی گلی میں نکڑ والا۔۔۔"

"فاروقی صاحب کا؟"

"جی بیگم صاحب وہی۔ ان کی بیوی نے طوطا پال رکھا ہے۔ ہم ان کو آسانی کے لیے طوطے والی کہتے ہیں۔"

"اور یہ کھلونے والی کون ہے؟"

"وہ جو میت کے برابر والے بنگلے میں رہتی ہیں۔"

بیگم تراب علی نے اس علاقے کا نقشہ ذہن میں جمایا اور ذرا دیر غور کیا۔ پھر بولیں:

"اچھا بخش الہی صاحب کا مکان؟"

"جی سرکار وہی۔"

"اری کم بخت تو ان کی بیگم کو "کھلونے والی" کیوں کہتی ہے۔ جانتی بھی ہے وہ تو لکھ پتی ہیں لکھ پتی۔ کھلونے تھوڑا ہی بیچتے ہیں۔"

"جب دیکھو ان کی کوٹھی میں ہر طرف کھلونے ہی کھلونے بکھرے رہتے ہیں۔ بہت بڑھیا بڑھیا کھلونے۔ یہ بڑے بڑے ہوائی جہاز۔ چلنے والی باتیں کرنے والی گڑیا۔ بجلی کی ریل گاڑی، موٹریں۔۔۔"

"اری موئی یہ کھلونے تو وہ خود اپنے بچوں کے کھیلنے کے لیے ولایت سے منگواتے ہیں بیچتے تھوڑا ہی ہیں۔"

"ہم تو آسانی کے لیے کہتے ہیں بیگم صاحب۔"

"اور یہ کالی میم کس بی صاحبہ کا خطاب ہے؟"

"وہ جو کرستان رہتے ہیں نا۔۔۔"

"مسز ڈی کھوری؟"

"جی ہاں وہی۔"

"ہے کم بخت تیرا ناس جائے۔۔۔ اور چپ دق والی کون ہے؟"

"ادھر کو" سکو نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بڑی سڑک پر جو پتلی گلی ہے کونے والا جو گھر ہے اس میں ہر وقت ایک عورت پلنگ پر پڑی رہتی ہے اور پچ پر بہت سی دواؤں کی شیشیاں نظر آتی ہیں۔"

بیگم صاحب بے اختیار مسکرا دیں۔ ان کا غصہ اب تک اتر چکا تھا اور وہ سکو کی باتوں کو بڑی دلچسپی سے سن رہی تھیں کہ اچانک ایک بات ان کے ذہن میں آئی اور ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ڈانٹ کر بولیں:

"کیوں ری مردار تو نے میرا بھی تو کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھا ہوگا۔ بتا کیا نام رکھا ہے؟ سچ سچ بتا دیجیو نہیں تو مارتے مارتے کس نکال دوں گی۔"

سکو ذرا جھجکی مگر فوراً ہی سنبھل گئی۔

"بیگم صاحب چاہے ماریے چاہے جان سے چھوڑ دیجیے ہم تو آپ کو بیگم صاحب ہی کہتے ہیں۔"

"چل جھوٹی مکار۔"

"میں جھوٹ نہیں بولتی سرکار چاہے جس کی قسم لے لیجیے۔۔۔ کیوں ری جگو۔ ہم بیگم صاحب کو بیگم صاحب ہی کہتے ہیں نا؟"

جگو نے ماں کی طرف دیکھا اور جلدی سے منہ ہلا دی۔

"مجھے تو تم ماں بیٹیوں کی بات پر یقین نہیں آتا" بیگم تراب علی بولیں۔ اس پر سکو خوشامدانہ لہجے میں کہنے لگی:

"اجی آپ اپنی سمجھی (کہی) اور گریب پرور ہیں۔ بھلا ہم آپ کی شان میں ایسی گستاخی کر سکتے ہیں۔"

بیگم صاحب کا غصہ کچھ دھیما ہوا اور انہوں نے سکو کو نصیحت کرنی شروع کی۔

"دیکھو سکو۔ اس طرح شریف آدمیوں کے نام رکھنا ٹھیک نہیں۔ اگر ان کو پتہ چل جائے تو تجھے ایک دم نوکری سے جواب دے دیں۔"

"اچھا بیگم صاحب۔ اس دفعہ تو ہمیں معاف کر دیں۔ آگے کو ہم کسی کو ان ناموں سے نہیں بلائیں گے۔"

سکو نے جب دیکھا کہ بیگم صاحب کا غصہ بالکل اتر گیا ہے تو اس نے زمین پر پڑے ہوئے ٹہنیوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"بیگم صاحب" اس نے بڑی لجاجت سے کہنا شروع کیا۔ "خدا حضور کے صاحب اور بچوں کو سدا سکھی رکھے۔ یہ جو دو ٹہنے آپ نے کٹوائے ہیں یہ تو آپ ہمیں دے دیجیے سرکار۔ جھونپڑی کی چھت کئی دنوں سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ اس کی مرمت ہو جائے گی۔ گریب دعا دیں گے۔"

بیگم بلقیس تراب علی پہلے تو خاموش رہیں مگر جب سکو نے زیادہ گڑگڑانا شروع کیا تو کہنے لگیں۔

"اچھا اپنے آدمی سے کہنا اٹھا لے جائے۔"

"خدا آپ کو سدا سکھی رکھے بیگم صاحب۔ خدا۔۔۔"

بیگم صاحب اس کی دعا پوری نہ سن سکیں۔ کیونکہ ان کو ایک ضروری کام یاد آ گیا اور وہ بنگلے کے اندر چلی گئیں۔

دوپہر کو بارہ بجے کے قریب سکو اور جگو سب کام ختم کر جا رہی تھیں کہ سامنے سے ایک مہتر منہ اٹھائے جھاڑو سے سڑک پر گرد و غبار کے بادل اڑاتا جلد جلد چلا آ رہا تھا۔

دونوں ماں بیٹیاں اس کے قریب پہنچ کر رک گئیں:

"آج بڑی دیر میں سڑک جھاڑنے نکلے ہو جگو کے بابا!"

"ہاں ذرا آنکھ دیر میں کھلی تھی۔"

یہ کہہ کر وہ مہتر آگے بڑھ جانا چاہتا تھا کہ اس کی بیوی نے اسے روک لیا۔

"سن جگو کے بابا۔ جب سڑک جھاڑ چکیو۔ تو ڈھڈو کے بنگلے پر چلے جائیو۔ وہاں دو بڑے بڑے ٹہنے کٹے پڑے ہیں انہیں اٹھا لائیو۔ میں نے ڈھڈو سے اجازت لے لی ہے۔۔۔"

بحران

جب سے سرکار نے لوگوں کو مکانات تعمیر کرانے کے لیے زمینیں الاٹ کرنی شروع کی ہیں، اس شہر کی کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ آس پاس کے وہ علاقے جو میلوں تک ویران پڑے تھے اب ان میں جگہ جگہ کھدائیاں ہو رہی ہیں۔ ان گنت راج مزدور، مستری اور ٹھیکیدار ایک عجیب بے چینی اور عجلت کی کیفیت کے ساتھ کام کرتے اور ادھر سے ادھر دوڑتے بھاگتے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آثارِ قدیمہ کا کوئی بہت بڑا محکمہ اپنے پورے لاؤلشکر کے ساتھ آ پڑا ہے اور کسی بھرے پرے قدیم شہر کو جو صدیاں گزریں کسی آفتِ ناگہانی کے سبب زمین میں دھنس گیا تھا، جوں کا توں باہر نکالنے کی سعی کر رہا ہے۔

مکان بنوانے کی آرزو انسان کی فطرت کا لازمہ ہے۔ یہ وہ آرزو ہے جو بچپن ہی سے جب وہ گھروندے بنا بنا کر کھیلتا ہے اس کے دل میں گھر کر لیتی ہے۔ اور پھر عمر بھر کبھی ابھرتی، کبھی دبتی رہتی ہے۔ عمر کے کسی دور میں بھی جب کبھی اسے ذرا سی بھی خوش حالی نصیب ہوتی ہے وہ اپنی اس دیرینہ خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ صاحبِ جائیداد ہونے کا فخر حاصل کر سکے۔

حکومت کی اس امداد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر وہ شخص جو تھوڑی سی بھی مقدرت رکھتا تھا، بغیر زیادہ سوچے سمجھے مکان بنوانے پر کمربستہ ہو گیا۔ کچھ لوگ بے سہارے ہی کسی امدادِ غیبی کے بھروسے پر

تعمیر کے منصوبے باندھنے لگے۔

سنبل ایک سرکاری کالج میں فلسفے کا پروفیسر ہے۔ وہ دبلا پتلا، کم آمیز اور خاموش طبع انسان ہے۔ وہ شہر کے بیچوں بیچ ایک کمرے والے فلیٹ میں اپنی بیوی اور دو بچیوں کے ساتھ رہتا ہے۔ جب تک بچیاں چھوٹی چھوٹی تھیں جیسے تیسے گزر ہوتی چلی جاتی تھی مگر اب جب کہ لڑکیاں بڑی بڑی ہو گئی ہیں سب کے ایک کمرے میں سونے سے قباحتیں پیدا ہونے لگی ہیں۔

آخر سنبل نے ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کی وساطت سے چھ سو مربع گز زمین شہر سے باہر ایک وسیع علاقے میں خرید لی۔ پندرہ ہزار روپیہ حکومت سے قرض مل گیا۔ کوئی تین ہزار روپیہ پاس تھا۔ کالج سے دو مہینے کی چھٹی لی اور مکان کی تعمیر میں مصروف ہو گیا۔

بدقسمتی سے بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ جس ٹھیکیدار کو مکان کا ٹھیکہ دیا گیا وہ تعمیر شروع کرنے سے قبل دو تین مرتبہ پلاٹ پر آیا اور زمین پر اکڑوں بیٹھ کر مختلف زاویوں سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر ایک دن اس نے مکان کے نقشے کو دیکھ دیکھ کر زمین پر چونے سے کچھ نشانات لگائے۔ اس موقع پر اس نے نیک شگون کے طور پر بازار سے کچھ شیرینی منگوا کر آس پاس کے راج مزدوروں میں بانٹی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے سنبل سے پانچ سو روپے پیشگی مانگے جو اسی وقت دے دیے گئے۔

دوسرے روز ٹھیکیدار کچھ ایسا گم ہوا کہ یہ جانئے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ پروفیسر سنبل کو بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شخص کئی بھولے بھالے آدمیوں کو اسی طرح جل دے چکا ہے۔ اس کی بیوی نے یہ ماجرا سنا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ آخر سنبل نے فیصلہ کیا کہ آئندہ تعمیر کا کام ٹھیکے پر نہ دیا جائے بلکہ امانی پر کرایا جائے۔

چاند خاں کسی دفتر میں چپراسی ہے۔ وہ ہے تو ادھیڑ عمر مگر اس کا جسم خوب گٹھا ہوا ہے۔ دن بھر سائیکل چلا چلا کے اس کی ٹانگیں خوب مضبوط ہو گئی ہیں گو رنگ زیادہ کالا پڑ گیا ہے۔

وہ اپنی بڑھیا ماں، بیوی، دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے ساتھ پھونس کے جھونپڑوں کی ایک کالونی میں رہا کرتا تھا۔ بڑا لڑکا علی الصباح اخبار بانٹتا۔ چھوٹا لڑکا اسکول جاتا۔ بیٹی پڑوس کے ایک بابو کے گھر میں دس روپے ماہوار پر صبح شام برتن مانجھنے جایا کرتی۔ اچانک چاند خاں کا نصیبہ کھلا۔ اسے ستر مربع گز زمین الاٹ ہو گئی۔ اور ڈیڑھ ہزار روپیہ گورنمنٹ سے قرض بھی مل گیا۔ اس کی بیوی نے چاندی کے

کرے اور پازیبیں اتار کر میاں کو دیں کہ انہیں بیچ کر مکان پر لگا دو۔ دو تین کانوں سے چاندی کی بالیاں بھی اتارنا چاہتی تھی۔ مگر میاں نے یہ کہہ کر روک دیا کہ ان کے تو کوئی آٹھ آنے بھی نہ دے گا۔

شام کو چاند خاں کی بیوی نے کالونی کے گوالے سے جو سائیکل پر دودھ بیچنے جایا کرتا تھا دبی زبان سے کہا:

"تمہارے بھی مکان بن رہے ہیں۔ آگے دالان پیچھے دو کمرے۔ غسل خانہ۔ کوئی کرایہ دار ہو تو ذرا نظر میں رکھیے۔"

ایک فوجی افسر کو جس کی لمبی لمبی اکڑی ہوئی مونچھیں ہیں، چار سو مربع گز زمین ملی ہے۔ وہ ہر روز ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی وردی پہنے ٹرک پر سیدھا اپنے زیر تعمیر مکان پر پہنچ جاتا ہے۔ اور پیٹی میں پستول لٹکائے گھنٹوں کڑی دھوپ میں راج مزدوروں کے درمیان پھرتا اور ان کے کام کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ ان سے اپنے جنگی کارنامے بھی بیان کرتا ہے۔ اس کے پاس جو پستول ہے وہ اس کے بقول تو ایک جرمن افسر کو قتل کر کے حاصل کیا تھا۔

پروفیسر کنول کے مکان کی نیو رکھی جا چکی ہے چونکہ اس نے کسی کتاب میں بلڈ اسٹائل کی تعمیر کی بڑی تعریف پڑھی تھی اس لئے اس نے اسی طرز پر مکان بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور اب تو سرے سے کھڑے کر کے ستونوں کی بھرائی ہو رہی ہے۔ وہ ہر روز ایک کاپی میں معماروں اور مزدوروں کی حاضری درج کرتا۔ اور ہفتے کے ہفتے سب کا حساب چکتا کر دیتا ہے۔

کنول نے ایک مستری کو جو شکل وصورت سے خاصا تجربہ کار معلوم ہوتا تھا اس کی روزانہ اجرت کے علاوہ پچاس روپے ماہوار زائد دینا منظور کر رکھا ہے تاکہ وہ اپنے کام کے ساتھ ساتھ دوسروں کے کام کی نگرانی بھی کرتا رہے۔ کنول نے یہ انتظام اس لیے کیا کہ ایک تو وہ تعمیری کام کی کچھ عملی واقفیت نہ رکھتا تھا۔ گو اس نے کتابی معلومات کافی حاصل کر لی تھیں۔ دوسرے دو ماہ کی رخصت ختم ہونے کے بعد وہ وہاں نگرانی کے لئے موجود بھی نہ رہ سکتا تھا۔

مگر اس مستری کی نگرانی کے باوجود کام بہت آہستہ آہستہ ہو رہا تھا۔ اس سلسلے میں چوکیدار اور دوسرے ذریعوں سے جو اطلاعات پروفیسر کنول کے کانوں تک پہنچیں ان کا لب لباب یہ تھا:

(الف) جب سے اس مستری کو دوسروں کے کام کا نگران مقرر کیا گیا ہے اس نے اپنے ہاتھ

سے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔

(ب) یہ مستری صرف ان ہی کاریگروں اور مزدوروں کو کام پر لگاتا ہے جو اپنی اجرت کا چوتھائی حصہ اس کو بطور کمیشن دینا منظور کرتے ہیں۔

(ج) چونکہ مزدوروں کو پوری مزدوری نہیں ملتی اس لئے وہ دل لگا کے کام نہیں کرتے۔

علاوہ ازیں آئے دن جھگڑے بھی ہوتے رہتے اور سمنٹ کی بوریوں کی گنتی میں تو ہر روز کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو ہی جاتی۔

کنول سب کچھ دیکھتا سنتا مگر زبان نہ ہلاتا۔

ایک دن شام کو جب راج مزدور چھٹی کر گئے اور چوکیدار نماز پڑھنے میں مشغول ہو گیا تو پروفیسر کنول کا ایک ہمسایہ جس کا مکان دو تین پلاٹ چھوڑ کر بن رہا تھا اس کے پاس آیا اور کہنے لگا:

"پروفیسر صاحب۔ کیا آپ بیچ بیچ اپنا سمنٹ بیچنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں تو! کیوں کیا بات ہے؟"

"کل آپ کا مستری دو مزدوروں کی پیٹھ پر دو بوریاں اٹھوائے میرے پاس آیا تھا اور میرے ہاتھ سمنٹ فروخت کرنا چاہتا تھا۔ مجھے کچھ شک گزرا اور میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ مزدوروں کو لیے ہوئے کسی اور سمت چل دیا۔"

کنول نے مستری کو موقوف کر دیا مگر بدقسمتی سے اس کے ساتھ ہی تعمیر کا کام رک گیا اور نئے مستری کی جستجو ہونے لگی۔

چاند خاں چپراسی نے ایک ٹھیکیدار سے دوستی گانٹھی۔ وہ سگرٹ پان اور چائے سے اس کی تواضع کرتا اور اس کو خوش کرنے کے لیے بڑی چاپلوسی کی باتیں کرتا۔ بڑے بڑے افسروں کی گھریلو زندگی کے خفیہ حالات مزے لے لے کر بیان کرتا۔ آخر ٹھیکیدار نے اس کا مکان رعایتاً بنا دینے کی حامی بھر لی۔ جس دن دفتر میں چھٹی ہوتی چاند خاں اور اس کے بیٹے خود مزدوروں کی طرح کام کرتے۔

اس کے گھر کی دیواریں کھڑی ہو گئیں اور دروازوں اور کھڑکیوں کی چوکھٹیں بھی چنائی میں لے لی گئیں۔ مگر چھت تک پہنچتے پہنچتے چاند خاں کے پاس دام ختم ہو گئے۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو جو

کسی دوسرے شہر میں آڑھت کی دکان کرتا تھا لکھا کہ میں سخت بیمار ہوں، ہسپتال میں پڑا ہوں، مرنے کے قریب ہوں۔ اگر تم میری جان بچانا چاہتے ہو تو فوراً دو سو روپے بھیج دو۔ وہ خط پڑھ کر بھی بھائی نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس پر چاند خاں نے بھائی کو بھاری بھاری مغلظات سنائیں جو چاند خاں ہی سنا سکتا تھا اور سود پر قرض دینے والے پٹھانوں کی تلاش شروع کر دی۔

ایک دن ایک عورت جو سیاہ برقع پہنے ہوئے تھی، ہر اس جگہ جاتی ہوئی دیکھی گئی جہاں عمارت بن رہی تھی۔ وہ وہاں دردناک لہجے میں راج مزدوروں سے یوں خطاب کرتی:

"اے مسلمان بھائیو۔ میں ایک بیوہ ہوں۔ میرا شوہر فلاں دفتر میں ہیڈ کلرک تھا کہ اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے مرنے سے میں بے یار و مددگار رہ گئی ہوں۔ للہ میرے یتیم بچوں پر ترس کھاؤ اور مجھے کوئی ایماندار مستری دلواؤ۔"

مستری اور راج مزدور اپنا کام چھوڑ بڑی توجہ سے اس کی تقریر سنتے اور جب وہ اپنا دعا کہہ چکتی تو اسے کوئی جواب دیے بغیر پھر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے۔

دو باپ بیٹے اپنی نگرانی میں چار سو گز کے ایک پلاٹ پر مکان بنوا رہے تھے۔ باپ کو تعمیر کے کام کی خاصی سوجھ بوجھ تھی۔ بیٹا حساب کتاب اور لین دین کے کاموں میں ہوشیار تھا۔ جب لوہا بندھ چکا اور شٹرنگ ہو چکی تو ایک خاص دن چھت ڈالنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ مگر اس دن نہ تو مستری ہی پہنچا اور نہ نگرانی والے ہی آئے۔ آخر باپ بیٹوں نے ادھر ادھر سے دو چار مزدور پکڑے اور ان کی مدد سے خود ہی چھت ڈالنے پر تیار ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ چھت دس روز میں جا کے پڑی۔ ایک ایک کمرے پر دو دو دن صرف ہوئے۔ اس واقعے کا اس نواح میں کئی روز تک چرچا رہا۔

ایک وکیل صاحب نے زمین کا ٹکڑا تو خاصا بڑا خرید لیا مگر اتنا بڑا مکان بنوانے کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے وسط میں صرف ایک کمرہ اور ایک باورچی خانہ بنوا لیا اور دیواروں پر پلستر، سفیدی یا رنگ روغن کرائے بغیر باقاعدہ طور پر رہنا شروع کر دیا۔ ان کا کنبہ خاصا بڑا تھا۔ رات کو یہ لوگ لالٹین جلاتے۔ چونکہ یہ پلاٹ سر راہ تھا جس پر آنے جانے والے کی نظر پڑتی تھی اس لیے انہوں نے پلاٹ کے گرد گرد چار دیواری کی جگہ پودے لگا دیے۔ اس سے چند ہی ہفتوں میں باڑھ بن گئی

جس سے اچھا خاصا پردہ ہو گیا۔ مگر ایک دن مٹی ڈھونے والوں کے بہت سے گدھے اس طرف سے گزرے۔ صحرا میں وہ اس ہریالی کو دیکھ کر بری طرح اس پر ٹوٹ پڑے اور جب تک گھر کے زن و مرد ہاتھوں میں ڈنڈے لیے شور مچاتے ان کو ہنکانے کے لیے پہنچے، انہوں نے آدھی سے زیادہ باڑھ صاف کر دی۔

پروفیسر سہیل کے ہاں تعمیر کا کام پھر شروع ہو گیا تھا اپنے پچھلے تلخ تجربے کے بعد جس میں اس کی نصف سے زیادہ چھٹیاں یوں ہی برباد ہو گئی تھیں۔ اس نے مستریوں کی بے ایمانیوں پر چشم پوشی شروع کر دی تھی۔ وہ دیکھتا کہ بعض کاریگر دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد اپنے ٹفن کے خالی ڈبوں کو سیمنٹ سے بھر لیتے ہیں۔ وہ دیکھتا کہ لوہار لوہا باندھنے والے تار کے پونڈ کے پونڈ غائب کر دیتا ہے۔ وہ دیکھتا کہ بڑھئی پیمائش کر کے اس سے جتنی لکڑی منگواتا ہے اس سے آدھی بھی دروازے اور کھڑکیاں بنانے میں صرف نہیں کرتا۔ وہ ہر روز چھٹی کے وقت لکڑی کے کئی کار آمد ٹکڑے سیمنٹ کی خالی بوری میں برادے کے ساتھ بھر کر سائیکل کے پیچھے باندھ لے جاتا۔ وہ دیکھتا کہ چوکیدار مستریوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ مستری اکثر کام سے غائب رہتے ہیں مگر وہ ان کی رپورٹ نہیں کرتا۔ وہ یہ سب کچھ دیکھتا مگر دم نہ مارتا۔ رات کو وہ اپنی بیوی سے ان لوگوں کی دغا بازیاں بیان کرتا۔ بیوی سن سن کر آنسو بہاتی رہتی۔

اس کے دو مہینے کی چھٹی ختم ہو گئی اور وہ پھر کالج جانے لگا۔ مگر درس و تدریس میں اس کا مطلق دل نہ لگتا۔ اس کا وہ دوپہر کا کھانا بالکل چھوٹ گیا تھا۔ وہ کالج سے گھر جانے کے بجائے پلاٹ کا رخ کرتا اور وہاں سے شام کو بڑی دیر میں گھر پہنچتا۔ غضب یہ ہوا کہ ابھی مکان کا بہت سا کام باقی تھا کہ مستریوں کی بے ایمانی، عمارتی سامان کی نایابی اور بلیک مارکیٹ سے اس کی خرید کے باعث اس کا سرمایہ ختم ہو گیا۔ رفتہ رفتہ بیوی کے زیورات، ریڈیو، بائیسکل، کپڑے سینے کی مشین، کیمرا، گھڑیاں اور کئی اور مفید اشیا، مکان کی بھینٹ چڑھنے لگیں۔ اس کے پاس نایاب کتابوں، قلمی تصویروں اور پرانے بادشاہوں کے سکوں کا بہت نادر ذخیرہ تھا وہ سب کوڑیوں کے مول بک گیا۔ اس کی آدھی سے زیادہ تنخواہ مکان کی تعمیر میں اٹھ جاتی۔ اس نے سگرٹ پینا چھوڑ دیا۔ گھر میں دونوں وقت دال بھاجی پکنے لگی۔ کسی کے پاس پہننے کے لئے ڈھنگ کا کپڑا نہ رہا۔ کالج میں پرنسپل سمیت کوئی پروفیسر یا لیکچرار ایسا نہ تھا جس کا وہ سو پچاس کا مقروض نہ ہو۔ وہ شب و روز انھیں فکروں میں گھلنے لگا۔ اس کی صحت جواب دینے لگی۔

جس علاقے میں پروفیسر کنیل کا مکان بن رہا تھا اس کے قریب ہی چار سو گز کے ایک پلاٹ پر کسی دفتر کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کا مکان بھی زیر تعمیر تھا۔ اس شخص نے اپنے عہدہ کا اثر و رسوخ کو کام میں لاتے ہوئے ہر چیز سستے داموں خریدی تھی اور ہر کام رعایت سے کرایا تھا۔ پھر بھی مکان کی تیاری میں چار پانچ ہزار روپے کی کسر رہ گئی۔ یہ رقم اس نے ایک ڈاکٹر سے جسے رہائش کے لیے مکان کی تلاش تھی، دو سال کے پیشگی کرائے کے طور پر حاصل کر لی۔ جب مکان بن کر تیار ہوا تو اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی بیوی جو مصری برقع پہنے ہوئے تھی، اپنے کنبے اور بچوں سمیت آ گئی اور مکان پر قابض ہو گئی۔ ڈاکٹر یہ دیکھ کر بہت سٹپٹایا۔ مگر اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے بڑی لجاجت سے اس سے کہا کہ چند روز میرے بیوی بچوں کو اپنے مکان کا چاؤ پورا کر لینے دو۔ پھر ہم اسے خالی کر دیں گے۔

مگر یہ چند روز ہفتوں میں بلکہ مہینوں میں تبدیل ہو گئے۔ اب اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے ڈاکٹر کی خوشامدیں شروع کر دیں۔ کہ مجھے اسی مکان میں رہنے دو۔ میرے پاس رہنے کو کوئی جگہ نہیں۔ کچھ ساتھ ہے۔ میں آپ کا روپیہ جو میں نے پیشگی وصول کرایا تھا ماہانہ قسطوں کی صورت میں ادا کروں گا۔

اس پر ڈاکٹر نے وکیل کے ذریعے سے اسے نوٹس دیا اور قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی۔ تو اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے مکان خالی کر دینے ہی میں مصلحت سمجھی۔ مکان سے نکلتے وقت اس کی بیوی بچے زار و قطار رو رہے تھے۔

ایک اونچے عہدیدار نے دو ہزار مربع گز زمین پر ایک عالی شان بنگلہ تعمیر کروایا اور اس میں خوش نما باغیچہ بھی لگوایا۔ اس کا نام "رین بسیرا" تجویز ہوا۔ ایک دوست نے مشورہ دیا کہ اس پر "ھذا من فضل ربی" بھی لکھوا دیا جائے۔ عہدیدار نے اس رائے کو پسند کیا اور جلی قلم سے یہ الفاظ بنگلے کی پیشانی پر کندہ کرا دیے۔ دو ہفتے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ بنگلہ جس پر کوئی نوے ہزار روپے لاگت آئی تھی، ڈیڑھ لاکھ میں بک گیا۔

چاند خان کو بالآخر ایک ایسا کرایہ دار مل ہی گیا جس نے حامی بھر لی کہ میں تمہارے ادھورے مکان کو مکمل کرا دوں گا بشرطیکہ تم ابھی سے مجھے اس میں بس جانے دو۔ چاند خان کو مجبوراً اس کی یہ شرط منظور کر لینی پڑی۔ اس کی بیوی نے مکان کا کرایہ دار مل جانے کی خوشی میں گنے کے رس کی کھیر پکائی

اور سارے محلے کی بڑی بوڑھیوں کا منہ میٹھا کر دیا۔

خدا خدا کر کے پروفیسر کنیل کا مکان تکمیل کو پہنچا۔ مگر وہ اس قدر ناقص بنا تھا کہ اس کے اندر جاتے ہوئے پروفیسر کی جمالیاتی حس سخت مجروح ہوتی تھی۔ دیواروں میں کب، کھڑکیاں اور دروازے ٹیڑھے بینگے، برآمدہ بے ڈھنگا ایک طرف سے جھکا ایک طرف سے بڑھا۔ رنگ چپس کے فرشوں میں ابھی سے دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ پھر وہ یہ بھی وثوق سے نہ کہہ سکتا تھا کہ اس کی تعمیر میں مستریوں نے لوہا اور سیمنٹ پوری مقدار میں استعمال کیا ہے یا نہیں۔ اور اس میں رہنے سے جان کا خطرہ تو نہ ہوگا۔ بہت روز تک وہ مکان خالی پڑا رہا۔

آخر ایک دن اس نے جرأت کر کے اخبار میں اشتہار دے ہی ڈالا۔ اس کی توقع کے خلاف تین چار ہی روز میں اسے پچاس ساٹھ خطوط وصول ہو گئے۔ ان میں سے نصف کے قریب غیر ملکیوں کے تھے۔ یہ لوگ سفارت خانوں یا تجارتی فرموں سے تعلق رکھتے تھے اور مکان نہ ملنے کے باعث ہوٹلوں میں بھاری کرائے ادا کر رہے تھے۔

پروفیسر کنیل نے چار پانچ اچھی اچھی اسامیوں کو منتخب کیا اور مکان دکھانے کے لیے بلوایا۔ اس کے تعجب اور خوشی کی حد نہ رہی جب ان لوگوں میں سے کسی نے بھی ان نقائص کی طرف اشارہ تک نہ کیا جو وہ اپنی دانست میں اس مکان میں پاتا تھا۔ آخر ایک جرمن کو اس نے اپنا مکان کرائے پر دے دیا۔ اسے اتنی رقم پیشگی کرائے کے طور پر مل گئی کہ وہ اس سے ایک چھوٹا سا نیا مکان بنا سکے۔

اس معاملے کے یوں خوش اسلوبی سے نمٹ جانے کے بعد وہ شاداں و فرحاں گھر پہنچا اور بیوی سے کہنے لگا:

"اچھا ہی ہوا کہ ہم خود اس مکان میں نہ گئے۔ ایک تو اس کی بناوٹ بڑی ناقص ہے دوسرے اس میں رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ مگر اب مجھے مکان بنوانے کا بخوبی تجربہ ہو گیا ہے۔ اب کے میں انتہائی احتیاط سے کام لوں گا اور خدا نے چاہا تو ایسا مکان بنواؤں گا جو بے عیب ہوگا۔ پھر خواہ کوئی مجھے کتنا ہی روپیہ دے میں اسے کرائے پر نہیں اٹھاؤں گا۔ وہ مکان ہمارے اپنے رہنے کے لیے ہوگا۔ کیوں کہ لڑکیاں بڑی ہو گئی ہیں اور ہم سب کا ایک ہی کمرے میں سونا اخلاقی لحاظ سے اچھا نہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اخبار اٹھایا اور اس کا وہ کالم بڑے غور سے پڑھنے لگا جس میں خالی پلاٹوں کی خرید و فروخت کے اشتہار درج تھے۔

سرخ گلاب

اس کا اپنا گھر تو کوئی تھا ہی نہیں مگر گاؤں کے ہر گھر کو وہ اپنا ہی گھر سمجھتی تھی۔ دن میں وہ کبھی کسی گھر میں دکھائی دیتی کبھی کسی گھر میں۔ کبھی ذیل دار کے ہاں تھپا کوٹ رہی ہوتی کبھی شیخ گوجر کے ہاں چھاچھ بلو رہی ہوتی۔ کبھی مائی تاباں کے ساتھ اس بگی دیوار پر جس نے سارے گاؤں کا احاطہ کر رکھا تھا اپلے تھاپتی دکھائی دیتی۔ غرض جب دیکھو وہ گاؤں والوں کے کسی نہ کسی کام میں جتی ہی نظر آتی۔

کبھی کبھی روز وہ گاؤں والوں کی بکریاں اس پہاڑی پر چرانے لے جاتی جس پر چمن شاہ ولی کا مزار تھا۔ اور جہاں بیلوں اور جھاڑیوں پر رنگ برنگے جھنڈے بارہ مہینے لہرایا کرتے۔ یہ جھنڈے آس پاس کے دیہات کے ان زائرین نے باندھے تھے جن کی مرادیں چمن شاہ ولی کے فیض سے پوری ہوئی تھیں۔

وہ یہ سارے کام ہنسی خوشی کیا کرتی۔ اور صلے کا کبھی خیال تک اس کے ذہن میں نہ آتا۔ کسی نے کچھ روکھا سوکھا دے دیا تو کھا لیا۔ کہیں سے کوئی پھٹا پرانا کپڑا مل گیا تو پہن لیا ورنہ اپنے حال میں مست رہا کرتی۔ اس کی اوڑھنی میں جگہ جگہ چھید تھے جن میں سے اس کے لمبے بھورے بال دھول اور تنکوں سے اٹے ہوئے کسی سادھو کی جٹا کی طرح دکھائی دیتے۔

وہ اسی گاؤں کی ایک نائن کی بیٹی تھی۔ باپ کی اس نے صورت نہیں دیکھی تھی۔ چار برس کی ہوئی تو ماں بھی چل بسی۔ اور کوئی رشتے دار تھا نہیں بس گاؤں ہی میں رل رلا کر پل گئی۔ گاؤں کی ہر عورت خواہ وہ ذیل دارنی ہوتی یا مہترانی اس کی "چاچی" تھی۔ اور گاؤں کا ہر مرد اس کا "چاچا"۔

پندرہ برس کی عمر کو پہنچ کر اس نے خوب ہاتھ پاؤں نکالے اور روپ بھی نکھر آیا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور رسیلی تھیں ہرنیوں کی سی۔ شروع شروع میں جس کسی نے دیکھا حیران رہ گیا اور دل میں کہنے لگا۔ "ارے یہ وہی نائن کی چندی لونڈیا کا کی ہے جو چھ سات برس ادھر تک نالیوں میں لوٹا کرتی تھی!"

کا کی کی عمر چار پانچ برس ہی کی تھی کہ اس میں مجذوبیت کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اگر ماں باپ زندہ ہوتے تو شاید اس کے علاج کی کچھ فکر کرتے۔ یا کم سے کم اسے شعور کی کچھ باتیں ہی سکھاتے۔ گاؤں والوں کو تو اس کی پروا تھی نہ ضرورت۔ ان کی ہمدردی تو بس یہیں تک تھی کہ کبھی کبھی اس کے ہاتھ میں گڑ کی بھیلی یا گاجر پکڑا دی۔ وہ جوں جوں بڑی ہوتی گئی اس کے اعضا تو نشوونما پاتے رہے مگر دماغ کمزور ہی رہا۔ جوانی کو پہنچ کر بھی وہ مجذوب کی مجذوب ہی رہی۔ مگر اس کا یہ مرض گاؤں والوں کے لیے بڑے فائدے کا موجب تھا۔ کیونکہ وہ دن بھر اس سے طرح طرح کے کام لیتے رہتے۔ جنھیں وہ تاگی میں بے تکان کرتی رہتی۔

کا کی نے اپنے دماغ کی کمزوری کے باوجود ایک بات میں بڑی ترقی کی تھی وہ یہ کہ اس کی زبان خوب چلنے لگی تھی۔ جس گھر میں بھی جاتی اپنی اوٹ پٹانگ باتوں سے اس کے مکینوں کا دماغ چاٹ جایا کرتی۔ جب بات کرنے کو کوئی نہ ملتا تو آپ ہی آپ بولتی رہتی۔ کبھی کبھی اسے مارا پیٹا بھی جاتا۔ مگر جلد ہی گھر کی کوئی بڑی بوڑھی اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے اسے بہلا لیتی۔ اور یہ خطرہ دور ہو جاتا کہ کہیں وہ ناراض ہو کر اس گھر کا آنا جانا ہی بند کر دے۔

جب کا کی کے کپڑے بہت میلے ہو جاتے تو پٹواری کی بیوی اسے صابن کا ایک ٹکڑا دے کر کہتی "کا کی تیرے کپڑوں سے بڑی بدبو آنے لگی ہے۔ جا انگنائی میں بیٹھ کر انھیں دھو لے۔" کا کی انکار کرتی تو پٹوارن زبردستی اس کے کپڑے اتروا کر اس سے دھلواتی۔ شلوار یا کرتا کہیں سے پھٹا ہوتا تو اسے سوئی دھاگا دے دیا جاتا۔ مگر کا کی سینا پرونا نہ جانتی تھی۔ اس پر پٹوارن کو خود ہی اس کے پھٹے ہوئے کپڑے سینے پڑتے۔ مگر اس کے عوض کا کی کو گھنٹوں پٹوارن کی کمر دابنی پڑتی۔

جس روز کا کی گاؤں والوں کی بکریاں چرانے لے جاتی۔ اسے کسی نہ کسی گھر سے چین کی دو

جہاں وہ تھوڑا سا گھاس ایک پوٹلی میں باندھ کر لے جاتی۔ پہاڑی پر پہنچ کر بکریاں اپنے آپ چرتی رہتیں اور وہ خود بھی ان ہی کی طرح ادھر ادھر گھومتی رہتی۔ وہ اونچے اونچے سپاٹ ٹیلوں پر بے دھڑک چڑھ جاتی۔ کبھی کسی درخت کی اونچی ڈال پر چڑھ بیٹھتی۔ کبھی کسی جھاڑی کے نیچے ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر لیٹ جاتی اور آپ ہی آپ باتیں کرنے لگتی۔ یا دور سے آتی ہوئی ریل کی گھوں گھوں سنتی رہتی۔ کبھی پہاڑی کی چوٹی پر جا پہنچتی۔ جہاں سے ایک طرف چن شاہ ولی کے مقبرے کا سبز گنبد نظر آتا اور دوسری طرف گاؤں کا بڑا سہانا منظر دکھائی دیتا۔

منالی کی آبادی چار پانچ سو نفوس سے زیادہ نہ تھی۔ یہ ویسی ہی کچے گھروندوں کی بے ترتیب گھچم گچھا تھی جیسے پنجاب کے اور گاؤں ہوتے ہیں۔ گرد گرد کچی دیوار جس پر اپلے تھپے ہوئے۔ بیچ میں ایک تنگ سی دھنگی سڑک کہیں سے تنگ کہیں سے کشادہ، بیچ کھاتی اور قریب قریب ہر گھر کے آگے سے گزرتی ہوئی۔ سڑک کے دونوں طرف بیل گاڑیوں کے پہیوں نے مستقل طور پر نالیوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جب کچھ بارش ہوتی تو ان نالیوں میں پہیے بڑی روانی سے چلتے۔ اور بیلوں کو زور لگانا پڑتا۔ گاؤں کی دیوار پر صبح ہی سے بہت سے کوے آ بیٹھتے اور دن بھر کائیں کائیں کا شور برپا رکھتے۔ ان کے علاوہ گاؤں کے لڑکے بھی کھدر کے میلے کچیلے کرتے پہنے کچھ ننگے، بعض لنگوٹی اور بعض صرف ایک دھاگا سا کمر پر باندھے دیوار پر ایک ٹانگ ادھر ایک ٹانگ ادھر گھوڑے کی سی سواری کرتے نظر آتے۔

منالی میں دو تین مکان پختہ اینٹوں کے بنے ہوئے بھی تھے۔ مگر یہ گاؤں کی دیوار سے باہر کھیتوں کے بیچ میں تھے۔ ان میں ایک بڑا مکان تو ذیلدار کا تھا اور دوسرا اس سے ذرا فاصلے پر چھوٹا مکان پٹواری کا۔ کاکی کا آنا جانا زیادہ تر انہیں دو مکانوں میں رہتا تھا۔

منالی تھا تو چھوٹا سا گاؤں مگر چن شاہ ولی کے مزار کے باعث اس کی شہرت دور دور تک پہنچی ہوئی تھی۔ ہر سال چیت کی چھبیسویں تاریخ کو بڑی دھوم دھام سے عرس منایا جاتا۔ جس میں شامل ہونے کے لئے پچاس پچاس کوس سے زائرین بال بچوں سمیت آیا کرتے تھے۔

چن شاہ بڑے زبردست ولی مانے جاتے تھے۔ مشہور تھا کہ جو کوئی عرس کے روز ان کے مزار پر آکر مراد مانگے۔ خاص کر اولاد کی مراد، تو وہ جلد ہی یا کچھ عرصے بعد پوری ہو کے رہتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ دیہاتی عورتیں خاص طور پر چن شاہ ولی کی بڑی معتقد تھیں۔ ان کی ایک کرامت یہ بھی تھی کہ مراد مانگنے والی کو پہلے ہی سے معلوم ہو جاتا کہ میری تمنا بر آئے گی یا نہیں۔ اگر بر آنے والی ہوتی تو چن شاہ ولی خود سائلہ کے خواب میں آکر اس کی بشارت دیتے۔ یہ بشارت کیا تھی سرخ گلاب کا ایک

پھول۔ ولی سفید گھوڑے پر سوار ہاتھ میں پھول تھامے جسے وہ بار بار سونگھتے، سائلہ کے پاس سے گزرتے۔ اور وہ پھول اس کی جھولی میں پھینک دیتے۔ آنکھ کھلنے پر جب سائلہ گھر کے لوگوں کو یہ مژدہ سناتی تو سب اسے مبارک باد دینے لگتے۔

چن شاہ ولی کی ان کرامتوں کے تذکرے گاؤں کے ہر گھر میں اکثر ہوتے رہتے تھے۔ کاکی بڑے غور سے ان باتوں کو سنا کرتی۔ کبھی کبھی وہ خود بھی کوئی بات پوچھنے لگتی:

"اچھا چاچی جب چن شاہ ولی نے تیری جھولی میں پھول پھینکا تو وہ پیدل تھا یا گھوڑے پر؟"

"گھوڑے پر۔"

"وہ شکل و صورت کا کیسا تھا؟ بڈھا تھا یا جوان؟"

"چپ کر پگلی کنواری لڑکیاں ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتیں۔"

"کیوں کنواری لڑکیوں کو کیا ہوتا ہے؟"

گھر کی مالک کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوتا۔ اور ادھر کاکی جواب کا انتظار کئے بغیر چن شاہ کے بارے میں کوئی اور بات پوچھنے لگتی اور مالک کو خواہ مخواہ کوئی کام پیدا کر کے کاکی کو اس میں الجھا دینا پڑتا۔

تیسرے پہر وہ بکریوں کو ہانکتی ہوئی پہاڑی پر سے اترتی۔ گاؤں میں پہنچ کر بکریاں تو اپنے اپنے ٹھکانے پر خود بخود چلی جاتیں اور وہ سیدھی موٹے گنڈیری والے کی دکان پر پہنچتی اور اس سے گنڈیریاں مانگتی۔ موٹا گنڈیریاں تو گنے کے موسم ہی میں بیچا کرتا تھا۔ مگر سارا سال وہ اسی نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ خواہ اس نے گڑ کی ریوڑیاں، میٹھے چنوں اور دال موٹھ کا خوانچہ ہی کیوں نہ لگا رکھا ہو۔ یہ شخص سیاہ فام اور بدرو تھا۔ اس پر بچپن میں اس کی ایک آنکھ بھی جاتی رہی تھی۔ چالیس کے قریب عمر تھی۔ دس سال ہوئے اس کی بیوی مر گئی تھی مگر اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ بس دن بھر اپنی ایک آنکھ سے گاؤں کی لڑکیوں کو گھورا کرتا۔

وہ کاکی کو اس وقت سے جانتا تھا جب وہ پانچ چھ برس کی بچی تھی اور ننگی پھرا کرتی تھی۔ اسی وقت سے وہ اس کے پاس گنڈیریاں مانگنے آنے لگی تھی۔ کاکی کو دیکھ کر وہ حیران ہوتا کہ لڑکیاں کتنی جلدی جوان ہو جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نگاہیں کاکی کے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے کپڑوں پر پڑتیں، جن میں سے اس کے سڈول گھٹنے یا سفید سینے کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا ہوتا اور اس کا دل خواہ مخواہ کاکی سے محبت بازی کرنے کو چاہتا۔

''کاٹھیں نہیں ہیں پھر؟''

''وہ جو بڑی ہیں چاچا میرے گھٹنے تک پہنچے۔''

''یہ میں نے اپنے لئے رکھی ہیں۔''

''تو گنڈیریاں کیوں نہیں چوستا چاچا؟''

''واہ گنڈیریاں چوسوں تو بیچوں کیا! .... میں کہتا ہوں کاکی تو دن بھر جن لوگوں کے کام کرتی رہتی ہے۔ ان سے پیسے کیوں نہیں مانگتی۔ پھر تو جتنی چاہے گنڈیریاں چوس سکتی ہے۔ کاٹھوں سے تیرے دانت نہیں دکھتے۔''

''نہیں اللہ کی سوں۔ مجھے کاٹھیں ہی اچھی لگتی ہیں .... لا چاچا جلدی کاٹھیں دے دے۔ دیر ہو رہی ہے۔''

اور مولا دو چار کاٹھیں اسے دے ہی دیتا۔

بیت کا مہینہ نصف سے زیادہ گزر چکا تھا۔ چن شاہ ولی کے عرس کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ چونکہ یہ عرس ایسے زمانے میں ہوتا جب دیہاتی فصل کی کٹائی سے فارغ ہو چکے ہوتے اور اپنی محنتوں کا صلہ پا کر خوش حالی کی ایک ہلکی سی جھلک ان کی زندگیوں میں نظر آنے لگتی۔ اس لئے وہ خوشی خوشی اپنی بساط کے مطابق عرس کی تیاریاں کرتے تھے۔

چن شاہ کے مزار کا پرانا مجاور جس کا نام جیون سائیں تھا مزار کے آس پاس کی زمین کو جھاڑ جھنکار سے صاف کرتا نظر آنے لگا۔ اس نے گاؤں والوں سے دو جوان مانگے اور ان کی مدد سے مزار کی دیواروں اور برجیوں پر سفیدی کی اور گنبد پر سبز رنگ کیا۔ ادھر گاؤں کی عورتوں میں ہر وقت چن شاہ ولی ہی کا ذکر رہنے لگا۔ وہ ہر روز پہلے سے بھی زیادہ بے تابی کے ساتھ عرس کے دن کا انتظار کرنے لگیں۔

اب کے جن عورتوں کو مراد مانگنی تھی۔ ان میں گاؤں کے ذیلدار کی بیوی بھی تھی۔ جس کا نام خیر النساء تھا۔ وہ ایک موٹی بھسکس بدمزاج اور غصہ ور عورت تھی۔ چند مہینوں سے وہ کاکی کو بہلا پھسلا کر زیادہ تر اپنے پاس ہی رکھنے لگی تھی۔ وہ اس سے طرح طرح کی محنت مشقت کے کام لیا کرتی۔ جب عرس کے دن قریب آئے تو اس نے کچھ تو کاکی کی خدمت گزاریوں کے صلے میں اور کچھ مراد مانگنے کی خوشی میں اسے گھٹیا جاپانی ریشم کا ایک سوٹ سلوا دیا۔ جس پر گلاب کے بڑے بڑے پھول چھپے ہوئے تھے۔

جب عرس کا دن آیا تو خیر النساء نے کاکی کو گرم پانی سے خوب نہلایا۔ گھر کی ایک بوڑھی عورت

نے اس کے سر میں سرسوں کا تیل ڈال کر کنگھی کی اور ایک سرخ چٹلا اس کی چوٹی میں گوندھا گیا جو اس کے بھورے بالوں پر خوب سجنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل ڈالا گیا۔ ریشمی کپڑوں اور بناؤ سنگھار سے اس کا روپ کچھ نکھر گیا اور وہ کسی زمیندار کی بہو بیٹی معلوم ہونے لگی۔

''کاکی'' ذیلدارنی نے کہا۔ ''تو میرے ساتھ ساتھ ہی رہیو۔''

''اچھا چاچی۔''

''جانے کن کن گاؤں سے لوگ آئیں گے۔ ان میں شریف بھی ہوں گے، بدمعاش بھی، اور کہیں کوئی تجھے بہکا لے جائے۔''

''نہیں چاچی۔''

''اور جب میں مزار پر دعا مانگنے بیٹھوں تو تو بھی میرے پاس ہی بیٹھ جائیو۔''

''چاچی تیری تو اولاد ہے تو مراد کیوں مانگے گی؟''

''میرے اب تک لڑکیاں ہی ہوئی ہیں۔ میری تمنا ہے چن شاہ ولی مجھے ایک چاند سا بیٹا بھی دیں۔''

کاکی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''چاچی میں بھی مراد مانگوں گی؟''

''ہٹ پگلی تیرا ابھی بیاہ ہی کب ہوا ہے۔''

''تو میرا بیاہ کب ہوگا؟''

''چپ کمبخت کیسی باتیں منہ سے نکالتی ہے۔''

کاکی کہنا اور پوچھنا چاہتی تھی کہ خیر النساء نے زور سے اس کی چٹیا کھینچ کر اسے چپ کرا دیا۔

چن شاہ ولی کا مزار زیادہ دور نہیں تھا۔ اس لئے ذیلدارنی کاکی اور چند رشتہ دار عورتوں کے ساتھ پیدل ہی پہاڑی کی طرف روانہ ہوگئی۔

اس روز ابھی تڑکا ہی تھا کہ دور دور کے گاؤں سے عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی بیل گاڑیاں آنی شروع ہوگئی تھیں۔ مرد ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ ان میں کچھ گھوڑوں پر بھی سوار تھے یہ گاؤں کے بانکے چھیلے نوجوان تھے۔ رنگ دار پگڑیاں باندھے، بوسکی کی قمیصیں پہنے چاندی کے بٹن لگائے خواہ مخواہ گھوڑے کو اڑیاتے اور ہٹو بچو کرتے چلے آتے تھے۔ کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا کہ میاں آگے گھوڑے پر بیٹھا ہے، بیوی پیچھے بیٹھی ہے۔ بیوی نے ایک ہاتھ سے میاں کی کمر پکڑ رکھی ہے اور

دوسرے ہاتھ سے بچے کو سہارا دے رکھا ہے جو ان دونوں کے بیچ ماں کی چھاتی سے چمٹا ہوا دودھ پی رہا ہے۔

بہت سی عورتیں جن کے گاؤں قریب ہی تھے ٹولیاں بنا کر پیدل آئی تھیں۔ ان میں ہر عمر کی عورتیں تھیں۔ نئی نویلیاں بیاہی ہوئی، مہندی رچی ہوئی، سرخ جوڑا، سرخ دوپٹہ جس میں چمکیں ٹنکی ہوئی ہیں۔ کناروں پر گوٹہ لگا ہوا۔ ہونٹ کثرت سے دنداسہ ملنے کی وجہ سے بالکل عنابی ہو گئے تھے اور آنکھوں سے کاجل بہا جاتا تھا۔ ادھیڑ عمر کی بیوہ تھیں، ... ان کی اور ہی وضع تھی۔ موٹی ململ کے کرتے، کھدر کی شلواریں جنہیں ... دیا ہوا، سر اور سینے کو لٹھے کی چادر میں چھپائے۔ چلتے وقت ان کی کمر ذرا سیدھی اور نگاہیں سامنے رہتی تھیں۔ یہ عادت انہیں سالہا سال سر پر گھڑے اور گٹھے یا اناج کی گٹھریاں ... کے سہارے اٹھا کر چلنے کے باعث آپ ہی آپ پڑ گئی تھی۔

مزار سے ذرا فاصلے پر ایک جگہ کو ہموار کر کے میدان سا بنا لیا گیا تھا۔ جہاں ... دکانیں چڑھا دی گئی تھیں۔ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے قصبوں سے کچھ دکاندار سستے کھلونے لے آئے تھے اور زمین پر چادریں بچھا کر دکانیں سجا دی تھیں۔ کچھ لوگ بانس کی کھپچیوں پر غبارے، پھرکیاں ... ہوئے وغیرہ دھاگوں سے لٹکائے، تو وہیں ... جاتے ہوئے میلے کی رونق بڑھا رہے تھے۔

ایک طرف پہاڑی کے نیچے چرخ اور گنڈولے ... تھے۔ جن کی چرخ چوں سے ... ایک گونج سی سنائی دے رہی تھی۔ بچوں کے علاوہ خاصی بڑی عمر والے مرد بھی ... جھولتے شور مچا رہے تھے۔ ... دو چار منچلی عورتیں بھی ہنڈولوں میں بیٹھ جاتیں اور جب ہنڈولا اوپر آسمان کی طرف جاتا تو وہ ڈر کر چیخنے لگتیں اور اپنے بچوں کو اور بھی بھینچ کر سینوں سے چمٹا لیتیں۔ کئی ... جن میں تین عورتیں اور تین مرد بیٹھے جھولا رہے تھے۔

سہ پہر ہوتے ہوتے اتنی مخلوق جمع ہو گئی کہ پہاڑی پر چڑھنا مشکل ہو گیا۔ زمین کے علاوہ پہاڑی کے سب پیڑوں کی ڈالوں پر بھی آدمی ہی آدمی نظر آنے لگے۔ جو زائرین مراد مانگنے آتے تھے وہ پہاڑی پر چڑھ کر مزار کے اندر پہنچتے اور قبر کے سرہانے بیٹھ جاتے یا جہاں بھی جگہ مل جاتی بیٹھ کر خضوع و خشوع کے ساتھ دعا میں مشغول ہو جاتے۔ قبر پر سبز رنگ کی نئی ریشمی چادر ڈال دی گئی تھی۔ زائرین پھول اور چڑھاوے اسی پر چڑھا جاتے تھے۔

زیلدارنی نے اپنے قافلے کے ساتھ ایک گھنے پیڑ کے نیچے ڈیرا جما لیا تھا۔ وہ شام کے قریب پھولوں کی چادر، الائچی دانہ اور تبرک کی دوسری چیزیں لے کر مراد مانگنے گئی۔ کاکی اور دو ایک عورتیں اس کے

ہمراہ تھیں۔ قبر کے سرہانے تھوڑی سی خالی جگہ دیکھ کر انہوں نے جلدی سے اس پر قبضہ جما لیا اور خشوع خضوع ... کر دو زانو بیٹھ گئیں۔ پھر زیلدارنی اور دوسری عورتوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ کاکی نے بھی ان کی پیروی کی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی۔ آخر دعا ختم ہوئی اور یہ عورتیں مزار سے نکل کر پھر اسی پیڑ کے نیچے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئیں۔

اب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ہر چند گیسوں کا انتظام کیا گیا تھا مگر ان کی تعداد دو تین سے زیادہ نہ تھی۔ ایک گیس مزار کی کوٹھری کے باہر صحن میں رکھا گیا تھا۔ ایک پہاڑی راستے کے بیچوں بیچ تاکہ زائرین کو ٹھوکر نہ لگے اور ایک اس جگہ جہاں لنگر تقسیم کیا جاتا تھا۔ باقی تمام جگہوں پر تیل کی کپیاں چراغ یا مشعلیں جلائی گئی تھیں۔ کچھ لوگ گھر سے لالٹینیں لے آئے تھے۔ وہ بھی کہیں کہیں روشن تھیں۔ مگر ان سب کی روشنی اتنی مدھم تھی کہ ہر طرف ہم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

رسم کے مطابق سب زائرین کو رات یہیں گذارنی تھی۔ دیہات کے لوگ اور خاص طور پر عورتیں رات کو جلد ہی سو جانے کی عادی ہوتی ہیں۔ اس پر میلہ دیکھنے اور گھومنے پھرنے سے وہ تھک کر چور ہو گئی تھیں۔ بعض نے تو لنگر کا بھی انتظار نہ کیا اور دریوں اور چٹائیوں پر جہاں جگہ ملی پڑ کر سو گئیں۔

رات کو نو بجے کے قریب لنگر تقسیم کیا گیا اور میلے میں ایک مرتبہ پھر چہل پہل پیدا ہو گئی۔ آخر دس بجتے بجتے یہ ہنگامہ بھی ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی زائرین کی بیشتر تعداد کو نیند نے بے سدھ کر دیا۔

کاکی زیلدارنی کے پاس ہی لیٹی ہوئی تھی۔ عرس کی ریل پیل، ہنگامے، کھیل کود، شور غل، بھانت بھانت کی صورتیں، عورتوں کا جن شاہ ولی کے مزار پر جانا اور اولاد کی مراد مانگنا، دن بھر یہ سب تماشے دیکھ دیکھ کر اس کے کمزور دماغ میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ جس سے اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ کچھ دیر تو وہ یونہی پڑی رہی۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پہاڑی پر اب بھی کہیں کہیں لوگ آہستہ بول رہے تھے۔ ایک طرف ذرا فاصلے پر ملنگوں کی منڈلی جمی ہوئی تھی اور کچھ لوگ مٹکے کی لے کے ساتھ گا رہے تھے:

"چل سجناں دے سنگ تی جے توں ہونا ست تی"

اس منڈلی سے بار بار ایک شعلہ اندھیرے میں لپکتا اور لمحہ بھر کو بعض شکلوں کو اجاگر کر دیتا۔ کاکی کچھ دیر یہ منظر دیکھتی رہی۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت زیلدارنی اور دوسری عورتیں نیند میں مدہوش تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اس منڈلی کی طرف جانے لگی۔ جب ذرا قریب پہنچی تو ایک گرے ہوئے درخت کا تنا نظر آیا اور وہ اس پر بیٹھ گئی۔ یہاں سے وہ شعلہ زیادہ روشن اور اوپر اٹھتا ہوا دکھائی دینے لگا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ انہماک کے ساتھ یہ تماشہ دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر میں اس منڈلی میں سے ایک آدمی اٹھا اور زور زور سے کھانستا ہوا اس طرف آنے لگا جدھر کاکی درخت کے تنے پر بیٹھی تھی۔ کاکی نے اسے جھٹ پہچان لیا

"چاچا مولا تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"تو کون ہے؟"

"واہ مجھے نہیں پہچانا؟"

مولے نے اپنی واحد آنکھ کو ملا اور بے اختیار بول اٹھا

"اوہو ہو۔ بھئی واہ یہ تو اپنی کاکی ہے۔"

اس نے کاکی کو ہمیشہ برے حال میں دیکھا تھا۔ مگر اب اس کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"بھئی رب کی سوں کاکی تو ان کپڑوں میں بڑی خوبصورت لگ رہی ہے۔"

"چاچا یہ کپڑے ذیلدارنی نے سلوائے ہیں۔"

"اچھا! شاباش ہے بھئی۔"

"چاچا تجھے ایک بات بتاؤں؟"

"بتا"

"جب ذیلدارنی نے لڑکے کی مراد مانگی۔ تو میں نے بھی ڈھولے کی دعا مانگی۔ آہا ہا۔ چاچا یہ بات ذیلدارنی کو نہ بتانا۔"

مولے نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کا دماغ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ عین اس وقت منڈلی سے پھر ایک شعلہ لپکا۔ کاکی اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی:

"چاچا۔ یہ آگ سی کیا اٹھتی ہے؟"

"کون سی آگ؟"

"وہ دیکھو پھر نکلی۔"

اس اثنا میں کئی شعلے پے در پے لپکے۔ مولے نے دیکھا تو مسکرانے لگا:

"اس کو لاٹ کہتے ہیں پگلی۔ تو نے یہ لاٹ پہلے کبھی نہیں دیکھی؟"

"کبھی نہیں۔ چاچا چل مجھے دکھا۔"

مولا گھبرا سا گیا۔

"آج نہیں پھر کبھی سہی۔"

"نہیں۔ میں آج ہی دیکھوں گی۔"

"اچھا ٹھہر" اس کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ رہی تھی۔

"ایک شرط ہے"

"کیا؟"

"کسی کو بتائے گی تو نہیں"۔

"کبھی نہیں"

"قسم کھا چن شاہ ولی کی"۔

"چن شاہ ولی کی سوں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

"یاد رکھ تو نے قسم توڑ دی۔ تو چن شاہ ولی تجھ پر غصے ہوگا اور تیری مراد بھی پوری نہیں کرے گا۔"

"کہہ جو دیا چاچا نہیں بتاؤں گی۔"

"اچھا تو ٹھہر۔ میں وہ لاٹ یہیں لاتا ہوں۔ ....."

علی الصباح ذیلدارنی کاکی کو جو دری سے ذرا ہٹ کر زمین پر بے ہوش پڑی تھی، جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھ کھلنے میں نہ آتی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ کہتی جاتی:

"کلموہی نے ایک ہی دن میں زمین پر لوٹ لوٹ کر کپڑوں کا کیا ناس کر دیا۔ اری اٹھتی ہے یا دوں ایک لات۔"

"اٹھتی ہوں چاچی۔" آخر بڑی مشکل سے کاکی نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ جو اس وقت بہت سرخ ہو رہی تھیں۔

"او ناشدنی اٹھ۔ میلہ ختم ہو گیا۔ سب لوگ جا رہے ہیں۔ جلدی سے برتن سنبھال۔ دری لپیٹ ذیلدار صاحب انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"کاکی کا سر درد سے پھٹا جاتا تھا۔ پیاس سے حلق سوکھ رہا تھا۔ وہ جیسے تیسے اٹھی۔ مگر کھڑی ہوئی تو ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ گرتی پڑتی درخت کے تنے کے پاس پہنچی۔ جہاں پانی کی مٹکی رکھی تھی اور لوٹا بھر کر پانی پیا۔ پھر منہ پر چھینٹے دیئے۔ رفتہ رفتہ اس کے حواس درست ہونے لگے۔

چن شاہ ولی کے عرس کو ابھی ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ گاؤں کی عورتوں نے کاکی کے مزاج میں

ایک تبدیلی دیکھی۔ وہ یہ کہ اسے کھانے پینے کی رغبت نہ رہتی۔ کہاں تو ایسی چٹو کہ دن میں کئی کئی مرتبہ کھانا کھاتی اور چھالیہ کے ٹکڑے کے ٹکڑے پی جاتی۔ یا اب یہ حال کہ کھانا دیکھ کر اسے متلی ہونے لگتی۔ ویسے بھی اسے دن رات ابکائیاں آتی رہتیں۔ یہ کیفیت چار پانچ ہفتے تک رہی۔ اس کے بعد محلے کی عورتیں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئیں کہ کاکی کا پیٹ روز بروز پھولتا جا رہا ہے۔

سب سے پہلے ذیلدارنی پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا۔

"ارے کاکی بی بی۔ تجھے تو حمل ہے کمبخت۔"

ذیلدارنی کی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ دیوانوں کی طرح اس کا منہ تکنے لگی۔

"کاکی سچ سچ بتا تو کس آدمی سے ملی تھی؟"

"کسی سے بھی نہیں چاچی۔"

"تو پھر رنڈی یہ حرام کا بچہ تیرے پیٹ میں کیسا ہے؟"

"میرے پیٹ میں بچہ ہے چاچی؟" یک بارگی کاکی کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ "تو سچ کہتی ہے چاچی؟ آہا پھر تو جن شاہ ولی نے میری مراد پوری کر دی۔"

دو چار دن میں یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ وہ جس طرف بھی جاتی مرد اس کو گھورتے۔ اور عورتیں اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتیں۔ مگر کاکی کو اب نہ جھڑکیوں کا ڈر تھا نہ مار پیٹ کا خوف۔ اس پر ہر وقت اب ایک جذب کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ وہ اکثر اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی۔ کبھی اس طرح خطاب کرنے لگتی۔ جیسے کوئی اس کے سامنے کھڑا ہے۔ جس کو وہ تو دیکھ رہی ہے مگر کوئی اور نہیں دیکھ پاتا۔ کبھی ہنسنے لگتی تو ہنسے ہی چلی جاتی۔ اور رونے لگتی تو گھنٹوں روتی ہی رہتی۔ گاؤں کے اکثر گھروں میں اب بھی اس کا پھیرا رہتا مگر کہیں چند منٹ سے زیادہ نہ ٹکتی۔ کبھی آپ ہی آپ ہنس اٹھتی۔

"ہاں چاچی میرے پیٹ میں بچہ ہے۔ مجھے جن شاہ ولی نے دیا ہے۔ وہ اس رات میرے پاس آیا تھا۔ اس نے دانتوں میں سرخ گلاب کا پھول داب رکھا تھا۔ مجھے دیکھا تو مسکرانے لگا۔ پھر اس نے وہ پھول میری جھولی میں پھینک دیا......"

اور شیخ کوتری کی بیوی سے، جو ہمیشہ اس سے شفقت سے پیش آتی تھی اس نے کہا:

"جن شاہ ولی ہر رات میرے پاس آتا ہے۔ ایک دفعہ وہ اپنے سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ میں نے کہا۔ جن شاہ ولی مجھے سیر کرا۔ اس نے کہا اچھا۔ پھر اس نے مجھے اپنے پیچھے بٹھا لیا اور دور دور کی

سیر کرائی۔ اس کا گھوڑا دریاؤں کے اوپر چلتا تھا۔ پہاڑوں پر چڑھتا تھا آسمان پر اڑتا تھا۔ میں نے جن شاہ ولی کی کمر دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھی تھی۔ جن شاہ نے کہا کاکی ڈرتیں؟ تو گرے گی نہیں۔"

اور پٹواری کی نئی بیوی سے جو عمر میں کاکی سے تین چار سال ہی بڑی تھی اس نے کہا:

"تجھے پتا نہیں ہے چاچی جن شاہ ولی بڈھا نہیں۔ نہ اس کے داڑھی ہے۔ وہ بڑا گھبرو جوان ہے۔ اس کے لمبے لمبے گھنگھریالے بال ہیں۔ جو اس کے شانوں پر لٹکتے ہیں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا کاکی تیرے بال بڑے الجھے ہوئے ہیں۔ لا میں انہیں سلجھا دوں۔ اور وہ اپنی انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کرنے لگا......"

کبھی کبھی وہ مولے تندوری والے کی دکان پر بھی جاتی۔

"چاچا مولا! دیکھا جن شاہ ولی نے میری مراد پوری کر دی۔ لا تھوڑی سی گاچنی تو دے۔"

مولے کے چہرے کا رنگ یکبارگی زرد پڑ جاتا۔ اور وہ گھبراہٹ میں بہت سی گنڈیریاں اس کی جھولی میں ڈال دیتا۔

ایک دن وہ ذیلدارنی کے گھر پہنچی۔ تو خیر النساء نے پہلے تو اسے سینکڑوں گالیاں دیں۔ پھر چٹیا پکڑ کر خوب گھسیٹا۔ اور بہت سی لاتیں اور تھپڑ بھی رسید کئے۔

"خبردار رنڈی اگر پھر کبھی میرے گھر میں قدم رکھا۔"

"چاچی" کاکی نے بلک بلک کر روتے ہوئے کہا۔ "تو نے مجھے مارا ہے۔ رات جن شاہ آئے گا۔ تو میں اس سے کہوں گی۔ ذیلدارنی بہت بری ہے اس کی مراد کبھی پوری نہ کرنا۔"

اور پھر گاؤں والوں نے پنچایت کی۔ جس میں گاؤں کے سب چھوٹے بڑے شامل ہوئے۔ اور فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ کاکی کی وجہ سے گاؤں کی سخت بدنامی ہو رہی ہے۔ اس لئے اسے گاؤں سے نکال دیا جائے۔

اس فیصلے کو عمل میں لانے کے لئے علی الصباح ایک بیل گاڑی کا انتظام کیا گیا۔ اور اس میں کاکی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے سوار کر دیا گیا۔

یہ بیل گاڑی دن بھر نامعلوم راہوں سے گذرتی رہی۔ اور شام کو ایک اجاڑ مقام پر پہنچ کر رک گئی۔ وہاں کاکی کے ہاتھ پاؤں کھول دیے گئے۔ اور اسے زبردستی بیل گاڑی سے اتار دیا گیا۔

سنائی میں کچھ دنوں اس واقعہ کا چرچا رہا۔ مگر جب دو تین مہینے گذر گئے۔ اور کاکی کو نہ تو کسی نے دیکھا اور نہ اس کی کوئی خبر ہی آئی تو یہ بات آپ سے آپ گاؤں والوں کے ذہن سے اتر گئی۔

دن پر دن گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ پھر چیت کا مہینا آ گیا۔ زمین سے ہر طرف پھر ہریالی جھانکنے لگی۔ کسان فصلوں کی کٹائی سے فارغ ہوئے اور ایک بار پھر جمن شاہ ولی کے عرس کی تیاریاں ہونے لگیں۔

پچھلے برس تیر النسا کی مراد تو پوری نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس گاؤں کی دو عورتوں پر جمن شاہ کی نظر کرم ہو گئی تھی۔ ذیلدارنی کو اپنی محرومی کا رنج تو بہت تھا مگر وہ مایوس نہیں ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب کے جمن شاہ ولی ضرور خواب میں اپنا دیدار کرائیں گے۔

آخر عرس کا دن آ پہنچا۔ اس دفعہ پچھلے سال سے بھی زیادہ زور شور سے میلا بھرا۔ تمام گوشہ جمن شاہ ولی کی قبر پر مراد مانگنے والی عورتوں کا اس قدر ہجوم ہو گیا کہ سانس لینا مشکل تھا۔ مگر یہ فرط عقیدت سے اور بھی قبر پر پلی پڑتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہم جس قدر زیادہ تکلیف اٹھائیں گے اسی قدر جلد ہماری مراد پوری ہوگی۔

اس ہجوم میں تیر النسا بھی ولی کی قبر کے سرہانے جمی کھڑی تھی۔ وہ چڑھاوا چڑھا چکی تھی اور بہت منت وزاری سے بیٹے کے لئے دعا بھی مانگ چکی تھی۔ وہ درگاہ سے اٹھنے ہی کو تھی کہ ایک عورت جس کی وضع قطع بنجاروں کی سی تھی ہجوم کو چیرتی ہوئی قبر کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی گود میں تین چار مہینے کا بچہ تھا۔ دبلا پتلا ہڈیوں کی مالا۔ وہ یا تو سو رہا تھا یا اس میں اتنی سکت ہی نہ تھی کہ آنکھ کھولے۔

اس عورت کی نظر جیسے ہی تیر النسا پر پڑی۔ اس کی آنکھیں ایک دم چمک اٹھیں۔

"دیکھا او ذیلدارنی میرا اجالا دیکھ۔ یہ مجھے جمن شاہ نے دیا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا بچہ بڑے فخر سے تیر النسا کو دکھایا۔ ذیلدارنی نے کاکی کو فوراً پہچان لیا۔

"او بے حیا بے شرم یہ تو ہے! دور ہو یہاں سے حرام کا پلا لے کر"

"آہاہا۔ تو مجھ سے جلتی ہے ذیلدارنی۔ کیونکہ جمن شاہ نے تجھے بیٹا نہیں دیا۔ اس نے مجھے بیٹا دیا۔ آہاہا۔"

کاکی کے چہرے سے وحشیانہ خوشی ظاہر ہو رہی تھی۔ ذیلدارنی غصے سے کانپنے لگی۔ اس نے چاہا کہ آگے بڑھ کر کاکی کا منہ نوچ لے۔ مگر درمیان میں کئی عورتیں حائل تھیں جو حیرت سے کبھی ذیلدارنی کا منہ تکتی تھیں کبھی کاکی کا۔

"ٹھہر تو جا رنڈی۔ ابھی تجھے اس گاؤں سے نکلواتی ہوں۔ اب کے تیرا سر مونڈھا جائے گا۔ اور تیرا منہ کالا کر کے تجھے گدھے پر سوار کیا جائے گا۔"

مگر کاکی پر ذیلدارنی کی ان دھمکیوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ تیر النسا کو چڑھانے کے لئے برابر کہے جا رہی تھی:

"تو مجھ سے جلتی ہے ذیلدارنی۔ کیونکہ جمن شاہ ولی تیرے پاس راتوں کو نہیں آتا۔ وہ تیرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی نہیں کرتا۔ وہ تجھے اپنے سفید گھوڑے پر بٹھا کر آسمان کی سیر نہیں کراتا۔ تو ہمیشہ جلتی بھنتی رہے گی ذیلدارنی۔ جمن شاہ تجھے کبھی بیٹا نہیں دے گا۔"

وہ عورتیں جو پہلے تعجب سے کاکی کو دیکھ رہی تھیں۔ اور جن میں سے بعض کو شاید اس سے کچھ ہمدردی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی زبان سے اب جمن شاہ ولی کی شان میں گستاخانہ باتیں سن کر دانتوں سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگیں۔

اتنے میں درگاہ کا متولی جیون سائیں جو باہر دالان میں چٹائی پر بیٹھا تھا۔ شور سن کر اندر آ گیا۔ ذیلدارنی نے اسے دیکھتے ہی چلانا شروع کیا:

"دیکھ سائیں بابا۔ یہ کاکی بے حیا نہ جانے کہاں سے حرام کا پلا لے آئی ہے۔ اور درگاہ کی بے ادبی کر رہی ہے۔ اسے جھٹ سے پکڑ کر نکال دے۔"

جیون سائیں تھا تو ادھیڑ عمر مگر تھا خوب ہٹا کٹا۔ وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ کاکی نے سہم کر چیخ ماری:

"جمن شاہ۔ یہ لوگ مجھے مار رہے ہیں۔ مجھے بچا مجھے بچا۔"

مگر کوئی اس کی مدد کو نہ پہنچا۔ ادھر جیون سائیں عورتوں کو آگے سے ہٹاتا ہوا قریب آتا جا رہا تھا۔ اچانک کاکی نے گود کے بچے کو جو ابھی تک سو رہا تھا جمن شاہ ولی کی قبر کے نرم نرم پھولوں پر لٹا دیا۔ اور خود ایک ہرنی کی طرح طرارہ بھر درگاہ سے نکل بھاگی۔

اس کی یہ حرکت ایسی غیر متوقع تھی کہ سب لوگ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ آخر ذیلدارنی اور دو تین عورتوں نے "پکڑ لو پکڑ لو" کا شور مچایا۔ اس پر کچھ دیہاتی کاکی کے پیچھے بھاگے۔ مگر وہ کودتی پھاندتی پہاڑی کے ایک ایسے ٹیلے پر چڑھ گئی۔ جو بالکل سپاٹ تھا اور جس پر چڑھنا سخت خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ لوگ کچھ دیر نیچے کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ مگر کسی کو اس کے پیچھے جانے کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر دو ایک منچلے نوجوانوں نے ہمت کی۔ مگر ابھی انہوں نے آدھا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ کاکی نے ٹیلے کے دوسری طرف پہنچ کر، جس کے نیچے ایک کھائی تھی، بے جھجک چھلانگ لگا دی۔ شاید اسے کچھ چوٹ آ گئی تھی۔ کیونکہ وہ کچھ دیر زمین پر بیٹھی رہی۔ آخر وہاں سے اٹھی اور اس طرف کا رخ کیا جہاں سے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ فصل کی کٹائی کے بعد یہ جگہ اب ایک کھلا میدان بن گئی

تھی۔

اب گاؤں سے کئی آدمی اسے پکڑنے کے لئے دوڑ رہے تھے۔ مگر وہ ان کے ہتّے آ کے ہی نہ دی۔ ہاں ایک دفعہ دو آدمیوں نے اسے پکڑ ہی لیا ہوتا۔ مگر اس میں نہ جانے کہاں سے ایک منہ زور گھوڑی کی سی طاقت آ گئی تھی۔ کہ اس نے جھٹک کر اپنے ہاتھ چھڑا لئے۔ اور پھر تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔

ساری رات اس کا تعاقب جاری رہا۔ صبح کو جب سورج نکل رہا تھا تو وہ ایک میدان میں اپنا پیچھا کرنے والوں میں ایسی گھر گئی کہ فرار کی کوئی صورت نہ رہی۔ جب اسے پکڑا گیا تو وہ ایک درندے کی طرح ہانپ رہی تھی۔ خاردار جھاڑیوں میں الجھ الجھ کر اس کے کپڑوں کی دھجیاں اڑ گئی تھیں۔ اور اب اس کے جسم پر ایک تار بھی نہ رہا تھا۔

اسے کئی آدمیوں نے دبوچ رکھا تھا۔ ایک آدمی اپنے سر سے پگڑی اتار کر اس کے ہاتھ باندھنے لگا۔ وہ پہلے تو چپ چاپ اپنے ہاتھ بندھتے دیکھتی رہی پھر یک بارگی جوش آیا۔ اور اس نے وحشیانہ جدوجہد سے اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اس پر اس نے اس شخص کی طرف جس نے اس کے ہاتھ باندھے تھے غضب ناک نظروں سے دیکھا۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ مدافعت کر سکے۔ اچک کر اس کا کان اپنے دانتوں میں لے لیا اور چبا ڈالا۔

فرار

اس شام میں دفتر سے تھکا ہارا گھر پہنچا ہی تھا کہ میری بیوی نے بڑے تشویش کے لہجے میں مجھ سے کہا: "ابھی ابھی نانا جان کے ہاں سے پیغام آیا ہے۔ سرفراز ماموں کی حالت یک لخت بہت بگڑ گئی ہے۔ امید نہیں وہ آج کی رات بھی کاٹ سکیں۔ ہم سب کو فوراً بلایا گیا ہے۔"

سرفراز ماموں ہمارے وسیع کنبے کے قریب قریب ہر فرد کے بڑے محبوب تھے۔ ان کی عمر پچاس برس کی ہو چکی تھی۔ مگر ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ ابھی پچھلے دنوں میری والدہ نے بڑے اہتمام سے ان کی پچاسویں سالگرہ منائی تھی۔ وہ دعوت میں بڑے چہک رہے تھے اور چھوٹے بڑے ہر ایک پر پھبتیاں کہہ رہے تھے۔ مگر اس دعوت کے اگلے ہی روز وہ اچانک بیمار ہو گئے۔ کچھ عجیب ہی سا مرض تھا جسے ڈاکٹر یا حکیم کوئی بھی ٹھیک طور پر تشخیص نہ کر سکا تھا۔ ان کی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی اور وہ بے حد کمزور ہو گئے۔ ہر شخص کے دل سے ان کی تندرستی کے لئے دعا نکلتی تھی۔ مگر مرض میں کچھ افاقہ نہ ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس مرض سے جانبر نہ ہو سکیں گے۔

میری بیوی نے جلد جلد بچوں کے کپڑے بدلے۔ خود بھی لباس تبدیل کیا اور تھوڑی ہی دیر میں ہم نانا جان کے ہاں پہنچ گئے۔ میرے سب بھائی بہن اور دوسرے عزیز و اقارب پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ میری والدہ جو میرے والد کے انتقال کے بعد زیادہ تر ننھیال ہی میں رہنے لگی تھیں، سرفراز

ماموں کو بہت چاہتی تھیں۔ انہیں اپنے چھوٹے بھائی کی اس بیماری کا سخت صدمہ تھا۔ وہ غم سے نڈھال ہو رہی تھیں مگر ضبط کیے ہوئے تھیں۔ وہ بڑی جانفشانی سے ان کی تیمارداری کر رہی تھیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ میرے ضعیف نانا نانی اس صدمے کی تاب نہ لا کر اپنے حواس کھو بیٹھے ہیں۔ انہیں ان کے کمرے میں بند کر دیا گیا ہے۔ اور کسی کو ان سے ملنے جلنے نہیں دیا جاتا۔

جس کمرے میں سرفراز ماموں بستر مرگ پر پڑے تھے۔ اس میں ان کی مسہری کے علاوہ صرف ایک چھوٹی میز دوائیں وغیرہ رکھنے کے لئے اور ایک کرسی ڈاکٹر کے بیٹھنے کے لئے رہنے دی گئی تھی۔ باقی سامان اٹھوا دیا گیا تھا۔ سرفراز ماموں طبعاً بڑے خوش خلق اور ملنسار تھے۔ مگر اس بیماری نے رفتہ رفتہ انہیں سخت تنک مزاج بنا دیا تھا۔ وہ میری والدہ کے سوا اور کسی کا اپنے پاس آنا پسند نہ کرتے تھے۔ کہتے "للہ مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

بیماری کے آخری ایام میں تو ان کی تنہائی پسندی اس حد تک بڑھ گئی تھی۔ کہ انہوں نے تمام کانسی اور چینی کے مجسمے، عورت مرد کی تصویریں، قدرتی نظارے، یہاں تک کہ خوش خطی کے مرقعے بھی اپنے کمرے سے نکلوا دیے تھے۔ کہتے: "ان سے ذہنی سکون میں خلل پڑتا ہے۔"

اقربا کے بیٹھنے کے لئے ملحقہ کمرے میں انتظام کیا گیا تھا۔ میرے تینوں بھائی، دو بیاہتا بہنیں اور ان کے بچے اسی کمرے میں جمع تھے ان میں ہم بھی شامل ہو گئے۔ ہم دو دو تین تین مل کر بے پاؤں سرفراز ماموں کے کمرے میں جاتے اور تھوڑی دیر ان کی مسہری کے پاس کھڑے رہ کر بے پاؤں واپس آ جاتے۔

سرفراز ماموں پر اس وقت غشی طاری تھی۔ دیر سے انہوں نے آنکھ نہیں کھولی تھی۔ ہر چند ڈاکٹر جواب دے چکے تھے مگر ابھی تک کئی لوگوں کو امید تھی کہ شاید وہ بچ جائیں۔ قریب ہی ایک اور کمرے میں قرآن خوانی ہو رہی تھی اور ان کی صحت کے لئے دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔

ایک مرتبہ ان کے کمرے کو مہمانوں سے خالی دیکھ کر میں اکیلا ہی اندر چلا گیا۔ تاکہ ایک بار اور انہیں جی بھر کر دیکھ لوں۔ وہ بچپن میں مجھ پر خاص طور سے شفقت فرماتے تھے۔ اور سب سے زیادہ میری ہی فرمائشیں پوری کیا کرتے تھے۔ اور ادھر میں بھی ان سے کچھ زیادہ ہی مانوس تھا۔

وہ مسہری پر چت لیٹے ہوئے تھے۔ صرف ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا باقی سارا جسم ایک سپید پشمینے کی ہلکی چادر سے، جس کے کناروں پر چھوٹی بوٹی کی سرخ خوشنما بیل کڑھی ہوئی تھی، ڈھکا ہوا تھا۔ انہوں نے پچھلے دو تین ہفتوں سے ڈاڑھی نہیں منڈوائی تھی اس کی وجہ سے ان کے رخساروں پر ایک چھوٹی سی

کر بڑی ڈاڑھی نکل آئی تھی۔ جو کمرے کی مدھم روشنی میں ان کے گندمی رنگ کے چہرے پر بہت بھلی لگتی تھی۔

میں ان کی مسہری کے اور قریب پہنچ گیا۔ اور ان کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ ہر چند ان کی آواز نے جواب دے دیا تھا۔ مگر ابھی تک ان کا سانس اکھڑنے نہ پایا تھا۔ ان کے چہرے سے ایک عجیب طرح کی آسودگی جھلکتی تھی۔ کسی قسم کے کرب کا نشان نہ تھا بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ میٹھی نیند سو رہے ہیں۔

میں ان کے چہرے کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور ایسا معلوم ہوا جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر تک یہی کیفیت رہی۔ رفتہ رفتہ ان کی آنکھوں کا تجسس غائب ہونے لگا اور اس کی جگہ ایک خفیف سی مسکراہٹ جھلکنے لگی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ انہوں نے مجھے پہچان لیا ہے۔ اس لمحے میں بھی اپنا غم بھول گیا اور مسکرانے لگا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان کی مسکراہٹ ان کی آنکھوں سے نکل کر ان کے ہونٹوں اور رخساروں پر پھیل گئی۔ بلا شبہ یہ ان کی وہی مخصوص مسکراہٹ تھی، جس میں ہمیشہ شرارت کا ایک خفیف سا عنصر چھپا رہتا تھا۔

اس کے بعد دھیرے دھیرے ان کی آنکھیں بند ہوتی گئیں اور وہ مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ میں جلدی ہی ان کے کمرے سے چلا آیا۔ اس ملاقات کا میرے دل پر بہت گہرا اثر پڑا تھا مجھے اپنے جذبات پر قابو نہ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ اس خیال سے کہ میری بہنیں اور خاص طور پر میرے بیوی بچے میری اس کمزوری کو دیکھ کر پریشان نہ ہوں، میں چپکے سے کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ اور باغیچے میں ٹہلنے لگا۔

سرفراز ماموں کی اولین یاد جو میرے دل میں ابھری اس وقت کی تھی جب میں پانچ چھ برس کا تھا۔ اور وہ پچیس سال کے نوجوان تھے۔ وہ بہت عمدہ عمدہ کپڑے پہنا کرتے اور بڑے بنے سنورے رہا کرتے۔ وہ اکثر اپنی بہن سے ملنے آیا کرتے جو عمر میں ان سے پانچ سال بڑی تھیں۔ ہم بھائی بہن جیسے ہی برآمدے میں ان کی آواز سنتے، جہاں کہیں بھی ہوتے اڑ کر ان کے پاس جا پہنچتے اور ان سے لپٹ جاتے۔ وہ ہمارے لئے طرح طرح کی چٹخارے دار مٹھائیاں، ٹافیاں، پستہ بادام اور کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے کھلونے لے کر آیا کرتے۔ یہ چیزیں وہ اپنی جیبوں میں سے نکال نکال کر ہمیں دیا کرتے اور بہت خوش ہوتے۔ مٹھائی اور کھلونوں کے علاوہ کئی اور طریقوں سے بھی ہمارا دل بہلایا کرتے۔ وہ ہمیں جادو کے کھیل دکھاتے جنہیں دیکھ کر ہم دنگ رہ جاتے۔ کہانیاں سناتے جنہیں سن کر

بڑی ہنسی آتی۔ وہ ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے اور کبھی کبھی ہمارے اصرار پر ہمیں گانا بھی سناتے۔ ان کی یہ دلچسپی اپنے بھائیوں اور دوسرے اقربا کے بچوں کے ساتھ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے خاندان کے سارے بچے ان کے بے حد گرویدہ تھے۔ بچوں کے علاوہ بڑے بھی ان سے ملنے کے مشتاق رہتے تھے۔ مگر ان کے پاس وہ زیادہ دیر نہ ٹھہرتے۔ بس چند منٹ رسمی باتیں کر کے کسی بہانے سے کھسک لیتے۔

میں نے اب تک سرفراز ماموں کی خوبیاں ہی گنوائی ہیں مگر ان میں برائیاں بھی تو تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اول درجے کے سست تھے۔ اور محنت سے بہت ہی جی چراتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے دونوں بڑے بھائی تو کبھی کے گریجویٹ ہو کر اونچے اونچے عہدوں پر پہنچ گئے۔ اور یہ برسوں اسکول ہی میں لٹکے رہے۔ اور آخر میٹرک کئے بغیر ہی انہیں تعلیم ختم کر دینی پڑی۔ لطف یہ کہ وہ کند ذہن نہیں، بلکہ بڑے ذہین تھے۔ بس ایک ذرا لکھنے پڑھنے میں ان کا جی نہ لگتا تھا۔

دوسرا عیب ان میں یہ تھا کہ وہ حد درجے کے ڈرپوک تھے۔ جھگڑے فساد کا تو کیا ذکر جہاں ذرا گھر کے اندر یا باہر کوئی طیش میں آ کر اونچی آواز میں بولنے لگا۔ یہ وہاں سے کھسکے۔ میرے حضرت نانا بھی غضب کے تھے اور آپ تو ایسی باتیں کہتے کہ جس کا سر ہوتا نہ پیر۔ پھر انہیں ورزش سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جب تک اسکول میں رہے کسی قسم کے کھیل میں حصہ نہ لیا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ وہ قدرتی طور پر بہت ہی دبلے پتلے اور کمزور ہوتے تھے۔ یہ کمزوری بڑے ہونے پر بھی قائم رہی۔ چنانچہ ان کے دونوں بھائی تو خوب کڑیل جوان نکلے مگر یہ دھان پان ہی رہے۔

نانا جان کو اپنے چھوٹے بیٹے کے تعلیم میں اور دنیاوی ترقی میں اپنے بھائیوں سے پیچھے رہ جانے کا افسوس تو ہوا۔ مگر ان کی شفقت میں ذرا فرق نہ آیا۔ بلکہ وہ اس کی کچھ زیادہ ہی دلجوئی کرنے لگے۔ وہ خدا کے فضل سے آسودہ حال اور صاحب جائیداد تھے۔ اراضی کے علاوہ ان کے متعدد مکان اور دکانیں تھیں جن کے کرائے کی ہر مہینے ایک معقول رقم آیا کرتی تھی۔ انہوں نے یہ سوچ کر کہ سرفراز کو اپنی کم علمی کی وجہ سے کوئی مناسب سرکاری نوکری تو ملنے سے رہی اور نہ وہ کوئی کاروبار ہی کر سکتے ہیں ان کے ذمے یہ کام سپرد کر دیا کہ وہ جائیداد کا کرایہ اگاہا کریں اور آمدنی اور خرچ کا حساب رکھا کریں۔ اس کام کے عوض میں ان کا ایک معقول مشاہرہ مقرر کر دیا گیا۔

یہ کام ان کی سست اور آرام طلب طبیعت کے لئے بہت موزوں تھا۔ انہیں نہ تو دفتر جانا پڑتا نہ کسی قسم کی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی۔ بس مزے سے گھر ہی میں رہتے یا اپنے عزیزوں کے ہاں چلے

جاتے۔ اور ان کے بچوں کے ساتھ اپنا وقت گزارتے۔ اس پر بھی ان کی یہ حالت تھی کہ جب دیکھو چہرے سے تکان برس رہی ہوتی، ہائے وائے کرتے۔ اور کہتے "چلو بچو! ذرا میرے ہاتھ پاؤں تو داب دو۔" وہ ہمارے لئے مٹھائیاں وغیرہ تو لایا ہی کرتے تھے مگر جب ہم نے "مٹھی چاپی" کی خدمت کی ہوتی تو اس کے صلے میں ایک الگ تھیلے میں بہت سی چیزیں بھر کر لاتے۔ ہم ان کے ساتھ کسی الگ تھلگ کمرے میں چلے جاتے۔ وہ اپنی شیروانی اتار دیتے اور بستر پر چت لیٹ جاتے۔ پھر کوئی بچہ ان کے بازو دباتا کوئی ان کی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر چلتا۔ کوئی سر میں تیل ڈال کر انگلیوں سے سہلاتا اور وہ ایک ایک، دو دو منٹ کے بعد سب کو ٹافیاں، سنگترے کی پھانکیں، اور دوسری چھوٹی والی مٹھائیاں بانٹتے رہتے۔ یہ سلسلہ بعض اوقات گھنٹوں جاری رہتا۔ ہم لوگ مٹھائیوں کے لالچ میں تھکنے کا نام نہ لیتے۔ اور ادھر وہ انعام و اکرام کی بارش جاری رکھتے۔ ہماری اس خدمت گزاری سے ان کے تھکے ہوئے اعضا کو یقیناً آرام پہنچ رہا ہوتا۔ کیونکہ ان کے پژمردہ چہرے پر آہستہ آہستہ بشاشت آتی جاتی اور ان کی آنکھیں جو پہلے بجھی بجھی ہوتیں روشن ہو جاتیں۔

آخر وہ کہتے "بچو، اب بس کرو، شکریہ، بہت شکریہ۔"

پھر وہ غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھوتے، شیروانی پہنتے۔ اور ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرتے اور جلد ہی پھر آنے کا وعدہ کرتے ہوئے چلے جاتے۔ ہم جب امی سے یہ واقعہ بیان کرتے تو وہ ہنستیں اور کہتیں: "بے چارہ سرفراز!"

سرفراز ماموں اپنی اس آسودہ زندگی سے بہت مطمئن تھے لیکن اب مشکل یہ آ پڑی کہ نانا جان کو ان کی شادی کی فکر ہوئی۔ ان کے لئے جگہ جگہ رشتے ڈھونڈے جانے لگے۔ مگر ان کے سامنے جس لڑکی کا نام لیا جاتا۔ جھٹ اسے رد کر دیتے۔ کہتے "ابھی کیا جلدی ہے۔ جب وقت آئے گا تو میں خود کہہ دوں گا۔"

مگر مہینے اور سال گزرتے جاتے تھے اور وہ وقت نہیں آنے پاتا تھا۔ نانا جان سخت فکرمند رہنے لگے تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹوں کی طرح ان کا گھر بھی بستا بستا دیکھ لیں۔ مگر وہ راضی نہ ہوتے تھے۔ گو اب والد کی آرزو مندی انہیں بھی کسی قدر پریشان کرنے لگی تھی۔

اسی زمانے کا ذکر ہے۔ ایک دن شام کو گھر آئے تو بہت چپ چپ اور سنجیدہ صورت بنائے ہوئے تھے۔ ان کے والد اور بڑے بھائیوں کو تعجب ہوا۔ پوچھا کیا بات ہے بھئی۔ یہ خاموش رہے۔ مگر صورت پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ بنالی۔ اس پر بھائیوں نے اصرار کیا، تو یوں گویا ہوئے:

"آپ روز روز کہا کرتے تھے۔ لیجیے میں نے اپنی پسند کی لڑکی تلاش کر لی ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ وہ پچھلے روز شام کو نمائش دیکھنے گئے تھے۔ وہاں اتفاق سے انہوں نے ایک لڑکی کو جو اپنے والدین کے ہمراہ آئی تھی، بے پردہ دیکھ لیا۔ بس اسی وقت سے اس کی صورت ان کے دل میں ایسی بس گئی ہے کہ کسی طرح محو نہیں ہوتی۔ انہوں نے ڈرائیور کو اشارہ کر کے اس کے والد کا نام اور پتا بھی پوچھ لیا ہے اور وہ اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔

"کیا نام ہے؟" نانا جان نے پوچھا۔

"نواب ظہیر الدولہ" سرفراز ماموں نے نام کا ایک ایک جزو پر زور دیتے ہوئے کہا۔

یہ نام سننا تھا کہ نانا جان اور ہمارے دونوں بڑے ماموں حیران و پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ سرفراز ماموں خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اس کے بعد ان کی تمام خوش فعلی اور زندہ دلی جیسے ایک دم رخصت ہو گئی۔ کھانا پینا بھی برائے نام ہی رہ گیا۔ انہوں نے اپنے عزیزوں کے گھروں میں آنا جانا بھی موقوف کر دیا۔ وہ سارا سارا دن اپنے کمرے میں بند بستر پر پڑے رہا کرتے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر ایک دن ہماری نانی جان نے اپنے شوہر سے کہا "نواب ظہیر الدولہ بڑے آدمی سہی، ان کا خاندان بھی اونچا سہی لیکن پیغام تو بھیج کر دیکھو۔"

نانا جان نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس پر نانی جان نے خود ہی شہر کی دو تین مشاطاؤں کو جو رشتے کرانے میں مشہور تھیں، اپنے ہاں بلوایا اور ان سے صلاح مشورہ کیا۔ پھر بسم اللہ کر کے ایک مشاطہ کے ذریعے پیغام بھیج ہی دیا۔

ایک ہفتے کے بعد وہاں سے جواب آیا کہ نواب صاحب خاندان کی بلندی و پستی کے زیادہ قائل نہیں ہیں۔ مگر ان کے ہونے والے داماد کے لیے کم از کم یہ شرطیں ضروری ہیں۔ ایک تو وہ اچھی شکل و صورت کا ہو۔ دوسرے کم از کم گریجویٹ ہو۔ اور تیسرے اس کے والدین اس قدر آسودہ ضرور ہوں کہ دو دو لاکھ روپیہ نقد بطور حق مہر لڑکی کے نام بنک میں جمع کرا سکیں۔

نانا جان کو اس جواب سے بڑی مایوسی ہوئی۔ ہر چند ان کا شمار شہر کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہوتا تھا۔ مگر وہ اپنی ساری جائیداد بیچ دیتے تب بھی دو لاکھ روپیہ جمع نہ کر سکتے تھے اور بالفرض روپے کا انتظام ہو بھی جاتا تو سرفراز کے گریجویٹ ہونے کی شرط بڑی ٹیڑھی تھی۔ کیونکہ وہ تو انٹرنس بھی پاس نہ کر پائے تھے۔ بس ایک ہی شرط تھی جس پر وہ پورے اترتے تھے وہ یہ کہ شکل صورت کے بڑے اچھے

تھے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ حسین تھے۔ چنانچہ نواب ظہیر الدولہ کے جواب پر عام طور پر یہی تصور کیا گیا کہ وہ چونکہ بڑے بردبار اور نیک دل ہیں اس لیے انہوں نے صاف انکار کر کے اپنے ایک معزز ہم وطن کو ناراض کرنا مناسب نہیں سمجھا اور جان بوجھ کر ایسی شرطیں لگا دی ہیں، جن کا پورا کرنا سرفراز ماموں اور ان کے متعلقین کے لیے ممکن نہ ہو۔

نانا جان نے اپنے دونوں بڑے بیٹوں کی موجودگی میں سرفراز ماموں کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ ماموں چپکے چپکے ان کی باتیں سنتے رہے۔ جب ان کے گریجویٹ نہ ہونے کا ذکر آیا تو وہ فوراً بول اٹھے:

"یہ کیا مشکل بات ہے۔ یہ شرط تو میں آسانی سے پوری کر سکتا ہوں۔"

اس پر ان کے دونوں بڑے بھائی کہنے لگے۔ "اگر تم اسے پورا کر لو تو روپیہ ہم کسی نہ کسی طرح مہیا کر ہی لیں گے۔ خواہ ہمیں اپنے حصے کی جائیداد بیچنی ہی کیوں نہ پڑے۔"

اس شام گھر والوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ سرفراز ماموں کتابوں کی ایک گٹھڑی کی گٹھڑی اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے کسی سے بات نہ کی۔ سیدھے اپنے کمرے میں پہنچے اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اور یوں انہوں نے اکیلے ہی بغیر کسی کی مدد کے پڑھائی شروع کر دی۔ وہ کھانا کھانے کے لیے باہر نہ آتے، بلکہ کھانا کمرے کے اندر ہی منگوا لیا کرتے۔ ان کے تمام عزیزوں کو سخت تعجب تھا کہ جو شخص عمر بھر ایسا آرام طلب اور سست رہا ہو اس میں اچانک اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ وہ دن رات مشین کی طرح کام کرنے لگے۔

جب ایک ہفتہ گزر گیا تو انہوں نے اپنی والدہ سے کہا "نواب ظہیر الدولہ کو کہلوا دیا جائے کہ ان کی شرطیں منظور کر لی گئی ہیں مگر انہیں کچھ مہلت دینی ہو گی۔"

اتفاق سے آئندہ میٹرک کے امتحان میں صرف تین ہی مہینے باقی تھے۔ انہوں نے پرائیویٹ طور پر امتحان دیا اور اچھے نمبروں سے پاس ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے فارسی کے ایک اعلیٰ امتحان کی تیاری شروع کر دی، جس کو پاس کرنے کے بعد وہ ایف۔ اے اور بی۔ اے کے صرف انگریزی کے امتحان دے کر بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر سکتے تھے۔

اگلے دو سال میں انہوں نے ز۔ ن اور ایف۔ اے انگریزی کے امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کر لیے۔ جب نواب ظہیر الدولہ کو اس کی اطلاع پہنچی، تو وہ بڑے متعجب ہوئے۔ ادھر ان کی صاحب زادی بھی یہ سن کر پھولی نہ سمائی کہ کوئی شخص اس کی خاطر اتنی مصیبت جھیل رہا ہے۔ اسے اپنی بعض بے





کیا ہم چپ تھے۔ وہیں غش کھا کر گر پڑی اور تین دن تین رات تک اسے ہوش نہ آیا۔ اس کے والدین اس کی زندگی سے مایوس ہو ہو گئے۔ آخر اس کی جان تو بچ گئی مگر اسے صحت یاب ہونے میں چھ مہینے لگ گئے۔ سرفراز ماموں کے متعلق کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ وہ کہاں غائب ہو گئے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انہوں نے خودکشی کر لی ہے۔ بعض کہتے کہ وہ کسی دور دراز ملک کو فرار ہو گئے ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں!

دس برس تک ان کی کوئی خبر نہ آئی اور پھر ایک صبح اچانک وہ اپنے والد کے ہاں آ گئے۔ کہتے ہیں کہ وقت زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔ یہی معاملہ ان کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ان کو زندہ سلامت دیکھ کر نانا جان اور تمام عزیزوں کا دل باغ باغ ہو گیا۔ عورتوں نے ان کی بلائیں لیں اور خوب ڈھولک پر گا بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

ادھر اسی اثنا میں نواب صاحب کی بیٹی کی شادی ایک نواب زادے سے ہو چکی تھی اور وہ دو لڑکوں کی ماں بھی بن چکی تھی۔ چونکہ نواب زادہ خوبصورت بھی تھا اور نوجوان بھی اور پھر جاہت اور امارت میں بھی وہ اپنے سسر سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس لئے سرفراز ماموں کے ساتھ اس رشتہ کا نہ ہونا نیک فال ہی تصور کیا گیا اور اس واقعہ کو جلد ہی بھلا دیا گیا۔

سرفراز ماموں نے مرتے دم تک یہ راز کسی کو نہ بتایا کہ وہ اپنی شادی کے روز بھاگ کیوں گئے تھے اور ان دس سال کی مدت میں وہ کہاں کہاں رہے اور روپے پیسے کے بغیر انہوں نے کیسے گزر کی۔ جب کبھی ان سے پوچھا جاتا تو ان کی آنکھوں میں ایک پراسرار مسکراہٹ، جس میں شرارت کا خفیف سا عنصر چھپا ہوتا، جھلکنے لگتی۔ یہی پراسرار مسکراہٹ رفتہ رفتہ ان کے کردار کا ایک جزو بن گئی۔

میں نے اس مسئلے پر بہت غور کیا۔ لیکن ان کے فرار کی اصل وجہ نہ سمجھ سکا۔ ممکن ہے کہ یہ ان کی طبعی بزدلی کا دخل ہو۔ یعنی انہیں اپنی ازدواجی صلاحیتوں پر اعتماد نہ ہو یا یہ وجہ ہو کہ وہ بیوی بچوں کا بوجھ اٹھانے سے ڈرتے ہوں۔ یا شاید یہ وجہ ہو کہ وہ اپنے والد اپنے بھائیوں اور ان کے بچوں سے ان کی جائیداد چھین کر انہیں مفلس اور قلاش بنانا نہیں چاہتے تھے۔

چاک

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین۔

اما بعد۔ برادران اسلام۔ میں آج اپنی اس تقریر میں آپ سے کچھ باتیں صاف صاف کہنا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ تقسیم ہند اب ایک حقیقت بن چکی ہے اور دو مملکتوں کا قیام بھی عمل میں آ چکا ہے۔ مگر میں پھر بھی ڈنکے کی چوٹ کہوں گا کہ یہ تقسیم سراسر غیر فطری، خلاف حقیقت اور فتنہ انگیز ہے۔

برادران اسلام! اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک ہزار برس سے مشترک زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ہماری تہذیب، ہماری معاشرت، ہمارا لباس، ہمارا رہن سہن، ہماری زبان، ہماری شاعری، ہمارا ادب غرض زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر ہماری متحدہ قومیت کی چھاپ نہ لگ چکی ہو۔

دراصل جب تو میرے دوستو اگر بچشم غور دیکھو گے تو اسلام اور ہندو دھرم میں کچھ زیادہ مغائرت بھی نہ پاؤ گے۔ کون نہیں جانتا کہ عیسائیوں یہودیوں کی طرح ہندو بھی اہل کتاب ہیں اور رام چندر جی اور کرشن مہاراج نبیوں کا سا درجہ رکھتے ہیں۔ ہندوؤں کے بھی فرقے توحید الٰہی کے بارے میں

مشتق ہیں۔ وہ کتابِ عالم، نیک و بد کی سزا و جزا اور حشر و نشر کے قائل ہیں۔ یاد رکھو! ان کی بت پرستی شرک کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کا یہ عمل "تصورِ شیخ" کے فلسفے سے مشابہت رکھتا ہے جو ہمیشہ سے صوفیائے اسلام کا شعار رہا ہے۔

جب اس حی و قیوم اور قادر مطلق ذات نے کائنات کو تخلیق کیا تو اپنے ایک فرشتے برہما کے وسیلے سے نوعِ بشری کی ہدایت کے لئے ایک کتاب "وید" کی صورت نازل کی۔ وید میں چار دفتر ہیں اور امر و نہی کے احکام اور ماضی و مستقبل کے واقعات ہیں۔

دھرم شاستر سے مراد علم کلام ہے۔ کرم شاستر سے علم فقہ۔ ڈنڈوت سے مراد سجدہ ہے جو ماں باپ مرشد اور استاد کی تعظیم کے لئے رائج ہے۔ اور یہ اسلام میں بھی "سجدہ تعظیمی" کے نام سے جائز ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام اور نارد جی میں جو مماثلت ہے وہ اہلِ دانش سے پوشیدہ نہیں ہے۔

پس اے میرے دوستو! کفر و دین کا جھگڑا بے معنی ہے۔ حقیقت میں ایک ہی چراغ سے کعبہ و بت خانہ روشن ہیں......

۴

برادرانِ اسلام! آج میں پھر آپ سے مخاطب ہوں۔ جن مسلمانوں نے پاکستان بنانے کا منصوبہ بنایا تھا وہ تو پاکستان جا چکے اور جو آئندہ جانا چاہتے ہیں گے چلے جائیں گے۔ مگر چار کروڑ مسلمان کسی صورت ہندوستان کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ہندوستان آج بھی مسلمانوں کا ویسا ہی وطن ہے، جیسا ہندوؤں کا ہے۔ اور اس پر مسلمانوں کا بھی ویسا ہی حق ہے جیسا ہندوؤں کا ہے۔ یہیں تو ہمیں رہنا ہے۔ یہیں جینا یہیں مرنا ہے۔

یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کو یہاں رہنے کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ پھر ان کو اپنے حقوق کا ایسا تحفظ بھی حاصل نہیں ہے جیسا ہندوؤں کو حاصل ہے۔ پھر یہ بھی درست ہے کہ ہمارے بعض نا سمجھ برادرانِ وطن ہمیں مٹانے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ ہماری دل آزاری کی جا رہی ہے۔ شہروں قصبوں اور دیہات میں فسادات روز مرہ کا معمول بن چکے ہیں۔ ہماری بستیوں کو آگ لگائی جا رہی ہے۔ ہزاروں مرد عورتیں اور بچے موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔

مگر میں کہوں گا کہ موجودہ فرقہ وارانہ کشیدگی ہندوستان کی زندگی کا محض ایک عارضی باب ہے اور جیسے ہی مسلمان اپنے ہندو بھائیوں پر یہ ثابت کر دیں گے کہ ان کے دلوں میں بھی بھارت ماتا کی اتنی

ہی حرمت ہے جتنی کہ ہندوؤں کے دلوں میں ہے۔ اور وہ وقت آنے پر کٹ مریں گے مگر مادرِ وطن کی ناموس پر آنچ نہ آنے دیں گے تو اے میرے دوستو! یہ سب کچھ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

۳

برادرانِ اسلام! ہندوستان کی حیثیت اس وقت ایک سیکولر اسٹیٹ یعنی لادینی مملکت کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں سرکاری طور پر نہ تو اسلام کی کوئی حیثیت ہے نہ ہندو دھرم کی اور نہ عیسائیوں سکھوں اور پارسیوں کے مذہب کی اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ سیدھا اور سچا راستہ ہے جس پر چل کر ہمارا ملک ترقی کر سکتا ہے اور ہم اپنے آئے دن کے مذہبی جھگڑوں سے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔ آج سیکولرزم ہماری ایک ضرورت بھی ہے اور ہمارا ایک آدرش بھی اور سیکولرزم ہی میں ہمارے دیس کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔

برادرانِ اسلام! نئے ہندوستان میں جو حالات پیدا ہو چکے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ اسلام پر نظر ثانی کی جائے۔ علما کی روایتی شریعت موجودہ زمانے کے تقاضوں کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ چنانچہ وقت کی ضرورت اور زمانے کے رجحانات کو نظر میں رکھتے ہوئے کیا ہمارے لئے یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم شریعت میں ایسی لچک پیدا کر لیں۔ کہ اس میں حکومتِ وقت کے ہر قانون کو قبول کرنے اور اپنانے کی صلاحیت پائی جائے............

بھائی مسلمانو! جیسا کہ میں نے پچھلی دفعہ تقریر کرتے ہوئے کہا تھا، ہمارے دیش میں دنگے فساد کا سلسلہ برابر جاری ہے اور مسلمانوں کی جائیدادیں برابر لوٹی جا رہی ہیں۔ ان کی بستیوں کو برابر آگ لگائی جا رہی ہے اور جو لوگ بھاگنا چاہتے ہیں ان کو برچھیاں اور بلم مار مار کر چتاؤں میں دھکیلا جا رہا ہے۔ ہزاروں مسلمان جھوٹے مقدمے کے الزاموں میں جیلوں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ بڑے کٹھور پن کا برتاؤ ہو رہا ہے۔

بھائی مسلمانو! جانتے بھی ہو اس کا کارن کیا ہے؟ اس کا کارن یہ ہے کہ ہمارے بھائی ابھی تک ہم کو بڑے شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں اور ان کو ہم پر بھروسہ نہیں ہے۔ حالاں کہ ہم کوئی غیر تھوڑا ہی ہیں۔ ہم میں سے بہت سوں کی رگوں میں ہندو خون دوڑ رہا ہے اور اگر چھان بین کی جائے تو اکثر مسلم خاندانوں کا شجرہ نسب کسی نہ کسی ہندو گھرانے ہی سے جا ملے گا۔

مگر ہمارے بھائی ہم سے کہتے ہیں، کہ ہندو سماج میں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم نے یہاں چاہے کتنی صدیاں حکومت کی ہو مگر تمہاری حیثیت ہمیشہ ایک اجنبی اور بیرونی حملہ آور کی رہی

ہے۔ اب تمہارے لئے یہی مناسب ہے کہ یا تو یہاں سے نکل جاؤ یا خود کو ہندو سماج میں سمو دو۔ اپنے اسلامی ناموں کو بدل دو۔ مکے مدینے کو بھول جاؤ اور رام لکشمن اور سیتا جی کے آستانوں پر سر جھکاؤ۔ بھئی مسلمانو! میں نے تم کو وقت کے تقاضے سے خبردار کر دیا ہے۔ اب اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا تمہارا کام ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں تو زندگی کی آخری گھڑی تک ہندوستان ہی میں رہنے اور یہیں ہر قسم کے دکھ سہنے کو تیار ہوں۔ کیونکہ ہندوستان میرا وطن ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ وطن کی محبت ہر چیز پر مقدم ہے۔

کیا ہرج ہے اگر میں آج چھپ کر بھی گائے کی قربانی نہ کر سکوں۔ یہ کوئی دین کا کام تو ہے نہیں اور پھر کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا اگر میں اردو کو دیوناگری رسم الخط میں پڑھنے لگوں۔ خط تو بدل جائے گا مگر مضمون تو وہی رہے گا۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ کوئی ہندوستانی کپڑے اتار کر انگریزی لباس پہن لے۔ اس سے ہیئت شاید بدل جائے مگر روح تھوڑا ہی بدل سکتی ہے؟

اور پھر اگر میں ہولی کے دنوں میں گھر سے باہر نکلوں اور میرے بھائی مجھ پر کیچڑ یا گندگی اچھال دیں اور میرا منہ کالا کر دیں تو اس سے میرا دھرم تھوڑا ہی نکل جائے گا۔۔۔

٭

محترم تھاولیش چشتو!

مہاتما گاندھی کی مہما کون کہہ سکے۔ ان کا ہر زاویہ بہت ہی اپوروا آدرش تھا۔ ان کے اونچے تیاگ نے ہی ان کو دیوتا بنا دیا تھا۔ حضرت مسیح کا کہنا ہے کہ انسان کے اشک کو خشک کرنے کے کارن ہوں ہم نانا پرکار کی دکھیوں کا دکھ پی پو دور سن کرتے رہنا ہی ان کے جیون کی وشیشتا تھی ستیہ اور اہنسا کا پالن کرنا ہی ان کے جیون کا مول منتر تھا۔

جس بات کو وہ ٹھیک سمجھتے تھے اس کا دشا ساوجنک پر ظاہر کر کے جب تک سدھار نہ کر لیتے تب تک وشرام نہیں لیتے تھے۔ اور اپنے اسی آدرش کا پالن کرتے ہوئے انت میں وہ اپنے جیون کی بھینٹ دے کر امر ہو گئے۔

سنسار میں کرم ویر، دھرم ویر تھا تیاگی ویکتیوں کا ابھاو نہیں ہے۔ کنتو ان کے سمان کرم ویر تھا دھرم ویر تھا تیاگی ہونا درلبھ ہے۔ یہ تھے باپو ...... تم تھے باپو ...... تھا ...... تھا ......

اوتار

ہندو دیومالا کی ایک کہانی

۱

پرتھوی گائے کا روپ دھارن کرتی ہوئی دیوتاؤں کے راجہ اندر کی سبھا میں پہنچی اور یوں فریاد کرنے لگی:

"دوہائی ہے اندر مہاراج کی۔ مہاراج! سنسار سے دھرم تو اٹھ گیا۔ اور پاپ کا اندھیرا چھا گیا ہے۔ شہر شہر نگری نگری گاؤں گاؤں راکشسوں کی حکومت ہو رہی ہے۔ ان کی پوری پوری بستیوں کو جلا کر راکھ کیا جا رہا ہے۔ گربھ وتی استریوں کے پیٹ سے ان جنے بچے نکال کر انہیں بھالوں کی انیوں پر لٹکایا جاتا ہے۔ عورتوں کی چھاتیاں اور ناک کان کاٹ کر انہیں زندہ چتاؤں پر جلا دیا جاتا ہے۔ منش پیڑا سے بھی تنگ ہو گیا ہے۔ میں یہ اتیا چار نہیں دیکھ سکتی مہاراج۔ آگیا دیجئے کہ میں زمین پھوڑ پاتال چلی جاؤں۔"

اندر مہاراج آکاش کے دیوتا ہیں۔ وہ ایک سفید ہاتھی پر سوار ہوتے ہیں جس کا نام ایراوات ہے۔ وہ مینہ برساتے اور فصلیں اگاتے ہیں۔ بجلی کا کڑکا اور دھنک ان کے ہتھیار ہیں۔ وہ پرتھوی کی یہ بات سن کر بڑے دکھی ہوئے۔ اور دیر تک سوچ ساگر میں ڈوبے رہے۔ پھر انہوں نے گنیش جی کو بلایا۔ گنیش جی کی ہاتھی کی سی سونڈ ہے۔ وہ شو جی اور پاروتی دیوی کے بیٹے ہیں۔ مشکلوں کو حل کرنے

واسے انجم وفراست کے دیوتا۔

گنیش جی کے مشورے سے اندر مہاراج نے تمام دیوتاؤں کو اکٹھا کیا۔ ان میں آگ کے دیوتا اگنی، پانی کے دیوتا ورن، ہوا کے دیوتا وایو، رتوں کے دیوتا بسنت، دیہات کے دیوتا مدن، سورج کے دیوتا سوریہ، چاند کے دیوتا سوم اور بہت سے اور دیوتا بھی تھے۔ پھر وہ ان سب کو ساتھ لے برہما جی کے پاس پہنچے۔

برہما جی نے سنسار جنم دیا۔ ان کا رنگ سرخ ہے۔ ان کے چار چہرے، آٹھ کان اور چار ہاتھ ہیں۔ انہوں نے ان ہاتھوں میں سے ایک میں کمان، دوسرے میں کچھ جڑیوں کی مالا، تیسرے میں پانی کی گڑوی اور چوتھے میں وید تھام رکھے ہیں۔ علم ودانش کی دیوی سرسوتی ان کی استری ہے۔

اندر مہاراج نے پرتھوی کی کتھا برہما جی کو سنائی مگر وہ بھی اس کا دکھ دور نہ کر سکے اور سب کو ساتھ لے مہادیو جی کے پاس پہنچے۔

مہادیو جی کو شو جی بھی کہتے ہیں۔ ان کے پانچ چہرے، چار بازو اور تین آنکھیں ہیں۔ تیسری آنکھ ماتھے کے درمیان ہے۔ وہ ایک بیل پر جس کا نام نندی ہے سوار ہوتے ہیں۔ وہ شنڈو دھاری سادھو کا روپ بنائے انگوں میں ساتوں کی بھبھوت لگائے کمر پر مرگ چھالا لٹکائے گلے میں پھنکارتا ہوا سانپ مالا کی طرح ڈالے بن بن پھرتے رہتے ہیں۔ جب بھی وہ وار پی کر اپنی استری جگد مبا کے ساتھ جوش و مستی کی حالت میں تانڈو ناچ ناچتے ہیں تو دھرتی ڈولنے لگتی ہے۔ وہ دکھوں کو ہرن اور پاپوں کو نشٹ کرتے ہیں مگر پرتھوی کے دکھ کا علاج ان کے پاس بھی نہ تھا۔ اور وہ سب دیوتاؤں کو ساتھ لے وہاں پہنچے جہاں چھیر سمندر میں وشنو جی اپنی پتنی لکشمی رانی کے ساتھ شیش ناگ اننت پر آرام سے لیٹے تھے۔

وشنو بھگوان میں اتنی شکتی ہے کہ وہ اپنے تین ہی قدم میں دنیا کے ساتوں طبق الانگھ لیتے ہیں۔ وہ گروڑ پکشی پر سوار ہوتے ہیں۔ گنگا ندی ان ہی کے چرنوں سے نکلی ہے۔ وہ بڑے تیجے جوان ہیں۔ ان کا دل بڑا نرم ہے۔ وہ ہمیشہ مظلوموں کی فریاد کو پہنچتے ہیں۔ وہ سو رہے تھے مگر سارے دیوتاؤں کے آنے سے ان کی نیند اچٹ گئی۔ اس پر سب دیوتا ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور ان کے گن گانے لگے:

"مہاراج ادھیراج! آپ کی مہما کون کر سکے۔ مچھلی کا اوتار لے سارے سنسار کو اور ویدوں کو ڈوبنے سے بچایا۔ کچھوے کا اوتار دھار مندراچل پہاڑ کو اپنی پیٹھ پر اٹھایا جس سے سمندر بلویا گیا۔ سوّر

کا اوتار لے دھرتی کو اپنے دانتوں سے اٹھا سمندر کی تہہ سے نکالا۔ نرسنگھ کا اوتار لے جس کا سر شیر کا اور دھڑ آدمی کا تھا پرہلاد کی جان اس کے ظالم باپ سے بچائی۔ بونے بامن کا اوتار لے راجہ بل سے چھل کیا۔ پرسو رام کے روپ میں اکیس بار کشتریوں کا ناش کیا اور برہمنوں کو دلوایا۔ رام چندر جی کا اوتار دھار راکھشسوں کے سردار مہا دشٹ راون کو مارا۔ کرشن بھگوان بن کر متھرا کے ظالم راجہ کنس کو موت کے گھاٹ اتارا۔ گوتم بدھ کا اوتار لے سنسار میں سکھ شانتی پھیلائی۔"

"ناتھ جی! جب جب سنسار میں کٹھورتائی اور کھوٹائی حد سے بڑھی تب تب آپ اتماؤں اور نردوشوں کی رکشا کے لئے دھرتی پر گئے۔ آج پھر سنسار پر ادھرم اور پاپ کا اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ دھرتی نرناری کے خون سے لال ہو رہی ہے۔ وہ گئے کا روپ دھار یہاں دیولوک میں فریاد کرنے آئی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میری چھاتی پر ان دنوں ایسی ایسی بھیانک گھٹنائیں ہو رہی ہیں کہ پہلے کبھی نہ ہوئی تھیں۔ میں اب یہ اتیاچار نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے پاتال میں چلے جانے کی آگیا دے دیجئے۔"

"ناتھ جی! ہم آپ سے بنتی کرنے آئے ہیں کہ ایک بار پھر سنسار کی سدھ لیجئے۔ پاپوں کا ناش کیجئے تاکہ نرناری آنند ہو کر رہیں۔ یہ کام آپ کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔"

وشنو بھگوان کے کومل دل پر اس کتھا کا بڑا اثر ہوا۔ ان کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ وہ ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ لکشمی رانی ابھی تک شیش ناگ اننت پر بے خبر سو رہی تھیں۔ نیند میں ان کے کنول ایسے سندر مکھڑے سے بڑا سکھ چین برس رہا تھا۔ آخر وشنو جی نے ایک پریم بھری نظر اپنی پتنی پر ڈالی اور پھر اکایکی وہ اپنے استھان سے غائب ہو گئے....

۲

سنبھل ضلع مراد آباد کا ایک پرانا قصبہ ہے۔ یہ قصبہ ہندوستان کے دوسرے قصبوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ وہی گرد سے اٹی ہوئی سڑکیں، وہی تنگ بازار اور گلی کوچے۔ کہیں مٹی کے گھروندے کہیں پختہ اینٹوں کے مکان۔ دیہاتی اور شہری زندگی کی آمیزش۔ مگر ایک بات جو اسے دوسرے قصبوں سے تمیز کرتی ہے یہ ہے کہ یہاں مندروں کی کثرت ہے جو قصبے اور اس کے اطراف میں جا بجا دیکھنے میں آتے ہیں۔

ملک کی تقسیم سے پہلے سنبھل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مخلوط آبادی تھی۔ مگر تقسیم کے بعد ہندوستان کے دوسرے شہروں اور قصبوں کی طرح یہاں بھی ہنگاموں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ہندو جو بھاری اکثریت میں تھے مسلمانوں کو تاخت و تاراج کرنے لگے۔ ان کے مسلح جتھے مسلمانوں کے محلوں

پر ٹوٹ پڑے۔ مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ اور اَن گنت مردوں عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جو مسلمان اس قتلِ عام سے بچ رہے وہ جان بچانے کے لئے قصبے سے بھاگ نکلے۔

سنبھل سے چار پانچ کوس کے فاصلے پر ایک سنسان گھاٹی تھی جو راہ بات سے کٹی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کے لٹے پٹے گھرانوں کے کچھ افراد کسی نہ کسی طرح جان بچا کر اس گھاٹی میں پہنچ گئے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے اور کچھ ایسے لوگ بھی جو ہندوؤں کے ہاتھوں زخمی ہوئے تھے۔ چونکہ اس وقت سارے ملک میں آگ لگی ہوئی تھی اور مسلمانوں کو ہر طرف موت ہی موت دکھائی دیتی تھی اس لئے انہوں نے آگے بڑھنا خطرے سے خالی نہ سمجھا اور اسی گھاٹی میں چھپ کر بیٹھ رہے۔ جب ذرا کھڑکا سنتے تو گھاٹی میں نیچے اتر جاتے۔ وہ کئی دن تک وہیں چھپے رہے اور درختوں کے پتے یا گھاس کھا کر پیٹ بھرتے رہے۔ انہیں گھاٹی میں دور نیچے اتر کر ایک چھوٹے سے نالے کا سراغ مل گیا تھا جس میں پچھلی برسات کا پانی ابھی تک کچھ کچھ باقی تھا۔ وہ اسی پانی سے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔

ادھر اس عرصے میں سنبھل کے ہندوؤں کا جوش دھیما پڑ چکا تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کی بیشتر آبادی یا تو نیست و نابود ہو چکی تھی یا قصبے سے بھاگ چکی تھی اور ان کے مکانوں ان کی دکانوں اور دوسری املاک پر ہندو قبضہ کر چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اس کامیابی پر مطمئن ہو کر بھاگنے والوں کا پیچھا کرنے یا ان کی کھوج لگانے کا خیال چھوڑ دیا تھا۔

رفتہ رفتہ ملک کے حالات سدھرنے لگے۔ ہر مذہب و ملت کے پیشوا اور لیڈر اکٹھے ہو ہو کر شہروں گاؤں کا دورے کرنے لگے۔ امن کمیٹیاں بننے لگیں اور ان مسلمانوں کو جو اپنے گھروں سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے تھے دوبارہ ان کے علاقوں میں آباد کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ ایسی ہی ایک جماعت گھومتی گھامتی اس گھاٹی میں بھی پہنچ گئی جہاں سنبھل کے یہ مسلمان کئی ہفتوں سے پناہ گزیں تھے۔ اس جماعت کے اراکین نے مسلمانوں کو بہتیرا سمجھایا بجھایا مگر وہ سنبھل کے ہندوؤں کے درمیان رہنے کے خیال سے ایسے خائف تھے کہ کسی طرح قصبے میں واپس جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ناچار انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔

جب ان مسلمانوں کو جان کا خطرہ نہ رہا تو انہوں نے اسی گھاٹی کے آس پاس زمین صاف کر کے درختوں کی ٹہنیوں، گھاس پھونس اور مٹی سے جھونپڑیاں بنانی شروع کر دیں۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں کے کچھ اور خاندان بھی جو ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے ان میں آ ملے اور اس طرح

تھوڑے ہی دنوں میں وہاں ایک کالونی سی آباد ہو گئی جو سوا سو نفوس پر مشتمل تھی۔

سنبھل کے مسلمانوں کے قتلِ عام کی شب کو جن لوگوں نے بھاگ کر گھاٹی میں پناہ لی تھی ان میں ابراہیم نامی ایک لوہار بھی تھا۔ بڑا محنتی اور خوش اخلاق۔ وہ اپنے باپ اور تین بھائیوں کے ساتھ قصبے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی اسحاق کے ساتھ دکان پر کام کرتا تھا۔ اس کے دوسرے دو بھائی جو کم عمر تھے ابھی مدرسے میں پڑھتے تھے۔ جب مسلح ہندوؤں کے جتھے نے ان کے مکان میں آگ لگائی تو خاندان کے سب افراد گھر پر ہی تھے۔ یہ لوگ آگ سے خوف زدہ ہو کر مکان سے نکلے ہی تھے کہ ہندو برچھیاں بھالے لئے ان پر ٹوٹ پڑے۔ مردوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ اور انہیں کے ہتھیار چھین کر دو چار کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مگر ہندو تعداد میں زیادہ تھے یہ لوگ زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکے اور آخرکار ابراہیم کا باپ، بڑا بھائی اسحاق، دونوں چھوٹے بھائی، اسحاق کی دو جوان لڑکیاں جو باپ اور چچا کے پہلو بہ پہلو ہندو غنڈوں کا مقابلہ کر رہی تھیں، اور ابراہیم کا چھوٹا بچہ شہید کر دیے گئے۔ ان لوگوں کی مدافعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہیم کی بیوی اور بھاوج کو کسی نہ کسی طرح اندھیرے میں بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔

ادھر ابراہیم کو ہندوؤں سے لڑتے ہوئے زخم تو کئی آئے تھے مگر کوئی کاری نہ تھا۔ اور وہ بھی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ اسے تھوڑی ہی تلاش کے بعد دونوں عورتیں قریب ہی کی ایک تاریک گلی میں چھپی ہوئی مل گئیں۔ وہ ان کا ہاتھ پکڑ اندھیرے میں چھپتا چھپاتا سایوں کی آڑ لیتا انہیں قصبے سے نکال لایا۔ پھر انہیں لے کر دوسرے مسلمانوں کے ساتھ جو اس قتلِ عام سے بچ نکلے تھے اسی گھاٹی کی سمت روانہ ہو گیا۔

اسحاق کی بیوی نے جس کا نام نفیس تھا اپنی آٹھ ماہ کی بچی کو سینے سے چمٹا رکھا تھا۔ آمنہ خالی ہاتھ تھی۔ اپنے دو سالہ معصوم بچے اصغر کو اپنی آنکھوں کے سامنے ذبح ہوتے دیکھ کر غم اور دہشت سے اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ اور وہ ہر طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی تھی۔ ان لوگوں کا صدمہ ایسا تو نہ تھا کہ آسانی سے بھلایا جا سکتا۔ مگر جب انہوں نے اپنے چاروں طرف ہر شخص کو اپنے ہی جیسا مظلوم اور ستم رسیدہ دیکھا تو ان کے دل کو کچھ کچھ قرار آ گیا۔

اس گھاٹی کے قریب ہی پرانے وقتوں کا کوئی مندر تھا جو بڑی خستہ حالت میں تھا۔ اس کی چھت غائب تھی اور کوئی دیوار بھی سالم نہ تھی۔ اس مندر کے بت محکمہ آثارِ قدیمہ کے افسر مدت ہوئی کسی عجائب خانے میں رکھنے کے لئے اٹھا لے گئے تھے۔ اور اب یہاں سوائے کھنڈروں کے کچھ نہ رہا تھا۔ اس

مندر کے باہر ایک کنواں تھا جو مدتوں سے بند پڑا تھا۔ چمگادڑوں اور نہ جانے کن کن جانوروں نے اس میں مسکن بنا رکھے تھے اور اس میں سے سخت بدبو آتی تھی۔ کالونی والوں نے درختوں کے ریشوں سے بٹ کر ایک رسی بنائی۔ پھر ٹین کا ایک پرانا کنستر مہیا کیا گیا۔ کالونی کے تین دو مرد کئی دن تک لگاتار کنوئیں کا گندہ پانی نکالتے رہے۔ آخر ان کی محنت ٹھکانے لگی۔ اور انھیں پینے کے لئے صاف اور میٹھا پانی مل گیا۔

ان لوگوں کے پاس نہ تو روپیہ پیسہ تھا نہ زیور یا کوئی اور قیمتی چیز اس لئے چوروں اور ڈاکوؤں سے تو وہ محفوظ رہے۔ البتہ سنبھل کے بعض شر پسند ہندو جوان کے اس کالونی میں اچھوتوں کی طرح رہنے کو بھی روادار نہ تھے کبھی کبھی رات کو چپکے سے آ کر ان کی جھونپڑیوں میں آگ لگا جاتے۔ کالونی والے جو ہر وقت چوکنے رہتے تھے اکثر جلد ہی آگ پر قابو پا لیتے تھے۔ مگر ایک مرتبہ ایسی زبردست آگ لگی کہ آدھی سے زیادہ جھونپڑیاں جل کر راکھ ہو گئیں۔ اس واقعے سے ان لوگوں کو رنج تو بہت ہوا مگر انہوں نے ضبط و تحمل سے کام لیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں پھر اپنی جھونپڑیاں استوار کر لیں۔ اب کے انہوں نے کالونی کے گرد اگرد مٹی اور پتھروں سے ایک دیوار بھی کھینچ دی۔ اور یوں آگ لگانے والوں کے شر سے کسی قدر محفوظ ہو گئے۔

ضرورت نے ان مسلمانوں کو کئی کام سکھا دیے مثلاً رسیاں بٹنا، ٹوکریاں اور چھاجیں بنانا، چٹائیاں بننا، مٹی کے برتن اور کھلونے بنانا۔ یہ چیزیں قصبے کے نچلے طبقے کے دکاندار ان سے سستے داموں خرید لے جاتے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے کھدر بننے اور دریاں اور پلنگ پوش بنانے کا کام بھی شروع کر دیا۔ بعض لوگوں نے مرغیاں اور بکریاں پال لیں۔ مرغیوں کے انڈے وہ قصبے والوں کے ہاتھ بیچ دیتے اور بکریوں کے دودھ کو وہ اپنے بچوں کے استعمال میں لاتے۔

اس کالونی کی عورتوں نے جن کی ایک عمر پردے میں گزری تھی اور جن میں اب زیادہ تعداد بیواؤں کی تھی، ضرورت وقت کو دیکھتے ہوئے پردہ ترک کر دیا تھا۔ وہ محنت مشقت کے کاموں میں مردوں کے برابر حصہ لیتیں۔ دستکاری کا کام زیادہ تر ان ہی کے ہاتھ میں تھا۔ علاوہ ازیں کنوئیں سے پانی بھی وہی بھرتی تھیں۔

ابراہیم کی بیوی اور بھاوج بھی یہ سارے کام کرتیں۔ بلقیس کو اپنے شوہر اور دو جوان لڑکوں کے شہید ہو جانے کے بعد جینے کی کوئی خواہش نہ رہی تھی مگر ننھی سارہ کے لئے وہ زندہ رہنے پر مجبور تھی۔ وہ کبھی کبھی اس کی قلقاریوں کی دلکشی میں گم ہو کر اپنا غم بھول جاتی۔ ادھر آمنہ کے غم زدہ دل کو

بھی جلد ہی اس امید نے بہلانا شروع کر دیا کہ وہ پھر ایک بچے کی ماں بننے والی ہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس حمل سے اسے کسی قسم کی تکان یا تکلیف یا بھاری پن کا احساس نہ ہوتا تھا۔ جوں جوں اس کے وضع حمل کا زمانہ قریب آتا جا رہا تھا اس کا روپ نکھرتا آ رہا تھا۔ اس محنت و جفاکشی کی زندگی کے باوجود وہ ہر وقت چونچال نظر آتی تھی۔ وہ بھاری بھاری بوجھ آسانی سے اٹھا لیتی اور اس کا شوہر اس کی بھاوج یا کالونی کی کوئی اور عورت اسے منع کرتی تو وہ کہتی:

"مجھ میں بڑی طاقت پیدا ہو گئی ہے اور یہ کام تو مجھے بڑے ہلکے پھلکے معلوم ہوتے ہیں۔"

سنبھل کے مسلمانوں کو جب اس کالونی میں آباد ہوئے نو مہینے گزر گئے تو ایک شب ابراہیم کی جھونپڑی میں ایک ننھی سی جان کا اضافہ ہوا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ چودھویں کا چاند جو سر شام ہی نمودار ہو گیا تھا اپنا سفر طے کرتا ہوا آسمان کے ایک سرے سے دوسرے پر پہنچ گیا تھا۔ اس کی روشنی سے اس وقت ٹوٹے پھوٹے مکان اور جھونپڑے تک خوش نما معلوم ہو رہے تھے۔ اچانک ایک ننھی آواز نے اس خاموشی کو توڑ دیا جو اس کالونی پر چھائی تھی۔ ابراہیم جو اپنی جھونپڑی کے باہر ایک کھٹملی کھٹیا پر بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا جلدی سے اٹھ کر اندر گیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ آمنہ چٹائی پر چادر اوڑھے لیٹی ہے اور بلقیس کالونی کی ایک عورت کی مدد سے خون میں لت پت بچے کا جسم چیتھڑوں سے پونچھ رہی ہے۔

ابراہیم کو دیکھ کر بلقیس بول اٹھی:

"بھیا تمہیں بیٹا مبارک ہو!"

ابراہیم کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ اس نے اپنی بیوی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ آمنہ ہلکے ہلکے کراہ رہی تھی مگر جیسے ہی دونوں کی نظریں ملیں ایک خفیف سی مسکراہٹ آمنہ کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ ابراہیم چٹائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ بلقیس نے بچے کو جو تھوڑی دیر رونے کے بعد چپ ہو گیا تھا ایک پرانے مگر صاف کپڑے میں لپیٹ کر اس کی گود میں لٹا دیا۔

یہ بچہ بڑا ہی خوبصورت اور پیارا پیارا تھا۔ اس کے بال سنہرے اور گھونگھریالے تھے۔ اور چہرہ بھی کندن کی طرح دمکتا تھا۔ ابراہیم جوں جوں اسے دیکھتا گیا اس کی حیرت بڑھتی گئی۔ آخر اسے اور تو کچھ نہ سوجھا اس نے بچہ بھاوج کو دے دیا اور خود سجدے میں گر پڑا۔

رفتہ رفتہ بچہ پرورش پانے لگا۔ اس کا نام حمزہ رکھا گیا۔ ابراہیم کی خستہ حالی، فاقہ کشی اور کالونی کے گندے ماحول کے باوجود ماں اور بچہ دونوں بڑے تندرست تھے۔ آمنہ بچے کے سر پر ایک کالا کپڑا باندھ کر اس کے بالوں کو چھپائے رکھتی تاکہ اڑوس پڑوس کی عورتوں کی نظر نہ لگے۔ حمزہ جلد جلد بڑا ہونے

لگا۔ جلد ہی آس پاس کی جھونپڑیوں میں اس کی قلقاریاں سنائی دینے لگیں۔ چند ہی ہفتوں میں اس نے چلنا شروع کر دیا اور ابھی سال بھر کا نہ ہوا تھا کہ باتیں بھی کرنے لگا۔ وہ سارہ کے ساتھ جو اس سے ڈیڑھ سال بڑی تھی دن بھر کھیلتا رہتا۔ وہ بڑا خوش مزاج بچہ تھا۔ کبھی روتا بلکتا نہ تھا۔ نہ کسی چیز کے لئے ضد کرتا تھا۔

جب وہ پانچ برس کا ہوا تو مکتب جانے لگا جو ایک نیک دل مولوی صاحب نے کالونی کی ایک جھونپڑی میں کھول رکھا تھا تا کہ کالونی کے بچے علم سے بے بہرہ نہ رہیں۔ وہ ایسا ذہین تھا کہ چند ہی ہفتوں میں اس نے ابتدائی قاعدہ ختم کر کے قرآن مجید کا پہلا پارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کی ذہانت اور شوق کو دیکھ کر مولوی صاحب بھی اسے بڑی توجہ سے پڑھانے لگے۔

اس نے بڑی فیاض طبیعت پائی تھی۔ ماں اسے کوئی اچھی سی چیز کھانے کو دیتی تو وہ مکتب میں لے آتا۔ اور اپنے تھوڑے سے ہم سبقوں میں بانٹ کر کھاتا۔

آٹھ برس کی عمر میں حمزہ نے کلام مجید ختم کر لیا۔ اس خوشی میں اس کے باپ نے کالونی کی ساری جھونپڑیوں میں لڈو بانٹے۔ حمزہ جوں جوں بڑھتا گیا کھیل کود میں بھی سب لڑکوں سے آگے رہتا تھا۔ جب وہ دس برس کا ہوا تو کالونی کا کوئی لڑکا کشتی، کبڈی یا تیز دوڑنے میں اس سے بازی نہیں لے جا سکتا تھا۔ وہ اونچے اونچے پیڑوں پر ایسی پھرتی سے چڑھ جاتا کہ اس کے ساتھی تکتے کے تکتے رہ جاتے۔

اسی زمانے میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس کا کالونی میں بہت دنوں چرچا رہا۔ ہوا یہ کہ حمزہ حسب عادت ایک بہت اونچے پیڑ پر چڑھ گیا۔ اس پیڑ کی اوپر کی ٹہنیاں کمزور تھیں۔ اس نے جیسے ہی ایک ٹہنی کو پکڑنا چاہا وہ اچانک ٹوٹ گئی۔ اور حمزہ تیس پینتیس فٹ کی بلندی سے نیچے آ رہا۔ سب لڑکے خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے۔ مگر حمزہ کپڑے جھاڑ کر اٹھ بیٹھا اور مسکراتا ہوا اپنے ساتھیوں سے آ ملا۔ اسے کہیں خراش تک نہ لگی تھی۔

جب حمزہ نے علم دین کے ساتھ ساتھ کسی قدر اردو اور ریاضی کی بھی تعلیم حاصل کر لی۔ تو باپ نے اسے مکتب سے اٹھا لیا۔ اور اسے اپنا آبائی پیشہ سکھانے لگا۔ ابراہیم نے اپنی جھونپڑی کے آگے پھوس کا سائبان ڈال کر ایک چھوٹی سی لوہار کی دکان کھول رکھی تھی۔ دونوں باپ بیٹے صبح سے شام تک اس میں کام کرتے۔ حمزہ دھونکنی دھونکتا، ہتھوڑا چلاتا اور ابراہیم کھیتی باڑی کے آلات طرح طرح کے اوزار اور دوسری کارآمد چیزیں بناتا۔

یہ دس بارہ سال کا زمانہ ہندوستان کے اور شہروں اور قصبوں میں تو نہیں البتہ سنبھل کی اس کالونی میں نسبتاً امن کا گذرا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان یہاں بڑی پستی کی حالت میں تھے۔ اور وہ اسی میں رضائے الٰہی سمجھ کر صبر شکر سے گذر بسر کیے جا رہے تھے۔ وہ کالونی سے باہر شاذ ہی نکلتے۔ اور جب سنبھل یا آس پاس کے قصبوں کے ہندو بیوپاری ان سے مال خریدنے آتے تو وہ ان سے بڑی عاجزی سے بات کرتے۔ اور انہیں کبھی شکایت کا موقع نہ دیتے۔ ان کی دستکاریوں نے اب خاصی ترقی کر لی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے گائے بھینسیں بھی پالنی شروع کر دی تھیں اور آس پاس کے قصبوں کو دودھ مہیا کرنے لگے تھے۔

کالونی کے مسلمانوں نے اب تک اپنے اسلامی طور طریقے قائم رکھے تھے۔ ایک بڑا سا جھونپڑا مسجد کا کام دیتا تھا جہاں پانچوں وقت نماز ادا کی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں وہ عید بقر عید اور دوسرے تہوار بھی منایا کرتے تھے مگر خاموشی کے ساتھ۔ ایک دن ایسا ہی کوئی تہوار تھا۔ ابراہیم نے اپنی دکان بند کر رکھی تھی۔ حمزہ کو کوئی کام تو تھا نہیں۔ وہ گھومتا پھرتا کھائی سے دور نکل گیا۔ ایک سمت اسے آبادی کے کچھ آثار نظر آئے اور وہ بغیر سوچے سمجھے اس طرف چل دیا۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک میدان میں بہت سے لڑکے کھیل رہے ہیں۔ کہیں گیند بلے کا میچ ہو رہا ہے۔ تو کہیں کبڈی اور کہیں کشتی کے داؤں پیچ۔ وہ دیر تک بڑی دلچسپی سے ان لڑکوں کے کھیل دیکھتا رہا۔

یہ سنبھل کے باہر والا وہ میدان تھا جہاں قصبے کے لڑکے کھیلنے آیا کرتے تھے۔ حمزہ کی دیہاتی وضع قطع کو دیکھ کر کچھ لڑکوں نے سمجھا کہ یہ آس پاس کے کسی گاؤں سے آیا ہوگا۔ کیونکہ یہ تو وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ مسلمانوں کی کالونی کے کسی لڑکے کو تن تنہا یہاں آنے کی جرات ہوگی اور انہوں نے حمزہ کو بھی کھیلنے کو کہا جسے اس نے فوراً منظور کر لیا۔

تھوڑی ہی دیر میں سنبھل کے ہندو لڑکوں کو بخوبی اندازہ ہو گیا کہ پھرتی، ہوشیاری، چالاکی، داؤں پیچ یا زور آزمائی میں ان میں سے کوئی اس کے پاسنگ بھی نہیں۔ چنانچہ پے در پے ہزیمتیں اٹھانے کے بعد وہ دھاندلی پر اتر آئے اور ایک ہی دفعہ بہت سے لڑکوں نے اس پر دھاوا بول دیا۔ حمزہ ذرا نہ گھبرایا۔ وہ انہیں اٹھا اٹھا کر یوں پٹخنے لگا جیسے وہ روئی کے گالے ہوں۔ جس لڑکے کو ایک دفعہ اس کا گھونسا پڑ جاتا پھر وہ اس کے قریب آنے کا نام نہ لیتا۔ آخر سب پٹ پٹا کر دور دور ہٹ گئے اور اسے وہاں سے چلے جانے دیا۔

کالونی میں پہنچ کر حمزہ نے اس واقعے کا ذکر اپنے ماں باپ یا کسی دوست سے نہیں کیا، کیونکہ

اسے ڈر تھا کہ اگر اس واقعے کا پتہ چل جاتا تو ممکن ہے اس کی خبر قصبے تک پہنچ جائے اور قصبے والے بدلہ لینے کے لئے کالونی پر دھاوا بول دیں یا کسی اور طریقے سے ان لوگوں کا جینا حرام کر دیں۔

اب حمزہ اٹھارہ برس کا ہو گیا تھا۔ وہ بڑا البیلا نوجوان تھا۔ بالا قامت، چوڑا سینہ، مضبوط بازو، بھرا ہوا جسم، سر پر بال کیا تھے جیسے کسی نے سونا بکھیر دیا تھا۔ گورا رنگ، ابھرواں نقشہ، بڑی بڑی آنکھیں جیسے کنول کی ادھ کھلی کلیاں۔ کالونی کی جس لڑکی نے بھی ایک مرتبہ اس کی جھلک دیکھ لی پھر وہ اس کا نقش کبھی دل سے مٹا نہ سکی اور سارہ تو اس پر جان چھڑکتی تھی۔ وہ خود بھی دبلی پتلی نازنین تھی، پھول کی طرح مسکراتا ہوا چہرہ، نشیلی نشیلی سی آنکھیں جن کی پتلیاں شربتی رنگ کی تھیں۔ یہ جوڑا بے حد موزوں تھا اور جب کبھی گھر میں ذکر چھڑتا کہ ان کے لئے دوسرے گھروں میں رشتے کی جستجو نہ کرنی پڑے گی تو سارہ شرم سے سر جھکا لیتی۔ کالونی کی ساری لڑکیاں اس کی خوش قسمتی پر رشک کرتی تھیں۔

اگرچہ حمزہ نے اسی کالونی میں آنکھ کھولی تھی اور وہ بچپن ہی سے اپنے ماں باپ اور کالونی کے دوسرے مسلمانوں کو بڑی پستی کی زندگی بسر کرتے دیکھتے آ رہا تھا اور رفتہ رفتہ ان حالات کا عادی ہو چکا تھا۔ مگر اب جیسے ہی وہ سن بلوغت کو پہنچا اسے اپنی قوم کی تذلیل کا احساس بڑی شدت سے ہونے لگا۔ وہ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے قتل عام کے دہشت ناک واقعات سن چکا تھا کہ کس طرح اس کے ماں باپ اور دوسرے مسلمان ہندو غنڈوں کے ہاتھوں اپنے بھرے پرے گھروں کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور کس طرح اس کا تایا اسحاق، اس کی دو جوان تایازاد بہنیں، اور اس کے دو کم عمر بچے بلوائیوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور کس طرح اس کے دو سالہ معصوم بھائی اصغر کو ماں کی آنکھوں کے سامنے بلوائی کے ساتھ تہ تیغ کر دیا گیا۔ ایسی ہی ہولناک کہانیاں اس نے کالونی کے دوسرے گھروں کے بارے میں بھی سن رکھی تھیں۔ اب ان کو یاد کر کر کے اس کا خون کھولنے لگا۔ پھر وہ یہ بھی دیکھتا کہ اس کالونی کے مردوزن کو اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے کس قدر محنت اور جفاکشی کرنی پڑتی ہے اور دوسری طرف ہندو ہیں کہ ان کے یہاں اچھوتوں کی طرح رہنے کے بھی روادار نہیں اور جب مسلمان یہاں جھونپڑیاں بنا رہے تھے تو ان میں آگ لگا لگا کے انہیں یہاں سے بھگانے کی کیسی کیسی کوششیں کی گئی تھیں۔

ان باتوں کو سوچ سوچ کر وہ اندر ہی اندر گھلنے لگا۔ اس کا جی کسی کام میں نہ لگتا۔ وہ ہر وقت چپ چپ اور کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ اس کا کھانا پینا چھوٹ گیا اور جب سارہ اور گھر کے دوسرے لوگ بڑی فکر مندی کے ساتھ اس تغیر کا سبب پوچھتے تو وہ کوئی جواب نہ دے پاتا۔ سارہ کوشش کرتی مگر کچھ نہ کر

سکی۔ اس کی محبت بھی حمزہ کا یہ دکھ دور نہ کر سکی۔

جب اسی طرح کئی دن گزر گئے تو ایک دن وہ خود اپنے ماں باپ کے پاس گیا اور کہنے لگا:

''میرا دل یہاں رہتے رہتے اچاٹ ہو گیا ہے۔ میں پردیس جانا چاہتا ہوں۔ میں اب اتنا بڑا ہو گیا ہوں کہ اپنی دیکھ بھال خود کر سکوں۔ میں جہاں کہیں جاؤں گا محنت مزدوری کر کے روزی پیدا کر لوں گا۔ میں ہندوانہ بھیس بنا کے جاؤں گا اس لیے مجھے کوئی نقصان نہ پہنچائے گا۔ آپ لوگ میری فکر نہ کریں''۔

ابراہیم اور اس کی بیوی حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ سارہ نے بے تابانہ اس کا دامن پکڑ لیا۔ اور رو رو کر کہنے لگی:

''تم مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ تمہارے بغیر میں کیسے زندہ رہ سکوں گی؟''

''سارہ گھبراؤ نہیں'' اس نے دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں جلد واپس آ جاؤں گا۔ میں تمہارے لیے اچھے اچھے کپڑے اور زیور لاؤں گا''

''مجھے نہ کپڑے چاہئیں نہ زیور۔ بس تم کہیں نہ جاؤ''۔

مگر اس نے ایک نہ سنی۔ اس کے ماں باپ اور بہنوں نے بھی بہتیرا روکنا چاہا مگر وہ نہ رکا۔ اسی روز وہ کچھ کپڑوں اور ضروری چیزوں کی ایک گٹھڑی بغل میں دبا سفر پر روانہ ہو گیا۔

دن پر دن گزرتے گئے مگر حمزہ واپس نہ آیا۔ جب چھ مہینے تک اس کے گھر والوں نے اس کی صورت نہ دیکھی تو انہیں یقین ہو گیا کہ ضرور کسی نے اسے پہچان کر مار ڈالا ہے۔ تینوں عورتیں اس کی یاد میں بلک بلک کر روتیں اور اس کا باپ گردن جھکائے ایک سائے کی طرح کالونی میں ادھر ادھر پھرتا رہتا۔ اس کی دکان سونی سونی رہتی۔ وہ نہ کسی سے بات کرتا نہ کسی کی بات کا جواب دیتا۔

جب حمزہ کو گھر سے نکلے پورا ایک سال ہو گیا، تو ایک رات وہ اچانک واپس آ گیا۔ اس کے گھر والوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا وہ اس سے لپٹ گئے۔ عورتیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ابراہیم نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ مگر حمزہ بت بنا کھڑا رہا۔ اپنے عزیزوں کو دیکھ کر نہ تو اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی اور نہ ہونٹوں پر مسکراہٹ ہی آئی۔

اس کے گھر والوں نے دیکھا کہ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے اس کی آنکھیں بجھی بجھی سی ہیں۔ چہرے پر مردنی سی چھائی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے اسے کوئی سخت روگ لگ گیا ہے۔ انہوں نے اس سے طرح طرح کے سوال کرنے شروع کئے مگر اس نے کسی کا جواب نہ دیا۔ جیسے وہ سن ہی نہیں رہا

تھا۔ اس کی ماں نے اس کے سامنے کھانا لا کر رکھا مگر اس نے نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ جھونپڑی میں ایک طرف ایک ٹوٹی ہوئی کھٹیا پڑی تھی۔ وہ اس پر لیٹ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں سو گیا۔ اس کے گھر والے رات اسے بخار میں کراہتے اور بڑبڑاتے سنتے رہے۔

اگلی صبح کو وہ اٹھا تو اس کے چہرے پر کچھ کچھ سکون کے آثار تھے۔ ماں نے اسے بکری کے تازہ دودھ کا گلاس بھر کے دیا۔ جسے اس نے بلا حیل و حجت پی لیا۔ اب اس کے گھر والوں نے پھر اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ پہلے تو کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور آپ بیتی کہانی یوں سنانی شروع کی۔

''آپ لوگوں سے رخصت ہو کر میں نے بہت سے شہروں کی سیر کی۔ میں دن بھر مزدوری کرتا اور رات کو کسی سرائے میں یا کسی مندر کے باہر پڑ رہتا۔ میں نے ہندوانہ لباس کے ساتھ ہندی کے کچھ الفاظ بھی اپنی بول چال میں شامل کر لئے تھے۔ اس لئے کسی کو مجھ پر شک نہ گزرتا تھا۔ میں جہاں کہیں گیا میں نے مسلمانوں کو بڑی مظلومیت کسمپرسی اور بے چارگی کی حالت میں دیکھا۔ وہ ہر وقت ڈرے سہمے رہتے۔ ان کی مسجدوں، اولیاء کے مزاروں اور ان کے قبرستانوں کو مسمار کیا جا چکا مگر وہ دم نہ مار سکتے۔ ہندوستان کا کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں آئے دن مسلمانوں پر بلوے نہ ہوتے رہتے۔ ان بلوؤں میں ہزاروں بے گناہ زن و مرد بچے بوڑھے موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے۔ ان کی جائیدادیں اور املاک لوٹ لی جاتیں۔ جو مسلمان زندہ بچ رہتے ان پر سخت ظلم ڈھائے جاتے اور انہیں بڑی ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا۔ خدا جانے گنگا جمنا نربدا اور تاپتی کے پانیوں میں کتنا خون بے گناہ مسلمانوں کا مل گیا ہے!

''میں ایک دفعہ ایک بڑے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر مزدوری کرنے گیا وہاں میں نے ایک بڑھے کو دیکھا جو میری طرح مزدوری کرنے آیا تھا۔ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور آنکھیں دھنسی ہوئی۔ میں نے اس سے زیادہ مظلوم چہرہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ گو اس نے ہندوؤں کی طرح دھوتی باندھ رکھی تھی مگر مجھے فوراً خیال آیا کہ کہیں یہ بھی میری طرح مسلمان ہی نہ ہو۔ چنانچہ میں نے جرأت کر کے اسلامی طریق پر اسے سلام کیا۔ اس پر وہ بڑھا تھر تھر کانپنے اور خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ جب میں نے اس کی ڈھارس بندھائی تو اس نے اپنے مسلمان ہونے کا اقرار کر لیا۔

''یہ شخص ایک خاصا خوش حال تاجر تھا۔ اس کے کئی جوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ جب اس کے

شہر میں مسلمانوں پر بلوے ہونے شروع ہوئے تو اس کے مکان کو بھی گھیر لیا گیا۔ ہندو غنڈے دروازے اور کھڑکیاں توڑ کر گھر کے اندر گھس آئے۔ اس شخص کو رسیوں سے جکڑ دیا گیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے پہلے اس کی معصوم کنواری لڑکیوں کی آبرو لوٹی گئی۔ بعد میں ان لڑکیوں اور ان کے بھائیوں کو نہایت بے دردی کے ساتھ ذبح کر دیا گیا۔ جب اس پر بھی ہندو غنڈوں کا دل ٹھنڈا نہ ہوا تو انہوں نے مکان کے چاروں طرف مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ دم بھر میں شعلے بلند ہونے لگے اور اس کی بیوی، اس کے بوڑھے باپ اور دوسرے لواحقین کی آہ و بکا در و دیوار میں گم ہو کے رہ گئی۔ یہ شخص بڑا سخت جان تھا کہ پھر بھی کسی طرح زندہ بچ رہا۔ وہ اب مزدوری کر کے پیٹ پالتا ہے مگر خود کو ہندو ظاہر کرتا ہے کیونکہ اس کے بغیر اسے مزدوری نہیں مل سکتی۔

''میں نے ایسے واقعات سنے ہی نہیں اپنی آنکھوں سے بھی دیکھے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان مظلوموں کی شکلیں سوتے جاگتے میری آنکھوں کے سامنے پھرتی رہتی ہیں اور مجھ پر ہر وقت ایک اضطراب کی کیفیت طاری رکھتی ہیں۔

''میں تم لوگوں کو اپنی شکل دکھانے آ گیا ہوں تا کہ تم کو اطمینان ہو جائے کہ میں زندہ ہوں۔ لیکن میں یہاں ٹھہر نہ سکوں گا۔ میرے دل میں کوئی بیٹھا کہہ رہا ہے کہ اٹھ اور چل۔ لیکن کہاں؟ یہ ابھی مجھے بھی معلوم نہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے عنقریب مجھ سے کوئی بڑا اہم کام لیا جانے والا ہے۔''

ابراہیم، آمنہ، بلقیس اور سادہ چاروں مبہوت ہو کر حمزہ کی زبان سے یہ ماجرا سنتے رہے۔ اگلی صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو حمزہ کی کھٹیا خالی پڑی تھی۔

وہ فتنہ جو ایک عرصے سے خوابیدہ تھا اچانک بیدار ہو گیا۔ کسی نے قصبے میں یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ کالونی کے ملیچھ مسلمان ہندوؤں کے متبرک کنوئیں سے پانی بھر کر اسے ناپاک کرتے ہیں۔ اس بات کو وہ کٹر ہندو لے اڑے جو مسلمانوں کے وجود کو کسی صورت ہندوستان کی سرزمین پر نہیں دیکھنا چاہتے تھے اور اسے ایک تحریک کی شکل دے دی گئی۔ پھر کیا تھا کئی ہندو کنوئیں پر پہنچ گئے اور مسلمان عورتوں سے جو پانی بھرنے آئی تھیں چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ جب یہ بے چاری پانی بھرے بغیر چلی گئیں تو انہوں نے کنوئیں پر باقاعدہ پہرا بٹھا دیا۔ یہ ہندو جو والنٹیر کہلاتے تھے صبح سے آدھی رات تک باری باری مندر کے آس پاس پہرہ دیتے رہے۔

کالونی والوں کے لئے یہ بڑا نازک مسئلہ تھا۔ وہ دنیا کی ہر مصیبت جھیل سکتے تھے مگر پانی کے

بمشکل زندہ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ جب ہندو پہرے دار چلے جاتے تو رات کے پچھلے پہر کالونی کی عورتیں چھپتے سے جا کر پانی بھر لاتیں۔ یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ مگر آخر ہندوؤں کے کان میں اس کی بھنک پڑ گئی اور ایک رات پچھلے پہر کے سناٹے میں جب یہ عورتیں پانی بھرنے آئیں۔ تو بہت سے ہندوؤں نے جو مسلح ہو کر آئے تھے اور مندر میں چھپے بیٹھے تھے ایکا ایکی ان پر حملہ کر دیا۔ وہ غل مچاتے اور نعرے لگاتے بھوکے بھیڑیوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے اور کیا کنواری اور کیا بیاہتا سب کی آبرو لینے لگے۔ جو ذرا مزاحمت کرتی اس کے سینے میں چھرا بھونک دیا جاتا۔

رات کی خاموشی میں جب ان عورتوں کی چیخیں غنڈوں کے قہقہوں میں ملی ہوئی کالونی میں پہنچیں تو سارے مرد جھونپڑیوں سے باہر نکل آئے اور لٹھ، ڈنڈا، کلہاڑی جو بھی ہاتھ میں آیا لے کر کنویں کی طرف دوڑے۔ ہندو پہلے تو ان کو دیکھ کر ڈرے اور بھاگنے کی سوچنے لگے۔ مگر جب دیکھا کہ ان کی تعداد چند درجن سے زیادہ نہیں ہے تو ان کے قدم رک گئے اور وہ اپنی پوری جمعیت کے ساتھ جس کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی تھی مسلمانوں سے مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ مسلمان بڑی بہادری سے لڑے اور بہت سے ہندوؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مگر ایک آدمی دس کا مقابلہ کب تک کر سکتا تھا۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں کئی مسلمان لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ جو زندہ بچے وہ زخموں سے چور چور تھے۔ ہندوؤں نے ان پر جلد ہی قابو پا لیا۔ ابراہیم بھی ان بچے کھچے لوگوں میں تھا۔ اس کے جسم پر بہت سے زخم آئے تھے جن سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔

ہندوؤں نے ان مسلمان مردوں اور عورتوں کو رسیوں سے جکڑ دیا۔ وہ جوش انتقام سے دیوانے ہو رہے تھے کیونکہ مسلمانوں کی آٹھ دس لاشوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی بیس پچیس لاشیں بھی زمین پر لوٹ رہی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے صلاح ٹھہرائی کہ ایک بہت بڑا الاؤ لگایا جائے اور ان مسلمانوں کو اس میں زندہ جلا دیا جائے۔

کئی ہندو اسی وقت دوڑے دوڑے قصبے میں گئے اور ٹال کھلوا چھکڑوں میں لکڑیاں بھر لائے۔ تھوڑی ہی دیر میں مندر کے سامنے ایک بہت بڑا الاؤ لگا دیا گیا۔ دم بھر میں شعلے آسمان کی خبر لانے لگے۔

سارہ جو اپنی ماں اور بچی کے ساتھ رسیوں سے بندھی زمین پر پڑی تھی اس بھیانک منظر کی تاب نہ لا سکی۔ اس کی دہشت زدہ نظریں مرد قیدیوں میں جو اس سے ذرا ہٹ کے رسیوں میں جکڑے پڑے تھے، اپنے چچا کو ڈھونڈنے لگیں۔ آخر اس نے ابراہیم کو تلاش کر لیا۔ جو زخموں سے چور زمین پر

پڑا سسک رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر سارہ کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ ابراہیم نے نقاہت کے باوجود یہ چیخ سن لی اور اس نے بڑی مشکل سے گردن اٹھا کر قیدی عورتوں پر نظر ڈالی۔ آخر چچا بھتیجی کی نظریں مل گئیں اور وہ دونوں بڑی بے بسی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

اب ہندو غنڈوں نے قیدی مردوں کے جسموں میں بھالوں کی انیاں چبھو چبھو کر پہلے انہیں الاؤ کی طرف لے جانا شروع کیا۔ ابراہیم سب سے آگے تھا۔ بہت سا خون نکل جانے سے وہ ایسا نحیف ہو گیا تھا کہ ایک قدم بھی چل نہ سکتا تھا۔ اس پر دو تین ہندو اسے اٹھا کر گھسیٹتے ہوئے الاؤ کے قریب لے گئے اور آگ میں دھکا دے دیا۔ سارہ کے منہ سے ایک مرتبہ پھر چیخ نکل گئی۔ مگر یہ چیخ پہلی سے کہیں زیادہ بلند اور کرب ناک تھی۔

اس چیخ کا سنائی دینا تھا کہ یکبارگی آسمان پر بڑے زور کا کڑکا ہوا جس سے زمین کانپنے لگی اور اس کے ساتھ ہی الاؤ کی آگ خود بخود بجھ گئی۔ یہ دیکھ کر ہندو ایسے سراسیمہ ہوئے کہ اندھا دھند ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ بھاگتے ہی میں آسمان میں ایک بہت بڑا شگاف ہو گیا اور اس میں سے دم دار تارے کی شکل کی کوئی چیز نمودار ہوئی۔ جس میں سے اس قدر تیز روشنی پھوٹ رہی تھی کہ زمین و آسمان جگمگا اٹھے تھے۔

یہ چیز بڑی تیزی کے ساتھ اس مندر کی طرف آنے لگی۔ جوں جوں وہ قریب آتی جاتی تھی روشنی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں اور وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کے اپنی آنکھوں کو چھپانے لگے۔ آن کی آن میں وہ چیز ہندوؤں کے سروں کے بالکل قریب آ کر ٹھہر گئی۔

اگرچہ روشنی اس قدر تیز تھی کہ نظر اس پر نہ ٹھہرتی تھی۔ پھر بھی ان لوگوں نے اپنی آنکھوں کو کبھی بند کر کے اور کبھی کھول کے یہ دیکھ ہی لیا کہ یہ ایک بڑا سندر چھیلا نوجوان ہے۔ جو ایک دودھ ایسے سفید گھوڑے پر سوار ہے۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک لمبی تلوار ہے۔ جس سے یہ ساری روشنی نکل رہی ہے۔ اس کے سر پر بڑا خوبصورت مکٹ ہے۔ جس میں جگمگاتے ہوئے لعل، ہیرے، زمرد، پکھراج، نیلم اور دوسرے بے بہا جواہر جڑے ہیں۔ گلے میں بڑے بڑے موتیوں کی کئی کئی مالائیں ہیں۔ اس کے گھوڑے کا ساز و یراق بھی جواہر سے مزین ہے۔ سر پر اونچی کلغی ہے۔ گھوڑے کی سامنے کی ٹانگوں پر گردن کے قریب دو بڑے بڑے پر ہیں۔ جو مور کے پروں سے بھی زیادہ رنگین اور خوش نما ہیں۔ یہ پر فر فرا رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے گھوڑا ہوا میں معلق ہے۔

اس عجیب و غریب گھڑ سوار کو دیکھ کر ہندوؤں کی گھگھی بندھ گئی۔ بعض نے اضطراری حالت میں

پوجا پاٹ شروع کر دی۔ بعض ہاتھ جوڑ جوڑ کر اسے ڈنڈوت کرنے لگے۔ ادھر ابراہیم نے بھی جسے آگ نے ذرا گزند نہ پہنچایا تھا سر اٹھا کر اس سوار کو دیکھا اور وہ تکنے کا تکتا رہ گیا۔ یہی حال سارہ کا تھا جو ایک حیرت کے عالم میں کبھی اپنے بچے ابراہیم کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی اس سفید گھوڑے کے سوار کی طرف۔

اب اس سوار نے گمبھیر مگر بڑی سریلی آواز میں ہندوؤں کے مجمع سے یوں خطاب کرنا شروع کیا:

"میں ہی ہوں وہ کلکی اوتار، جس کے آنے کی خبر شاستروں میں دی گئی تھی۔ میں وشنو بھگوان کا دسواں اور آخری اوتار ہوں۔ مجھے کل جگ کے ختم ہونے پر ظاہر ہونا تھا جس کی مدت چار لاکھ بتیس ہزار سال ہے۔ مگر آج سنسار پر ادھرم اور پاپ کا ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے مقررہ وقت سے بہت پہلے یہاں آنا پڑا ہے۔

"میں وشنو ہوں۔ جب کبھی سنسار میں نیکی گھٹ جاتی ہے اور بدی غلبہ پالیتی ہے تو میں دیو لوک میں اپنے استھان کو چھوڑ کر یہاں آتا ہوں تاکہ نیکوں کی حفاظت کروں اور بدکاروں کو ان کے کئے کی سزا دوں۔ میں نو مرتبہ مختلف اوتاروں کے روپ میں دھرتی پر آچکا ہوں۔ مگر جیسا ظلم آج تم نے آج اس اندھیر نگری میں دیکھ رہا ہوں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ تم انسان نہیں بھیڑیوں سے بھی بدتر ہو۔ پرتھوی جس نے تمہیں پالا ہے تمہارے کرتوتوں سے ایسی دکھیا ہے کہ وہ تمہاری صورت تک دیکھنا نہیں چاہتی۔ وہ پاتال میں چلی جانا چاہتی ہے۔ دھرتی تو دھرتی آکاش کے دیوتا بھی تم پر لعنت کرتے ہیں۔ کیونکہ تم نے ان کے بھگت ہو کر ان کے نام پر کلنک کا ٹیکہ لگایا ہے۔

"تم شاستروں کے احکام کے خلاف ہو۔ تم ویدوں سے منحرف ہو گئے ہو۔ ہندو دھرم جو سب دھرموں میں بڑا اونچا درجہ رکھتا تھا تم نے اس کو بٹہ لگایا ہے۔ ہندو دھرم تو اتنا اہنسک ہے کہ اس میں ایک چیونٹی کی ہتھیا بھی مہا پاپ ہے مگر تم نے اس دھرم میں رہ کر لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون بہایا ہے۔ تم نے عورتوں کو بے آبرو کیا ہے۔ تم نے ان کو ننگا کر کے بازاروں میں پھرایا ہے۔ تم نے ان کی چھاتیاں اور ناک کان کاٹ کے انہیں زندہ چتاؤں میں جلایا ہے۔ تم نے ان کے بچوں کو بھالوں کی انیوں پر لٹکایا ہے۔ کیا ہندو دھرم کا یہی کرتو ہے؟

"اور پھر ان لاکھوں انسانوں کا قصور کیا تھا؟ محض یہ کہ انہوں نے اپنی نجات کے لئے جو راہ منتخب کی تھی وہ تمہاری راہ سے مختلف تھی۔ ان کا طریق عبادت اور طرز حیات تم سے جداگانہ تھا۔ کیا یہ

اتنا ہی قصور تھا کہ انہیں دائرہ انسانیت سے خارج کر کے نیست و نابود کر دیا جاتا؟

"کیا تم نہیں جانتے کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک ہی مقصد رکھتے ہیں یعنی سفر آخرت۔ ہر شخص مسافر ہے اور اپنے اپنے طریق پر سفر کرتا ہے۔ مگر منزل سب کی ایک ہی ہے۔ اور ایک ہی روشنی ہے جو مختلف رنگوں میں نمودار ہوتی ہے مگر سب کے لئے مشعل راہ ہے۔

"مجھ سے پہلے رام چندر جی، کرشن جی اور گوتم بدھ آئے تھے جو میرے ہی تین سروپ تھے۔ انہوں نے تم کو سچائی، دیانت، عدل و انصاف، ایثار، علم و صبر کی تعلیم دی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ سنسار میں سکھ شانتی کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے تم کو نصیحت کی تھی کہ کسی کا دل نہ دکھاؤ۔ بیکسوں بیچاروں کی سیوا کرو۔ کسی سے نفرت نہ کرو۔ محبت سب چیزوں کا سرچشمہ ہے۔ عارف کی نظر میں برہمن، گائے، ہاتھی، کتا اور چنڈال برابر ہیں۔ سب سے اونچا شخص وہ ہے جو دوست دشمن نیک و بد سب کو ایک نظر سے دیکھے۔

"مگر تم نے ان کی تعلیمات کو بھلا دیا۔ تم جاہ و حشمت، حرص و ہوا کے بندے بن گئے۔ عناد، تعصب، نفرت اور غرور تمہاری گھٹی میں پڑ گئے۔ اگیان نے تمہاری آنکھوں پر پردے ڈال دیئے۔ تم بس کو امرت اور شعلے کو پھول سمجھنے لگے۔ تم یہ بھول گئے کہ یہ جگت کچھ بھی نہیں محض ایک سراب ہے۔ جیسے آکاش نیلے رنگ کا نظر آتا ہے مگر بچار کرنے سے یہ بھرم مٹ جاتا ہے۔

"یہ بھی نہ بھولو کہ تقدس، معصومیت، شرافت، خلوص اور حق شناسی کے جوہر کسی ایک قوم کو ودیعت نہیں ہوئے۔ بلکہ ساری کائنات کے حصے میں آئے ہیں۔ اسی طرح دیوتا بھی کسی خاص مذہب و ملت سے تعلق نہیں رکھتے۔ بلکہ وہ ساری انسانیت کے لئے ہیں۔ اور تمام موجودات میں ان کی ذات کا پرتو ہے۔ چنانچہ میں نے اسی بات کو ثابت کرنے کے لئے اب کے کسی ہندو راج محل میں نہیں بلکہ ایک غریب مسلمان لوہار کے جھونپڑے میں جنم لیا ہے..............."

دیگر افسانے

بندر والا

میں شہر کے جس علاقے میں رہتا تھا وہیں ایک صاحب بھی رہتے تھے۔ نام تو ان کا کچھ لمبا سا تھا مگر اس علاقے کے لوگوں میں وہ مسٹر شاہ کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ وہ کسی دفتر میں اونچے عہدے پر فائز تھے اور ایک چھوٹے سے خوش نما بنگلے میں رہائش پذیر تھے۔ بڑے خلیق اور ملنسار معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کے بنگلے کے باہر صبح شام دو ایک موٹریں کھڑی نظر آیا کرتی تھیں۔

میں صبح کو ٹہلنے نکلتا تو کبھی کبھی ان سے ملاقات ہو جاتی، خصوصاً چھٹی کے روز۔ انھیں کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے شعر و ادب سے لگاؤ ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے بڑے التفات سے پیش آتے اور اپنے بنگلے پر آنے کی دعوت دیتے۔ میں اسے ان کی خوش اخلاقی پر محمول کرتا اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ بہانہ کر کے ٹال دیا کرتا مگر ایک دن جو انھوں نے مجھے سہ پہر کی چائے پر مدعو کیا تو میں انکار نہ کر سکا۔

مجھے معلوم تھا کہ ان کا تین چار سال کا ایک صاحبزادہ ہے۔ جس کو میں نے کئی بار ان کی انگلی پکڑے ساتھ ساتھ چلتے دیکھا تھا۔ بڑا بھولا بھالا پیارا بچہ تھا۔ راہ میں نے بازار سے ٹافیوں اور پیڑے والی مٹھائیوں کی دو تھیلیاں خریدیں اور وقت مقررہ پر ان کے بنگلے پر پہنچ گیا۔

وہ غالباً میرے ہی منتظر تھے۔ خود پھاٹک پر مجھے لینے آئے اور میری آمد پر بڑی مسرت کا اظہار

کیا۔ ڈرائنگ روم میں لے گئے اور ایک نرم اور آرام دہ صوفے پر مجھے بٹھایا۔ ڈرائنگ روم بڑے تکلف سے سجایا گیا تھا۔ قیمتی قالینوں، دیواروں پر خوش نما تصاویر، چینی کے ظروف، آرٹ کے نوادر غرض ہر چیز ان کی خوشحالی کی غمازی کرتی تھی۔

اسی ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں ان کا صاحبزادہ چند بیٹری سے چلنے والے کھلونوں موٹر، ہوائی جہاز، ٹینک وغیرہ سے کھیلنے میں مشغول تھا۔ اس کو دیکھ کر مسٹر شاہ نے کہا:

"مانی، دیکھو انکل آئے ہیں، انھیں سلام کرو۔"

لڑکا چونکا اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مگر اس کی نظریں ابھی تک کھلونوں پر گڑی تھیں۔

"مانی بیٹے سلام کرو انکل کو، شاباش۔"

لڑکے نے باپ کی طرف دیکھا، پھر اپنے ننھے سے ہاتھ سے پیشانی کو چھو کر مجھے سلام کیا۔ میں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ٹافیوں اور چوسنے والی مٹھائیوں کی تھیلیاں اسے دے دیں۔

"انکل کو تھینک یو کہو مانی۔"

لڑکے نے کچھ تامل کیا۔

"دیکھو انکل تمہارے لئے کیسی اچھی اچھی سویٹس لائے ہیں۔ انھیں تھینک یو کہو۔ شاباش!"

آخر لڑکے نے اپنی باریک آواز میں آہستہ سے تھینک یو کہہ ہی دیا۔ میں نے دوبارہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"ماشاء اللہ بڑا پیارا ہونہار بچہ ہے۔ خدا عمر دراز کرے۔"

بچہ چند لمحے شرمیلے پن سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر جانے لگا۔ مگر مسٹر شاہ نے فوراً اسے روکا۔

"تم نے انکل کو اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

بچہ رک گیا۔ وہ گھر میں ایک اجنبی کو دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا تھا۔

"شاباش، شاباش، بتاؤ اپنا نام۔"

لڑکے نے پہلے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا پھر نظریں نیچی کر کے اپنی باریک آواز میں آہستہ سے کہا:

"خاکسار کو امان اللہ شاہ کہتے ہیں۔"

مسٹر شاہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

اتنے میں ایک خاتون ہلکے سبز رنگ کی ساڑی میں ڈرائنگ روم میں تشریف لائیں۔ قدرے شوخ میک اپ کیا ہوا جس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ خاصی قبول صورت تھیں۔ عمر میں وہ مسٹر شاہ سے جو چالیس کے پیٹے میں معلوم ہوتے تھے یقیناً آٹھ دس برس چھوٹی ہوں گی۔ مسٹر شاہ نے میری ادبی صلاحیتوں کے بارے میں کافی زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے بیگم سے میرا تعارف کرایا جس پر انھوں نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا۔ میں نے اپنی منکسر المزاجی کو ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے ظاہر کرتے ہوئے ان کے سلام کا جواب دیا اور وہ ڈرائنگ روم ہی میں ایک بڑی سی میز پر چائے کے برتن سجانے میں مصروف ہو گئیں۔

میں نے مسٹر شاہ سے پوچھا: "آپ کا صاحبزادہ ماشاء اللہ بہت ذہین ہے۔ کس نرسری اسکول میں جاتا ہے۔"

"ابھی تو کسی میں بھی نہیں۔ میں گھر پر خود ہی اس کو پڑھاتا ہوں۔ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ شروع ہی سے اسے پڑھنے کا شوق پیدا ہو جائے۔ مانی بیٹے، ذرا انکل کو اے بی سی تو سناؤ۔"

رفتہ رفتہ لڑکے کی جھجک دور ہوتی جا رہی تھی۔ اب کے اس نے بغیر شرمائے اے سے لے کر زیڈ تک پوری اے بی سی فرفر سنا دی۔

اس دوران میں دو ایک بار لڑکا کہیں اٹکا بھی مگر باپ کی صورت دیکھتے ہی اسے اپنا آموختہ جلد ہی یاد آ جاتا تھا۔

اب تو مسز شاہ بھی خاصی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگی تھیں۔

"صاحب کیا بتاؤں، مسٹر شاہ کو تو بس یہی دھن ہے کہ لڑکے کو اسکول بھیجنے سے پہلے ہی لائق فائق بنا دیں۔ اس کی چوتھی سالگرہ میں بس چند ہی مہینے رہ گئے ہیں اس کے بعد وہ اسکول جانے لگے گا۔ مسٹر شاہ چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے ہی اردو کے کچھ مشہور شعر بھی اسے یاد کرا دیں، اور کچھ تو یاد کرا بھی دیئے ہیں۔ غالب کا وہ کون سا شعر تھا جو۔۔۔۔۔۔"

میں نے جلدی سے قطع کلام کرتے ہوئے کہا:

"معاف کیجئے گا بیگم صاحب! آپ کا صاحبزادہ بے شک بہت ذہین ہے مگر بے چارہ اس وقت بہت تھک گیا ہو گا۔ میں وہ شعر کسی اور وقت سن لوں گا۔"

مسز شاہ بولیں: "اجی آپ تھکنے کو کہتے ہیں۔ مسٹر شاہ تو صبح صبح ہی اسے اٹھا کر بٹھا دیتے

ہیں، اپنے ساتھ ہوا خوری کو لے جاتے ہیں۔ اپنے ساتھ ورزش کراتے ہیں۔ علاوہ ورزش بھی تحت قسم کی۔ وہ جو جاپانی کشتی جوڈو کراٹے کہلاتی ہے۔ اس کے بھی تو کچھ داؤ پیچ سکھاتے ہیں۔۔۔۔

چائے کے دوران بھی گفتگو کا موضوع زیادہ تر ان کا صاحبزادہ ہی رہا۔

آخر جب کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد میں مسٹر شاہ کے بنگلے سے نکلا تو مجھے بڑی تھکاوٹ معلوم ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ ایک جگہ سڑک سے ہٹ کر میں نے ایک مجمع دیکھا جس میں بوڑھے، بچے، جوان سبھی دائرہ باندھے کھڑے تھے۔ ان کے قہقہوں کی آوازیں سن کر میرے قدم خود بخود اس مجمع کی طرف اٹھنے لگے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ بندر کا تماشا ہو رہا ہے جسے تماشائی بڑے ذوق وشوق سے دیکھ رہے ہیں۔

بندر ایک چھوٹی سی سرخ رنگ کی انگریزی ٹوپی پہنے تھا جسے بندر والے نے اس کی تھوڑی کے نیچے ڈوریوں سے باندھ دیا تھا۔ وہ پچھلے پاؤں پر انسانوں کی طرح سیدھا کھڑا تھا اور دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر خوب مٹک مٹک کے اور اکڑ اکڑ کے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر چل رہا تھا۔ ساتھ ساتھ بندر والا ڈگڈگی بجا بجا کے کہے جا رہا تھا۔

"اس ٹوپی صاحب۔ بہت ہو چکی لندن کی سیر۔ اب گھر کو سدھارو۔۔۔۔ لو صاحب بہادر تمہاری میم صاحب تو ناراض ہو کر ولایت چلی گئیں۔ اب تمہیں روٹی پکا کے کون کھلائے گا؟۔۔۔۔ کیا کہا خود پکاؤ گے؟ وہ کیسے؟۔۔۔۔ بھئی واہ صاحب بہادر واہ تم روٹی پکانا تو خوب جانتے ہو۔۔۔۔ کیا کہا دشمن سے لڑو گے، لڑو گے!۔۔۔۔ بندوق چلانی آتی ہے؟۔۔۔۔ لو یہ رہی تمہاری بندوق ۔۔۔۔ اب کھڑے ہو کر نشانہ باندھو۔ شاباش۔۔۔۔ اب لیٹ کر نشانہ باندھو۔۔۔۔ بہت ٹھیک ۔۔۔۔ شاباش! شاباش!۔۔۔۔ ارے یہ کیا؟ ہوائی جہاز کو نشانہ بنانا چاہتے ہو؟۔۔۔۔ بھئی تم تو بڑے بہادر نکلے۔ تم نے تو سچ مچ دشمن کو بھگا ہی دیا۔"

بندر نے ان کرتبوں کے علاوہ اور بھی کئی تماشے دکھائے۔ مثلاً سر کو ہلا کر ہاں یا نہیں کا اشارہ کرنا، ہوا میں قلابازی لگانا، ڈھیک چند کرنا، دونوں ہاتھوں کے بل الٹا ہو کر چلنا، کانوں کو ہلانا وغیرہ۔

ان کرتبوں کے دوران بندر کبھی کبھی دانت کچکچانے یا چیخ چڑانے لگتا مگر بندر والے کی لکڑی اور رسی کا جھٹکا اور آنکھ کا اشارہ جلد ہی اسے راہ پر لے آتا تھا۔

بندر کا تماشا تو میں نے زندگی میں بیسیوں مرتبہ ہی دیکھا ہوگا مگر جو مزہ آج مجھے اس تماشے کے دیکھنے میں آیا پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔

میری تھکن دور ہو چکی تھی۔

جب میں گھر لوٹ رہا تھا تو اچانک میرے ذہن میں یہ سوال ابھرا!

بندر والا تو ڈگڈگی بجا کر تماشائی اکٹھے کر لیتا ہے۔ کیا مسٹر شاہ کو اس مقصد کے لئے بھی ڈھولوں ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے؟

روحی

اے میرے بچپن کے دوست!

ایک طویل مدت کے بعد تمہارا خط ملا۔ میں تو تمہاری طرف سے مایوس ہی ہو چکا تھا مگر تمہارے اس خط کو پا کر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ اس کا اظہار مشکل ہے۔ تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ تم بفضل خدا ابھی تک تندرست و توانا ہو اور پیرانہ سالی کے باوجود نہ تو جہاں گردی سے تمہارا جی بھرا ہے اور نہ سیر و سیاحت سے تمہارے پاؤں ہی تھکتے ہیں۔

تم نے پچھلا خط روم سے لکھا تھا۔ اس امر کو دس برس گزر چکے ہیں اور اب تم ہونولولو میں ہو جہاں سے تم نے یہ خط لکھا ہے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ طویل وقفوں کے بعد ہی مگر تم مجھے یاد تو کر ہی لیتے ہو۔ میں تمہارے سیر و سیاحت اور تمہاری مہم جوئی کے حالات بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ میں خوش ہوں کہ تم بھی میرے معاملات سے دلچسپی رکھتے ہو۔ کیونکہ تم نے میری زندگی کے پچھلے دس برس کے واقعات پوری تفصیل کے ساتھ دریافت کیے ہیں۔ تم نے لکھا ہے کہ تم تین ماہ تک مندرجہ پتہ پر میرے جواب کا انتظار کرو گے لہٰذا تعمیل ارشاد کرتا ہوں۔

میں اب خاصہ بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میرے سر کے بال تقریباً سفید ہو گئے ہیں، کمر میں کسی قدر خم بھی آ گیا ہے۔ شاید کچھ ایسی ہی کیفیت تمہاری بھی ہو۔ مگر میرے تصور میں تو تم اب بھی وہی جوان

رعنا ہو جو آج سے تقریباً نصف صدی قبل میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کالج کی گراؤنڈ میں گھوما کرتا تھا۔

تم جانتے ہو کہ جہاں تک شعر و ادب، فنون لطیفہ بالخصوص موسیقی و مصوری کا تعلق ہے ہماری طبیعتوں میں بڑی مماثلت رہی ہے۔ مگر ساتھ ہی ایک بڑا فرق بھی رہا ہے وہ یہ کہ تم ہمیشہ سے مہم جو اور سیلانی فطرت رہے ہو اور میں ہمیشہ سے آرام طلب اور سہل انگار ہوں۔ تم نے اپنی آزادی طبع کو ہر چیز سے مقدم جانا اور اسی وجہ سے عمر بھر خود کو تاہل کی زنجیر میں نہیں جکڑا اور میں نے تعلیم کے بعد ملازمت میں منسلک ہوتے ہی ایک چھوٹا سا گھر بسا لیا۔

تم کو عابدہ کی موت یاد ہو گی اور یہ بھی یاد ہو گا کہ کس طرح وہ شادی کر کے دوسرے ہی برس مجھے ایک بچی کا تحفہ دے کر ہمیشہ کے لیے مجھ سے رخصت ہو گئی تھی۔ میں اس بچی سے نفرت بھی کرتا تھا اور محبت بھی۔ نفرت اس لیے کہ اس کی وجہ سے میں ایک متاع عزیز سے محروم ہو گیا تھا اور محبت اس لیے کہ وہ آخر تھی تو میرا خون ہی۔ میں نے اس کی خاطر دوسری شادی کا خیال ہی ترک نہیں کر دیا تھا بلکہ جنس لطیف کی طرف سے اپنی آنکھیں ہی بند کر لی تھیں۔

میں دل و جان سے سلمیٰ کی پرورش کرتا رہا۔ میں نے اس کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ جب وہ جوان ہوئی تو ہو بہو اپنی ماں کی تصویر تھی۔ ویسے ہی خدوخال، ویسے ہی سنہرے بال، ویسے ہی دراز قامت۔ اس کی ذمہ داری اس وقت تک مجھ پر رہی جب تک کہ اس کی شادی نہ ہو گئی۔ اسے یونیورسٹی کے زمانے ہی میں اپنے ایک ہم سبق سے دل بستگی ہو گئی تھی۔ یہ صاحبزادہ خاصے خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ شادی کے بعد وہ دونوں دو سال تک اپنے ہی ملک میں رہے۔ پھر شوہر کا تبادلہ کاروبار کے سلسلے میں ممالک غیر میں ہو گیا جہاں وہ اب اپنے بچوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سلمیٰ کی شادی کے بعد میں نے اس بوڑھی ماما کو جسے عابدہ نے ملازم رکھا تھا اور جس نے اس کی موت کے بعد سلمیٰ کی پرورش میں میری مدد کی تھی اپنے پاس ہی رہنے دیا، البتہ اب وہ میرا دونوں وقت کا کھانا پکا کر سرِ شام اپنے بیٹے اور بہو کے پاس چلی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ میرا ایک خدمت گار رضا بخش بھی تھا جو مالی کا کام بھی کرتا تھا اور میری دیکھ بھال بھی۔

پچپن برس کی عمر کو پہنچ کر میں ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔ کوئی نیا کام شروع کرنے کو دل ہی نہ چاہا اور نہ اس کی ضرورت ہی محسوس ہوئی۔ ماہانہ پنشن اور ملازمت کے دوران بچائی ہوئی پونجی کی بدولت مجھے ہر ماہ اتنی رقم مل جاتی کہ میں اس سے خاصی آرام و آسائش کی زندگی گزار سکوں۔ مکان

جس میں میں رہتا تھا وہ بھی میری ہی ملکیت تھا جسے میں نے ملازمت کے ابتدائی برسوں ہی میں سرکاری سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تعمیر کرا لیا تھا۔ اس مکان میں مجھے پہلی مرتبہ وہ سکون اور تنہائی نصیب ہوئی جس کا میں عمر بھر خواہاں رہا تھا۔ میرا زیادہ تر وقت مطالعہ میں صرف ہوتا۔ گھر سے بہت کم باہر نکلتا، نہ کہیں آتا نہ جاتا۔ جب بیٹھے بیٹھے تھک جاتا تو اپنے بنگلے کے چھوٹے سے باغیچے میں چہل قدمی کر لیا کرتا۔

میرے دوست! شاید تم پوچھو کہ اس مکان میں چوبیں گھنٹے تن تنہا رہتے ہوئے تمہارا جی گھبرا نہ جاتا ہوگا۔ نہ کوئی دوست نہ کوئی ساتھی، نہ محرم راز نہ غمگسار۔ یہ پہاڑ سے دن، یہ سونی سونی راتیں بھلا کیسے کٹتی ہوں گی! تمہارا یہ سوال دنیا والوں کے نقطۂ خیال سے شاید درست ہو مگر شاید تمہیں یاد رہا ہو کہ میری طبیعت شروع ہی سے تنہائی پسند رہی ہے۔ جب اسکول میں پڑھتا تھا تو اکثر چھٹی کے روز کتاب لے کر گھر سے نکل جاتا اور باغ کا کوئی سنسان گوشہ تلاش کر کے دن بھر مطالعہ میں مصروف رہتا۔ کالج کے زمانے میں بھی جیسا کہ تم جانتے ہو میں دوسرے طلباء سے الگ تھلگ ہی رہا۔ تم البتہ وہ واحد شخص ہو جس کی دوستی اور رفاقت میرے لئے خوشیوں کا سرچشمہ رہی۔

پھر جب میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوا تو اپنی رفیقۂ حیات کو جنون کی حد تک چاہنے لگا اور اس کی خاطر مجھے اپنے کئی اصول توڑنے اور اپنی عادتیں بدلنی پڑیں۔ مگر یہ میری انتہا درجے کی بدقسمتی تھی کہ عابدہ جلد ہی میرا ساتھ چھوڑ گئی اور سلیمہ کی تعلیم و تربیت کا سارا بوجھ مجھ پر پڑ گیا۔ اس کی دیکھ بھال اور دفتر کی مصروفیت نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ میں دوبارہ لذتِ تنہائی سے بہرہ مند ہو سکتا۔ آخر جب سلیمہ کی شادی خیر و خوبی سے انجام پا گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ سچ ہے کہ سلیمہ کے چلے جانے کے بعد کچھ دنوں مجھے یہ گھر بہت سونا سونا معلوم ہوا لیکن پھر جلد ہی مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میری کوئی کھوئی ہوئی چیز رفتہ رفتہ مجھے واپس مل رہی ہے۔ پھر جب میں ملازمت سے سبکدوش ہوا تو میری مسرت کا ٹھکانا ہی نہ تھا کیونکہ لامحدود فراغت کا ایک طویل زمانہ میرے سامنے تھا۔

تم لوگ جو عورت کو دنیا جہان کی مسرت کا گہوارہ سمجھتے ہو تم کو کیا معلوم کہ عورت کے سوا دنیا میں اور بھی کئی دل کو لبھا لینے والی چیزیں ہیں جن سے روح کو تسکین اور دماغ کو فرحت ملتی ہے۔ شاعری! کون ہے کہ میر، غالب، حافظ، عمر خیام، کیٹس، شیلی کے نغمات سن کر اس کے سازِ دل کے تار جھنجھنا نہ اٹھیں۔ یہی حال مصوری، موسیقی اور دوسرے فنونِ لطیفہ کا ہے۔

تم بھی یہاں آ کر تو دیکھو کہ میں نے دنیا بھر کے شعر و ادب کے کیسے کیسے شاہکار اپنے گھر میں جمع

کر رکھے ہیں جن کے مطالعہ کو میں صدیوں ترستا رہا ہوں۔ دنیا بھر کے باکمال مصوروں کی تصویریں میرے گھر کی زینت ہیں۔ میں انہیں پہروں دیکھتا رہتا ہوں۔ میں ان سے باتیں کرتا ہوں۔ میں ان کی خاموشی کا راز سمجھتا ہوں۔

پھر دنیا بھر کی کلاسیکی موسیقی کے ریکارڈ میرے پاس ہیں۔ ان کو سنتا ہوں تو مجھ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے کائنات کے سربستہ راز مجھ پر عیاں ہو رہے ہیں۔ انسان کے جذبات و حسیات، حسن و عشق، نفرت و محبت، گناہ و ثواب، صلح و جنگ کی کیسی کیسی تمثیلیں ان شاعروں، مصوروں اور موسیقی دانوں نے اپنے اپنے فن کے ذریعے پیش کی ہیں۔ کیسے کیسے ناول اور ڈرامے لکھے گئے جن کو پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ ہم بھی ان کے کرداروں کے ساتھ اسی ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مذاق کے پیتا بکار عورت ذات سے کتنے مختلف ہیں، نہ یک بیک ساتھ چھوڑ دینے والے نہ دغا فریب دینے والے نہ کچھ طلب کرنے والے!۔۔۔۔۔۔ پیارے دوست معاف کرنا میں نہ جانے کدھر بھٹک گیا۔

میری ملازمت سے سبکدوشی کو چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ بڑھیا ماما جس کا نام حسین بوا تھا اپنے گھر سے آئی تو باورچی خانے میں جانے کے بجائے سیدھی میرے کمرے میں چلی آئی۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی، سانس پھولا ہوا تھا۔ میں نے اس کے چہرے سے بھانپ لیا کہ وہ مجھ سے کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہے۔

”حسین بوا! کیا بات ہے، خیریت سے تو ہو؟“ میں نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

حسین بوا نے اپنی گھبراہٹ پر کسی قدر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”خدا حضور کو سلامت رکھے ویسے تو سب خیریت ہے مگر ایک معاملے میں حضور کی مدد کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔۔“

”کس معاملے میں؟“

”بڑا نیکی کا کام ہے حضور۔ خدا آپ کو اس کا بڑا اجر دے گا۔“

”بتاؤ تو سہی حسین بوا میں کیا کر سکتا ہوں؟“

بہت سوال و جواب کے بعد معلوم ہوا کہ حسین بوا نے پچھلے دو تین دن سے ایک بے سہارا لڑکی کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے۔ یہ لڑکی یتیم ہے اور اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ پڑھی لکھی ہے اور ایک اسکول میں بچوں کو پڑھاتی ہے۔ اس کام سے اسے اپنے گزارے کے لئے خاصی رقم مل جاتی ہے۔ وہ پچھلے دس ماہ سے اسی اسکول کی ایک بڑی استانی کے ساتھ رہتی تھی۔ اس استانی نے نوکری

چھوڑ دی اور کسی اور شہر چلی گئی چنانچہ اس لڑکی کو بھی اپنا کمرہ خالی کرنا پڑا۔ تحسین بوا اس لڑکی کو اپنے محلے میں پریشان حال پھرتے دیکھ کر، اور اس پر ترس کھا کر اپنے گھر لے گئی۔ وہ دو دن سے شہر کے کئی علاقوں میں اس لڑکی کے لئے کرایہ پر کمرہ تلاش کرتی رہی ہے مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ جن گھروں نے اسے کمرہ دینے پر آمادگی ظاہر کی انہیں تحسین بوا نے لڑکی کی کم عمری کے سبب (اس کی عمر صرف بیس سال ہے)
مناسب نہیں سمجھا۔ ان میں یا تو مردوں کی کثرت تھی، یا ان کا رہن سہن مشکوک تھا۔ وہ دو ایک ہوسٹلوں میں بھی گئی مگر ان میں بھی کوئی جگہ خالی نہیں ملی۔ آخر میں تحسین بوا نے مجھ سے درخواست کی کہ وہ کمرہ جو سلیمہ بی بی کی شادی کے بعد سے اب تک خالی پڑا ہے، اس میں اس لڑکی کو دو ایک مہینے کے لئے ٹھہرا لیا جائے۔ اس عرصے میں وہ لڑکی کوئی نہ کوئی ٹھکانہ تلاش کر ہی لے گی۔

میں بوڑھی ماما کی یہ بات سن کر بھونچکا سا رہ گیا۔ میں کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اپنے اسی نرم لہجہ میں جس سے میں ہمیشہ اس سے مخاطب ہوتا تھا کہا:

”تحسین بوا! ذرا سوچو تو، جس مکان میں ایک مرد اکیلا رہتا ہو اس میں ایک نوجوان بن بیاہی لڑکی کیسے رہ سکتی ہے؟ آس پاس کے لوگ کیا کہیں گے۔ طرح طرح کی چہ میگوئیاں نہ ہوں گی! یہ گھر بدنام نہ ہو جائے گا! مجھے حیرت ہے کہ تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہی کیونکر ہوا!“

”حضور میں جانتی ہوں کہ یہ معاملہ ذرا مشکل ہے لیکن میں تیس برس سے حضور کا نمک کھا رہی ہوں۔ میں نے حضور جیسا شریف اور نیک دل انسان کہیں نہیں دیکھا۔ حضور کے بارے میں کوئی برا خیال دل میں لا ہی نہیں سکتا۔ رہا دنیا والوں کا معاملہ تو ایک نیک کام کے لئے حضور کو دنیا والوں کی باتوں کا کچھ خیال نہیں کرنا چاہیے۔ اس لڑکی کا چال چلن دیکھیے۔ اگر اسکول والوں کو اس کے بارے میں ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو وہ اسے استانی کی نوکری دیتے ہی کیوں؟ اس لڑکی کی آنکھوں میں حیا ہے، شرم ہے۔ میں عورت ہوں۔ وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے بھی نظریں جھکائے ہی رکھتی ہے۔ اس کی صورت ایسی بھولی بھالی ہے کہ بے اختیار اس پر ترس آتا ہے۔ اگر میری کوٹھریا اس قابل ہوتی تو میں اسے اپنے پاس ہی رکھ لیتی۔ اسے یہاں ہمیشہ تھوڑا ہی رہنا ہوگا حضور، بس دو ایک مہینے ہی کی تو بات ہے۔ اللہ حضور کو اس کا اجر دے گا اور وہ لڑکی بھی عمر بھر دعائیں دے گی۔“

پیارے دوست! تحسین بوا کی اس درخواست نے مجھے عجب خلجان میں ڈال دیا ہے۔ جب عابدہ نے اسے ملازم رکھا تھا تو وہ ایک کم عمر بیوہ تھی جس کا تین چار سال کا ایک لڑکا تھا۔ وہ دیہات کی

رہنے والی ان پڑھ عورت تھی مگر عابدہ نے چند ہی مہینوں میں اسے تربیت دے کر خاصا مہذب بنا لیا تھا۔ اس نے لڑکے کو تو اپنے بھائی بھاوج کے پاس چھوڑا اور خود ہمارے پاس رہنے لگی تھی۔ پھر جب عابدہ نے انتقال کیا تو سلیمہ کی پرورش زیادہ تر اسی نے کی تھی۔ اس لحاظ سے میں اس کا بڑا احسان مند تھا چنانچہ میں ہمیشہ اس سے نرمی کا سلوک کیا کرتا تھا۔ اس کی تیس سال ملازمت کے دوران مجھے کبھی اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اسے نہ تو چوری کی عادت تھی نہ جھوٹ بولنے کی۔ اسے سلیمہ سے بڑی محبت تھی چنانچہ جب شادی کے بعد ہم نے اسے رخصت کیا تو تحسین بوا ایسے پھوٹ پھوٹ کر روئی جیسے یہ اس کی اپنی لخت جگر ہو۔ پھر جب تک اس کے اپنے لڑکے کی شادی نہ ہوئی وہ ہمارے گھر میں رہتی رہی۔ لڑکے کی شادی کے بعد البتہ وہ میری اجازت سے رات کو بیٹے کے پاس چلی جاتی کیونکہ بیٹا اپنی بیوی کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ تحسین بوا کی ایک بات اور بھی تھی وہ یہ کہ اس سے پہلے اس نے مجھ سے کبھی کوئی درخواست نہیں کی تھی اور یہ درخواست بھی اس نے مجبوری کے عالم میں اور مجھ پر پورا بھروسہ کر کے کی تھی چنانچہ اس کا دل توڑنا میرے لئے بہت مشکل ہو گیا۔

اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا کہ شاید تحسین بوا کو اس لڑکی کا کھانا وغیرہ بھی پکانا پڑتا ہو اور اس طرح اسے کچھ مالی فائدہ پہنچنے کی امید ہو مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اس خیال کو دل سے نکال دیا کیونکہ تحسین بوا لالچی ہرگز نہ تھی۔ تاہم میں نے تھوڑی سی مدافعت اور کی مگر بالآخر میں نے تحسین بوا کے آگے ہتھیار ڈال ہی دیئے۔

اگلے روز کوئی عام تعطیل تھی۔ اسکول اور دفاتر بند تھے۔ میں ابھی اپنی خواب گاہ ہی میں تھا کہ برآمدے اور بڑے کمرے میں تیز اور سبک قدموں کی آواز سن کر مجھے احساس ہوا کہ گھر میں کوئی تیسرا آدمی بھی موجود ہے۔ میری بچی کا کمرہ جو اس کی شادی کے بعد سے اب تک بند پڑا تھا کھلوایا اور صاف کرایا گیا۔ یہ کمرہ بنگلے کے سامنے کے رخ ایک گوشے میں تھا۔ یہاں سے باغیچے کا منظر اور بنگلے کا پھاٹک نظر آتا تھا۔ میرا کمرہ بنگلے کے دوسرے گوشے میں تھا۔ ان دونوں کمروں کے درمیان وسیع برآمدہ تھا جس سے ملحق ایک بڑا کمرہ تھا جو بیک وقت ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم دونوں کا کام دیتا تھا۔ اس کے برابر میں ایک اور بیڈ روم تھا جسے میں نے لائبریری میں تبدیل کر لیا تھا۔ یہ یک منزلہ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا مگر میری آسائشوں کے لئے کافی تھا۔

تھوڑی دیر بعد میرے کمرے کے دروازے پر دستک کے ساتھ تحسین بوا کی آواز سنائی دی:

”ناشتہ تیار ہے سرکار۔“

اور پھر جب میں ڈائننگ روم میں ناشتہ کر رہا تھا تو بوڑھی ماما نے مسکراتے ہوئے کہا:

"روحی آگئی ہے سرکار۔ کیا آپ اسے دیکھنا پسند کریں گے؟"

"نہیں نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "آج نہیں۔ پھر کبھی دیکھا جائے گا۔"

تو اس لڑکی کا نام روحی ہے! میں نے دل میں کہا۔

میں دن بھر حسبِ معمول اپنے مشاغل میں مصروف رہا اور وہ لڑکی بھی دن بھر اپنے کمرے ہی میں بند رہی۔ کھانا بھی اس نے اپنے کمرے ہی میں کھایا۔ اگلے روز میں صبح جلدی بیدار ہو گیا تا کہ جب وہ اسکول جانے لگے تو میں کھڑکی کے پردے کے پیچھے سے اس کی ایک جھلک دیکھ سکوں۔ میرے دوست شاید تم میری اس بات پر ہنسو لیکن یہ محض ایک انسانی جذبہ تھا جسے تجسس نے خود بخود میرے دل میں پیدا کر دیا تھا۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ ایک دبلی پتلی لمبے قد کی لڑکی سفید رنگ کی قمیض پہنے دوپٹہ اوڑھے، ہاتھ میں سیاہ چرمی بیگ لیے جلد جلد قدم اٹھاتی باغیچے سے گذری اور پھاٹک کا چھوٹا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ میں اس کی شکل صورت بالکل نہ دیکھ پایا۔

اسی روز سہ پہر کو جب نصیبن بوا چائے کی ٹرے لے کر لائبریری میں آئی جہاں میں عموماً چائے پیا کرتا تھا تو وہ بڑی خوش معلوم ہوتی تھی۔ کہنے لگی:

"خدا حضور کو سلامت رکھے۔ روحی یہاں بہت خوش ہے۔ اسے بہت آرام ملا ہے۔ یہ بنگلہ اس کے اسکول سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں۔ رکشا ٹیکسی آسانی سے مل جاتی ہے اور نہ ملے تو پیدل بھی آ جا سکتی ہے۔"

ایک ہفتہ گذر گیا۔ اس کے دوران میں میرا اور روحی کا آمنا سامنا نہ ہو سکا۔ دو ایک مرتبہ اور میں نے صبح اٹھ کر اپنے کمرے سے اس کو اسکول جاتے ہوئے دیکھا مگر مجھے اس کی صرف پشت ہی دکھائی دی، صورت نہ دیکھ سکا۔

یہ بھی کوئی چھٹی ہی کا دن تھا جب میں اپنی لائبریری میں گیا تو وہاں اس لڑکی کو پایا۔ وہ شیلفوں میں رکھی ہوئی کتابوں کو بڑی اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میرے اچانک وہاں آ جانے سے وہ ایک دم گھبرا سی گئی، اور سر پر اپنے دوپٹے کو درست کرنے لگی۔

"سر" اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔ "معافی چاہتی ہوں کہ آپ کی اجازت کے بغیر آپ کی لائبریری میں آ گئی، ویسے بڑی بی نے مجھے اجازت دے دی تھی اور کہا تھا کہ میں خود صاحب سے

اجازت لے لوں گی۔ شاید وہ آپ سے کہنا بھول گئیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس میں بعض شیلف مقفل ہیں جن میں قلمی کتابیں یا نایاب نسخے ہیں۔ باقی شیلف کھلے ہیں، ان میں سے آپ جو بھی کتاب چاہیں نکال کر پڑھ سکتی ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ!"

آج جب پہلی مرتبہ میں نے اس کی صورت دیکھی تو پتا چلا۔ مجھے احساس ہوا کہ نصیبن بوا نے یقیناً ایک بات مجھ سے چھپائی تھی وہ یہ کہ یہ لڑکی غیر معمولی طور پر حسین تھی۔ اس کے خدوخال میں بلا کی جاذبیت تھی۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی اور لہجہ شائستہ۔ گفتگو کے دوران اس نے اپنی نظریں جھکائے رکھی تھیں۔

"آپ کس قسم کی کتابیں پڑھتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"سر مجھے فرانسیسی ادب سے خاص طور پر دلچسپی ہے اور کسی قدر انگریزی شاعری سے بھی۔ کالج کے زمانے ہی سے مجھے ادب کے مطالعے کا شوق پیدا ہو گیا تھا مگر ابا جان کے انتقال پر مجھے کالج چھوڑ دینا پڑا اور نوکری تلاش کرنی پڑی۔ امی جان کو پہلے ہی کئی سال ہوئے انتقال ہو چکا تھا۔۔۔"

میں نے اس ناخوشگوار موضوع کو بدلنے کے لیے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کو فرانسیسی ادب میں کون سی کتاب سب سے اچھی لگی؟"

"سر مجھے فلوبیر کی 'مادام بواری' بہت پسند ہے۔ اس کو انگریزی میں پڑھنے کے بعد میں نے کالج میں فرانسیسی زبان کو بھی ایک مضمون کے طور پر لے لیا تھا اور فرانسیسی سے کچھ شد بد بھی ہو گئی تھی۔"

میں نے کہا: "میرے کتب خانے میں فلوبیر کی قریب قریب تمام کتابیں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں بالزاک، زولا، وکٹر ہیوگو، موپاساں کی بھی متعدد کتابیں ہیں۔ روسی مصنفین میں آپ کو ترگنیف، ٹالسٹائی، دوستوئفسکی، چیخوف اور گورکی کی کتابیں ملیں گی۔"

جب میں یہ نام گنوا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ہر نام پر روحی کی آنکھیں چمک چمک اٹھتی تھیں۔

"سر۔ کیا مجھے ان کتابوں کو پڑھنے کی اجازت ہوگی؟"

"ہاں۔ کیوں نہیں۔"

"اپنے ساتھ اسکول لے جانے کی بھی؟ مجھے وہاں ہر روز کوئی نہ کوئی پیریڈ خالی مل جاتا

ہے۔ میں کتابوں کو بڑی حفاظت سے پڑھتی ہوں۔ میں ان پر اخباری کاغذ چڑھا لیتی ہوں تا کہ ہر ورق میلا نہ ہونے پائے۔"

"آپ کو جس کتاب کی ضرورت ہو بے تکلف الماری سے نکال کر لے جا سکتی ہیں۔"

"تھینک یو سر۔"

اس ملاقات کے بعد کوئی آٹھ دس روز تک میں اس سے دوبارہ نہیں مل سکا۔ البتہ جب وہ اسکول چلی جاتی تو میں لائبریری میں جا کر دیکھتا کہ وہ کون سی کتاب اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ اس نے پہلے تو شولوخوف کی "کنواری زمین" کے دونوں حصے پڑھے اور اس کے بعد دوستوئفسکی کی "احمق" کا مطالعہ شروع کیا۔ میں یہ بھی دیکھتا کہ ہر روز رات کو اس کے کمرے کی بتی دیر تک روشن رہتی ہے۔

ایک دن سہ پہر کو میں اپنے باغیچے میں ٹہل رہا تھا جس کو خدا بخش نے خاصا سرسبز بنا رکھا تھا کہ اتنے میں ایک ٹیکسی بنگلے کے پھاٹک پر رکی۔ روحی بنگلے میں داخل ہوئی۔ پل بھر کے لئے ہماری نظریں ملیں پھر جھٹ اس نے اپنی نظریں نیچی کر لیں اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں تھوڑی دیر تک اور باغیچے میں ٹہلتا رہا، پھر لائبریری میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ پہلے سے وہاں موجود ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"سر،" اس نے کہا، "میں آپ کی نوازشوں سے کچھ زیادہ ہی فائدہ اٹھانے لگی ہوں۔ آپ مجھے باعث زحمت تو نہ سمجھتے ہوں گے!"

میں نے کہا: "ہرگز نہیں۔ کوئی ادب سے دلچسپی رکھتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے، پھر آپ کے ذوق و شوق پر تو مجھے اور بھی مسرت ہے۔"

"سر، میرا جی چاہتا ہے کہ کبھی کبھی زیر مطالعہ کتاب کے بارے میں آپ کی رہنمائی بھی حاصل کروں۔ بعض دفعہ کتاب پڑھ کر دل میں طرح طرح کے سوال پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب مجھے نہیں سوجھتا۔ مثال کے طور پر دوستوئفسکی کے ناول "احمق" میں پرنس مشکن کے کردار نے مجھے خاصا الجھن میں ڈال دیا ہے۔ یہ شخص بیک وقت دیوانہ بھی ہے اور فرزانہ بھی۔ دنیاوی معاملات سے لاتعلق بھی ہے اور دنیاداری کا خواہش مند بھی۔ محبت کا جذبہ اس کے دل میں بڑی شدت سے ابھرتا ہے مگر اپنی ناکامی پر اسے کوئی خاص افسوس بھی نہیں ہوتا بلکہ اپنے رقیب تک سے بڑی دردمندی سے باتیں کرتا ہے جس نے اس کی اور اپنی دونوں کی محبوبہ کو قتل کر دیا ہے۔ کیا دنیا میں سچ مچ ایسے لوگ ہوتے ہیں؟"

جس وقت وہ یہ کہہ رہی تھی تو بیچ بیچ میں رک رک بھی جاتی تھی جیسے سوچ سوچ کے کہہ رہی ہو۔

میں نے کہا: "دوستوئفسکی نے یہ بڑا الجھا ہوا کردار اختراع کیا ہے۔ ایسے لوگ اس دنیا میں شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ دراصل اس نے پرنس مشکن کے روپ میں انسان کامل کا ایک نمونہ پیش کیا ہے اور تمام اعلیٰ و ارفع صفات اس کی ذات میں جمع کر دی ہیں۔ جیسے سچ بولنا، صاف دل ہونا، انسان کی بھلائی چاہنا، اس سے محبت کرنا، اس کی خطاؤں کو بخش دینا، مال و زر اور عزت و جاہ سے بے نیاز ہونا وغیرہ۔ وہ بظاہر سادہ لوح نظر آتا ہے مگر کوئی اسے بیوقوف نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ وہ لوگوں کے دلوں کا حال جانتا ہے۔ اس کردار کا المیہ یہ ہے کہ ایسے انسان کامل کو بھی آخر میں ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔"

روحی بظاہر اس کا جواب سے مطمئن معلوم ہوتی تھی۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

"سر دوستوئفسکی کی ناول نگاری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

میں نے کہا: "میں اسے دنیا کا عظیم ترین ناول نگار سمجھتا ہوں۔ اگر دنیا کے سات بہترین ناول چنے جائیں تو ان میں سے تین بلاشبہ دوستوئفسکی ہی کے ہوں گے اور ان تینوں میں "احمق" ضرور شامل ہوگا۔ اس کے ناولوں کے بارے میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ وہ بہت جلدی میں لکھے گئے اور ان پر مصنف کو زیادہ غور و خوض کا موقع بھی نہیں ملا۔ ایک مرتبہ تو وہ قرضوں کے بوجھ تلے ایسا دب گیا کہ اس کے جیل جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا چنانچہ اس صورت حال سے بچنے کے لئے اسے ایک ناشر سے ایک ماہ میں ایک نیا ضخیم ناول لکھ دینے کا معاہدہ کرنا پڑا۔ اس کام کے سلسلے میں شارٹ ہینڈ جاننے والی لڑکی کی خدمت حاصل کی گئیں۔ بس پھر کیا تھا وہ تیزی سے بولتا جاتا تھا اور وہ لڑکی شارٹ ہینڈ میں لکھتی جاتی تھی اور یوں ایک مہینے کے بجائے چھبیس ہی دن میں یہ ناول مکمل کر لیا گیا۔ اس واقعہ کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جب یہ ناول تخلیق ہو رہا تھا تو اسی دوران میں دوستوئفسکی اور اس لڑکی میں جو اس سے عمر میں پچیس برس چھوٹی تھی قلبی رشتہ استوار ہو گیا اور انہوں نے جلد ہی شادی کر لی۔"

روحی میری باتوں کو بہت غور سے سن رہی تھی۔ میرے آخری جملے پر وہ ذرا ٹھٹکی۔ پل بھر کے لئے اس کے ہونٹوں پر ایک لطیف تبسم نمودار ہوا اور وہ "تھینک یو سر" کہہ کے لائبریری سے چلی گئی۔

رفتہ رفتہ اب ہم میں باہمی حجاب اٹھنے لگا تھا۔ میں اب اس سے "آپ" کے بجائے "تم" کہہ کے مخاطب ہونے لگا تھا۔ اگرچہ وہ ہمیشہ مجھے "سر" ہی کہا کرتی۔ ہم اکثر لائبریری میں یا کبھی باغیچے میں ادب، شاعری، موسیقی اور مصوری پر گفتگو کیا کرتے۔ ہر چند روحی کو موسیقی اور مصوری سے کوئی عملی

دلچسپی نہ تھی مگر وہ اچھے کلاسیکل گانوں کے ریکارڈ بہت شوق سے سنا کرتی اور دنیا کے نامی گرامی مصوروں کی تصاویر کو غور سے دیکھتی۔ میں ان فنون کی باریکیاں بیان کرتا تو وہ میری باتوں کو ایسی توجہ سے سنتی گویا ایک ایک نکتے کو اپنے دل میں اتار لینا چاہتی ہے۔

میرے دوست! تم تصور کر سکتے ہو کہ جس شخص نے تیس برس تک کسی عورت کے جسم کو چھوا تک نہ ہو وہ ہر روز ایک خوش شکل، خوش ذوق، ذہین، شائستہ خاتون کو اس قدر قریب سے دیکھتا ہو کہ بعض دفعہ تصاویر کو دیکھنے یا کسی کتاب کی عبارت کو مل کر پڑھنے کے دوران چہروں کے درمیان صرف انچ کا فاصلہ رہ جاتا ہو تو اس کے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔ میری تنہائی کی زندگی میں اس لڑکی کا آنا ایسا تھا جیسے کوئی کسی پرانے تالاب میں پتھر پھینک دے اور اس میں بھنور پڑنے لگیں۔

اس طرح دو مہینے گذر گئے!

ایک دن جب روشی اسکول کو روانہ ہوئی تو نصیبن بوا میرے پاس آئی اور بڑے گمبھیر لہجے میں کہنے لگی: "صاحب۔ روشی کو ہمارے پاس رہتے ہوئے دو مہینے گذر چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب اسے کوئی اور ٹھکانہ دیکھنا چاہئے ورنہ میں آپ کی نظروں میں جھوٹی بن جاؤں گی۔"

میں ششدر رہ گیا۔

"میں سمجھتی ہوں۔" وہ پھر بولی۔ "اس کے لئے سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ کسی شریف مرد کو دیکھ کر اس سے شادی کر لے مگر مصیبت یہ ہے کہ اسے مردوں سے کوئی خاص دلچسپی ہی معلوم نہیں ہوتی یا یہ کہ ابھی تک کوئی مرد اس کی نظروں میں جچا ہی نہیں۔"

میں نے کہا: "نصیبن بوا! جہاں تک اس کے یہاں رہنے کا تعلق ہے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں، کیونکہ شروع شروع میں اس کے متعلق جو اندیشے پیدا ہوئے تھے وہ سب بے بنیاد ثابت ہوئے۔ وہ واقعی بہت شریف سیدھی سادی لڑکی ہے۔ رہا اس کی شادی کا معاملہ تو اس میں نہ تم اس کی مدد کر سکتی ہو نہ میں۔ اس لئے میری رائے میں جب تک اس کی رہائش کا کوئی مناسب انتظام نہ ہو جائے وہ یہیں رہ سکتی ہے۔"

یہ سن کر نصیبن بوا کچھ دیر تک کھوئی کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ معاملے کے اس پہلو کی طرف میرا ابھی دھیان ہی نہیں گیا تھا، جیسے کوئی سہانا خواب دیکھنے میں محو ہو اور اچانک اس کی آنکھ کھل جائے۔

دو تین روز کے بعد نصیبن بوا پھر میرے پاس آئی اور کہنے لگی:

"صاحب۔ روشی بی بی نے خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ آئندہ دونوں وقت کا کھانا اور شام کی چائے خود آپ کو دیا کرے۔ ناشتہ اس لئے نہیں کہ اسے صبح ہی صبح اسکول جانا ہوتا ہے اور صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ اب میں خود بھی بہت بوڑھی ہو گئی ہوں۔ زیادہ کام کی مجھ میں ہمت نہیں رہی۔ میں دونوں وقت کھانا تیار کر دوں تو یہ بھی بڑی بات ہے۔"

میں نے کہا: "نصیبن بوا! اگر تمہاری اور اس لڑکی کی یہی مرضی ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

نصیبن بوا مجھے دعائیں دیتی ہوئی خوش خوش چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دل میں کہا روشی بہت خوددار لڑکی ہے۔ شروع شروع میں جب اس نے نصیبن بوا کے ذریعے کرائے اور کھانے پینے کے خرچ کے سلسلے میں کچھ رقم پیش کرنی چاہی تھی تو میں نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ تو ایک عارضی رہائش ہے۔ اس عرصے کے لئے اس کی حیثیت اس گھر میں ایک مہمان کی سی ہوگی مگر اب جب نصیبن بوا نے اس سے میری اور اپنی تنہا زندگی کا ذکر کر دیا ہوگا تو اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا ہوگا کہ وہ آئندہ بھی یہاں مفت ہی رہے اور مفت ہی کھائے پیئے لہٰذا اس کے بدلے میں اس نے اپنی خدمات پیش کی ہوں گی۔ بہرحال صورت حال کچھ بھی ہو میں نے اس نئے انتظام کو اپنے لئے ایک خوشگوار تبدیلی تصور کیا۔

میرے دوست! مجھے اعتراف ہے کہ جب سے روشی اس گھر میں آئی تھی میرے معمولات رفتہ رفتہ بدلتے جا رہے تھے۔ میں نے ہر وقت آرام کرسی پر بیٹھے کتاب پڑھتے رہنے یا موسیقی سنتے رہنے کی عادت کو بڑی حد تک ترک کر دیا تھا۔ میں اب اکثر اپنے چھوٹے سے باغیچے میں پھولوں اور پودوں کی نشوونما میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ میں پودوں کی سوکھی پتیوں کو اپنے ہاتھ سے نوچ نوچ کر الگ کرتا۔ میں خدا بخش کو نئے نئے پھول اگانے، کیاریوں میں تبدیلیاں کرنے، پودوں کو جھاڑ جھنکار سے صاف کرنے کی ہدایتیں دیتا۔ غرض آرام طلبی کی زندگی چھوڑ کر کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا ولولہ سا میرے دل میں اٹھنے لگا۔

اس میں شک نہیں کہ روشی کے غیر معمولی حسن و جمال، اس کے متناسب اعضا، اس کی جوانی اس کی مشرقی شرم و حیا اس کی ذہانت، اس کی سلیقہ مندی کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا تھا۔ مجھے اس سے جو لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس جذبے کو کیا نام دوں۔ اس زمانے میں میری جو کیفیت تھی اسے میں تمہاری دلچسپی کے لئے عقل و دل

کے ایک مکالمے کی صورت میں لکھتا ہوں:

عقل: بڑے میاں! اتم عمر کے جس حصے سے گزر رہے ہو اس میں احتیاط کی بے حد ضرورت ہے۔

دل: کیوں نہیں۔ پوری احتیاط برت رہا ہوں۔

عقل: تو پھر تمہارے معمول زندگی میں فرق کیوں آ گیا ہے؟ یا تو تم آٹھ آٹھ دن تک ڈاڑھی نہیں مونڈتے تھے یا اب ہر روز بلا ناغہ شیو کرنے لگے۔ اب تم پہلے سے کہیں زیادہ وقت نہانے دھونے میں صرف کرتے ہو۔ ہر وقت صاف ستھرے رہتے ہو۔ دن میں دو دو مرتبہ لباس تبدیل کرتے ہو۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

دل: کوئی خاص وجہ نہیں۔ انسان پر طرح طرح کے دور آتے رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی میری زندگی کا ایک دور ہے

عقل: اور یہ آئینے کے سامنے دیر دیر تک کھڑے اپنی صورت کیوں دیکھتے رہتے ہو؟

دل: میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا میں شکل صورت سے بھی اتنا ہی بوڑھا لگتا ہوں جتنا کہ عمر کے لحاظ سے ہوں۔

عقل: آخر یہ معلوم کرنے کی کوئی وجہ؟ دیکھو بڑے میاں خود کو دھوکا نہ دو۔ اصل بات یہ ہے کہ روحی تمہارے دل کو بھا گئی ہے اور یہ کوئی عجیب بات بھی نہیں کیونکہ مردوں کو اکثر بڑھاپے میں جوان لڑکیوں سے عشق ہو جاتا ہے۔

دل: نہیں، یہ بات نہیں۔ سچ یہ ہے کہ مجھے اس لڑکی کی بے کسی پر اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے جیسے اپنے کسی عزیز یا دوست سے پیدا ہو جاتی ہے۔

عقل: نہیں، یہ ہمدردی نہیں۔ اس کا نام ہے محبت، لگاوٹ! اتم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ تمہاری اور روحی کی عمروں میں کتنا فرق ہے؟ چھتیس سال کا۔ بڑے میاں چھتیس سال کا! اور یہ اتنی طویل مدت ہے کہ اس میں اپنی اولاد خود بڑی ہو کر صاحب اولاد بن جاتی ہے۔ اور پھر تم نے یہ بھی سوچا کہ تمہارے متعلق فریق ثانی کا کیا خیال ہے؟ یہ سچ ہے کہ روحی تمہارا بڑا احترام کرتی ہے، ہمیشہ نظریں جھکا کر تم سے بات کرتی ہے۔ ممکن ہے وہ تم کو ایک نیک شریف بزرگ یا شاید اپنا باپ سمجھ کر ایسا کرتی ہو۔ اکثر لڑکیاں جو باپ کی شفقت سے محروم ہو جاتی ہیں ان میں انسیت کا یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جسے یہ بوڑھے لگاوٹ تصور کر لیتے ہیں مگر جب ان پر لڑکی کے اصلی جذبات عیاں ہوتے ہیں تو انھیں ایک

دھچکے کے ساتھ اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔

اور حضرت دل سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔

پیارے دوست! اس مکالمے سے تمھیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس زمانے میں میرے دل پر کیا گزر رہی تھی۔ بے شک میں روحی کو والہانہ طور پر چاہنے لگا تھا۔ لیکن میں نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ میں کسی اشارے کنائے سے بھی روحی پر یہ بات ظاہر نہ ہونے دوں گا۔ روحی کے آنے سے پہلے میں بڑی پرسکون زندگی بسر کر رہا تھا۔ شعر و ادب، موسیقی، مصوری، میرے یہ مشاغل مجھے اپنی تنہائی کا احساس ہی نہ ہونے دیتے تھے اور میں اپنی زندگی سے پورے طور پر مطمئن تھا مگر جب سے روحی سے مجھے وابستگی پیدا ہوئی تھی، ان مشاغل سے میری طبیعت اچاٹ سی ہو گئی تھی۔ بس ایک خیال تھا جو میرے دماغ پر مسلط ہو گیا تھا وہ یہ کہ میں تنہا ہوں، میں تنہا ہوں۔ مجھے برسوں پہلے کسی ایسے مونس کو تلاش کر لینا چاہیے تھا جس سے اپنے دل کی بات کہہ سکتا، جو میرے دکھ درد میں شریک ہوتا، جس کی موانست میرے لئے راحت جاں ہوتی۔

جب سے روحی نے مجھے کھانا وغیرہ کھلانے کی خدمت اپنے ذمے لی تھی میں اسکول سے واپس آنے سے گھنٹوں پہلے اس کا منتظر رہنے لگا تھا، اور آخر جب وہ بنگلے میں داخل ہوتی تو میرے کان دور ہی سے اس کے سبک قدموں کی آواز کو سن لیتے۔ میں دل ہی دل میں تصور کرنے لگتا کہ اب وہ اپنے کمرے میں پہنچی ہوگی۔ اب اس نے اپنا بیگ میز پر رکھا ہوگا۔ اب اس نے لباس تبدیل کیا ہوگا۔ اب وہ باورچی خانے میں گئی ہوگی۔ اب اس نے سکھن بوا سے پوچھا ہوگا کہ کھانا تیار ہے۔ اب وہ میز پر کھانا چن رہی ہوگی۔ اب وہ میرے کمرے کی طرف چل ہوگی۔ اب وہ دروازے پر دستک دے گی۔ "سر کھانا کھا لیجئے۔" میرے اندازے میں صرف ایک آدھ منٹ ہی کا فرق ہوتا تھا۔ میں جب تک کھانا کھاتا رہتا وہ میرے آس پاس کھڑی رہتی۔ ایک دو مرتبہ میں نے اس سے کہا بھی

"روحی! تم بھی میرے ساتھ ہی کیوں نہیں کھانا کھا لیا کرتیں۔ اسکول سے آ کر تمھیں بھوک لگی ہوگی۔" مگر اس نے انکار کر دیا۔

"نہیں سر! مجھے اسکول سے آ کر فوراً بھوک نہیں لگتی۔ آپ پہلے کھانا کھا لیجئے میں بعد میں کھا لوں گی۔"

رات کا کھانا بھی وہ خود ہی میز پر چنتی مگر میرے اصرار کے باوجود وہ کھانے میں شریک نہ ہوتی۔ البتہ سہ پہر کی چائے ہم دونوں ایک ساتھ ہی پیتے، اور یہی وقت ہوتا تھا گفتگو کرنے کا۔ ہم کئی

شعر و ادب کی باتیں کرتے، کبھی پھول پودوں کی، کبھی موسموں کی تبدیلیوں کی۔ میں اکثر بیچ بیچ میں خاموش ہو جاتا اور وہ حیرانی سے میرے جواب کا انتظار میں میرا منہ تکتی رہتی۔ میں جلد ہی ہوش میں آجاتا اور اپنے کو لعن طعن کرتا کہ میں نے ایسا کیوں کیا، کیونکہ میں کسی طور بھی روحی کو اپنی حالت زار سے واقف ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

اسی طرح ایک مہینہ اور گذر گیا۔

اس دوران میں میری حالت پہلے سے بھی ابتر ہوگئی۔ میری صحت روز بروز گرنے لگی۔ مجھے کھانے پینے سے کچھ رغبت نہ رہی۔ دل ہر وقت بے چین رہنے لگا۔ راتوں کو دیر دیر تک جاگتا رہتا اور جب نیند آتی تو سوتے سوتے چونک اٹھتا مگر میں نے روحی کو اپنی حالت سے کسی طرح خبردار نہ ہونے دیا۔ وہ میری کم خوری کی شکایت کرتی تو میں بدہضمی یا کوئی اور بہانہ کر کے ٹال دیا کرتا۔

کبھی کبھی مجھے اپنے پر غصہ بھی آتا کہ یہ مصیبت میں نے خود اپنے ہاتھوں مول لی ہے۔ مجھے نصیبن بوا کی بات پر کان نہیں دھرنا چاہئے تھا مجھے بڑی سختی کے ساتھ صاف صاف اس سے کہہ دینا چاہئے تھا کہ بڑی بی جو تم چاہتی ہو یہ ممکن ہی نہیں۔ وہ شاید کچھ ٹسوے بہاتی یا شاید کچھ دنوں چپ چپ رہتی یا شاید نوکری ہی چھوڑ دیتی۔ میں یہ سب کچھ سہہ لیتا مگر روحی اس گھر میں نہ آنے پاتی اور میں اس مصیبت میں گرفتار نہ ہوتا۔

اپنی اس محرومی و مایوسی کی زندگی میں اچانک ایک نیا جذبہ میرے دل میں پیدا ہونا شروع ہوا اور یہ تھا غم کھانے کی لذت کا جذبہ۔ اس لذت نے جلد ہی ایک نشے کی سی صورت اختیار کر لی۔ اپنی پرسکون زندگی میں میں شاید دس پندرہ سال اور زندہ رہتا۔ یہاں تک کہ موت آکر مجھے ہمیشہ کی نیند سلا دیتی مگر یہ کیسی حسرت و افسوس کی بات ہوتی کہ میں اس لذت غم سے ہمیشہ نا آشنا ہی رہتا۔ میری یہ محرومی و مایوسی کی زندگی، میری گذشتہ پرسکون زندگی سے اس لحاظ سے بہتر تھی، کہ ہر چند ناکام ہی سہی مگر دل میں تمنائیں تو پیدا ہوتی ہیں، ولولے تو اٹھتے ہیں اپنی حرماں نصیبی سے یوں سمجھوتہ کر لینے کے بعد میرے دل کی بے کلی بڑی حد تک دور ہوگئی اور میں نے اسے اپنا مقدر سمجھ کر تسلیم کر لیا۔

اب جاڑوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ موسلا دھار بارش جو ہوئی تو اس کے تھمتے ہی سردی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اسی زمانے میں ایک رات میں اپنی خواب گاہ میں سو رہا تھا کہ کوئی تین بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ غسل خانے میں گیا مگر بے احتیاطی سے خود کو کسی گرم چادر میں نہیں لپیٹا۔ گرم گرم لحاف سے نکلا تھا، اچانک ہوا لگ گئی۔ پلنگ پر واپس آیا تو میری آنکھوں سے پانی جاری تھا۔ سانس

کچھ پھولا ہوا تھا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے پانچ چھ چھینکیں آئیں۔ میں نے لحاف میں سر کو چھپایا مگر اس سے اور دم گھٹنے لگا۔ منہ باہر نکالا تو آنکھوں کے ساتھ ناک سے بھی پانی بہنے لگا۔ حتیٰ کہ صبح ہوتے ہوتے سانس لینا دشوار ہو گیا مگر میں نے جیسے تیسے رات کا باقی حصہ کاٹ ہی دیا۔

صبح کو نصیبن بوا آئی تو میری یہ حالت دیکھ کر بہت گھبرائی، دوڑی دوڑی جا کر روحی کو بلا لائی۔ وہ بھی مجھے اس حال میں دیکھ کر سخت پریشان ہوئی۔ اس نے اسی وقت برقعہ اوڑھا اور گھر سے نکل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ شہر کے ایک مشہور ڈاکٹر کو لے کر آ گئی۔ ڈاکٹر نے میری نبض دیکھی، میرے سینے کا معائنہ کیا اور فوراً ایک انجکشن لگایا۔ کہا "معلوم ہوتا ہے انہیں سخت نمونیہ ہو گیا ہے۔ بہت احتیاط کرنی ہوگی۔ دیکھ بھال کے لئے ایک نرس کی بھی ضرورت ہوگی۔۔۔۔"

روحی فوراً بول اٹھی "میں خود ان کی نرسنگ کروں گی۔ میں نے کالج کے زمانے میں نرسنگ کا ابتدائی کورس بھی پاس کر لیا تھا۔ میں ٹیکہ لگانا بھی جانتی ہوں۔"

میں اس وقت تیز بخار میں پلنگ پر پڑا تھا۔ مجھ پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ میں سب کچھ سن رہا تھا مگر مجھ میں بولنے کا یارا نہ تھا۔

ڈاکٹر نے کئی دوائیں اور انجکشن تجویز کئے جنہیں لانے کے لئے روحی ڈاکٹر کے ہمراہ ہی چلی گئی۔ اس دن وہ اسکول نہیں گئی۔

پیارے دوست! اس قصے کو کہاں تک طول دوں۔ مختصر یہ کہ میں کوئی دو ہفتے تک بستر پر پڑا رہا۔ اس دوران میں روحی نے دل و جان سے میری تیمارداری کی۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت میرے ہی کمرے میں گذارتی، وقت پر مجھے دوائیں پلاتی،

اور بڑی احتیاط سے انجکشن لگاتی تاکہ مجھے کم سے کم تکلیف ہو۔ اس نے اسکول سے دو ہفتوں کی چھٹی لے لی تھی۔ سچ یہ ہے کہ یہ اس کی خدمت گذاری ہی تھی جس نے اس مہلک مرض سے میری جان بچائی۔

بیماری کے دوران میں جب مجھے کچھ کچھ افاقہ ہونے لگا تو جب کبھی میں اس کی طرف دیکھتا، اس کے ہونٹوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ نمودار ہوتی جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسکراہٹ دواؤں سے کہیں زیادہ زود اثر ثابت ہوئی اور میں جلد جلد اچھا ہونے لگا۔

اگرچہ اب میں غسل خانے میں خود اٹھ کر جانے لگا تھا مگر میری کمزوری کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے دو تین دن تک اور بستر پر آرام کرنے کی ہدایت کی تھی۔

ایک دن شام کو روحی میری دوائیں وغیرہ خریدنے بازار گئی تو مجھے بستر پر لیٹے لیٹے وحشت سی ہونے لگی۔ میں بستر سے اٹھا اور چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ گھر میں ادھر ادھر چلنے پھرنے لگا۔ میں لائبریری میں بھی گیا جہاں پچھلے چند روز سے میں نے قدم نہیں رکھا تھا۔ میں شیلفوں پر نظر ڈال رہا تھا کہ لائبریری کی بڑی میز پر مجھے سیاہ رنگ کی ایک کتاب نظر آئی۔ یقیناً میری لائبریری کی کوئی کتاب اس سے ملتی جلتی نہ تھی۔ بلاشبہ یہ کتاب روحی ہی کی ہو سکتی ہے۔ میں اسے میز سے اٹھا کر اس کے ورق الٹنے لگا۔ یہ روحی کی ڈائری تھی جس میں وہ روزمرہ کے واقعات پر اپنے تاثرات لکھا کرتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے میری دوائیں لانے کی جلدی میں وہ اسے یہیں بھول گئی تھی۔

پیارے دوست! پہلے تو مجھے خیال آیا کہ اسے وہیں میز پر جوں کا توں رکھ دوں کیونکہ کسی کی پرائیویٹ تحریر کو پڑھنا سخت اخلاقی جرم ہے۔ لیکن میرے دل میں روحی کی محبت کا جوش بھڑک رہا تھا۔ اس نے مجھے اخلاقیات سے بے پروا بنا دیا۔ میں وہیں میز کے قریب کرسی پر بیٹھ کر اس کی ڈائری کے اوراق الٹنے پلٹنے لگا۔ بعض تاثرات میرے لئے موجب حیرت تھے۔ اس ڈائری کے چند اقتباسات یہاں درج کرتا ہوں:

خدا کا شکر ہے کہ آخر مجھے سر چھپانے کو جگہ مل گئی۔ اگر صاحب یوں میری مدد نہ کرتے تو میرا کیا حشر ہوتا۔ یہ سوچتے ہوئے بھی دل کانپنے لگتا۔

....

میں اس گھر میں کتنی خوش ہوں۔ صاحب کا کتب خانہ کتنا بڑا ہے! کیسی کیسی نادر کتابیں اس میں موجود ہیں جن کو پڑھنے کو میرا دل ترپتا ہے۔ صاحب نے کیسی فراخ دلی سے ان کتابوں کو پڑھنے کی اجازت دے دی ہے لیکن میں یہاں اپنی عارضی رہائش کے دوران آخر کتنی کتابیں پڑھ سکوں گی!

....

صاحب کتنے خوش اخلاق، شریف الطبع اور نیک نفس ہیں۔ ان کا مطالعہ کتنا وسیع ہے۔ انھوں نے کیسی خوبی سے ان الجھنوں کو دور کر دیا ہے جو دوستوفسکی کے ناول "احمق" کے پڑھنے سے میرے دل میں پیدا ہو گئی تھیں۔

....

وہ شارٹ ہینڈ جاننے والی لڑکی دوستوفسکی سے پچیس تیس سال چھوٹی تھی، پھر بھی وہ اس سے محبت کرنے لگی۔ کیا محبت کا تعلق عمر سے بھی ہوتا ہے؟ کیا صرف ہم عمر ہی ایک دوسرے سے محبت کر

سکتے ہیں۔؟

....

میں صاحب کی بیماری میں ان کی جو خدمت کر رہی ہوں یہ اس احسان کا بدلہ نہیں ہے جو صاحب نے اپنے ہاں پناہ دے کر مجھ پر کیا ہے۔ اس میں انسانی ہمدردی کو بھی کچھ زیادہ دخل نہیں ہے۔ تو کیا دوستوفسکی کی اس شارٹ ہینڈ جاننے والی لڑکی کی طرح میرے خیالات بھی ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں۔۔۔؟

....

میں نے ڈائری بند کر دی اور اسے اسی جگہ میز پر رکھ دیا جہاں سے میں نے اٹھایا تھا۔

اگلی صبح روحی کو نوکری پر اسکول جانا تھا کیونکہ اس کی دو ہفتے کی چھٹی ختم ہو چکی تھی۔ جب وہ مجھے دوا پلا کر جانے لگی تو میں نے دل کو مضبوط کر کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے کہا:

"اب تمھیں کبھی اسکول جانے کی ضرورت نہ ہوگی۔"

وہ پہلے تو کچھ دیر حیرانی سے میرا منہ تکتی رہی پھر رفتہ رفتہ اس کے ہونٹوں پر وہی دلآویز مسکراہٹ پھیلنے لگی جس کا مشاہدہ میں نے بیماری کے دوران میں کیا تھا۔

دو ماہ کے بعد ہماری شادی ہو گئی۔

دوست، یہ نہ سمجھنا کہ میں نے شادی سے پہلے اس کی ہر طرح رضامندی حاصل نہیں کر لی تھی۔ میں نے تو اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں اس سے عمر میں پچیس سال بڑا ہوں اور یہ کہ میری بیٹی عمر میں اس سے بھی کئی سال بڑی ہے۔

اس نے کہا:

"مرد کی عمر میں چھوٹا بڑا ہونا کوئی بات نہیں۔ سچی خوشی کی چند گھڑیاں، عمر بھر کی طویل بے کیف اور پر مصائب زندگی سے لاکھ درجہ بہتر ہیں۔"

ہم نے دو سال بڑی محبت و رفاقت میں گزارے۔ ہم شہروں شہروں گھومتے پھرے۔ اس دوران میں اس کا حسن پہلے سے بھی زیادہ نکھر آیا تھا اور میں پھر ایک بچی کا باپ بن گیا تھا۔

لیکن پیارے دوست! میری زندگی کا یہ عجیب المیہ ہے کہ ازدواجی زندگی مجھے راس نہیں اور میری قسمت میں ہمیشہ تنہا رہنا ہی لکھا ہے۔ ایک صبح روحی اچانک نہ جانے کس طرح ایک پر اسرار مرض وائرس کا شکار ہو گئی اور پھر چند ہی گھنٹوں میں میرے اور ڈاکٹروں کے دیکھتے دیکھتے اس نے دم توڑ دیا

موت کے وقت بھی اس کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص دلآویز مسکراہٹ تھی۔

جیسا کہ عابدہ کے مرنے پر میں نے اپنے ہاتھوں اپنا خاتمہ کر لینے کا ارادہ کیا تھا مگر سلیمہ کے خیال نے مجھے زندہ رہنے پر مجبور کیا تھا بالکل اسی طرح روحی کی موت پر بھی میرے دل میں زندہ رہنے کی کوئی تمنا نہ رہی تھی مگر ننھی یاسمین نے مجھے خودکشی کے خیال سے باز رکھا۔ وہ اس حادثے سے بے نیاز جو اس پر گذر رہا تھا ہنستی کھلکھلاتی میری گود میں آ کر بیٹھ گئی۔

روحی کی موت کو اب سات برس گذر چکے ہیں اور یاسمین جس کی عمر اب آٹھ برس ہے میرے دل کی راحت اور میری آنکھوں کا نور ہے۔

فقط

تمہارا۔۔۔۔

مجسمہ

بادشاہ اپنی حسین و جوان سال ملکہ کو دیوانہ وار چاہتا تھا۔ ملکہ دل ہی دل میں اس کی الفت پر ناز کرتی مگر فطرتاً وہ عورتوں کے اس مغرور و خود سر طبقے میں سے تھی جو دنیا میں کسی کو اپنی کمزوری سے باخبر کرنا اور اپنے تئیں اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا عورت کے وقار کے منافی سمجھتا ہے۔ وہ انسان تھی اور انسانوں کی طرح اس کے سینے میں بھی درد و محبت کا طوفان بار بار اٹھتا مگر اس کا جذبۂ خودداری اسے دبا لینے میں کامیاب ہو جاتا۔ جب وہ بادشاہ کو آتے دیکھتی تو اس کی نظریں فرط ادب سے جھک جاتیں۔ کان فرمان شاہی کے منتظر ہو جاتے۔ وہ تسلیم و اطاعت کا ایک پیکر بن جاتی تھی۔ بادشاہ اس چیز سے اکتا چکا تھا۔

جب وہ سلطنت کے کاروبار سے فارغ ہو کر تھکا ہارا محل میں آتا تو چاہتا کہ کوئی ایسا رفیق و دمساز ہو جو محبت کے میٹھے اور جاں نواز کلمات سے میرے دل کو تسکین دے۔ جو مجھے مخاطب کرنے کے میرے دل سے ہم کلام ہو۔ اس کے برعکس ملکہ کے پرتکلف ادبی اور محبت سے عاری الفاظ اس کے دل میں نشتر بن کر چبھ جاتے تھے۔

ایک مدت گذر گئی مگر ملکہ کے برتاؤ میں ذرا فرق نہ آیا۔ اس کی نگاہوں میں بادشاہ کا احترام جیسا پہلے تھا ویسا ہی اب بھی تھا۔ وہ اس کی خدمت گذاری میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتی تھی۔ مگر وہ کلمۂ محبت جسے

سننے کے لئے بادشاہ کے کان بے تاب رہتے تھے اس کے منہ سے کبھی نہ نکلتا۔ اتفاق سے اس عرصہ میں بادشاہ کے ہاں کوئی اولاد بھی نہ ہوئی۔ جو اپنی ماں کی سرد مہری کا نعم البدل بن جاتی۔ جسے پروان چڑھتے دیکھ کر بادشاہ کے دل میں امیدیں اور امنگیں پیدا ہوتیں اور پھلتی پھولتیں۔ بادشاہ روز بروز طلب زیست سے مایوس ہوتا جاتا تھا۔

ایک دن جب بادشاہ دربار جانے لگا تو ملکہ اس کے پاس آئی اور بڑے ہمدردانہ لہجہ میں کہنے لگی "عالیجاہ! آپ دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ کیا عجب دوسری عورت سے آپ کے ہاں اولاد ہو جائے جو آپ کے بعد تخت و تاج کی وارث بنے اور آپ کا نام قائم رکھے۔ میں آپ کو سچے دل سے اس کی اجازت دیتی ہوں۔ یقین جانیے سوت کے آنے سے میرے دل کا امن اور چین بحال رہے گا۔"

بادشاہ نے کسی قدر خشمگیں نظروں سے ملکہ کی طرف دیکھا اف یہ عورت احساسات سے کس درجہ خالی ہے۔ گوشت پوست کی نہیں پتھر کی بنی ہے۔ اور اس کے سینے میں دل بھی پتھر ہی کا ہے۔ بادشاہ نے نظریں دوسری طرف پھیر لیں اور محل سے باہر نکل گیا۔

تو کیا اس عورت کو سزا دینی چاہیے۔ اور اس التفات شاہانہ کا جس کی وہ تنہا مالک ہے کسی اور کو بھی حصہ دار بنا دینا چاہیے؟ بادشاہ دن بھر طرح طرح کے خیالوں میں پیچ و تاب کھاتا رہا اسے ملکہ سے بے حد الفت تھی ایسی الفت جیسی صرف شاعروں کا تخیل ہی تخلیق کر سکتا ہے۔ وہ اس قسم کے چاہنے والوں میں سے تھا جو محبوب کی ہر تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھ کر درد و کرب سے کراہتے ہیں۔ بادشاہ نے فیصلہ کر لیا کہ دوسری شادی نہ کروں گا۔

بادشاہ بے حد افسردہ اور ملول رہنے لگا۔ نہ کسی سے بات کرتا نہ کسی سے ملتا۔ اپنے ہی خیالوں میں کھویا رہتا۔ سلطنت کے کسی کام میں اس کا دل نہ لگتا۔ روز بروز رعایا کے سود و زیاں سے بے پروا ہوتا جاتا۔ عمائد سلطنت اس کی یہ حالت دیکھ کر کڑھتے مگر دم نہ مار سکتے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ کوئی غم بادشاہ کو اندر ہی اندر کھائے جاتا ہے مگر اس غم کا سبب پوچھنے کی انہیں جرات نہ ہوتی تھی۔ وہ اس کا دل بہلانے کے لئے اسے شکار کو لے جاتے۔ شمشیر زنی اور نبرد آزمائی کے اکھاڑے منعقد کراتے۔ دور دور کے باکمال سے باکمال مغنی بلائے۔ مہ رو سے مہ رو رقاصہ لڑکیاں اس کے دربار میں پیش کی جاتیں۔ لیکن اس قسم کے مشاغل چونکہ جذبات کو اکساتے اور دل میں ولولے پیدا کر دیتے اس لئے بادشاہ بجائے لطف اندوز ہونے کے اور افسردہ ہو جاتا تھا۔ ہاں ایک مشغل تھا جس سے اسے کسی قدر تسکین حاصل ہوتی تھی۔ فن مصوری۔ بادشاہ کے پاس قلمی تصاویر کا ایک نادر و نایاب ذخیرہ

تھا۔ جس میں آئے دن اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ بادشاہ کی صنعت پرستی اور قدر دانی کے چرچے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ چنانچہ جوان تو جوان بڈھے اور نحیف صناع بھی قدر دانی کے بھروسے پر ہزاروں میل کا سفر طے کر کے آتے۔ اور اپنی محنت کی داد امیدوں سے بڑھ کر پاتے تھے۔

ایک دن ایک بوڑھا سنگتراش ایک مرمریں مجسمہ لئے ہوئے بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا۔ یہ ایک حسین عورت کی شبیہ تھی۔ صنعت کا نادر ترین نمونہ! معلوم ہوتا تھا کسی وارفتہ مزاج ساحر نے پتھر کے ایک بے جان ٹکڑے میں عشق کا گرم سانس پھونک کر اسے حیات دوام بخش دی ہے۔ یہ شبیہ اس دنیا کی کسی عورت کی نقل نہ تھی۔ بلکہ وہ صناع کے تخیل کی ان عورتوں میں سے ایک تھی جن کی ہمسری عالم بالا کی عورتیں اور دیویاں بھی نہیں کر سکتیں۔ بادشاہ صنعت کے اس عجیب و غریب نمونے کو دیکھ کر بے حد محظوظ ہوا۔ بوڑھے صناع کو نہال کر دیا اور مجسمہ اپنی خواب گاہ میں ایک ایسی جگہ رکھوایا کہ نظر ہر وقت اس پر پڑتی رہے۔

یہ مجسمہ قد آدم سے زیادہ نہ تھا۔ مگر سنگتراش نے اس میں ایسی زندگی بھر دی تھی کہ اسے دیکھ کر اس کے قد و قامت کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ یہی معلوم ہوتا کہ بادلوں کی رنگین دنیا کا ایک پیکر حسن و شباب ہے جسے سحر و افسوں سے ساکت کر دیا گیا ہے۔ جس کے ساکت اعضا میں مچلنے کی آرزوئیں بیتاب ہیں۔ جس کے خم آلود ہونٹوں میں ہم کلامی کی تمنا آنکھیں کھول رہی ہے۔

اٹھتے بیٹھتے بادشاہ کی نگاہ اس مجسمے پر پڑتی اور وہیں جم جاتی تھی۔ اس کی خواب گاہ میں صنعت و حرفت کی سینکڑوں چیزیں تھیں مگر نہ جانے مجسمہ میں کیا بات تھی کہ وہ اسے دوسری چیزوں کی طرف متوجہ نہ ہونے دیتی تھی۔ بعض اوقات وہ پہروں محویت کے عالم میں لٹکا اسے تکتا رہتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے اور مجسمہ کے درمیان نامعلوم طور پر ایک رشتہ ایک تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ جو بتدریج بڑھتا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بادشاہ کی حالت میں بھی ایک تغیر ہوتا جاتا تھا۔ ملکہ کی سنگدلی اور بے مہری کا غم تو کسی وقت بھی دل سے دور نہ ہوتا تھا مگر اب اس غم کو مٹانے کا ایک حد تک ذریعہ اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ عورت سے یا یوں کہو ملکہ سے وہ جس چیز کا خواہاں تھا۔ وہ ایک حد تک اسے اس مجسمہ سے حاصل ہو رہی تھی۔

ملکہ کو اس حسین مجسمہ کا علم تھا۔ اور وہ جانتی تھی کہ بادشاہ اسے تحسین کی کیسی نظروں سے دیکھتا ہے۔ اس نے کئی بار بادشاہ کو محویت کے عالم میں اس مجسمہ کی طرف تکتے بھی دیکھا تھا۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ میرے ساتھ بادشاہ کے برتاؤ میں فرق آ گیا ہے۔ اور وہ مجھ سے دور دور رہنے لگا ہے۔۔۔

یہ سب کچھ جانتی تھی مگر معترض نہ ہوتی تھی۔

بہار کا موسم آیا۔ آنکھوں میں آپ سے آپ ایک خمار، دل میں ایک درد اور روح میں ایک تشنگی پیدا ہو جانے کا موسم آیا۔ جب ہر جاندار اپنے لئے ایک مونس و دمساز کی جستجو کرتا ہے۔

ایک دن صبح کو بادشاہ بستر سے اٹھا تو بہت بے چین تھا۔ رات اسے اپنی کم نصیبی کا احساس شدت سے ہوا تھا۔ کروٹیں بدلتے بدلتے صبح کر دی تھی۔ ملکہ سے اسے جتنی شکایتیں اور رنجشیں تھیں وہ سب تازہ ہو گئی تھیں۔ ان خیالات کا اثر اب تک زائل نہ ہوا تھا۔ وہ آہستہ سے اٹھ کر در یچے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ نیچے پائیں باغ میں خوش گلو پرندوں کے چہچہے بہار کو نغمیں تر بنا رہے تھے۔ بادشاہ اور بھی افسردہ ہو کر در یچے کے پاس سے چلا آیا۔ اب اس کی نظر مجسمہ پر پڑی۔ آج یہ مجسمہ اسے جس قدر حسین معلوم ہوا پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ بوڑھے سنگ تراش کے تخیل کی یہ نامعلوم عورت آج اس قدر زندہ نظر آتی تھی گویا اگر بادشاہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا تو ناز کے ساتھ اپنے ننھے ننھے پاؤں اٹھاتی ہوئی بے تحاشا اس کے پاس چلی آئے گی۔

بادشاہ بہت دیر تک اس کے سامنے کھڑا اسے تکتا رہا۔ ملکہ کئی بار خواب گاہ میں آئی۔ مگر بادشاہ کو اس محویت کے عالم میں دیکھ کر الٹے پاؤں لوٹ گئی۔ وہ پھر ہونے آئی مگر بادشاہ اس مجسمہ کے پاس سے نہ ہٹا۔ اچانک کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ بادشاہ چونک کر پلٹا اور دیکھا تو ملکہ تھی۔ وہ بولی "آج کیا بات ہے آپ ایسے افسردہ نظر آتے ہیں صبح ناشتہ بھی نہیں کیا؟"

بادشاہ نے جواب دیا "ہاں صبح میری طبیعت کچھ اچھی نہ تھی۔" یہ کہہ کر وہ پھر مجسمہ کو دیکھنے میں محو ہو گیا۔

ملکہ آگے بڑھ کر مجسمہ کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اسے بادشاہ کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ بولی "بس بہت دیکھ چکے چلئے ناشتہ کریں۔ آج صبح میری طبیعت بھی گری گری تھی۔ اس لئے میں نے بھی اب تک ناشتہ نہیں کیا۔"

ملکہ کی زبان سے یہ فقرہ سن کر بادشاہ چونک اٹھا۔ اس کے بعد وہ ملکہ کے ساتھ کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔ گو چند لقموں سے زیادہ نہ کھا سکا مگر آج اسے ایک ایسی لذت کا احساس ہوا جس سے وہ ناآشنا تھا۔

اس دن بادشاہ کی زندگی میں ایک نیا تغیر رونما ہوا۔ پہلے کی طرح وہ اب مجسمہ کو افسردگی سے نہ دیکھتا اور نہ اسے دیکھ کر اس پر محویت طاری ہوتی۔ بلکہ جس طرح کوئی بچہ اپنے محبوب کھلونے سے کھیل

کر خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ مجسمہ سے کھیل کر لطف اندوز ہوتا تھا۔ وہ اس کے چھوٹے سے خوبصورت سر پر ہاتھ پھیرتا۔ اس کے اعضا کو چھوتا۔ انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر پیار سے جھنجھوڑتا۔ اپنے ہاتھ سے پھولوں کا تاج بنا کر محبت سے اس کے سر پر رکھتا اور خوش ہوتا۔ ملکہ نے بادشاہ کی ان حرکات کو بار بار دیکھا اور اسے اس کی عقل اور کچھ پریشانی ہوئی۔ مگر جب وہ اس سے ہمکلام ہوئی تو اسے پہلے سے بھی بڑھ کر عقلمند اور ہوشمند پایا۔

اب ملکہ کے رویہ میں بھی فرق آنے لگا تھا۔ صبح کو جب وہ بادشاہ کو جگانے آتی تو یہ دیکھ کر کہ وہ پہلے ہی سے بیدار ہے اور حسب معمول مجسمہ سے کھیلنے میں مشغول ہے پہلے کی طرح الٹے پاؤں نہ لوٹ جاتی تھی۔ بلکہ اب وہ بادشاہ کو کبھی سیر کی غرض سے اور کبھی ناشتے کے لئے غرض کسی نہ کسی بہانے خواب گاہ سے باہر لے جاتی تھی۔ بادشاہ ملکہ کے اس تغیر سے بے خبر نہ تھا۔ اور اس سے ایک خاص حظ اٹھاتا تھا۔

ایک دن محل میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ صبح کو جب بادشاہ بستر سے اٹھا اور حسب معمول اس حسینہ کے مجسمہ کے قریب آیا تو دیکھا کہ اس کے داہنے گال پر سیاہی کا بڑا سا بدنما دھبہ لگا ہے۔ یہ دیکھ کر بادشاہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ پیشانی پر بل پڑ گئے۔ غیظ و غضب کے عالم میں مٹھیاں بند ہو گئیں۔ چاہتا تھا کہ دنیا اور اس کی ہر چیز کو تہ و بالا کر دے کہ اچانک کسی خیال سے اس کا ہاتھ رک گیا۔ وہ چہرہ جو غصے سے تاریک ہو گیا تھا آہستہ آہستہ روشن ہونے لگا۔ اور اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم نمودار ہو گیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے محل کے تمام لونڈی غلاموں کو بلایا اور غیظ و غضب کے دیوتا کی طرح گرجا برسا۔ دو غلاموں پر شبہ ظاہر کیا اور ان کے کوڑے لگوائے۔ پھر پانی، برش اور صندل چھال منگوایا اور خود ہی اس مجسمہ کے گال پر سے سیاہی کا دھبہ دور کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ملکہ بھی ہوئی اور ہجر کئے ہوئے دل کے ساتھ یہ سب ماجرا دیکھتی رہی۔ مگر بدبختی نے اس کی زبان سے ایک حرف بھی نہ نکلنے دیا۔ جب تک بادشاہ مجسمہ کے گال سے دھبہ دور کرنے میں مصروف رہا وہ اس کے پاس ہی کھڑی رہی۔ مگر اس اثنا میں اس نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھا۔ جب بادشاہ اس کام سے فارغ ہو گیا تو اس نے بڑی محبت سے مجسمہ کی طرف دیکھا۔ ملکہ چپ چاپ وہاں سے چلی آئی۔

اس واقع کو دو ہفتے گزر گئے۔ ایک دن ایک اس سے بھی بڑھ کر ناگوار واقعہ پیش آیا۔ بادشاہ صبح کو اٹھ کر مجسمہ کے پاس آیا تو دیکھا کہ اس کی دونوں آنکھیں پھوٹی ہوئی ہیں۔ مجسمہ کی آنکھیں بادشاہ کو

بہت محبوب تھیں اور وہ انہیں جل پریوں کی زمردیں آنکھوں سے تشبیہ دیا کرتا تھا۔ مگر یہ دیکھ کر بادشاہ بجائے غضبناک ہونے کے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ محل کے سب لونڈی غلام طلب کئے گئے اور ان کی پیٹھ پر کوڑے لگوائے گئے۔ اس دن بادشاہ کو ایسی خوشی ہوئی کہ شاید کسی بڑے غنیم پر فتح پانے سے بھی نہ ہوتی۔

مجسمہ کے عیب دار ہو جانے پر بھی بادشاہ کی نظروں میں اس کی وقعت ویسی ہی رہی جیسی پہلے تھی اور وہ ہر روز اسی فریفتگی سے اس سے کھیلا کرتا۔

اس کے بعد ایک دن بادشاہ نے دیکھا کہ مجسمہ کے دونوں کان کٹے ہوئے ہیں۔ یہ وہی کان تھے جنہیں بادشاہ "صدف نیساں" کہا کرتا تھا۔ پھر ایک دن دیکھا کہ اس کی ناک کٹی ہوئی ہے۔ اس کے بعد ایک دن دیکھا کہ اس کے سینے پر کسی تیز ہتھیار سے ضربیں لگی ہوئی ہیں۔ ہر دفعہ بیچارے لونڈی غلاموں کی شامت آجاتی تھی۔ لیکن پھر بھی بادشاہ اس مجسمہ کا ویسا ہی گرویدہ رہا۔ اب بھی گھنٹوں اس سے کھیلنے میں مشغول رہتا۔

ایک دن صبح کو بادشاہ ذرا دیر سے اٹھا۔ رات اسے بڑے سکھ کی نیند آئی تھی۔ عمر بھر ایسی میٹھی نیند کبھی نہ سویا تھا۔ انگڑائی لیتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ جوں ہی مجسمہ کی طرف نظر گئی تو منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ فرش پر سنگ مرمر کے ہزاروں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھرے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ دوسرے لمحہ ملکا اس کے قدموں میں تھی۔

عرض حال

یہ افسانہ میں نے آج سے دو سال قبل لکھا تھا۔ اس وقت میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ اجرام فلکی کی تسخیر کے لئے انسانی مہمات اس قدر شدت اختیار کر لیں گی کہ اگلے دو ہی برس میں انسان کا چاند پر پہنچنا ممکن ہو جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی ٹیلی ویژن کی نشریات میں بھی اس قدر ترقی ہو جائے گی کہ اس کے ذریعے ساری دنیا انسان کی اس فیروز مندی کا "تماشا" دیکھ سکے گی۔ میں چاہتا تو افسانے میں ترمیم و تنسیخ کر کے اسے جدید ترین حالات کے مطابق بنا سکتا تھا۔ لیکن چونکہ میں نے تسخیر قمر کو محض انسان کی انتہائی ترقی کے Symbol (علامت) کے طور پر استعمال کیا ہے حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے نہیں، اس لئے ان تبدیلیوں سے افسانے کے نفس مضمون میں کچھ فرق نہ پڑتا۔ چنانچہ میں نے اسے جوں کا توں ہی رہنے دیا ہے جیسا کہ آج سے دو سال پہلے میرے تخیل میں اس کا نقش ابھرا تھا۔ حکیم الامت علامہ اقبال کی تعلیمات کے زیر اثر میں نے خود کو کبھی کسی فرقے سے وابستہ نہیں کیا بلکہ ملت اسلامیہ کا ایک فرد سمجھا ہے۔ اپنی اس حیثیت سے میں نے ملت کے مستقبل کے بارے میں جو خدشات محسوس کئے ان کا اظہار ایک افسانے کے پیرائے میں کیا ہے کہ یہی میرا فن ہے۔ حضرت علامہ اقبال نے غیر منقسم ہندوستان میں اہل وطن کی بے حسی، نا اتفاقی اور فرقہ بندی کو دیکھتے ہوئے انہیں خبردار کیا تھا:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

میں نے بھی کچھ اسی قسم کے حالات سے متاثر ہو کر یہ افسانہ لکھا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے اتنا اور عرض کرنا ہے کہ اس افسانے میں مسلمانوں کے کسی خاص فرقے یا جماعت یا کسی خاص شخصیت کو ہدف نہیں بنایا گیا۔ اور اگر کہیں مماثلت نظر آئے تو اسے محض اتفاقیہ سمجھا جائے

یکم جون ۱۹۶۹ء — غلام عباس

دھنک

۱

یہ بیسویں صدی کے اواخر کی ایک شب کا ماجرا ہے۔ ہوٹل موہن جوڈارو کی اکہترویں منزل پر جو سب سے اونچی اور "بالیچہ آویزاں" کے نام سے موسوم ہے، ارباب حکومت کی جانب سے ایک پر تکلف ضیافت نیم شبی دی جا رہی ہے۔ مہمانوں میں دنیا بھر کے ملکوں کے سفیر، سائنسداں، مفکر اور صحافی شامل تھے

ہوٹل کی چھت پر کھلے آسمان کے نیچے کمخواب کا ایک شامیانہ جس کے کناروں پر موتیوں کی خوش نما جھالر لگی تھی جڑاؤ استادوں پر نصب کیا گیا ہے۔ شامیانے کے نیچے رنگا رنگ قالینوں کا فرش بچھا ہے۔ یہ وہی قالین ہیں جو پٹ سن کے سنہرے ریشے سے بنائے جاتے ہیں۔ اور اپنی نفیس بنت پائیداری اور نقش و نگاری کی دل آویزی کے باعث دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ ان قالینوں پر تھوڑے تھوڑے فصل سے کشادہ اور آرام دہ مخمل صوفے رکھے ہیں جن پر معزز مہمان اپنی بیگمات کے ساتھ متمکن ہیں۔

یہ مہمان جو پانچوں براعظموں کے مختلف تمدنوں کی نمائندگی کرتے ہیں اپنا اپنا پر وقار قومی لباس پہنے ہوئے ہیں۔ ان کے جدا جدا ناک نقشے، ان کی مخصوص حرکات و سکنات، ان کی الگ الگ بولیاں ہر ملک کی عورتوں کا جداگانہ حسن، ان کی مختلف طرز آرائش و زیبائش، ان کے مخصوص کرشمہ و ادا دیکھنے

والوں پر ایک محویت کا عالم طاری کر دیتے ہیں۔

ہر چند بظاہر کوئی ہنڈا، لیمپ، گیس یا ٹیوب لائٹ دکھائی نہیں دیتی۔ پھر بھی سارا پنڈال بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ جا بجا فوارے چھوٹ رہے ہیں جن کی پھواروں پر رنگ برنگی شعاعیں پڑ رہی ہیں۔ "بالیچہ آویزاں" میں قسم قسم کے پیڑ پودے کثرت سے لگائے گئے ہیں۔ جن کے پھولوں کی ملی جلی خوشبو دلوں میں ایک نشاط کی کیفیت پیدا کر رہی ہے۔

مہمانوں کے وسط میں ایک اونچی گول میز پر جو کارچوبی کے کام کے ایک بیش قیمت میز پوش سے مزین ہے، ایک بڑا سا خوبصورت ریڈیو سٹ رکھا ہے۔ اس سٹ کے اندر چاروں طرف اسپیکر اس ترکیب سے لگائے گئے ہیں کہ ہر شخص کو خواہ وہ کسی سمت بیٹھا ہو آواز صاف سنائی دے سکے۔

اس وقت ریڈیو سے آرکسٹرا کی موسیقی نشر ہو رہی ہے جس کی دھن اس تقریب کے لئے خاص طور پر باندھی گئی ہے۔ اور وہ تقریب کیا ہے؟ وہ یہ کہ آج رات پونے دو سے لے کر دو بجے کے درمیان کسی وقت پاکستان کا پہلا خلائی جہاز چاند پر اتر جائے گا۔ اور اس کی اس بے نظیر کامیابی کا حال اور چاند پر اس کے مشاہدات براہ راست اسی کی زبان سے نشر کئے جائیں گے۔

گو دنیا کے بعض ممالک پچھلے کئی برس سے چاند پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر اس امر میں اولیت حاصل کرنا پاکستان کی قسمت میں لکھا تھا۔ جب پاکستان نے تسخیر قمر کے سلسلے میں اپنے عزم کا اعلان کیا تو پہلے تو ان ملکوں کے سربراہوں کو یقین ہی نہیں آیا کہ پاکستان نے اس میدان میں اس قدر ترقی کر لی ہے۔ مگر جب ان کے سفیروں نے جو پاکستان میں متعین تھے پاکستان کے اس ارادے کی تصدیق کر دی تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اور انھوں نے اپنے اپنے ہاں کے سائنسدانوں اور دانشوروں کو اس تقریب کا حال بچشم خود دیکھنے کے لئے یہاں بھیج دیا۔

اس وقت رات کا ایک بج چکا ہے مگر دنیا کے دور دراز حصوں سے آئے ہوئے ان مہمانوں میں سے کسی کے چہرے سے بھی تھکاوٹ یا کسل مندی کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے وہ پہلے سے بھی زیادہ چاق و چوبند نظر آ رہے ہیں۔

ہوٹل کے خدام زرنگار وردیاں پہنے ہلکے پھلکے طعام اور مشروبات کے طشت اٹھائے مہمانوں کی تواضع میں مصروف ہیں۔ کچھ لوگ باہم گفتگو کر رہے ہیں۔ کچھ ریڈیو کی موسیقی سن رہے ہیں جس کا سلسلہ کبھی کبھی منقطع ہو جاتا ہے اور اناؤنسر آج رات کے پروگرام کی تفصیل یا کوئی مقرر چاند کی مہم کے سلسلے میں ابتدائی کامیابیوں کا حال سنانے لگتا ہے۔ کچھ مہمان جب بیٹھے بیٹھے اکتا جاتے ہیں تو

شامیانے سے باہر نکل کر "ہاشیچو آوتیاں" کی پر فضا روشوں پر چلنے یا گرد و نواح کا منظر دیکھنے لگتے ہیں۔ یوں تو شہر میں کئی عمارتیں ہوٹل موہن جوڈارو سے بھی اونچی اونچی ہیں مگر مضافات اور سمندر کا جیسا دلفریب نظارہ "ہاشیچو آوتیاں" سے دکھائی دیتا ہے اور کہیں سے دکھائی نہیں دیتا۔ خصوصاً رات کے وقت تو جہازوں اور جزیروں کے مکانوں کی روشنیاں دور سے جھلملاتی ہوئی بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

اس وقت فروری کا چاند اپنی پوری تابندگی کے ساتھ روئے زمین پر خنک چاندنی بکھیر رہا ہے۔ اس کا نظارہ بجائے خود ایک جاذبیت رکھتا ہے۔ مہمانوں کی نظریں بار بار اس کی طرف اٹھ جاتی ہیں اور وہ موجودہ تقریب کی مناسبت سے اور بھی محویت کے ساتھ اسے دیکھنے لگتے ہیں۔

آخر ڈیڑھ بجے کے قریب ریڈیو پر اعلان کیا گیا کہ سب مہمان اپنی اپنی نشستوں پر آ کر بیٹھ جائیں۔ اس وقت مہمانوں کے اشتیاق کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ خصوصاً بعض خواتین پر تو اضطراب کی سی حالت طاری ہے جس پر قابو پانے کے لئے انہوں نے اپنی مٹھیاں بھینچ رکھی ہیں۔ دم بھر میں سب لوگ جو ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے اپنے اپنے صوفوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ سب نے کان ریڈیو کی آواز پر لگا دیے۔ کچھ وقت اور انتظار میں گذرا۔ اس کے بعد اناؤنسر کی آواز یہ اعلان کرتی ہوئی سنائی دی:

"اب ہم اپنے سننے والوں کو چاند پر لئے چلتے ہیں جہاں اس وقت اجرام فلکی پر انسانی فتوحات میں ایک نیا اور انوکھا اضافہ ہونے کو ہے۔ لیجئے ہمارے خلا باز جو اس مہم کو سر کر رہے ہیں آپ سے مخاطب ہوتے ہیں۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی ریڈیو سے ایسی گھڑگھڑاہٹ سنائی دینے لگی جیسی کسی دور دراز ملک کے اسٹیشن کو "پکڑتے" وقت سنائی دیا کرتی ہے۔ اس فضائی گڑبڑ کا سلسلہ چند لمحے جاری رہا۔ اس کے بعد ایک انسانی آواز اس شور میں سے ابھرنی شروع ہوئی۔ پہلے پہل الفاظ صاف سنائی نہ دیے مگر رفتہ رفتہ واضح ہوتے گئے:

"میں کیپٹن آدم خان سکنہ ضلع جھنگ عمر پینتیس (۳۵) سال آپ سے مخاطب ہوں۔ میرا خلائی جہاز اس وقت چاند کی سطح سے صرف ہزار فٹ کی بلندی پر رہ گیا ہے۔ جہاز کی رفتار پچھتر میل فی گھنٹہ کر دی گئی ہے۔ مجھ کو چاند کی سطح بہت صاف نظر آ رہی ہے۔ یہ وہی سرزمین ہے جسے سائنسدان "طوفانوں کے سمندر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ عجیب نظارہ ہے پر ہول بھی اور دلکش بھی۔ لیجئے اب بلندی

صرف دو ہزار فیٹ رہ گئی ہے۔ جہاز کی رفتار چالیس میل فی گھنٹہ ہے۔ مجھے اس سفر میں بحمد اللہ کسی قسم کا حادثہ پیش نہیں آیا۔ خدا نے چاہا تو میرا جہاز حسب توقع آہستگی کے ساتھ چاند پر اتر جائے گا۔۔۔ اب میں ایک ہزار فیٹ سے بھی کم بلندی پر ہوں۔ جہاز کی رفتار بتدریج بہت کم کی جا رہی ہے۔۔۔ لیجئے اب میں صرف سات سو فیٹ چاند کی سطح سے بلند ہوں۔۔۔ پانچ سو فیٹ۔۔۔ رفتار دس میل فی گھنٹہ۔۔۔ صرف اڑھائی سو فیٹ۔۔۔ سو فیٹ۔۔۔ الحمد للہ کہ میرا خلائی جہاز صحیح سلامت چاند کی سطح پر اتر گیا ہے۔۔۔ اس وقت پاکستانی گھڑیوں کے مطابق رات کا ایک بج کر اڑتالیس منٹ اور چار سیکنڈ آئے ہیں۔ پاکستان زندہ باد!"

جلسے کے تمام شرکا نے جو دم سادھے بیٹھے تھے اور جن کے دل کی دھڑکن پل پل میں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی ایک ساتھ اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ ریڈیو سے خلا باز کی آواز سنائی دینی بند ہو گئی۔ اور اس کے بجائے قومی ترانہ بجنا شروع ہوا۔ سب لوگ تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ جب ترانہ ختم ہوا تو جلسے کا پنڈال تالیوں کے شور اور نعرہ ہائے تحسین و آفرین سے گونج اٹھا۔ غیر ملکی سفیر، سائنسدان اور اہل دانش اپنی نشستوں سے اٹھ اٹھ کر ارباب حکومت کے پاس جا کر ان سے مصافحہ کرنے اور انہیں مبارکباد دینے لگے۔ یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہا۔ اس کے بعد ریڈیو سے پھر پہلے کی طرح گھڑگھڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ سب مہمان جلدی سے پھر اپنی جگہ آ بیٹھے اب کے کیپٹن آدم خان کی آواز پہلے سے بھی زیادہ صاف سنائی دی:

"ابھی ابھی میں نے اپنا قومی پرچم "طوفانوں کے سمندر" کی سرزمین پر گاڑ دیا ہے۔ چاند کی سطح جمی ہوئی جھاگ کی طرح ہے۔ کہیں سخت کہیں نرم مگر اس میں پاؤں نہیں دھنستے۔ جا بجا دراڑیں اور گڑھے ہیں۔ کہیں کہیں یہ گڑھے بہت بڑے بڑے ہیں جیسے آتش فشاں پہاڑوں کے دہانے ہوں۔ پرچم گاڑنے کے مقدس فریضے سے فارغ ہو کر میں نے سب سے پہلے اس کے سائے میں اس خدائے لم یزل کے حضور نماز شکرانہ ادا کی جس کے فضل و کرم سے آج ہمارے ملک نے اپنا صحیح مقام پا لیا ہے۔ اور اب وہ دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقتور ممالک کی صف میں شامل ہو گیا ہے۔ پاکستان پائندہ باد!"

جلسے کا پنڈال ایک مرتبہ پھر نعرہ ہائے تحسین و آفرین سے گونج اٹھا۔ جب شور تھما تو خلا باز کی آواز یہ کہتی ہوئی سنائی دی:

"آپ کو یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ چاند میں دو ہفتے کا دن ہوتا ہے اور دو ہفتے کی رات۔ یہاں اس

وقت دن ہے جس کو شروع ہوئے ہمارے حساب سے تقریباً چھتیس گھنٹے گذر چکے ہیں۔ میرے پاس اتنی آکسیجن موجود ہے کہ میں یہاں چاند کا پورا ایک دن بسر کر سکوں۔ اور میرے خلائی جہاز میں اتنا ایندھن ہے کہ وہ مجھے بفضل خدا خیر و عافیت کے ساتھ وطن پہنچا سکے۔۔۔

"لیجئے اب میں آپ سے یہاں کے گرد و پیش کے حالات اور اپنے مشاہدات بیان کرتا ہوں۔۔۔"

۲

ابھی یہ خبر نشر نہیں ہوا تھا کہ کراچی سے سینکڑوں میل دور ایک قصبے کی چھوٹی سی مسجد میں ایک ملا نماز فجر کے بعد نمازیوں سے کہہ رہے تھے:

"ابھی ابھی میں نے اپنے ٹرانسسٹر پر یہ اعلان سنا ہے کہ پاکستان کا کوئی مردود شخص چاند پر پہنچ گیا ہے۔ خدا اس کو غارت کرے۔

"برادران اسلام۔ یہ صریح کفر ہے کہ جن اشیاء پر مشیت ایزدی نے اسرار و رموز کے حجاب ڈال رکھے ہیں انہیں سائنس اور نام نہاد ترقی کے نام پر بے نقاب کیا جائے۔

"بھائیو۔ ہم نے اپنی اس چھچھوری حرکت سے باری تعالیٰ کی جانب میں سخت گستاخی کی ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ عنقریب ہم پر خدائے قہار کا غضب نازل ہونے والا ہے۔۔۔"

گاؤں اور قصبوں ہی کے نہیں شہروں کے ملاؤں میں بھی اس خبر سے ہلچل مچ گئی۔ چنانچہ ایک شہر کی درسگاہ میں ایک ملا صاحب جو دریدہ شعر و سخن کا بھی مذاق رکھتے تھے، یوں نغمہ سنج تھے

"باری تعالیٰ نے انسان کو زمین پر خلیفہ بنا کر بھیجا اور یہ اختیار بخشا کہ جو یہاں جو جی میں آئے کرتا پھرے۔ مگر انسان کا ناشکرا پن اور اس کی ہوس ملک گیری دیکھو کہ اسے زمین کی لامحدود وسعتیں اپنے اعمال و افعال کے لئے تنگ معلوم ہوئیں۔ اور اس نے اپنے خالق ہی کے آستانہ خاص، اس کی آسمانی مملکت ہی پر جو چاند سورج اور ستاروں پر محیط ہے، غاصبانہ قبضہ جمانے کی ٹھان لی ہے۔۔۔

"اللہ اللہ! انسان کے جنون نخوت کا یہ ٹھکانہ ہے کہ اس نے فرشتوں کو تو صید زبوں قرار دے کر چھوڑ دیا اور خود یزداں ہی پر کمندیں پھینکنی شروع کر دیں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔۔۔"

اور پھر اگلے جمعہ کو دارالسلطنت کی وسیع جامع مسجد میں جہاں ہزاروں مسلمان نماز جمعہ کے لئے جمع ہوئے تھے شہر کے ایک شعلہ بیان خطیب للکار للکار کر اپنے خطبہ میں کہہ رہے تھے

"مسلمانو۔ تمہاری درسگاہوں میں جو شیطانی علوم پڑھائے جا رہے ہیں جانتے بھی ہو ان کا لب و لباب کیا ہے؟ ان کا لب لباب یہ ہے کہ مادہ مثل ذات باری تعالیٰ ازلی ہے۔ یا ذات باری تعالیٰ (نعوذ باللہ) خود مادی ہے۔ تم نے دیکھا ان علوم نے رفتہ رفتہ کیا گل کھلایا! میرا اشارہ تسخیر قمر کی طرف ہے جس کی خبر تم نے ریڈیو پر سنی اور اخباروں میں پڑھی ہوں گی۔ ہماری حکومت جو مغرب کی پیروی میں لادینیت کا شکار ہو گئی ہے اپنی اس کامیابی پر پھولی نہیں سماتی حالانکہ یہ سخت کافرانہ و ملحدانہ فعل ہے جس کے مرتکب شریعت کی رو سے واجب القتل ہے۔۔۔

"مسلمانو۔ آج ہر طرف فسق و فجور کا بازار گرم ہے۔ زمین فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ بے دینی، بے غیرتی، بے حیائی، فحاشی، عیاشی اور کفر و الحاد کا دور دورہ ہے۔ اللہ کا کلمہ نیچا اور کفر کا بول بالا ہو رہا ہے۔ آلات لہو و لعب اور ناچ گانے کا عام رواج ہو گیا ہے۔ عورت کی آنکھ سے حیا اور جسم سے لباس کی قید اٹھ گئی ہے۔ یہ ساری علامتیں قرب قیامت کی ہیں۔۔۔

مسلمانو۔ وہ وقت جلد آنے والا ہے جب کلام اللہ دلوں، زبانوں اور کاغذوں سے اٹھا لیا جائے گا۔ زمین جا بجا شق ہو جائے گی۔ سمندر ابل پڑیں گے۔ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تیز ہوا سے ریت کی طرح اڑنے لگیں گے۔ گرد و غبار اور آندھیوں سے جہان تیرہ و تار ہو جائے گا۔ آسمان پھٹ جائے گا اور ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔۔۔

مسلمانو۔ جاؤ گاؤں گاؤں قریہ قریہ شہر شہر لوگوں کو خبردار کر دو کہ انسان من حیث القوم توبہ استغفار کر لے کیونکہ قیامت آنے والی ہے۔۔۔"

اور اس طرح ملاؤں نے اپنی لسانی اور زور خطابت سے عوام کو قرب قیامت کا ایسا یقین دلا دیا کہ ہر شخص ڈرا ڈرا سہما سہما نظر آنے لگا۔ حکومت کے خلاف ہر طرف ایک بددلی سی پھیلنے لگی۔ ملاؤں کی تحریک روز بروز زور پکڑنے لگی۔ ملک بھر میں جگہ جگہ پہلے چھوٹے چھوٹے پھر بڑے بڑے جلوس نکلنے لگے۔ اسی طرح ان کے جلسوں کے شرکا کی تعداد بھی جلد جلد بڑھنے لگی۔ جلد ہی دارالسلطنت میں ایک بھاری جلسہ منعقد کیا گیا جس میں حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی:

"پاکستان کے عوام موجودہ نظام حکومت کو سخت کافرانہ اور فاسد اصولوں پر قائم تصور کرتے ہیں جس سے ہولناک نتائج نکلنے کا شدید خطرہ درپیش ہے۔ اس لئے وہ مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ اس نظام کو فوراً بدلا جائے۔ اور اس کے بجائے ملک میں قانون خداوندی رائج کیا جائے۔"

اس قرارداد نے یک بیک ارباب حکومت کو جیسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جب تک ملاؤں کی تحریک

تسخیر قمر کی مخالفت تک محدود رہی تھی، انہوں نے اسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ شروع شروع میں ان کے پاس اس طرف دھیان دینے کے لئے وقت بھی نہ تھا۔ ان کی توجہ تو تمام تر اس خراجِ تحسین کو وصول کرنے میں لگی ہوئی تھی جو ساری دنیا اس محیر العقول کامیابی اور سائنس میں ان کی پیش روی پر انہیں ادا کر رہی تھی۔ اور پھر وہ یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ اس کا عالمی سیاست اور خصوصاً ہمسایہ ممالک پر کیا اثر پڑا ہے۔ وہ ظاہر میں کیا کہتے ہیں اور در پردہ ان کا ردِ عمل کیا ہے۔

چنانچہ ملاؤں کی اس تحریک پر عام طور پر خیال کیا گیا کہ ان لوگوں کا کیا ہے۔ یہ تو سائنس کے ہر انکشاف، ہر نئی اختراع کی شروع شروع میں ایسے ہی مخالفت کیا کرتے ہیں۔ مگر پھر رفتہ رفتہ خود بھی اس کو قبول کر لیتے اور اپنے تصرف میں لانے لگتے ہیں۔ چنانچہ آج بڑے بڑے خرقہ و عمامہ والے ملاؤں میں سے شاید ہی کسی کا گھر ٹیلیفون، ریڈیو یا ٹیلی ویژن سے خالی ہوگا۔ یا ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو دینی نشریات میں اپنے لئے وافر حصے کا طلب گار نہ ہو۔ یا جو کسی سرکاری یا قومی دورے کے سلسلے میں ہوائی جہاز کو نقل و حرکت کے دوسرے ذرائع پر ترجیح نہ دیتا ہو۔

اور تو اور آج مساجد تک میں لاؤڈ اسپیکر جسے یہ لوگ تلفظ کی سہولت کے لئے ''آلہ مکبر الصوت'' کے نام سے یاد کرتے ہیں، اذان، خطبہ اور دینی تقریبات کی تشہیر کا ایک جزو لاینفک ہے۔ اس لئے عجب نہیں کہ چند ہی روز میں وہ تسخیر قمر کو بھی قبول کر لیں۔ اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ جب بھی چاند میں سب سے پہلی مسجد کے افتتاح کا موقع آئے تو ہر ملا اس مقدس فریضے کے ادا کرنے کا خود کو دوسروں سے کہیں زیادہ اہل ظاہر نہ کرے گا۔

لیکن اب جو اس تحریک نے ایک نیا ہی رنگ اختیار کر لیا تو اربابِ حکومت کو سخت تشویش ہوئی۔ اور انہوں نے اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے حکومت کا موقف واضح کرنے کی کوشش کی۔ اسی سلسلے میں ایک مفکر نے ''سائنس اور اسلام'' کے عنوان سے ریڈیو پر ایک زوردار تقریر بھی نشر کرائی۔ جس میں مفکر نے کہا:

''ہمارے ملا صاحبان سائنس کو کفر و الحاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس کے درس و تدریس کو گناہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جا بجا ارشاد فرمایا ہے کہ کائنات کو مسخر کرو۔ ہواؤں پر حکم چلاؤ۔ چاند اور سورج کی شعاعوں کو اپنی گرفت میں لاؤ۔ زمین کے سینے سے اس کے ان گنت خزانے نکالو۔ اور سمندر کی طوفانی موجوں کو تابع فرمان بناؤ۔۔۔۔۔ تسخیر قمر ان ہی ارشاداتِ خداوندی کی تعمیل کی ایک کوشش ہے۔۔۔۔''

ایک پمفلٹ میں جس کا عنوان ''برچھی سے ایٹم بم تک'' تھا، مضمون نگار نے موجودہ زمانے کے تقاضوں پر یوں روشنی ڈالی:

''حضور سرورِ کائنات کے زمانے میں تیر اندازی، شمشیر زنی اور شہسواری کی مہارت مسلمانوں کے لئے ایک مقدس فریضے کی حیثیت رکھتی تھی۔ کیونکہ اس سے دینِ حق کی حفاظت مقصود تھی۔ آگر آنحضرت صلعم موجودہ زمانے میں ہوتے اور دیکھتے کہ کس طرح باطل کی قوتیں چاروں طرف سے اسلام کو اپنے نرغے میں لینا چاہتی ہیں تو وہ ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے ٹینک اور ہوائی جہاز تو کیا راکٹ، میزائل بلکہ ایٹم بم تک کے استعمال کو ہر مومن کے ایمان کا جزو قرار دیتے۔۔۔۔''

مگر ملاؤں کی تحریک اب اس قدر زور پکڑ چکی تھی کہ محض بیانات سے اس کا مداوا مشکل تھا۔

ادھر جب کیپٹن آدم خان چاند کی مہم سر کر کے اپنے خلائی جہاز سمیت صحیح سلامت وطن واپس پہنچ گیا تو اس کی بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ اسے قومی ہیرو قرار دیا گیا۔ اس کا استقبال ایک فاتح کی حیثیت سے کیا گیا۔ اور اس کے فوجی مناصب میں جلد جلد ترقی دے کر اسے پہلے میجر اور پھر کرنل بنا دیا گیا۔ علاوہ ازیں ملکی و غیر ملکی اخبارات میں اس کی ان گنت تصویریں اور انٹرویو چھاپے گئے۔ ایک تصویر جو خاص طور پر بڑی مقبول ہوئی اس موقع کی تھی جب کہ ایک غیر ملکی سفیر کی بیوی پاکستانی خلا باز کی اس عدیم النظیر بہادری پر فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا منہ چوم رہی تھی۔ ہرچند اس میں بڑا معصوم سا جذبہ کارفرما تھا۔ مگر ملاؤں نے جو آدم خان کو مردود اور گردن زدنی سمجھتے تھے اسے یکطرفہ ہی معنی پہنا کے خوب خوب اچھالا۔ اور اسی سلسلے میں حزبِ اختلاف کے بعض اراکین سے ساز باز کر کے قومی اسمبلی میں ایک تحریکِ التوا بھی پیش کروا ڈالی۔

اس سے ملک میں اور بھی انتشار پھیل گیا۔ ملاؤں کے حوصلے پہلے سے بھی بڑھ گئے۔ اور انہوں نے جلد ہی اپنا ایک ملک گیر کنونشن منعقد کر ڈالا۔ جس میں متفقہ طور پر حکومت کے اربابِ حل و عقد سے مطالبہ کیا گیا کہ چونکہ وہ کافر و بے دین ہیں۔ اور مملکتِ خداداد پاکستان کی سربراہی کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اس لئے ان کو فوراً مستعفی ہو جانا چاہیے

جس عظیم الشان جلسے میں یہ قرارداد پیش کی گئی اس میں بڑی بڑی جوشیلی تقریریں سننے میں آئیں۔ ایک ملا صاحب حاضرین سے یوں خطاب کر رہے تھے:

''حیف صد حیف کہ اربابِ حکومت نے ہماری تنبیہ کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دی۔ لیکن دوستو اب تنبیہات کا وقت گذر چکا ہے اور وہ ساعت آپہنچی ہے کہ ملک کی زمام کار ملحدوں اور غدار کے

باغیوں سے چھین لی جائے۔ اور حکومت کی سربراہی مومنین اور صالحین کے ہاتھوں میں ہو۔ پس آئے مسلمانو اٹھو۔ اس کاقزاقانہ تہذیب کے علم برداروں سے عنان اقتدار چھین لو۔ اور چار دانگ عالم میں دین الٰہی کا ڈنکا بجادو۔۔۔

''کیا تم جاننا چاہتے ہو کہ ہم کیسی حکومت چاہتے ہیں؟ آؤ میں تمھیں اس کی ایک جھلک دکھاؤں۔ اس حکومت میں کوئی فقیر نہیں ہوگا، لاوارث نہیں ہوگا کیونکہ یہ حکومت خود اس کا مائی باپ ہوگی۔ زمین کا مالک اللہ اور صرف اللہ ہوگا۔ نہ مزارع ہوگا نہ زمیندار۔۔۔ اگر ایسی بادشاہت چاہتے ہو تو مسلمانو اس زور سے نعرہ تکبیر لگاؤ کہ ایوان کفر کے در و بام متزلزل ہو جائیں''۔

اور واقعی حاضرین جلسہ نے اس زور سے نعرہ تکبیر بلند کیا کہ دور دور تک راہ گیر چلتے چلتے تھم گئے۔ اور گردنیں اٹھا اٹھا کے دیکھنے لگے کہ یہ شور کیسا ہے!

اس کے بعد ایک چھوٹے سے قد کے ملاجن کی تقریر کا موضوع ''فی سبیل اللہ جہاد'' تھا بڑے جوش سے اچھل اچھل کر کہنے لگے:

''ہم اللہ کے سپاہی ہیں۔ حکومت نے ہم کو کچا کیا ہے۔ وہ ہماری طاقت سے بے خبر ہے۔ اگر ہم نہ چاہیں تو نہ کہیں شادی بیاہ ہو، نہ میت کی تجہیز و تکفین عمل میں آئے۔ حکومت لاکھ اعلانات کرتی پھرے میں کہتا ہوں دو رتیں لگا لگا کے دیکھے۔ ہوائی جہازوں میں بادلوں سے اوپر اوپر پرواز کرے۔ ٹیلیفون کے ذریعے دوسرے شہروں سے شہادتیں فراہم کرائے مگر جب تک ہم اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے ہلال کو نہ دیکھ لیں نہ عید کی خوشی ہو نہ محرم کا سوگ۔ حکومت اس باب میں بارہا ہم سے متصادم ہو کر ہماری طاقت کا اندازہ کر چکی ہے۔۔۔''

جب یوں کھلم کھلا نعرہ بغاوت بلند ہونے لگے تو کون حکومت اسے ٹھنڈے پیٹوں گوارا کرلے گی! چنانچہ ان تمام مقررین کو جنھوں نے اس جلسے میں اشتعال انگیز تقریریں کی تھیں، نقص امن کے خطرے کے تحت راتوں رات ان کے ٹھکانوں سے گرفتار کر لیا گیا۔ اور ملک بھر میں دفعہ ۱۴۴ (ایک سو چوالیس) نافذ کر دی گئی جس کی رو سے لاٹھیوں، تلواروں، برچھی بھالوں اور دوسرے ہتھیاروں کو لے کر چلنا، اینٹ پتھر تیزاب اور سوڈے کی بوتلوں کو دنگے فساد کی غرض سے جمع کرنا، پانچ یا زیادہ اشخاص کا اکٹھا ہونا ممنوع قرار دیا گیا۔

ان گرفتاریوں نے اور بھی آگ بھڑکا دی۔ حکومت کے اس فعل کو مداخلت فی الدین سمجھا گیا۔ لوگ اپنے مذہب سے خواہ کتنے ہی بیگانہ کیوں نہ ہوں مگر ایک مرتبہ جب ان کو یقین دلا دیا

جائے کہ یہاں ان کے دین کی حرمت کا سوال ہے۔ تو یکبارگی ان کے مذہبی احساسات بیدار ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ایک جنون کی سی کیفیت میں دین کی خاطر جان تک دے دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ یہی حال اس تحریک کا ہوا۔ عوام میں ہر طرف ناراضگی پھیل گئی لیکن چونکہ جلسوں جلوسوں پر پابندی عائد تھی اور وہ برملا غم و غصے کا اظہار نہ کر سکتے تھے اس لئے وہ ایک ایک دو دو کر کے مسجدوں میں پہنچنے لگے۔ اور خود کو ملاؤں کی تحریک سے وابستہ کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ تمام مسجدیں سیاسی کارروائیوں کا مرکز بن گئیں۔ دن رات رہنماؤں میں مشورے ہونے لگے۔ نمازیوں کو کھلم کھلا سرکشی پر آمادہ کیا جانے لگا۔ جب ملاؤں کو یقین ہو گیا کہ عوام پورے طور پر ہمارے ساتھ ہیں تو انہوں نے ایک خاص دن ان گرفتاریوں کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے مقرر کر دیا۔ اعلان میں کہا گیا کہ اس روز سارے ملک میں ہڑتال کی جائے گی۔ اور حکومت کی نافذ کردہ دفعہ ۱۴۴ (ایک سو چوالیس) کو توڑنے کے لئے شہر کی ہر مسجد سے نماز فجر کے بعد جتھے روانہ ہوں گے جن میں شرکا کی تعداد پانچ سے کسی صورت میں کم نہ ہوگی۔

یوم احتجاج کی صبح کو ابھی اندھیرا ہی تھا کہ حکومت نے شہر کی تمام چھوٹی بڑی مساجد کے باہر پولیس کی بھاری جمعیتیں متعین کر دیں۔ حسب اعلان نماز فجر کے بعد نمازیوں کے جتھے مسجدوں سے نکلنے شروع ہوئے۔ ہر شخص کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے تھے۔ اور اس کے کپڑوں پر عرق گلاب چھڑکا گیا تھا۔ پولیس نے ان لوگوں کو دھڑا دھڑ گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ صرف ایک گھنٹے کے اندر ملک کے طول و عرض میں دس ہزار سے اوپر گرفتاریاں عمل میں آ چکی تھیں۔ پھر بھی ان جتھوں کے کم ہونے کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ لوگ تھے کہ خود کو گرفتار کرانے کے شوق میں جوق در جوق چلے آتے تھے۔ شہروں سے قصبوں سے دیہات سے۔ بعض سروں پر کفن باندھے ہوئے تھے بعض درود شریف پڑھتے چلے آتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جوالا مکھی پہاڑ پھٹ پڑا ہے جس سے انسانی لاوا بہتا چلا آ رہا ہے۔

یہ تو تھا دفعہ ۱۴۴ (ایک سو چوالیس) کے توڑنے والوں کا حال۔ اب ہڑتال کرانے والوں کا ماجرا سنئے۔ یہ لوگ جن میں بہت سا عنصر غنڈوں اور آوارہ گردلڑکوں کا شامل ہو گیا تھا صبح ہوتے ہی بازاروں اور گلی کوچوں میں چکر لگانے لگے۔ رضاکاروں نے گذشتہ رات ہی کو شہر کے ہر حصے میں لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے ہڑتال کا اعلان کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے دکان دار فساد کے ڈر سے گھروں ہی سے نہ نکلے۔ اور اگر کچھ لوگوں نے پولیس کے اصرار اور حفاظت کی یقین دہانی پر دکانیں

کھولیں بھی تو ہڑتالیوں کے مشتعل گروہ فوراً موقع پر پہنچ گئے۔ اور لوٹ مار کی دھمکی دے کر دکانوں کو بند کرا دیا۔ اگر کہیں پولیس نے مزاحمت کی تو اس پر اینٹیں اور پتھر برسائے گئے۔ پولیس نے پہلے زیادہ سختی اختیار نہ کی۔ جب اس کے سمجھانے بجھانے سے ہجوم منتشر نہ ہوتا تو وہ ہلکا سا لاٹھی چارج کر دیتی۔ لوگ ادھر ادھر بکھر جاتے لیکن تھوڑی ہی دیر میں پھر آ موجود ہوتے۔ رفتہ رفتہ دونوں طرف تندی اور درشتی پیدا ہونے لگی، حالات نازک صورت اختیار کرنے لگے۔

یہ ہڑتالی دکانیں ہی بند نہیں کرا رہے تھے بلکہ بسوں، ٹیکسیوں اور رکشاؤں کو روک بھی رہے تھے۔ ان ہنگاموں میں دو بسوں اور آٹھ رکشاؤں کو جلا دیا گیا۔ جن بسوں کے شیشے توڑے گئے ان کا تو کچھ حساب ہی نہ تھا۔

کچھ لوگوں نے سرکاری دفتروں اور غیر ملکی سفارت خانوں کا رخ کیا۔ اور انہیں آگ لگانے لگے۔ حکومت کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ جب پولیس کا لاٹھی چارج اور آنسو گیس اس سیلاب کو نہ روک سکا تو فوج بلوائی گئی۔ یہی واقعہ کئی شہروں میں پیش آیا۔ ہر جگہ کرفیو لگا دیا گیا۔ مگر فتنہ و فساد اور بلووں کا سلسلہ ختم نہ ہوا۔ شام ہوتے ہوتے تقریباً پچاس ہزار رضا کار گرفتار ہو چکے تھے۔ اور سینکڑوں جانیں آتشیں اسلحہ کی نذر ہو گئی تھیں۔۔۔

۳

ملاؤں نے روئے زمین پر خدا کی بادشاہت کا جو تصور پیش کیا تھا وہ اب حقیقت بن چکا ہے۔

پچھلی حکومت کے مستعفی ہونے کے بعد سب سے پہلے بالغ رائے دہندگان کے ووٹوں سے ایک امیر چنا گیا۔ اور اسے دنیا پر خدا کے نائب کی حیثیت دی گئی۔ انتخاب کا مسئلہ بڑا ہنگامہ خیز ثابت ہوا تھا۔ اور سارا ملک جیسے ایک بحران کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ مگر شکر ہے کہ جب تک ملا صاحبان حکومت سے برسرِ پیکار رہے، ان میں اتحاد بھی رہا اور یک جہتی بھی۔ مگر جیسے ہی عام انتخاب منعقد کرنے کا اعلان ہوا ہر شخص حصولِ اقتدار کے لئے مضطرب ہو گیا۔

ملک بھر میں بہت سی جماعتیں الیکشن لڑنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہر جماعت نے اپنا اپنا لائحہ عمل، اپنے اپنے قواعد و ضوابط اور اپنی اپنی مخصوص وردی وضع کر لی۔ اور پھر جھنڈے بنا بنا کر اپنے اپنے امیر کے گن گاتی گلی گلی کوچے کوچے پھرنے لگی۔ جلسے جلوس، پوسٹر بازی غرض وہ وہ ہنگامے ہوئے کہ باید و شاید۔ الیکشن میں جن جماعتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں سبز پوش، سرخ پوش، نیلی پوش

پیلی پوش، سیاہ پوش اور سفید پوش خاص طور پر قابلِ ذکر تھیں۔ موخر الذکر جماعت زیادہ تر دیہاتیوں پر مشتمل تھی۔

اس الیکشن میں جو خوش نصیب طالع برسرِ اقتدار آیا وہ سبز پوشوں کی جماعت کا امیر تھا۔ زبان و قلم کا دھنی۔ آتش بیان۔ مرد دو قلم اس نے اپنے خطبوں اور پمفلٹوں سے ملک میں ہلچل سی مچا دی۔ اور اپنی آواز کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔ غرض اس زور شور سے پروپیگنڈا کیا کہ انتخاب میں سب سے زیادہ ووٹ اسی کو ملے۔ اور سرخ پوش، نیلی پوش، پیلی پوش، سیاہ پوش اور سفید پوش امیدوار منہ دیکھتے ہی رہ گئے۔

سبز پوشوں کے امیر نے انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد سوچا کہ ان مخالف جماعتوں کے نمائندوں کو مجلسِ شوریٰ میں شامل کر لینا بہتر ہوگا۔ اس طرح ایک تو ان کی اشک شوئی ہو جائے گی دوسرے وہ ملک میں فتنہ و فساد پھیلانے سے باز رہیں گے۔

امیر نے کہا: ''الگ الگ رنگ بجائے خود کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ لیکن جب یہی رنگ یکجا ہو جاتے ہیں تو دیکھو کیسی خوبصورت دھنک بن جاتی ہے۔''

یہ مصالحت بڑی کارآمد ثابت ہوئی۔ چنانچہ مجلسِ شوریٰ جس کا کام امورِ سلطنت میں امیر کو مشورہ دینا تھا پوری قوم کی نمائندہ بن کر اپنا کام بڑی دل جمعی کے ساتھ انجام دینے لگی۔ امیر نے مجلسِ شوریٰ کے اجلاس اور دیگر انتظامی امور سرانجام دینے کے لئے شہر کی جامع مسجد کو پسند کیا۔ اور اسی کے ایک حجرے میں بود و باش اختیار کی۔ چنانچہ دن رات جامع مسجد میں مجلسِ شوریٰ کے جلسے ہونے لگے۔ اور حکومت کا اصلاحی اور تعمیری کام بڑی سرگرمی سے شروع ہو گیا۔

مجلسِ شوریٰ نے سب سے پہلے اپنی توجہ اس امر پر مرکوز کی کہ پچھلی حکومت کے زیرِ اثر معاشرے کے رگ و پے میں مغربی تہذیب و تمدن کا جو زہر سرایت کر گیا ہے اس کو زائل کیا جائے۔ چنانچہ تمام انگریزی طور طریقے، لباس، آدابِ معاشرت یک قلم موقوف کر دیئے گئے۔ بلکہ اس اقدام کو زیادہ موثر بنانے کے لئے ''نہ رہے بانس نہ بجے بانسری'' کے مصداق انگریزی زبان کی تحصیل ہی کو نصابِ تعلیم سے خارج کر دیا گیا۔

ملک کی زمامِ کار امیر نے خود اپنے ہاتھ میں لی اور پچھلی حکومت کے انتظامی امور کے طریقے، سیکرٹریٹ اور اس کے ماتحت جملہ شعبے منسوخ کر دیئے گئے۔ اور ان کی پچھلی فائلوں اور تمام ریکارڈ کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ البتہ پولیس اور چنگی کے محکمے بحال رکھے گئے۔



غلام عباس گذشتہ نسل کے بہت نمایاں افسانہ نگار تھے۔ ان کے قدر دانوں میں محمد حسن عسکری اور انتظار حسین جیسے لوگ بھی تھے۔ علاوہ بریں الحمرا کی کہانیاں لکھ کر (یعنی ترجمہ کر کے نہیں کہہ رہا ہوں کیوں کہ ان افسانوں میں خود غلام عباس کی طبیعت کی اپج بھی پوری طرح کارفرما ہے) غلام عباس نے میری نسل کے لوگوں کو بھی اعلیٰ درجے کی اردو سے روشناس کرایا تھا۔ بلکہ کچھ عرصے تک تو الحمرا کی کہانیوں کی شہرت غلام عباس کی شخصیت سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ یعنی پڑھنے والوں کو وہ کہانیاں یاد تھیں لیکن غلام عباس کا نام انہیں یاد نہ تھا۔ غلام عباس نے افسانہ نگاری کے کئی مراحل طے کیے۔ لیکن افسوس یہ رہا کہ ان کے ایک افسانے "آنندی" کی غیر معمولی شہرت نے غلام عباس کے بقیہ کارناموں پر ایک طرح سے پردہ ڈال دیا۔ بالخصوص ہندوستان میں تو غلام عباس "آنندی" ہی کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔

ندیم احمد نے غلام عباس اور اردو افسانے کی بڑی خدمت انجام دی ہے کہ انھوں نے غلام عباس کے بارے میں چند اہم تنقیدی مضامین یکجا کر دیے ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ پوری چھان بین اور محنت کے بعد انھوں نے غلام عباس کے تمام افسانے بھی اس کتاب میں جمع کر دیے ہیں۔ اب یہ کتاب غلام عباس پر بڑی حد تک حرف آخر کا حکم رکھتی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی



ISBN 978-93-5265-604-2

Kalliyat-E-Ghalam Abbas

Ghulam Abbas Key Afsaney

Edited By :

Nadim Ahmad

Price : ₹ 800

الحمد للہ الخالق اللوح والقلم کہ این کتاب مستطاب موسوم بہ

"کلیاتِ غلام عباس"

غلام عباس کے افسانے

من تالیف بندۂ عاجز بارگاہ ایزدی المشتہر بہ

ندیم احمد

در ام البلاد عشرت خندہ بنیاد

شہر کلکتہ انطباع یافت